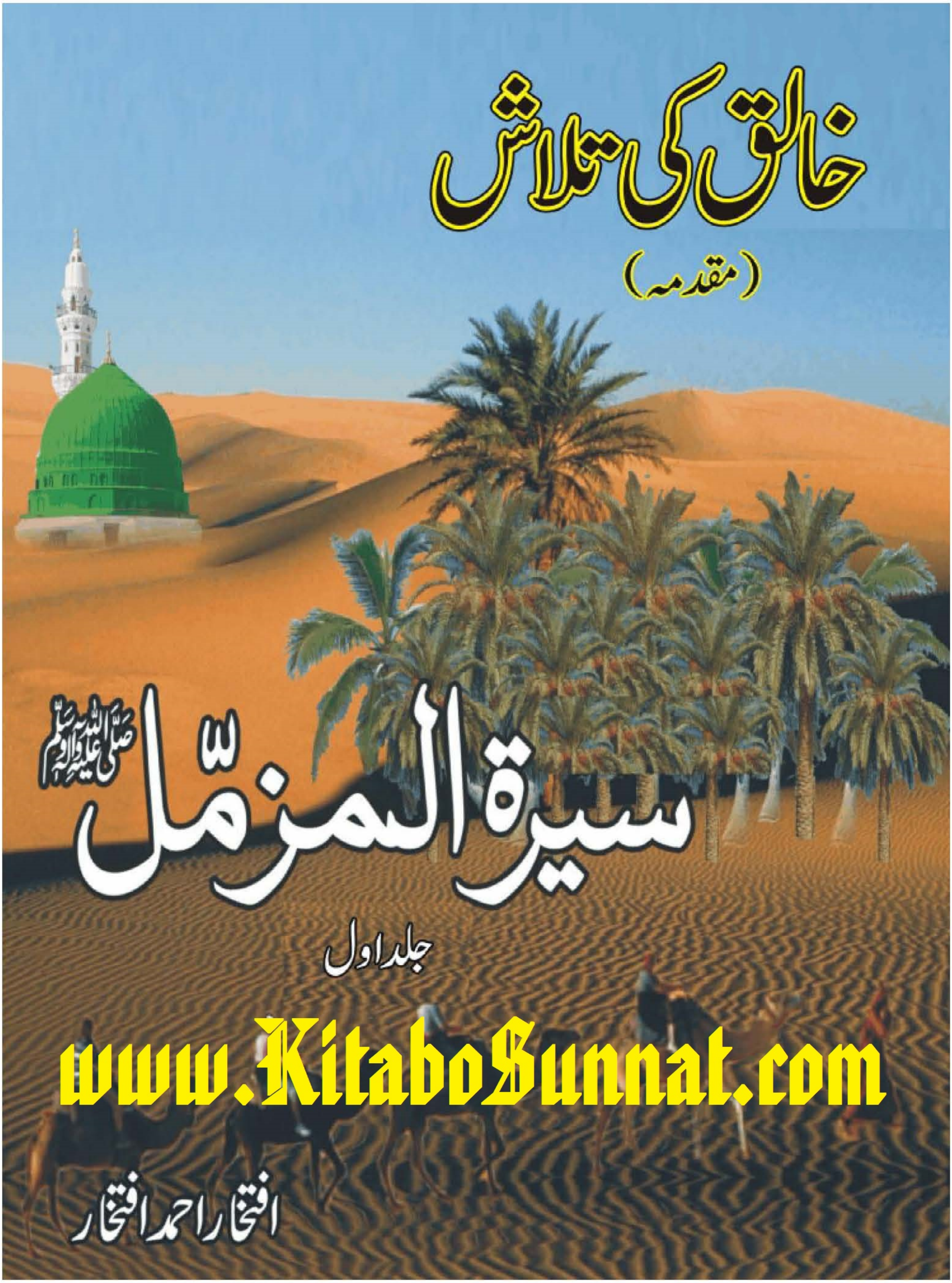

خالق کی تلاش
(مقدمہ)
سیرۃ المزمل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
جلد اول
www.KitaboSunnat.com
افتخار احمد افتخار



افتخار احمد افتخار

رہائش؛ ڈنگہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں

فون ؛ 03006281898

میل ایڈریس ؛ ift1167@gmail.com

نام کتاب؛ سیرۃ المزمل ﷺ جلد اول۔خالق کی تلاش

سنہ تحریر؛ مارچ 2009ء

کمپوزر و ڈیزائنر؛ افتخار احمد افتخار

اہتمام؛ kitabosunnat.com

انتساب

ریگزارِ عرب کے اُن بگولوں کے نام
جو اتنے شاہ بخت تھے کہ انہیں
یونہی راہ چلتے اُس رُخ جمال کی
زیارت ہو گئی جس کی مثل نہ
کوئی پہلے تھا نہ بعد میں ہو گا،،،



ابتدائے کلام

آج کی دنیا میں تو علم ہے مگر دانائی نہیں، طاقت تو ہے مگر اخلاق نہیں، ظلم تو ہے مگر رحم نہیں، گل تو ہے مگر خوشبو نہیں، امید تو ہے مگر منزل نہیں، تہذیب تو ہے مگر اقدار نہیں، آنکھیں تو ہیں مگر اشک نہیں وحشت تو ہے مگر امن نہیں، خزاں تو ہے مگر بہار نہیں، یاس تو ہے مگر آس نہیں، نفرت تو ہے مگر محبت نہیں، دھوپ تو ہے مگر سایہ نہیں، سانس تو ہے مگر آس نہیں، مکان تو ہے مگر مکین نہیں، دیوار تو ہے مگر حفاظت نہیں، زخم تو ہے مگر مسیحا نہیں ، درد تو ہے مگر دوا نہیں، دیا تو ہے مگر روشنی نہیں، روشنی ہے تو رستہ نہیں، رستہ ہے تو منزل نہیں، منزل ہے تو جستجو نہیں، احساس ہے مگر گراں نہیں، سکھ ہیں مگر ارزاں نہیں، دکھ ہیں تو دوا نہیں، دوا ہے تو اثر نہیں، صدائیں ہیں مگر خامشی نہیں، زندگی ہے مگر حرکت نہیں، حرکت ہے مگر برکت نہیں، ابتدا ہے مگر انتہا نہیں، فقر ہے مگر فلاح نہیں، آہ تو ہے مگر جزا نہیں ظلم تو ہے مگر عدل نہیں، شب ہے مگر سحر نہیں، سحر ہے تو آسودگی نہیں، آسودگی ہے تو اطمینان نہیں دریا ہے مگر روانی نہیں، سمندر ہے مگر تلاطم نہیں، دل ہے مگر مضطرب نہیں، آنچل ہے مگر رنگ نہیں ، گر رنگ ہیں تو ادا نہیں، حیا ہے تو ردا نہیں ، رِدا ہے تو حیا نہیں، صبح ہے مگر صبا نہیں، دست ہیں مگر دعا نہیں، دعا ہے تو مدعا نہیں، موتی ہیں تو دامن نہیں، دامن ہے تو کشا نہیں، رات ہے مگر سکوت نہیں گر سکوت ہے تو

فکر نہیں، گر فکر ہے تو گہرائی نہیں، ابر ہیں مگر ہوا نہیں، بیماری ہے مگر شفا نہیں، تمنا ہے مگر اشتہا نہیں، جفا ہے مگر وفا نہیں، بزم ہے مگر رونق نہیں، آدمی ہے مگر انسانیت نہیں، معلومات ہیں مگر علم نہیں، عقل ہے مگر شرف نہیں، عقیدہ ہے مگر عمل نہیں، دل ہے مگر گداز نہیں، رحمت ہے مگر طلبگار نہیں، علم ہے مگر آشکار نہیں، سجدے ہیں مگر خدا نہیں، وعدے ہیں مگر وفا نہیں، نیند ہے مگر خواب نہیں، خواب ہیں تو تعبیر نہیں، تعبیر ہے تو یقین نہیں، یقین ہے تو ایمان نہیں، ایمان ہے تو عمل نہیں، عمل ہے تو اخلاص نہیں، جستجو ہے مگر منزل نہیں، گر منزل ہے تو نشان منزل نہیں، طلب ہے مگر طلبگار نہیں، صحرا ہے مگر پیاس نہیں، بہمیت ہے مگر آشتی نہیں، شمع ہے مگر پروانہ نہیں، جگنو ہے مگر مسافر نہیں، عشق ہے مگر جنوں نہیں، خرد ہے مگر پہچان نہیں، اور یہ سب اس لیے ہے کہ آج کی دنیا میں آج کے انسان کا دامن علم وحی سے خالی ہے ہر چند کہ ہدایت کا وہ مخزن ہمارے درمیان موجود ہے جو انسان کے ہر دکھ کا مداوا ہے مگر انسان اُس سے راہنمائی حاصل کرنے پہ آمادہ نہیں انسان کی کج روی پہ حیرت ہے۔

افتخار احمد افتخار

حسن ترتیب

خالق کی تلاش

تیرگی ایسی تھی کہ منزلیں الجھنے لگیں اور منزلیں ایسی جو فلاح سے دور تھیں، دیارِ عشق میں خامشی تھی یاس تھا ،کوچہ ءِ وحشت میں رونقیں تھیں شور تھا،گلشن کی ہر کلی ،صحرا کا ہر بگولہ، بادِ صبا کی ہر لہر، پرندوں کے سب نگر ،آفتاب کی کرن کرن ،مہتاب کا نیلگوں نور،وادی وادی کے جگنو، تپتے صحرا کا ریزہ ریزہ ،اضطراب میں ڈوبے ساحل ، حیران وششدر چٹانیں ،انگشت بہ دنداں شجر و حجر،آبشاروں کی روانی ، بہتے چشموں کا پانی کوئل کی نغمگی،غزالوں کا حزن،زمیں کی وسعتیں،آسماں کی رفعتیں،ستاروں کی جگمگاہٹ،دریاؤں کی روانی بہاروں کی مستی،حسن کا بانکپن،جنوں کی منزلیں اور خرد کی انتہائیں سب اس شبِ دیجور میں انسان کی پستی پہ نادم تھیں، پشیمان تھیں،نوحہ کناں تھیں۔خطہ ارض پہ بسنے والے انسانوں کی ہر بستی ظلمت کی پناہوں میں تھی ،کوچہ کوچہ نگر نگر جہل تھا وحشت تھی،ظلم تھا،اضطراب تھا،گمراہی تھی ،جبر تھا، بے بسی تھی ،انسانی آنکھوں میں اگرچہ خواب تھے کہ اِن کو ادراک واحساس کی دولت عطا کی گئی مگر دن کی تیز روشنی میں وہ دکھ دیتے تھے۔ منزل کی خواہش تھی مگر راہبر نہ تھا،کارواں تو تھا مگر میر کارواں نہ تھا،اِک بسیط خزاں تھی جس کا دامن امیدِ بہار

سے بندھا تھا۔زیست اگر چہ تھی مگر اسلوبِ زیست کا دور دور تک کوئی نشاں نہ تھا۔انسان بے منزل مسافت کے آزار میں تھا،سرِ افلاک کھلتے دریچوں کے انتظار میں تھا۔وہ خود اپنی وحشت کے احساسِ گراں بار تلے پس رہا تھا مگر منزلوں کے سب رستے سراب زدہ تھے۔اس کے سماجی ڈھانچے کی زنجیریں اتنی مضبوط تھیں کہ وہ اپنے ہی جگر کا لہو خود پینے پر مجبور تھا۔اس کی آنکھوں میں حسرت و یاس کے سائے تھے اور گلے میں روایتوں کے طوق۔تختۂ ارض کے مختلف خطوں کے حالات ورسم ورواج اور عقائد اگر چہ مختلف تھے مگر ان میں اس حد تک مماثلت ضرور تھی کہ کسی بھی گوشہ میں اس حقیقی روشنی کا کوئی وجود نہ تھا جو اندھیروں کے اس پار منزل کے خدوخال کی وضاحت کر سکے،جو انسان کے اندر موجود احساسِ شرف کو اجاگر کر سکے،جو اسے معبودِ حقیقی کی تلاش پہ اکسا سکے،جو اس کی ذات کے دروں لہریں لیتی اس تڑپ کو زندگی بخش سکے،جس کا تعلق خالق کی تلاش کے ساتھ ہو۔وہ زندگی کے تپتے صحرا میں بادِ صبا کھوج رہا تھا مگر اس کے نصیب میں وہ سرکنڈے تھے جو اس کے عمل کا بدل اور اس کے سماج کا عکس تھے،جو اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بوئے تھے اور اسے خود ہی کاٹنے تھے،وہ رسموں رواجوں اور بے دلیل عقائد میں مقید تھا،وہ پتھر اور لکڑی کے ان بتوں کی پوجا کر رہا تھا جن میں ظاہری دلکشی بھی نام کو نہ تھی۔

انسان ایسی رسموں کا پجاری تھا جن کو بجا طور پر وحشت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ہندوستان سے لے کر چین تک اور ایران سے لے کر روم تک،یونان سے لے کر مصر تک کہیں بھی کسی بھی معاشرے میں انسانی فلاح کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔اہل رومہ اگر چہ اس بات کے دعویدار تھے کہ وہ ایک الہامی مذہب کے پیرو ہیں مگر ان کا یہ دعویٰ بھی محض دعویٰ ہی تھا اور دین کی اصل اساس کو وہ ایک مدت سے کہیں کھو چکے تھے کہ گذری پانچ صدیوں میں بنی اسرائیل نے کتابِ مقدس کو تحریف کی سان پہ چڑھا رکھا تھا جس نے اس کتابِ حقیقت اور الہامِ مقدس کے بنیادی تصور اور پیام کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا امت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔حضرت موسیٰ کی قوم اوہام عقائد اور علمائے بنی اسرائیل کے خود سے مرتب کئے ہوئے اُس دین کی پیروی کرنے لگی جس میں راہبوں اور پادریوں کے مفاد کی ضمانت تو مل سکتی تھی مگر اس میں الہٰامیات کا وہ عکس مفقود تھا جو دراصل پیامِ مسیح تھا۔وہ دین میں تحریف کی بدترین مثال تھی جو بنی اسرائیل کے ہاں ہی مل سکتی ہے۔یہ وہ تکون تھی جو سراسر اندھیرے رستوں کے آزار اور گمراہی کی طرف بلاتی تھی۔پھر وہ رذالت کی اس پستی میں جا اترے جہاں انھوں نے اپنے راہبر اور اللہ کے محبوب رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''عبداللہ'' کی بجائے ''ابن اللہ''

کہنا شروع کر دیا اور دین حنیف کی بنیادی قدر توحید سے انحراف کی راہ اپنالی جس نے ان سے نہ صرف دنیا چھینی بلکہ انھوں نے دنیا کے اس معمولی جاہ وحشم کے عوض اپنی آخرت کا سودا بھی کر لیا اور خالق کے در سے طوقِ لعنت کی مستحق قرار دے دی گئی۔ باقی دنیا کی عقائدی حالت کا اندازہ بنی اسرائیل کی اس روش سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ قوم ہی اپنے مرکز کو کھو بیٹھی تھی جس کے پاس بہر حال اس روشن دلیل کا قلیل حصہ تو موجود ہی تھا جس کا منبع خیر وفلاح سے وابستہ ہے۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے انسانیت اپنے تمام اخلاقی اثاثے اجاڑ چکی تھی۔ قریہ قریہ، نگر نگر توحید سے خالی تھے خالق کی پہچان سے عاری تھے۔ اپنی ذات میں آراستہ حسن کے ہر احساس سے تہی تھے۔ ان کی سیاسی معاشی معاشرتی سماجی اور اخلاقی قدروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگل کے قانون میں بھی آخر چند قاعدے اور روائتیں تو مستحکم سمجھی جاسکتی ہیں مگر انسانوں کے اس انبوہ میں تو اس کے آثار بھی نہیں ملتے کہ خالق کی پہچان کے بند دروازوں کے پیچھے تیرگی اور یاس کے وہ سنگِ میل ہی ملیں گے جو منزل کی راہنمائی کے لیے نہیں ہوتے بلکہ پاؤں کی ٹھوکر کے لیے ہوتے ہیں کہ شاید وہ اس ٹھوکر سے ہی کوئی سبق حاصل کر لے، شاید وہ جان جائے کہ خالق کی تخلیقات میں اس کا مقام کیا ہے۔

منصبِ خلافت کے تقاضے پکار پکار کر اسے راہ شکر پہ لانا چاہتے ہیں کہ مقام شکر ہی وہ اولین زینہ ہے جو معرفت اور پہچان کی ان بلندیوں پہ کھلتا ہے جہاں فلاح کی ابدی منزلیں ہیں، جہاں احساسِ عجز کی فراوانی ہے، جہاں عبدیت کا جنوں ہے، جہاں وصل کی راحتیں ہیں، جہاں بہاروں کی حکمرانی ہے، جہاں حزن ویاس کی موت ہے، جہاں سکینت کی انتہائیں ہیں، جہاں روش روش سعادت کے گُل کھلتے ہیں، جہاں رحمت اور نوازش کی آبشاریں ہیں، جہاں عطا کی فروانی اور جزا کی رونقیں ہیں، جہاں آرزوؤں کو دوام ہے، جہاں تشنگی ناکام ہے، جہاں ہر نفس شادکام ہے، جہاں عظمت وکمال ہے، جہاں ذرہ ذرہ شاہکار ہے، جہاں اسرارِ کائنات تہہ چشم ہیں کہ مقام شکر پہ ہی انسان خود کو پہچانتا ہے جس کے بعد ہی وہ خالق کی پہچان کے سفر پہ روانہ ہونے کی اہلیت کا حامل ہوتا ہے اور مقام شکر تک رسائی کے لیے راستہ وہ اشک مہیا کرتے ہیں جو خالق کے خوف میں بہیں۔

یہی اشک انسان کو اس اثاثہ ادراک تک لے جاتے ہیں جہاں اسے اپنے تاجِ شرف پہ جمی راکھ، خالق سے دوری اور اپنے رویوں کی کج روی کا وہ شعور حاصل ہوتا ہے جو اس پہ منزل فلاح کے خدوخال واضح کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرف ترسیل پیغام کے سلسلہ آخر یعنی قرآنِ حکیم میں انسان کی فطری کج روی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ؛

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

القرآن الحکیم (سورۃ روم30-آیات41)

ترجمہ:

''خشکی اور تری میں جو بھی فساد نظر آتا ہے وہ انسان کے اپنے ہی ہاتھ کی کمائی ہے''۔

❏❏❏❏❏❏❏❏

یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے کسی بھی موڑ پر انسان کے اس اندرونی اضطراب نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور اس کی طبع میں موجود فطری تنوع نے اسے کبھی بھی زیادہ دیر تک کسی ایک نظریہ کسی ایک فلسفہ اور کسی ایک مذہب پہ کار بند نہیں رہنے دیا۔ تاریخ اگر چہ انسانی تمدن کے تمام پڑاؤ محفوظ نہیں رکھ سکی تاہم بہت سے اہم ادوار زمانے کی دست برد سے اپنا راستہ بنانے میں کامیاب رہے۔ انسان کا سفر تنگ ودو اور جستجو کی اچھوتی داستان ہے۔ وہ مصر کے اہراموں سے نکلتا ہے تو بابل کے معلق باغات میں جا نکلتا ہے اس کی چشمِ حیراں نے تشنگی اور تلاش کے اس سفر میں اجنتا اور ایلورا کے غاروں سے لے کر بابل کے کھنڈرات تک دیکھے ہیں۔ وہ ہاروت و ماروت کے سحر سے لے کر شاردہ، نادرہ اور جولیانا کی عظیم درس گاہوں سے گذرا ہے۔ وہ گندھارا عہد کی موہوم دانش سے ہوتا ہوا فرعونوں کے متمدن معاشروں میں داخل ہوتا ہے۔

اس نے علوم عالم کے تمام میدانوں میں انسانی برتری کو ثابت کیا مگر مقام حیرت ہے کہ اسے نہ تب جینا آیا اور نہ وہ آج کے متمدن معاشرے میں کسی طرف انگلی اٹھا کر اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ بستی یہ گاؤں یہ کوچہ ظلم جبر استحصال اور برائی سے پاک ہے، وہ کل بھی اپنی منزل کے تعین میں تذبذب کا شکار تھا وہ آج بھی اپنے رب کی پہچان سے عاری ہے وہ دوسروں کی موت تو دیکھتا ہے مگر خود اپنی موت کے متعلق کسی خوش فہمی کا شکار ہے وہ اللہ کے اُس پیغام کو ہمیشہ سے نظر انداز کرتا چلا آیا ہے جس میں اس کی فلاح مضمر تھی جس میں اس کے ہر آزار کا مداوا تھا۔ جس کی خبر اسے ہر پیغمبر نے دی، ہر الہامی کتاب نے دی، ہر دانا و بینا نے دی، جس کی شہادت چرند پرند نے دی، شجر و حجر نے دی، سنگ و خار نے دی، نغمہ بلبل نے دی، بادِ صبا نے دی، دریا کی

روانی، پہاڑوں کی ہیبت نے دی، گُل کی نازکی پوّن کی صدانے دی، موجِ بحر کے اضطراب نے دی، رعدو برق نے دی، ارض وسماء نے دی، ابر و ہوانے دی، عقلِ نارسانے دی کہ سچ وہی ہے جو خالق کی طرف سے ہے، مرضی اور رضا اسی کی ہے باقی سب دھوکہ ہے۔ چنانچہ علامہ طبری کے مطابق ایک سو چار صحیفے الہامی تعلیمات سے سجے انسان کی راہبری کا فریضہ ادا کرتے رہے اور ایک لاکھ سے زیادہ پیامبر اُن کی تشریح و انذار کی جہد وسعی کرتے رہے، انھوں نے انسان کو بتایا کہ شدید ہیبت وخطرے والا دن زمین وآسمان کی پیدائش والے روز ہی مقدر ہو چکا ہے، جس دن جزا اور سزا کا میدان سجے گا جس کی تیاری ہی کامیابی کی اصل کلید ہے باقی سب دھوکہ ہے۔

مگر روزِ اول سے ہی شیطان انسان کی گھات میں مستعد تھا اس نے انسان کو باور کرایا کہ موت تو بس مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے کا نام ہے۔ وہ انسان کو کھلا دھوکہ دیتا ہے وہ اسے دنیا کی بے ثبات مگر جھوٹی سج دھج اور دلکشی کے الجھاوے میں الجھائے رکھتا ہے اور اس کے لمحاتِ مہلت کو گُھن کی طرح کھائے جاتا ہے، وہ انسان کو احساسِ امرِ فنا سے ایک فاصلے پر لیے ہوئے چلتا ہے اور دنیا کی دعوت وتعیش کو کئی گنا بڑھا کر اس کے نفس میں مصوّر کر دیتا ہے اور یہی وہ الجھاوا ہے جو عقل وبصیرت کو ڈھانپ لیتا ہے اور انسان کو حقیقت سے بہت دور لے جا کر پھینکتا ہے۔ وہ پیغام جو انسانیت کی فلاح کا ضامن ہے جو ابدی سچائیوں کا حامل ہے وہ اپنے ظاہر اور باطن کے حوالے سے کوئی بہت زیادہ پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہے بلکہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت سہل اور سادہ ہے شرط صرف یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے اندر کھلتے دریچوں کی طرف متوجہ ہو۔ اسے کائنات میں اپنے مقام کا ادراک حاصل ہو تو خالق کی پہچان کے تمام اسرار رفتہ رفتہ اپنی پوشیدگی کھو دیتے ہیں اور انسان ابدی فلاح کے اس رستے کا مسافر ہو جاتا ہے جو اسے مایوسی اور یاس کے اندھیروں سے دور لے جاتے ہیں اس کا انگ انگ اپنے خالق کے سامنے سربسجود ہو جانے کو بے تاب رہتا ہے، وہ اپنی زندگی میں سپردگی کے اس احساس کا لطف اٹھاتا ہے جو مومن کی معراج ہے اور بدلے میں اپنے خدا کی رضا اور مغفرت کے منصبِ عظیم پر فائز ہو جاتا ہے۔

تاریخ عالم انسانی رویوں کی حیران کن داستان ہے جس میں طرح طرح کے مصلحین ملتے ہیں جنہوں نے انسان کو خیر کی طرف بلایا، رنگ رنگ کے سلاطین ملتے ہیں جنہوں نے دنیا کو زیر وزبر کیا، طرح طرح کے فرعون ملتے ہیں جو خود کو خدا کہتے تھے، عظیم فلاسفر اور بلند قامت انقلابی ملتے ہیں جنہوں نے بار بار نقشہء

حیات میں نظرِ ثانی کی گنجائش پیدا کی۔دبنگ جنگجو اور فاتحین ملتے ہیں جنہوں نے زمین کو اپنے قدموں تلے روندا اور اپنی کامیابی کا اظہار انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر کیا۔الغرض ایوانِ تہذیب میں جلوہ گری کے اتنے رنگ ہیں کہ انسان یہ بات سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ کون سا فسوں ہے جو انسان کو چین نہیں لینے دیتا، وہ کون سی کمی ہے جو اس کو ایک منزل سے دوسری منزل کو روانہ کر دیتی ہے۔انسان مدت سے تضاد کی ان راہوں کا مسافر رہا ہے جنہوں نے اسے خالق کی تلاش سے روکا ہے۔اس نے اپنے ارتقاء کے ہر پڑاؤ پہ خالق کے ایک مختلف تصور کا سامنا کیا۔وہ عقائد اور اوہام کی ان پست پگڈنڈیوں کا راہی رہا جہاں سانپ، بچھو، گائے پہاڑ، چاند، ستارے، سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت بھی اس کے خالق کے طور پہ براجمان رہے۔وہ ہمیشہ سے اپنی بقاء کے خوف کا شکار رہا ہے اور احساسِ تحفظ کے عوض وہ کسی بھی پست معبود کی پوجا پر تیار ہو جاتا، چنانچہ کسی جابر اور قاہر قوت کی تلاش اور پرستش کا داعیہ ہمیشہ سے اس کے اندر موجود رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ روز اپنے خدا کو بدلتا رہا اور اپنی امید کے دامن نئے خدا سے وابستہ کرتا رہا۔مگر یہ حقیقت بھی بالکل عیاں ہے کہ سب سے قدیم عقیدہ توحید ہی ہے جو ہر تمدنی پڑاؤ پر انسان کے ہمراہ رہا یہ اور بات ہے کہ انسان بار بار اس کو بھولتا رہا اور خالق نے بار بار اپنے احسان کی روش کا اعادہ کیا اور انسان کو اس کی منزل فلاح کی طرف راہنمائی کا سلسلہ پوری دردمندی اور تسلسل کے ساتھ جاری رکھا۔

اس لیے خالق کی پہچان کی منزل انسان سے زیادہ فاصلے پر کبھی بھی نہیں رہی جب جب اس نے چشم تدبر سے مظاہر کائنات کو دیکھا ہے تو اس کی رگ رگ میں ایک احساس انگڑائی لے کر جاگا ہے کہ ''کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے'' ذرا سی فکر انسان کے اندر شکر اور احسان مندی کے داعیہ کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے اور یہ احساس تا حدِ ادراک اِک نور کی طرح پھیلتا چلا جاتا ہے کہ ہماری زندگی کا گوشہ گوشہ کسی کے بارِ احسان کو اٹھائے ہوئے ہے۔بادلوں کے غول جب آسمان کو اپنے وجود سے بھر دیتے ہیں تو کسی ان دیکھے اور بے نام احساس سے انسان کا وجود بھی کسی کلی کی طرح بے وزن اور آزاد ہو جاتا ہے۔پھول کی خوشبو کتنی دور سے سفر کر کے ہمیں راحت پہنچاتی ہے، ہواؤں کی نیم خرامی، بادِ صبا کی عارضِ گل سے شرارت، لبِ گل سے لپٹی شبنم اور صبح دم کی مسحور فضائیں انسان کو سرتاپا راحت کے اُن جہانوں میں لیے پھرتی ہیں جہاں شکر کے سوا اور کوئی در وا نہیں ہوتا۔مگر انسان کی فطری کجی اسے اکساتی ہے کہ وہ اندر سے آتی اس صدا کا گلہ گھونٹ دے۔چنانچہ وہ خود کو اطاعت کی روش سے خارج کر لیتا ہے جو انجام کے لحاظ سے ناکامی کا پہلا زینہ ثابت ہوتی ہے اور پھر

انسان بغاوت کی اس راہ کو چل دیتا ہے جو اس کی موجودہ زندگی میں بڑے خلا کا پیش خیمہ بنتی ہے اور اسے آخری سانس تک آزارِ نفس میں مبتلا رکھتی ہے۔ ہر دور میں کتابِ کائنات انسان کے سامنے ورق ورق کھلی رہی صرف اسے پڑھنے کی ضرورت تھی منزل نہ زیادہ دور تھی نہ مشکل مگر شرط صرف یہ تھی احساسِ یقین کے ساتھ حرف حرف بولتی کتابِ کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو ان تمام سوالوں کے جواب ایک ایک کر کے وصول ہو جاتے ہیں جو روزِ اول سے انسان کا سکھ اور چین برباد کر رہے ہیں حقیقت یہ ہے کہ جب بھی جس دور میں بھی انسان نے تدبر کی آنکھ سے اسرارِ کائنات پر غور کیا ہے تو بہت سے سوال اس کا احاطہ کر کے کھڑے ہو گئے۔

جب وہ دیکھتا ہے کہ میں ایک وسیع و عریض کائنات میں تنہا کھڑا ہوں تو قدرتی طور پر وہ سب سے پہلے اس حیرت انگیز کائنات کے خالق کی تلاش میں بے چین ہوتا ہے وہ خود اپنی ذات اور کائنات کے درمیان موجود تعلق کے بارے میں بھی بے چین ہو اٹھتا ہے۔ ذرا سے غور کے بعد اس کی آنکھوں سے ایک اور پردہ بھی اٹھ جاتا ہے اور وہ جان جاتا ہے کہ وہ خود بھی تو ایک مخلوق ہے تو یقیناً کوئی خالق بھی ہو گا۔ جب وہ اپنی فطرت میں سموئے ہوئے اشارات کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اپنے اردگرد کی دنیا میں گہما گہمی اور شدائد کے پس پردہ حقیقی عوامل کو جاننے کی خواہش اس کے اندر انگڑائیاں لینے لگتی ہے تو وہ حقیقت کی تلاش کا راہی بن جاتا ہے جو دراصل خالق ہی کی کھوج ہے۔ پھر یہی کھوج اسے مختلف وادیوں میں لیے پھرتی ہے انسانوں کا کوئی گروہ اس بات پہ مطمئن ہو کے بیٹھ جاتا ہے کہ ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کائنات کا نظم چلانے میں بڑے خدا کی معاونت کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کے بہت سے لوگ بلخصوص اہل عرب کچھ اسی قسم کے عقائد کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے۔

تاہم اول اول جب انسان نے شعور کی آنکھ کھولی تو اس نے اپنی ذات کے دروں اس خلا کی شدت کو محسوس کیا جو خالق سے دوری کی وجہ سے جنم لیتا ہے تب اس نے اپنے معبود کی تلاش کا وہ سفر شروع کیا جو اسے وہ سکون عطا کرتا جو اس کی کھوئی ہوئی میراث تھی ہم قدرے تفصیل سے خالق کی تلاش کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہیں۔ انسان کے تہذیبی اور تمدنی ارتقاء کو اگرچہ ایک ساتھ ہی بیان کیا جاتا ہے تاہم میرے خیال میں تمدن دراصل ارتقاء کے اس عمل کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے خارج میں مرتب کرتا ہے اور تہذیب اس کے داخلی اور فکری ارتقاء کا نام ہے۔ تمدنی طور پر انسان نے اپنی جہدِ مسلسل اور تگ و دو سے انتہائی منزلیں طے کی ہیں وہ

پتھر کے دور سے ایٹمی ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہوا مگر اس کا فکری ارتقاء آج بھی قابلِ رشک قرار نہیں دیا جا سکتا وہ آج بھی سمیریوں اشوریوں اور بابلیوں کے فکری رتبے سے کچھ زیادہ بلند نہیں وہ آج بھی خالق کی تلاش میں سسک رہا ہے اگرچہ آج اس کے خداؤں کی صورت کچھ بدل چکی ہے کہ کہیں معاشیات کو خدا سمجھا جا رہا ہے تو کہیں الحاد کی اندھیری راہیں ہیں، کہیں سائنس کو حرفِ آخر قرار دیا جا رہا ہے تو کہیں پتھر کے بت پوجے جا رہے ہیں آج انسان آواز کی رفتار سے تیز سفر کر رہا ہے مگر اس کا فکری ارتقاء ایک ایسے جمود کا شکار ہے جسے معاشیات، سماجیات، سیاسیات اور عمرانیات کے دائرے گھیرے ہوئے ہیں، تاریخ کے صفحات انسان کے اعتقادی ارتقاء کی کہانی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ہم یہاں مختصراً خالق کی تلاش کے اس سفر پر روشنی ڈالیں گے۔

تاریخ نشان عبرت ہے مگر لوگ کم ہی اس سے سبق حاصل کرتے ہیں۔قدیم تہذیبوں کا مطالعہ انسان کی عقائدی اور فکری پستی سے آگاہی فراہم کرتا ہے۔جس سے خالق کی تلاش میں مدد حاصل ہوتی ہے۔

اہل بابل ونینوا

آج جو خطہ عراق شام اور فلسطین پر مشتمل ہے ہزاروں سال قبل یہاں ایک مضبوط اور متمدن تہذیب تھی جسے اوراقِ تاریخ میں بابلی تہذیب کے نام سے جانا جاتا ہے۔عراق کا میدانی علاقہ انتہائی زرخیز تصور کیا جاتا اس لیے کہ اس کے میدانی علاقوں میں دجلہ اور فرات اپنے ساتھ پہاڑوں سے لائی ہوئی زرخیز مٹی بچھا دیتے جو اس کے میدانوں کو سرسبز فصلوں سے بھر دیتی[1*]۔دجلہ آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلتا اور دریائے فرات کوہ طارس سے اپنا سفر شروع کرتا تھا۔خلیج فارس میں گرنے سے پہلے یہ دونوں دریا آپس میں مل جاتے۔مقامِ اِتصال سے ملحق علاقے کو شط العرب کہا جاتا ہے جو زرخیزی میں آج تک اپنی مثال آپ ہے اس لیے اس خطے کی زرخیزی کے باعث قدیم زمانے سے قومیں اسے رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہیں اور بار بار اس پر حملہ آور ہوتی رہیں۔چنانچہ سمیریوں،اکادیوں،اشوریوں،ایرانیوں اور عربوں نے اپنے اپنے دورِ تسلط میں دجلہ اور فرات کے کناروں پر بڑے بڑے اور بارونق شہر آباد کیے۔جن میں اُور،کِش،بابل،نینوا،مدائن،

بغداد اور بصرہ نے شہرت پائی۔ایک طویل عرصہ تک مورخین کا خیال تھا کہ تمدنِ نوعِ انسانی کا اولین گہوارہ وادیٔ نیل ہے۔ پھر معاصرین کی اکثریت نے اس رائے سے اتفاق کیا کہ تمدن کی اولین داغ بیل عراق میں ہی ڈالی گئی۔ہم یہاں ان کے سماجی ڈھانچے کی بجائے اُن کے عقائد اور مذہبی رسوم سے بحث کریں گے۔وہ اپنے ہر شہر میں ایک سات منزلہ عمارت بناتے جسے ''زغورط'' یعنی مقدس پہاڑی کہا جاتا[2*]۔

اس عمارت کی سب سے اوپر والی منزل پر دیوتا کا معبد ہوتا، معبد کے اردگرد ان جانوروں کے باڑے ہوتے جنہیں قربانی کے لیے تیار کیا جاتا۔سمیریوں نے اپنی مذہبی رسومات کو محفوظ رکھنے کے لیے تحریر کا فن ایجاد کیا جسے خطِ میخی کہا جاتا ہے[3*]۔سمیری معاشرہ مادری نظام پر مشتمل تھا اور ان کے ہاں ''نانا دیوی'' کی پوجا کی جاتی۔اہل بابل کی مذہبی دیومالا کی بنیاد قدیم سمیریائی قصّوں پر رکھی گئی تھی۔وہ سات سیاروں کو ذی روح ہستیاں مانتے تھے جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں وہ مشتری کو مردوخ، تیر کو بنو، مریخ کو نرگل، آفتاب کو شمس، چاند کو سن، عطارد کو نِبب، اور زہرہ کو عِشتار کہتے تھے۔اُن کا عقیدہ تھا کہ ان سیاروں کی گردش انسانی طبائع کو متاثر کرتی ہے اس لیے وہ سیاروں کی نقل وحمل پر نظر رکھتے۔چنانچہ ان کی اسی عادت کی بدولت علم ہیت اور علم نجوم کی بنیاد پڑی۔

ان کے خیال میں بعل مردوخ اور شمس بڑے دیوتا تھے، عشتار حسن کی دیوی تھی، ان کے ہاں دیوتاؤں کے نام پر قربانی کی رسم بھی موجود تھی۔ہر سال ملک میں مذہبی جلوس کا اہتمام کیا جاتا جس میں ملک کا بادشاہ سب سے بڑے پروہت کی حیثیت سے جلوس کے آگے آگے چلتا اور اس کے پیچھے سینکڑوں کاہن اپنے خاص مذہبی لباس میں قطار اندر قطار مردوخ کے مجسّمے کے پیچھے پیچھے مناجات کے گیت گاتے ہوئے چلتے۔بتوں کو عطریات میں بسایا جاتا اور ان کے سامنے بخور جلائے جاتے۔انھیں بیش قیمت زیورات اور لباس پہنائے جاتے۔خوبصورت اور حسین لڑکیاں ان کی زوجیت میں دی جاتیں۔ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ سب انسانوں کی روحیں موت کے بعد ایک تاریک گڑھے میں چلی جاتی ہیں اور بہشت صرف دیوتاؤں کے لیے مخصوص ہے۔

بابلی مذہب کی نمایاں خصوصیات میں کہانت اور جادو نہایت اہمیت کے حامل تھے اور سحر بابل کو تو آج تک استعارہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔وہ اپنے جادو کی مدد سے روحوں کی تسخیر کا عمل کیا کرتے اور منتر پڑھ کر انسانوں کی روحوں کو جانوروں کے قالب میں منتقل کر دیتے۔کاہن غیب بینی کا دعویٰ کرتے اور عالم وجد میں مقفیٰ اور مسجع جملوں کی صورت میں مستقبل کی پیش گویاں کرتے جو اکثر مبہم ہوتیں۔معاشرے میں بردہ فروشی

اور زنا عام تھا۔ بابلیوں کا خداوند خدا بعل مردوخ تھا۔ اول اول اس کے معبد میں انسان کی قربانی بھی دی جاتی[4*]۔ تاہم بعد میں انسانوں کی جگہ بکریاں قربان کرنے کا رواج ہوا۔ مردوخ کا مجسمہ ایک پردار بیل کی شکل کا تھا جس کا چہرہ انسان کا تھا۔ ابتدا میں بعل زرخیزی اور آب پاشی کا دیوتا تھا مگر بعد میں آسمان کا دیوتا بن گیا جو بارش برسا کر زمین کو سیراب کرتا۔ بعل کے ساتھ عشتار دیوی کی پرستش بھی بڑے ذوق وشوق کے ساتھ کی جاتی جو دھرتی کی ماں بھی تھی اور حسن وعشق کی دیوی بھی۔ اس کے پجاری اسے مقدس دوشیزہ اور دوشیزہ ماں کہتے تھے زمین کی زرخیزی کو تحریک دینے کے لیے اس دیوی کے مندر میں دن رات عصمت فروشی کا بازار گرم رہتا۔ مندر کی دیوداسیاں مقدس کسبیاں تھیں جن سے زائرین معاوضہ دے کر تمتّع کرتے۔ یہ رقم دیوی کی بھینٹ چڑھائی جاتی مگر اصلاً پروہتوں کی عیاشیوں میں خرچ ہو جاتی جن کے تقدس کے باعث کوئی ان سے سوال کرنے کی جرات نہ کرتا۔ دیوی کے مندر کے وسیع وعریض صحن میں سینکڑوں جوان دیوداسیاں رنگ برنگ کے اشتہا انگیز لباسوں میں مزین زائرین کے انتظار میں بیٹھتیں۔

وہ عصمت فروشی کو مقدس خیال کرتیں اور اسے ایک مذہبی فریضہ کے طور پر ادا کرتیں۔ جو لوگ ان سے فیض یاب ہوتے ان کو بھی مقدس جان کر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ عشتار کے سالانہ تہوار پر جنسی بے راہ روی کے عجیب مظاہرے دیکھنے میں آتے اس موقعہ پر نوجوان لڑکیاں زائرین سے ہمکنار ہو کر اپنی دوشیزگی دیوی کی بھینٹ چڑھاتیں کہ بابل کی ہر عورت پر مذہباً یہ بات فرض تھی کہ وہ اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار مندر میں آ کر کسی غیر مرد کی خلوت میں جائے۔ مشہور مغربی مورخ ''Hero Dotes'' لکھتا ہے کہ ہر بابلی عورت پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار معبد میں جا کر کسی نہ کسی اجنبی سے ہمکنار ہو۔ امراء کی عورتیں جو عام عورتوں سے ملنا پسند نہ کرتی تھیں پردے دار گاڑیوں میں سوار ہو کر آتیں اور اپنے غلاموں اور کنیزوں کے جھنڈ میں معبد میں داخل ہو جاتیں۔ عام عورتیں اکثر اوقات اپنے بالوں کو فیتے سے باندھ کر زائرین کے انتظار بیٹھ رہتیں مندر میں عورتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صحن میں لکیریں کھینچ کر راستے بنا دیئے جاتے جن پر چلتے ہوئے زائرین ان عورتوں کے پاس جاتے۔ اپنی پسند کی عورت منتخب کرتے اور اس سے معاملات طے کرتے جب کوئی عورت مندر میں اس نیت سے داخل ہو جاتی تو جب تک وہ کسی اجنبی سے چاندی کے سکوں کے عوض ہمکنار نہ ہو لے مندر سے باہر نہ جا سکتی تھی۔ چاندی کا سکہ اپنی مالیت کے لحاظ سے چاہے کتنا ہی حقیر ہو عورت کو بہر حال وہ قبول کرنا پڑتا اس لیے کہ وہ مقدس ہوتا اور اسے ٹھکرانا گناہ تصور کیا

جاتا۔ چنانچہ جب کوئی متمنی شخص کسی عورت کی طرف چاندی کا سکہ اچھالتا تو وہ بلاچوں چرا اٹھ کے اس کے ساتھ چلی جاتی اور اس مقدس فرض سے سبکدوش ہوکر اپنے گھر کی راہ لیتی۔ تاہم اس کے بعد عموماً اس عورت کو جتنے بھی لالچ دیئے جاتے وہ کم ہی سپردگی پر آمادہ ہوتی۔ خوبصورت اور خوش رو عورتیں زیادہ جلد اس مقدس فرض سے سبکدوش ہو جاتیں مگر بدصورت عورتوں کے لیے یہ رسم کسی آزار سے کم نہ تھی کہ اتنے وسیع حسن کی موجودگی میں ان کو اپنی باری کے انتظار میں کبھی کبھی کئی سال تک مندر کے صحن میں ہی بسیرا کرنا پڑتا۔ مقدس عصمت فروشی کا یہ کاروبار صدیوں تک جاری رہا حتیٰ کہ یہ رسم دنیا کے بہت سے ممالک میں پھیل گئی۔ مصر میں یہ رسم ۳۲۵ء بعد از مسیح تک جاری رہی جبکہ جنوبی ہند میں یہ رسم کئی صورتوں میں آج تک قائم ہے۔ چنانچہ وہ قوم جو اس وقت تختۂ ارض پر متمدن ترین قوم ہونے کی دعویدار تھی ان کی عقائدی حالت اتنی پست تھی کہ سر شرم سے جھک جائے۔ اصل بات یہ ہے تمدن کی تعمیر انسانی جدوجہد اور انتھک محنت کا ثمر ہوا کرتی ہے مگر کسی بھی قوم کے عقائد اس کی اخلاقی پستی یا برتری پر دلیل ہوتے ہیں اس لیے یہ کہنا کہ کوئی قوم جب تمدنی طور پر عروج حاصل کر لیتی ہے وہ از خود تہذیبی برتری کے منصب پر فائض ہو جاتی ہے ایک عام فکری مغالطہ ہے جس کی تصیح ضروری ہے۔

ابھی ہم جس قوم کا ذکر پڑھ کر آئے ہیں وہ عقلی اور تمدنی لحاظ سے کوئی کم تر قوم نہ تھی بلکہ انھوں نے کئی بڑے بڑے علوم کی بنا رکھی۔ علم ہیت میں ان کی برتری کا یہ حال تھا کہ انھوں نے مریخ اور سورج کی گردش کا جو اندازہ قائم کیا وہ ''Hasparjkes'' اور ''Betlymoss'' سے زیادہ قرین صحت ہے۔ آج بیسویں صدی کے سائنس دانوں نے چاند کی گردش کا جو حساب لگایا ہے اس میں اور اہل بابل کے قائم کردہ اندازے میں صرف چار سیکنڈ کا فرق ہے۔ وہ وقت کی پیمائش کے لیے آبی گھڑیاں استعمال کرتے۔ وہ سورج اور چاند گرہن کی درست پیش گویاں کرنے پر بھی قادر تھے۔ اہل بابل نے زراعت اور صنعت کو بھی فروغ دیا۔ ہل ایجاد کی۔ زیتون اور انگور کاشت کیے۔ سونے چاندی کو لین دین کا سکہ قرار دیا۔ کانسی کے بھاری ہتھیار بنائے۔ کاروباری معاشرہ ہونے کی بدولت علم ریاضی کی مبادیات پر کام کیا اور اس کے بہت سے اصول وضع کیے۔ انھوں نے سال کو بارہ مہینوں، مہینے کو تیس دنوں، دن کو چوبیس گھنٹوں اور گھنٹے کو ساٹھ دقیقیوں اور دقیقے کو ساٹھ ثانیوں میں تقسیم کیا۔ دستاویز لکھنے اور اپنی مذہبی روایات کو محفوظ رکھنے کے لیے تحریر کا فن ایجاد کیا۔ چنانچہ اہل بابل کی یہ علمی اور عملی فتوحات میراثِ نوع انسان کا بیش قیمت حصہ سمجھی جا سکتیں

ہیں۔اور حمورابی جو بابل کا نامور بادشاہ گذرا ہے اسی نے انسان کو پہلا سماجی دستور فراہم کیا جو آج حمرابی قانون[5*] کے نام سے جانا جاتا ہے اور تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔مگر اس قوم کی مذہبی عقائدی حالت اتنی پست تھی کہ جسے بلا تعامل وحشت کا نام دیا جاسکتا ہے۔عقل کے سہارے تمدن کی تعمیر تو ممکن ہے مگر اس راستے کی تلاش جس کے دوسرے سرے پہ فلاح ہو کامیابی ہو سکینت اطمینان ہو ممکن نہیں اس کے لیے بہر حال علم وحی کی ضرورت پیش آئے گی کہ یہ خالق ہی کا حق ہے اور خالق ہی اس علم کا حقیقی مالک ہے کہ اس کی مخلوق کے لیے بہتری اور فلاح کی راہ کون سی ہے چنانچہ جب جب کسی قوم نے اپنی عقل کے سہارے معبود تراشنے کی کوشش کی تب تب وہ مسافتوں کے اس آزار میں الجھی رہی جس کی ابتدا میں توہم اور انتہا میں ذلت کے سوا کچھ نہ تھا۔

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے فرعونوں کی رعونت کا ذکر کیا ہے اور اُن کی ذلت کو رہتی دنیا تک انسانوں کی راہنمائی کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ فرعونی تہذیب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

وادی نیل کے باسی

تمدنِ مصر کا شمار دنیا کے قدیم ترین تمدنوں میں کیا جاتا ہے۔ مصر پر تین ہزار برس تک ایک ہی خاندان یعنی فراعین کی حکومت قائم رہی۔ مصری تہذیب کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسرائیلی قبائل نے جب پہلے پہل عراق سے فلسطین کی طرف ہجرت کی تو اس وقت اہرام مصر کی تعمیر کو ایک ہزار برس بیت چکے تھے۔ دریائے نیل کی روانی اور زرخیزی کی وجہ سے اس علاقے کو دنیا کا سب سے بڑا نخلستان بھی قرار دیا جاتا ہے۔ قدیم زمانوں میں جب دریائے نیل کا دہانہ ابھی نہیں بنا تھا اور سمندر دور تک وادی کے اندر جاتا تھا تو لوگ عموماً شکار کھیل کر اور جانور پال کر اپنی گزر اوقات کا اہتمام کرتے تھے۔ مگر بعد میں جب ہر سال دریائے نیل میں طغیانی آنے لگی اور اس کا مستقل دہانہ بن گیا تو لوگ اس کے کناروں پر آباد ہونے لگے اور نیل کے پانی سے اپنے کھیتوں کو سیراب کر کے گندم کاشت کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے کشتیاں

بنانا بھی سیکھ لیا اور وہ روغنی برتنوں کی ساخت سے بھی واقف ہو گئے تب انھوں نے اپنے اندر موجود اس کمی کا احساس کیا جو خالق کی تلاش کا اولین محرک ہوتی ہے۔ انھوں نے پتھر کے بت تراشے اور ہاتھی دانت سے بنے زیورات سے ان کی آرائش کی۔ مورخین نے خانوادوں کی بجائے تاریخ مصر کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی قدیم بادشاہی، وسطی بادشاہی اور نئی بادشاہت۔ پہلے دو ادوار کو فساد و انتشار تنزل اور طوائف الملوکی کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ مذہبی تحریروں کی شہادت ۳۱۰۰ ق م تک جاتی ہے کم و بیش اسی زمانے میں ملک کے دونوں حصوں نے مل کر ایک ریاست کی صورت اختیار کی۔ اس وقت (Mukhmus) نامی فرعون حکمران تھا وہ دو مصروں کا پہلا بادشاہ تھا اس لیے وہ دوہرا تاج پہنا کرتا۔ شمال کا سرخ تاج اور جنوب کا سفید تاج۔

تاریخ اس دور کے تمام حالات محفوظ نہیں رکھ سکی حتیٰ کہ ہم فرعون ''وجوسر'' کے عہد تک آ جاتے ہیں۔ جس کا دارالحکومت مفمس تھا جو دریائے نیل کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ اس دور کے عظیم معمار ''ہوتپ'' نے وجوسر کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا جس کے آثار آج تک سقارا نامی علاقے میں موجود ہیں اور اسی مقبرے کی تعمیر سے مصر میں اہرام بنانے کے فن کا آغاز ہوا۔ اسی عہد کے ایک فرعون ''پے پی'' نے مصر پر ۹۴ سال تک حکومت کی جو تاریخ عالم کا طویل ترین عہدِ حکومت گرداناں جاتا ہے پے پی کے اہرام کو اپنے مکین کا پچاس سال سے زیادہ انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ ایک سو سترہ سال تک زندہ رہا۔ ''Thebes'' کے حکمران نے مصر کی انارکی کو ختم کیا اور اسے ایک بار پھر سے متحد اور پر امن بنا دیا۔ مرورِ زمانہ سے ''Thebes'' اپنے زمانے کا عظیم ترین شہر بن گیا اور اسی شہر میں مصریوں کے سب سے بڑے دیوتا ''آمن'' کے عظیم الشان معبد کی تعمیر کا کام شروع ہوا جس کو ''کارنک'' کہا جاتا تھا۔ فراعین نے امن کے اس دور میں آب پاشی کا وسیع نظام قائم کیا اور نیوبیا کی کانوں سے کثیر مقدار میں سونا اور تانبہ نکالا۔ دو صدیوں کے امن و سکون کے بعد اہل مصر کو ایک بار پھر سے بیرونی حملہ آوروں کا سامنا تھا جو غالباً آریائی تھے۔ جنہوں نے اپنے جدید وسائل کی بدولت اہل مصر کو مغلوب کر لیا تاہم مصر صعید ان کی یلغار سے محفوظ رہا اور فراعین وہاں بدستور حکومت کرتے رہے۔ فرعون ''Tutmoos'' کے عہد حکومت میں فراعین کی شہنشاہی اپنے عروج کو پہنچ گئی اس نے گھوڑوں اور رتھوں سے مسلّح ہو کر مصر کے ہمسایہ ممالک پہ یلغار کر دی اور دور دور تک اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے اس نے ایشیا میں بھی نمایاں فتوحات حاصل کیں اور اپنی سلطنت کی حدود کو دریائے فرات تک وسعت

دے دی۔مفتوح ممالک سے لاکھوں غلام اور کنیزیں لائی گئیں "Tutmoos" کا شمار فراعین کے عظیم سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔بابل شام اور فلسطین سے غلاموں کے گروہ درگروہ خراج کے سامان سے لدے مصر وارد ہوتے رہتے تھے۔ملکہ مصر"Shipsot" نے کارنک کے معبد میں توسیع کرائی اور دیرالبحری میں ایک نہایت حسین معبد تعمیر کرایا۔پھر"Umenhotep" نے لکسر کا عظیم معبد تعمیر کرایا جو اس زمانے میں عجوبہ روزگار سمجھا جاتا تھا۔رعمسیس دوم کا زمانہ بھی اہل مصر اور حکمران خاندان فراعین کا سنہری دور گنا جاتا ہے۔اس کو خروج کا فرعون بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے لشکرِ جرار نے لاکھوں یہودیوں کو گرفتار کر کے مصر پہنچا دیا۔

رعمسیس دوم کے حرم میں سینکڑوں حسین کنیزیں موجود تھیں اس لیے جب وہ مرا تو اس نے کثیر اولاد اپنے پیچھے چھوڑی جن میں سولڑکے اور پچاس لڑکیاں تھیں۔اس کے پاس ایک لاکھ سات ہزار غلام تھے جن میں اکثریت بنی اسرائیل کی تھی اور اسی کے عہد میں جنابِ موسیٰ علیہ سلام مصر میں اللہ کے نبی مبعوث ہوئے جنہوں نے فرعون کے پنجے سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی۔قدیم مصریوں کے ہاں مذہب ہی اوڑھنا بچھونا تھا۔مذہب اِن کے ہاں طوطم مت سے لے کر الٰہیات تک اپنے تمام مراحلِ ارتقاء میں دکھائی دیتا ہے۔یہ مذہب بڑا ہمہ گیر تھا اور اس کے اثرات اُن کے معاشرے،فنون لطیفہ اور علم وادب میں ہر کہیں دکھائی دیتے ہیں۔اُن کی دیو مالا میں سینکڑوں دیوتا ہیں جن میں کم وبیش تمام پرندے اور جانور شامل ہیں۔مینڈھا،بیل، گائے،مگرمچھ،بلی،سانپ،گیدڑ،گوریلا،بندرعقاب اور چیل وغیرہ جو مختلف دیوتاؤں کے نام سے منسوب تھے اور مقدس مانے جاتے تھے۔ان کے لیے معبد تعمیر کیے جاتے ان کو مارنے کی سزا موت تھی۔اوزریس کے بیل اور منذیر کے بکرے کی زوجیت میں حسین لڑکیاں دی جاتیں اس لیے کہ یہ دونوں جانور قدیم زمانے سے مصریوں کے ہاں جنسی قوت اور رجولیت کے مظاہر سمجھے جاتے تھے۔دیوتاؤں کے بت اس طرح بنائے جاتے کہ ان کا سر کسی پرندے یا جانور کا ہوتا اور جسم انسان کا۔البتہ آئسس دیوی کا جسم اور چہرہ دونوں انسان کا ہوتا تھا۔مگر اس کے سر پہ بھی گائے کے سینگ ہوا کرتے۔

گائے آئسس دیوی کی علامت تھی اور بیل اور بچھڑے کی طرح مقدس تصور کی جاتی۔اس معاشرے میں اسے جان سے مارنا اور اس کا گوشت کھانا ایک سنگین جرم تھا۔مصریوں کا عقیدہ تھا کہ زمین گائے کے سموں کے نیچے ہے۔آفتاب ان کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور کبھی وہ اسے خداوند خدا کی صورت پوجتے اور وہ ان کا آسمانی

باپ بھی تھا اور کبھی اسے ہورس کا نام دیتے جس کا مقدس پرندہ شاہین تھا۔قدیم مصریوں کے بڑے بڑے دیوتا تھے جنوب میں اسے آمن کہتے تھے اور کئی دیگر علاقوں میں ان کے مختلف نام مروج تھے جیسے کہ آسس، اوزیس اور ہورس۔تاہم بعد کی صدیوں میں ان کے عقائد میں ارتقاء کا عمل جاری رہا۔یہ اور بات کہ ان کا ہر قدم جہالت اور تیرگی کی طرف ہی اٹھتا۔بعد کی صدیوں میں ایک ہی خداوند خدا یعنی خالق کائنات کے تین پیکر قرار دے دیئے گئے۔یعنی رع، آمن اور پتاخ۔فرعون رعمیسس خود کو خداوند خدا رع کا بیٹا تصور کرتا جس کی وجہ سے عوام میں بادشاہت کے علاوہ وہ مذہبی تقدس بھی حاصل کر لیتا تھا یہی وجہ تھی کہ فرعون خود کو لائقِ مسجود تصور کرتے تھے اور عوام بخوشی اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے۔

آمن دیوتا جو مقررہ وقت پر خود کو مادی دنیا منور کرنے لیے ظاہر کرتا اس کے سر پر شاہین کا مکٹ ہوا کرتا جو آمن دیوتا کا علامتی مظہر تھا۔وہ تمام ملک کا طوطم تصور کیا جاتا۔فرعون اپنی پیشانی پر پھن اٹھائے ہوئے سانپ کی شبیہ پہنتا تھا جو ملک کی زرخیزی کا علامتی مظہر ہوتا۔سانپ ان کے ہاں دانش کی علامت تصور کیا جاتا۔فرعون اپنے ملک کا سب سے بڑا پروہت بھی ہوتا اس لیے جب مخصوص تہواروں پر مذہبی جلوس نکلتے تو بادشاہ جلوس میں سب سے آگے چلتا اور اس طرح عوام کی جاہلیت اور شعور میں کمی کی وجہ سے فراعین مصر صدیوں بے خوف و خطر مصر پر حکومت کرتے رہے آسس دیوی اوزیرس کی بہن اور بیوی تھی اس لیے وہ کئی لحاظ سے اپنے عظیم شوہر پر برتری رکھتی تھی چونکہ وہ حیات اور بارآوری کی دیوی بھی تصور کی جاتی اس لیے اس کی پوجا میں بانجھ عورتیں اور بے اولاد مرد ہر لحہ مصروف رہا کرتے۔

قدیم مصری روایات کے مطابق آسس ہی نے بیج بونے اور فصلیں اگانے کا راز دریافت کیا تھا۔مصر کے باشندے نہایت عقیدت اور شیفتگی سے اس کی پوجا کرتے۔وہ اس کے مجسّموں میں ہیرے اور جواہرات جڑتے اور اسے مادرِ خداوند اور مقدس ماں کہا کرتے۔آسس دیوی کے عظیم معبد میں صبح و شام سینکڑوں پجاری جن کے سر منڈے ہوئے ہوتے۔دیوی کی مناجات کرتے اور اس کے بھجن گاتے۔ہورس کو اس کا مقدس بیٹا تصور کیا جاتا جو کہ آفتاب تھا۔دسمبر کے آخر میں جب ہورس دیوتا نئے سرے سے جنم لیتا تو ہورس کے معبد میں اس کا بہت بڑا جشن منایا جاتا جس کی تقریبات میں خود بادشاہ وقت شامل ہوتا۔ان کے قدیم تصوراتی مجسّموں میں آسس دیوی کو اپنے ننھے بیٹے ہورس کو دودھ پلاتے دکھایا جاتا ہے جس کا حمل اسے غیر فطری طریقے پر ٹھہرا تھا۔بعد میں ان نیم شاعرانہ نیم حکیمانہ علائم و رموز کے اثرات کلیسائے روم کی عبادات

اور مذہبی رسومات میں بھی محسوس کیے جاتے رہے [6*]۔اسی لیے دورِاول کے بہت سے نصرانیوں کو آسس اور ہورس پر مریم اور ننھے یسوع علیہ سلام کا دھوکہ ہوتا تھا۔ابتدائی صدیوں میں اوزیرس دیوتا کو صرف دریائے نیل کا دیوتا تصور کیا جاتا جس کی موت اور حیات کا جشن ہر سال منایا جاتا۔جب دریائے نیل میں پانی ختم ہونے کے قریب آتا تو سمجھا جاتا کہ اس کی موت ہوگئی ہے اس پہ وہ آہ و بکا اور نوحہ خوانی کرتے۔چنانچہ اوزیس دیوتا کو خوش کرنے کے لیے ملک بھر کی حسین ترین دوشیزہ کو اس کی نظر کیا جاتا۔یعنی اس کو دریا میں پھینک دیا جاتا۔پھر چند مہینوں کے بعد جب دریا میں پہاڑوں سے پگھلنے والی برف کی وجہ سے طغیانی آجاتی تو سمجھا جاتا کہ اوزیس دیوتا نے قربانی کو قبول کرلیا ہے دریائے نیل کے کناروں پہ یہ رسم اس وقت تک جاری رہی جب تک حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں دریائے نیل کو وہ تاریخی خط نہ لکھا جس میں انھوں نے دریا کو اللہ کی کبریائی سے ڈرایا اور اسے رواں رہنے کا حکم دیا۔

مصری چونکہ اوزیس دیوتا کو تولد و تناسل کا دیوتا بھی مانتے تھے اس لیے وہ اس کے مجسّموں میں اس کے اعضائے تناسل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے۔مذہبی تہواروں میں عورتیں اس کے لکڑی کے لنگ بنا کر اس کی پوجا کرتیں اور دیوتا کی بڑائی کے گیت گاتیں۔مشہور مغربی مورخ ''Herodostes'' نے اپنی تاریخ میں قدیم مصر کی مذہبی روایات پہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل نیل تناسخ اور حیات بعد الاممات کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جسم کو اگرچہ فنا ہے مگر روح اپنے قالب بدلتی رہتی ہے اور ہزاروں سال بعد پھر سے اپنے اولین جسم کو حاصل کرلیتی ہے اور شاید اسی لیے ان کے ہاں اجسام کو محفوظ رکھنے کا بھی اہتمام کیا جاتا جسے عرف میں ممی سازی کہا جاتا ہے وہ میت کو حنوط کرلیتے تاکہ جب روح اپنا سفر مکمل کرے تو اسے اپنا جسم محفوظ حالت میں دستیاب ہوسکے۔اگرچہ ممی سازی کا فن ایک مہنگا اور نایاب فن تھا اس کے باوجود فراعین اور ان کے امراء اپنے انتقال سے قبل ہی نہ صرف یہ کہ اپنی ممی بنوانے کا اہتمام کرلیتے بلکہ بادشاہ یعنی فرعون خود اپنی نگرانی میں اپنے اہرام کی تعمیر کا کام جاری رکھتے۔ممی سازی ایک دقیق فن تھا جس میں انسانی جسم سے ایسے تمام اجزا کو الگ کرلیا جاتا جو اس کے گلنے کا باعث بنتے ہیں۔

وہ نہایت مہارت اور باریکی سے خم دار اوزاروں کی مدد سے انسانی سر کو مغز سے خالی کرلیتے اور مقعد کے راستے انتڑیوں کو باہر نکال لیتے پھر سر اور جسم میں خوشبودار مصالحے بھر کر جسم کو نمک میں بھیگی پٹیوں سے لپیٹ کر تابوت میں بند کردیتے ان کی اپنے اس فن میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ صدیوں بعد تک وہ انسانی جسم موسم

اور دوسرے شدائد سے محفوظ پڑا رہتا۔ تاہم عام انسان کے لیے وہی ریت کا گڑھا تھا جو ان کی آخری منزل ہوتا۔ مصریوں کے حیات بعد الامات کے متعلق عجیب سے تصورات تھے اُن کا عقیدہ تھا کہ کسی آدمی کے انتقال کے بعد اس کی روح کو اوزیس دیوتا کے سامنے محاسبے کے لیے پیش کیا جاتا تو وہ مردے کی روح کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتا اور دوسرے پلڑے میں شترمرغ کا پر رکھا جاتا تو جو روح گنہگار ثابت ہوتی اسے ایک تاریک گڑھے میں قید کر دیا جاتا جہاں وہ بھوک پیاس سے تڑپتی رہتی۔

مصریوں کا مقدس ترین دیوتا پتاخ کا بیل ''اے پس'' تھا۔ اے پس سیاہ رنگ کا ایک بیل ہوتا جس کے ماتھے پر تثلیث کی سفید شبہیہ ہوا کرتی اس کے لیے علیحدہ سے ایک شاندار معبد تعمیر کیا جاتا اور پورے ذوق وشوق اور اہتمام سے اس کی پوجا کی جاتی۔ کسی اے پس کی وفات پر پوری قوم افسردہ ہو جاتی۔ پھر اس کی ممی بنائی جاتی اور مقبرے میں اسے ہمیشہ کے آرام کے لیے دفن کر دیا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی پوری قوم نئے اے پس کی تلاش میں جت جاتی۔ پوری قوم ان تمام آلائشوں میں ملوث تھی جو کسی قوم کی عقائدی ناپختگی کا ثبوت ہو سکتی ہیں۔ جہالت اور استحصال کا دور دورہ تھا اور وقت کے پروہتوں کے ہاں سب خیر جمع تھی مکار پروہت لوگوں کو موت کے بعد کے عذاب سے ڈراتے اور اس سے نجات کے لیے ان کے ہاتھ گراں قیمت پر ''کتاب مردگاں'' بیچتے۔

بعد کے ادوار میں اسی قدیم رسم کا عکس عیسائیوں کے ہاں پوپ کے معافی نامے میں دیکھا جا سکتا ہے جو اہل روم کے ہاں ایک باقاعدہ کاروبار کی حیثیت حاصل کر چکا تھا مصریوں کے ہاں جادو کا عام رواج تھا۔ ان کے پروہتوں کے پاس اوزیس دیوتا کے عذاب سے بچ نکلنے اور اسے دھوکہ دینے کے لیے منتر تھے۔ جادو تھا، خبیث ارواح سے بچنے کے لیے بھی وہ جادو کا سہارا لیتے اور ان مذموم رسوم میں تیسرے درجے کے کسی شہری سے لے کر بادشاہ وقت تک سب ملوث تھے۔ الغرض اتھاہ تاریکی کی ایک رات تھی جہاں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا کہ ایسے میں اچانک ہی جیسے قدرت کو ان کی حالت پہ رحم آ گیا اور فراعین مصر میں ایک ایسا بادشاہ تخت نشین ہوا جس نے کم از کم اپنے دور کی حد تک قدیم مصر کی تہذیب عقائد اور سماجیات کو بڑی حد تک بدل کر رکھ دیا اس کا نام آمن ہوتپ چہارم تھا۔ آمن ہوتپ چہارم کا عہدِ اقتدار ۱۳۵۸ ق م سے لے کر ۱۳۸۵ ق م تک محیط تھا۔ اس نے برسر اقتدار آتے ہی ان پروہتوں کے استحصال کے خاتمے کا تہیہ کر لیا۔ وہ ان کی ابلہ فریبی کو دکانداری قرار دیتا تھا۔ اس نے آمن دیوتا کی پرستش کو خلاف قانون قرار دے دیا اور اس کے مذبح

خانوں پر قربانی کرنے سے لوگوں کو روک دیا اور دیوتا کی سینکڑوں دیوداسیوں کو جو مندروں میں عصمت فروشی کا دھندا کرتی تھیں نکال باہر کیا قوم کو بت پرستی سے منع کیا۔ اس نے دیوتاؤں کے معبد بند کرا دیئے اور حکم دیا کہ آمن دیوتا کا نام تمام مذہبی صحائف سے خارج کر دیا جائے۔ اس نے جادو پر پابندی عائد کر دی اور کھلے عام اس کاروبار کو جاری رکھنے والوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ بت پرستی پرلے درجے کی جہالت ہے اور آمن دیوتا محض ایک ڈھونگ ہے جو پروہتوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے رچایا ہوا ہے۔ وہ لوگوں کو ایک خدا کی دعوت دیتا جو روح یا جوہر حیات اور اصول نمو بن کر کائنات کے چہار سو جاری و ساری ہے۔ اس لیے آمن ہوتپ کا ذکر عظیم فرعون بادشاہ کے طور پہ تاریخ عالم میں زندہ ہے وہ جہاں ایک اعلیٰ درجے کا سپہ سالار تھا وہیں اس میں ایک عظیم منتظم کی ساری خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں۔ پھر وہ ایک اعلیٰ درجے کا شاعر بھی تھا اس نے اپنے تصوراتی خداوند خدا کی حمد میں کئی طویل نظمیں بھی تحریر کیں جو تاریخ کا طویل سفر طے کرتی ہوئی ہم تک پہنچیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ آمن ہوتپ کی لکھی ہوئی ان نظموں اور عہد نامہ قدیم کی بعض نظموں کے مابین گہری معنوی مماثلت پائی جاتی ہے۔ آج کے علمائے مصریات نے آمن ہوتپ کے کلام پہ بہت کچھ خیال آرائی کی ہے مگر علمائے مصر اور مغربی محقق کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچے۔ آمن ہوتپ کے کلام پر الہامی ہونے کا شبہ ہوتا ہے، آمن ہوتپ کہتا ہے؛

> ''خدا ایک ہے، وہی خالق ہے اور وہی پروردگار ہے اور وہ جنگ و جدل اور فتح و نصرت میں نہیں ملتا بلکہ اگر تمہیں اس کی تلاش ہے تو پودوں کی بہار اور پھولوں کے حسن میں اس کو تلاش کرو، حیات و نمو کے تمام پہلوؤں میں اس کے وجود کا عکس موجود ہے وہ ایک احساسِ مسرّت ہے جس سے معمور ہو کر بھیڑیں اچھلتی ہیں جس سے سرشار ہو کر پرندے دلدلوں کے سرکنڈوں میں اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں۔ اسی کی تابش زندگی بخشتی ہے اور وہی شفیق باپ ہے وہ رحم کرنے والا اور مہربان ہے وہ امن و آشتی کا خدا ہے وہ بے رنگ اور بے صورت ہے''۔[*7]

□□□□□□□□

آمن ہوتپ نے پہلی بار اپنے لوگوں سے اس جبر کا خاتمہ کیا جو مذہبی پروہتوں نے ان سے روا رکھا ہوا تھا اور مصر کی تاریخ میں غالباً پہلی دفعہ بت پرستی اور کثرت پرستی کے خلاف کوئی طاقتور آواز گونجی۔وہ زنا کا بھی مخالف تھا اور اپنی قوم کو اس سے منع کرتا، اس کی ایک ہی بیوی تھی جس کے ساتھ اس نے بڑی محبت کی اور پیار بھری زندگی گذاری۔اس کی بیوی کا نام ملکہ نفریت تھا مگر افسوس کہ اس کی زندگی کے ساتھ ہی اس کے افکار بھی دفن ہو گئے اور اس کے پیشرو داماد نے پھر سے آمن مت بحال کر دیا اور اہل مصر ایک بار پھر اسی جہالت اور بت پرستی کی روش پر چلنے لگے جس پہ وہ صدیوں سے قائم تھے۔دوسری قوموں کی قدیم روایات کی طرح مصری قوم بھی مذہبی عقائد کے اسی جبر کا شکار تھی جس میں چند شاطر لوگوں نے اپنی ذاتی منعفت کے لیے پو رے پورے معاشرے یرغمال بنا رکھے تھے۔

چونکہ ان کو برسر اقتدار طاقتوں کی سیاسی پشت پناہی بھی حاصل ہوا کرتی اس لیے وہ اوہام اور عقائد کا ایک ایسا نظام وضع کر لیتے جس میں عوام کی دلچسپی کے تمام عوامل شامل ہوا کرتے اور عوام اپنی پوری دلجمعی سے اپنے ہی استحصال کے لیے ان پروہتوں کی باتوں پہ عمل پیرا رہا کرتی۔تاریخ کے اکثر ادوار میں اہل مصر کی طرح بہت سے دوسرے معاشرے بھی صرف عقائدی پستی کا شکار تھے ورنہ تمدنی اور سماجی سوجھ بوجھ میں وہ بہت ترقی پر تھے اس کی چند مثالیں مشہور مغربی مورخ Well deurant کے حوالے سے پیش کی جاتی ہیں۔

> ''مثلاً اہل مصر ہی کی مثال لی جائے تو ان کے باشندے ہاتھ سے جو کپڑا بنتے تھے وہ اتنا باریک نفیس اور عمدہ ہوا کرتا کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔چار ہزار قبل مسیح کی ململ کے نمونے آج بھی موجود ہیں اتنا وقت گذرنے کے باوجود بھی وہ کپڑے ایسے باریک اور نازک بنے ہوئے ہیں کہ انھیں ریشم اور کاٹن سے تمیز کرنے کے لیے محدب عدسوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔وہ جنابِ مسیح علیہ سلام کی پیدائش سے تین ہزار سال پہلے پپائرس کے پودے سے کاغذ بنانے لگے تھے وہ دائیں سے بائیں ہاتھ کو لکھتے تھے اور دو طرح کا رسم الخط استعمال کرتے تھے ایک سے وہ اپنے دنیاوی اور کاروباری مقاصد سے متعلقہ تحریریں لکھتے تو دوسرا رسم الخط صرف مذہبی تحریروں کے لیے مخصوص تھا۔وہ ان تحریروں کو شیشے کے

مرتبانوں میں محفوظ کیا کرتے ۔دو ہزار برس پہلے کے ایسے بہت سے مرتبان کتب خانے اب دریافت کر لیے گئے ہیں جن کی تحریروں میں مذہبی بھجن، گیت ،عشقیہ نظمیں، کہانیاں ،علم طب کے اصول اور نسخے اور تاریخ و سیر کے علوم وغیرہ محفوظ ہیں ۔ (Well t) deuran مزید لکھتا ہے کہ تمدن کے ابتدائی دور میں ہی مصریوں نے تانبے اور قلعی کی آمیزش سے کانسی بنانے کا راز معلوم کر لیا تھا پہلے انھوں نے کانسی سے ہتھیار بنائے جو لوہے سے ہلکے مگر دھار میں تیز اور مہلک ہوا کرتے اول اول انھوں نے کانسی سے تلواریں خود اور ڈھالیں بنائیں پھر پہیے ،گراریاں ،کلیں، پیچ اور پھانے وغیرہ بنائے۔کانسی کی ان کلوں کی مدد سے وہ سنگ خارا میں بھی شگاف ڈال سکتے تھے وہ اپنی آری سے تابوت بنانے کے لیے سخت ترین لکڑی بھی کاٹ سکتے تھے مصری کاریگر سیمنٹ اور پلاسٹک آف پیرس بنانا بھی جانتے تھے وہ اپنی اینٹیں پزادے میں پکاتے تھے۔مٹی کے سرخ روغنی برتن بناتے تھے اور شیشہ سازی سے بھی واقف تھے۔وہ لکڑی پر کمال کے نقش ابھارتے تھے اور تابوت تو ایسے حسین تراشتے کہ مرنے کو جی چاہے‘‘۔

❑❑❑❑❑❑❑❑

مصریوں کے فنون لطیفہ کے جو نمونے گذشتہ صدیوں میں دریافت ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں کا ذوقِ جمال بڑا ہمہ گیر اور ہمہ رس تھا۔’’طوطن آمخ‘‘ فرعون بادشاہ کے مقبرے سے جو چیزیں دریافت ہوئی ہیں انھیں دیکھ کر انسانی آنکھ حیرت کے ان جہانوں میں گم ہو جاتی ہے جہاں تاریخ اپنے جلوؤں میں روشن تھی۔ان کے روزمرہ کے استعمال کی اشیاء نہایت خوش وضع ہوا کرتیں۔ برتن کرسیاں اور پلنگ نہایت خوبصورت اور آرام دہ ہوتے۔اس کے علاوہ عطر دان اور منقش زیورات کے ڈبے بھی ملے ہیں سونے چاندی کے پیالے،آفتابے، بلور کے ساغر اور پتھر کے پیالے ایسے عمدہ ہیں کہ شفاف معلوم ہوتے ہیں۔شیشے کے مختلف رنگوں سے مزین ظروف اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ ظروف سازی کا فن ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا تھا اور پھر اہل مصر کا وہ فن جس کی مثال کسی اور معاشرے کسی اور مذہب کسی اور خطے میں موجود ہی نہیں یعنی ان کی اہرام سازی کا فن جن کی عظمت و ہیبت اور تاریخی روایات کا بہت سا حصہ پردہ اخفا

میں ہے۔تاہم معلوم تاریخ کے حوالے سے یہ بات بیان کی جاسکتی ہے کہ یہ فن پانچ ہزار سال سے زیادہ پرانا ہے کیونکہ اہلِ یونان نے جب اہرامِ مصر کو دنیا کا ساتواں عجوبہ قرار دیا تو اہرام کو تعمیر ہوئے دو ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا اس پہ بھی تین ہزار سال گذر چکے ہیں اگرچہ اہل مصر فنونِ لطیفہ میں فن تعمیر، مجسمہ سازی، مصوری، شاعری، ممی سازی، موسیقی اور دیواری نقوش بنانے میں بھی اپنی مثال آپ تھے[8*]۔مگر اہرام سازی میں وہ یدطولیٰ رکھتے تھے اس لیے کہ یہ صرف انھیں کا خاصہ تھا ایک عرب شاعر نے ان اہراموں کی مضبوطی اور پائیداری کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ؛

"تمام چیزیں زمانے سے خائف ھیں مگر زمانہ اھرام مصر سے خائف ھے"

□□□□□□□□

تمدن کے اولین دور میں اہل مصر اپنے مردوں کو ریت میں دفنایا کرتے۔تاہم صحرا کی تیز ہوائیں اگلے ہی دن مردے کو ننگا کر دیتیں اور وہ صحرائی لومڑیوں کی خوارک بن جاتا۔اہل مصر اس بات کو ناپسندیدہ تصور کرتے۔پھر انھوں نے مردوں کو زیادہ گہرا گڑھا کھود کر دفن کرنا شروع کیا تو انھیں ایک اور مشکل پیش آئی وہ یہ کہ صحرا کے تیز طوفانوں میں ریت کے ٹیلے اپنی جگہ بدل لیتے اور ان کے آباء کے مرقد گم ہوجاتے اور انھیں پتہ ہی نہ چلتا کہ انھوں نے مردے کو کہاں دفن کیا تھا۔اس کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ جہاں وہ اپنا کوئی خاص آدمی دفن کرتے اس کی قبر پر بڑے بڑے کئی پتھروں کی نشانی رکھتے اور مرقد کی نگرانی کرتے۔جب وہ پتھر ریت میں ڈوبنے لگتے تو وہ ان کے اوپر اور پتھر رکھتے اسی طرح پھر وہ قبر پہ ایک بڑا کمرہ بنانے لگے۔تبدیل ہوتے مذہبی عقائد کی وجہ سے کمرے کا رقبہ بڑھنے لگا کہ اب انھوں نے کمرے میں مردے کی پسندیدہ اشیا بھی رکھنا ہوتیں۔بعد کے اہراموں کے بارے میں تاریخی روایات بیان کی جاتی ہیں کہ جب کوئی فرعون انتقال کرتا تو اس کی ممی بنا کر اس کا تابوت اس کے اہرام میں محفوظ کیا جاتا۔اسی اہرام کے دیگر کمروں میں اس کی پسندیدہ اشیاء کو اس کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا اس کے زیورات اس کی دولت حتیٰ کہ اس کے غلاموں اس کی کنیزوں اور اس کی بیویوں کو زندہ بند کر کے اہرام کو باہر سے بند کر دیا جاتا۔اس طرح فرعون اپنی لاش کے ساتھ بہت سی سسکتی زندگیوں کو بھی لے ڈوبتا۔وہ غلام اور کنیزیں اس اندھیری قبر میں بھوک پیاس اور دم

گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے۔ حال ہی میں دریافت ہونے والے مقبروں سے چند ایسے خوفناک مناظر دکھائی دیئے ہیں کہ انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ ایک مقبرے میں ایک کنیز کو ایک سوراخ کے ساتھ اس طرح لپٹا ہوا پایا گیا کہ ہوا کا کوئی قطرہ حاصل کرنے کی اذیت اس کی آنکھوں میں منجمد ہو کے رہ گئی ہے۔

مشہور مغربی مورخ (Hero Dotees) لکھتا ہے کہ جونہی کوئی فرعون تخت سنبھالتا تو فوراً ہی اپنا مقبرہ یا اہرام تعمیر کرنے میں لگ جاتا اور اس کی خواہش ہوتی کہ اس کا اہرام پہلے تمام اہراموں سے زیادہ بلند وسیع اور عظیم الشان ہو۔ چنانچہ فراعین کئی ہزار برس تک اہراموں کی تعمیر میں مصروف رہے۔ قاہرہ کے نواح میں آج بھی چوراسی اہراموں کے آثار موجود ہیں۔ تاہم تین بڑے اہرام دریائے نیل کے مغربی کنارے پر تعمیر کرائے گئے اس لیے کہ سورج مغرب میں ڈوبتا ہے اور مصریوں کا خیال تھا کہ مردوں کا گھر بھی مغرب ہی کی طرف ہے۔ آج بھی یہ اہرام غزہ کی بستی میں فرعونوں کی پوری رعونت کے ساتھ سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ سب سے بڑا اہرام خوفو کا ہے جس کا رقبہ چودہ ایکڑ اور بلندی چار سو اسی فٹ ہے اس کی تعمیر پر تیس لاکھ بڑے بڑے پتھر صرف ہوئے جن کا مجموعی وزن اڑتالیس لاکھ اسی ہزار ٹن ہے اور آج کی جدید سائنس محو حیرت ہے کہ خوفو کے اہرام کی چھت پر لگی ہوئیں پچاس پچاس ٹن کی وزنی چٹانیں اتنی بلندی تک کیسے پہنچائی گئی ہوں گی۔

ان اہراموں کی تعمیر پر لاکھوں قیدی غلام مزدور اور معمار برسوں کام کرتے رہے، سنگِ خارا کی چٹانیں پہاڑوں سے تراش کر دریائے نیل کے راستے صحرا تک پہنچتیں۔ سنگِ خارا کی ان چٹانوں کو اس کاریگری سے جوڑا گیا ہے کہ آج بھی ان کی کسی درز سے بال تک اندر نہیں جاسکتا۔ چنانچہ جب ہم ان اقوام کے سماجی اور تمدنی پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں اور ان معاملات میں انکی حیرت انگیز چابکدستی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ اتنے بڑے ریاضی دان اتنے بڑے ماہرِ فنِ تعمیر اور ایسے پر از حکمت لوگ کیونکر ایسے احمقانہ اور طفلانہ عقائد کے حامل ہو سکتے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ تاریخ عالم کی جس قوم پہ بھی نظر ڈالیں وہ عقائدی پستی کا شکار ہی نظر آئے گی کیونکہ ان کے مذاہب ان اوہام اور رسومات کا ملغوبہ ہوتے تھے جو سیاسی بازیگروں اور پروہتوں کی ملی بھگت سے تیار کئے جاتے اور جس میں ہمیشہ انھی دو طبقات کے مفادات کو مدنظر رکھا جاتا۔ ان مذاہب میں عوام کو توہم اور خوف کی اس بند گلی میں پہنچا دیا جاتا جہاں اس کے

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تقریباً مٹ جاتی اور اس کو سوائے اس کے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا کہ وہ اپنے دکھ اپنی الجھن کو ان مذہبی پیشواؤں کے آگے ہی رکھے مگر اس در سے بھی ان کو مسیحائی نہیں ملتی بلکہ الٹا وہ معاشی طور پر مزید پسماندگی کا شکار ہو جاتے۔

ان نظاموں کی خوبی یہ ہے کہ عام انسان بار بار انھی پروہتوں کے در پہ ماتھا رگڑتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے قویٰ جواب دے جائیں وہ استحصال کی اسی بھٹی میں جلتا رہتا مگر اس کا سماج اس کی رسومات اور اس کے عقائد اس کے لیے مفر کے تمام دروازے بند ہی رکھتے ہیں اس لیے اس نظام کے خلاف بغاوت کا کوئی ادنیٰ سا تصور بھی اس کے ذہن میں راہ نہیں پاتا یہی وجہ ہے ان سماجی نظاموں میں غلام ابن غلام ہی پیدا ہوتے ہیں اور شاہ ابن شاہ ہی کے طور پہ زیست کرتے ہیں۔ ان کے یہاں متوسط طبقے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی اور نہ ہی نچلی سطح سے جنم لینے والی کسی فکر کو مثبت پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ عوام کی زندگیاں اور ان کے حقوق جانوروں سے کم تر تصور کیے جاتے ہیں اور کسی کو اس بات کا حق نہیں دیا جاتا کہ وہ بادشاہت یا اپنے مذہبی عقائد کے نظام کی کسی کمزوری کو زبان پر لا سکے۔ اہل مصر کے ہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا مصر پر فرعون تین ہزار سال تک حکومت کرتے رہے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ سلام نے جب بنی اسرائیل کو ان کے پنجوں سے نجات دلائی تو فرعون اپنے لشکروں سمیت دریائے نیل کی لہروں میں غرق ہو گیا۔ جس کا ذکر قرآن میں مذکور ہے۔

پھر قبطی خاندان نے مصر کی باگ ڈور سنبھالی تاہم وہ فرعونوں جیسا نظم و نسق ترتیب نہ دے سکے اس لیے چوتھی صدی قبل مسیح تک اہل مصر پر تیس مختلف خاندانوں نے حکومت کی۔ حتیٰ کہ وہ سکندر اعظم کے اس طوفانی لشکر کی زد میں آئے جس نے دنیا کی تاریخ کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ یونانی مصر پر قابض ہو گئے اور انھوں نے اسکندریہ کو مرکزی شہر قرار دے دیا۔ اب یونان کا بطلیموس خاندان مصر پر حکمران تھا وہ بھی کئی صدیوں تک مصر پر حکمران رہے یہاں تک ملکہ قلوپطرا نے تیس قبل مسیح میں رومیوں سے شکست کھائی رومی اس وقت خود بھی بت پرستی کی لعنت میں مبتلا تھے اس لیے مصر پر قابض ہونے کے باوجود رومی اپنے عقائد پر قائم رہے اور مصری قبطی اپنی بت پرستی میں مگن رہے۔ چوتھی صدی عیسوی میں جب قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کر لیا اور اسے ریاست کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا تو عیسائی مشنریوں نے رومی سلطنت کے تمام صوبوں میں زور و شور سے اپنے دین کی تبلیغ شروع کر دی اور مصر بھی چونکہ ان کا ایک مقبوضہ خطہ تھا اس لیے یہاں بھی عیسائیت کے مشنریوں نے پورے زور و شور سے اپنے عقائد کی دعوت و تبلیغ شروع کر دی اور کافی کامیابی بھی حاصل کر

لی اس طرح اہل مصر صدیوں بعد بت پرستی کی لعنت سے آزاد ہوئے اور آج تک پھر دوبارہ اہل مصر نے بت پرستی کا رستہ اختیار نہیں کیا۔ اگر چہ مصر کے قبطیوں نے عیسائیت کو قبول کر لیا تھا مگر اس کے باوجود اہل مصر اور حکمران رومیوں کے درمیان تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے اس کی جو وجوہات مورخین نے بیان کی ہیں اس میں اول تو یہ ہے کہ دونوں قوموں کے درمیان نسلی تعصب عروج پہ تھا قبطی خود کو فرعونوں کی اولاد تصور کرتے تھے اس لیے ان کو بلند نسل ہونے کا دعویٰ تھا مگر وہ محکوم تھے دوسرے ان کے اور اہل رومہ کے درمیان فرقہ وارانہ تعصب بھی موجود تھا کہ اہل مصر خود کو نسطوری مانتے تھے جب کہ اہل رومہ کا تعلق فرقہ ملکانیہ سے تھا اور یہ فرقہ وارانہ تعصب اتنا شدید تھا کہ عیسائیوں کا آج تک کسی اور قوم نے اتنا خون نہیں بہایا جتنا فرقہ واریت کی آگ نے اس قوم کا لہو بہایا۔ ان لوگوں نے بارہا اپنے مخالف فرقے کے قتل عام کا حکم جاری کیا ہے۔ اس دور کے صفحاتِ تاریخ عیسائیت کے فرقہ وارانہ لہو سے بھیگے نظر آتے ہیں۔ باہمی خون ریزی کا ایک دریا تھا جو مسیحیت کے ان دو فرقوں کے بغض و عناد کے باعث بہتا رہا۔ ایک مذہبی اجتماع میں اسکندریہ کے اسقف اعظم نے رومی سلطنت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے قربان گاہ پر کھڑے ہو کر نسطوری فرقہ کے قتل عام کا حکم جاری کیا۔

اس کے حامیوں نے گرجا میں عبادت کے لیے جمع ہونے والے سینکڑوں قبطیوں کو لمحوں میں بے دردی سے تہ تیغ کر دیا اور گرجے کی سیڑھیوں سے خون بہہ کر اس طرح باہر آ رہا تھا جیسے کسی سیلاب کا پانی ہو۔ رومی سلطنت میں فرقہ واریت کی یہ آگ کبھی نہ بجھی حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کا روشن پیغام لے کر اہل عرب نے مصر کے دروازوں پر دستک دی تب وہاں ہرقل نامی بادشاہ حکمران تھا ہرقل نے اسلام کی اس دعوت کو قبول نہ کیا مگر اب اس کا انکار بے معنی تھا اس لیے کہ تاریخ کا دھارا اپنا چکر پورا کرنے کو تھا اور اہل مصر کو اسلام کی روشنی سے منور ہونا ہی تھا۔ چنانچہ ۶۴۰ء میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے نیل و فرات کے باسیوں تک اس عہد کو پہنچا دیا جو دستورِ آخر ہے جس کے بعد اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی اللہ کا شکر ہے کہ اب اہل مصر تقریباً چودہ سو سال سے دین حق کے قافلے کے مسافر ہیں **الحمدوللہ**

آریاؤں کی سرزمین ہند

بیسویں صدی کے پہلے عشرے تک مورخین اور تہذیبِ انسانی کے ماہرین میں یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے قبل تہذیب وثقافت کا نام تک نہ تھا۔مگر ۱۹۲۰ء میں جب سر جان مارشل نے سندھ میں موہنجوداڑو اور پنجاب میں ہڑپہ کے آثار دریافت کئے تو مورخین کی سوچ کا رخ بدل گیا اور وہ ان قدیم تہذیبوں کے مطالعے میں گم ہو گئے جن کے آثار ان کی تمدنی برتری کی شہادت دے رہے تھے جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کو چار قدرتی خطوں میں تقسیم کیا جاتا ہے شمال مغرب میں ہمالیہ کا بلند سلسلہ کوہ ہے جو ملک کو شدید سرد ہواؤں سے محفوظ رکھتا ہے، سندھ اور گنگا کے سرسبز میدان ہیں جو برما تک پھیلے ہوئے ہیں، جنوب میں سطح مرتفع دکن اور اس کے مشرقی اور مغربی ساحلی میدان ہیں۔ہمالیہ کے دامن میں قدرتی لکڑی کے وسیع جنگلات ہیں اور اس کی برفانی چوٹیاں ملک کے بڑے بڑے دریاؤں کا منبع ہیں سندھ اور گنگا کے میدانوں کی زرخیزی اسی مٹی کی بدولت ہے جو یہ دریا پہاڑی راستوں سے اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔یہ خطہ انسانی تمدن کے اولین دور سے ہی انتہائی زرخیز تصور کیا جاتا ہے۔دکن کی سیاہ اور زرخیز مٹی کپاس گنے اور تمباکو کی فصلوں کے لیے عمدہ مانی جاتی ہے تو مغربی میدانوں میں گندم چاول کپاس اور دالیں عمدگی سے کاشت کی جاتی ہیں۔آسام اور بنگال میں گھنے جنگل ہیں جو معدنیات اور جنگلی جانوروں سے اٹے پڑے

ہیں۔ان میں شیر اور ہاتھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔تاہم ملک کے مشرقی حصے میں زیادہ بارشوں کی وجہ سے عموماً چاول ہی زیادہ کاشت کیے جاتے ہیں۔ملک کی زرخیزی کا انحصار زیادہ تر ان موسمی ہواؤں پر ہے جو خلیج بنگال سے اٹھ کر جولائی اور اگست کے مہینوں میں بارشیں برساتی ہیں تاہم خطے کا نہری نظام بھی دنیا کا سب سے بہتر نہری نظام تصور کیا جاتا ہے جو دریاؤں کے راستوں میں رگوں کی طرح پھیلی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔قدرتی اور زرعی پیداوار کے علاوہ ہندوستان میں کم وبیش تمام بڑی معدنیات کے وسیع ذخائر بھی پائے جاتے ہیں۔کوئلہ،لوہا،چونے کا پتھر،میگانیز،قلعی اور سونے کی کانیں مشرقی اور جنوبی سطح مرتفع میں موجود ہیں۔تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کسی زمانے میں ہندوستان کے ہیروں کی دنیا بھر میں گونج تھی اور یہاں دنیا کے سب سے قیمتی ہیرے کھود کر نکالے جاتے تھے اور شاید اسی شہرت نے شمال مغربی دروں سے آریاؤں ،ایرانیوں،ہنوں،سیتھیوں،ترکوں اور تاتاریوں کو حملے کی دعوت دی تو سمندری راستوں سے ولندیزیوں، پرتگیزیوں،انگریزوں اور فرانسیسیوں کو فوج کشی کی ترغیب دی۔

جدید تحقیق سے اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ برصغیر میں قدیم پتھر کے زمانے کا انسان موجود تھا تاہم یہ واضح نہیں کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور اس کا تعلق کس نسلِ انسانی سے تھا۔مگر مغربی پنجاب میں راولپنڈی کے قریب دریائے سواں سے ملنے والے آثار یہ بتاتے ہیں کہ کم وبیش پانچ لاکھ سال پہلے بھی اس دھرتی پر انسان موجود تھا مگر اس کی بودوباش کے متعلق ابھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی گئی۔قیاس کیا جاتا ہے کہ اس سرسبز اور اسراروں سے پر سرزمین پر قدم رکھنے والے اولین انسان وہ وحشی حبشی قبائل تھے جو خوراک کی تلاش میں ہمیشہ سفر میں رہا کرتے انھیں آسٹریلائڈ کہا جاتا ہے ان کے بعد جانے کتنی صدیاں گذریں کہ لوگوں کا ایک اور انبوہ مغربی دروں سے وارد ہوتا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ وہ رومی النسل تھے اور سفید چمڑی کے مالک تھے ان آسٹریلائڈ اور رومی نسلوں کے اختلاط سے دراوڑ قوم نے جنم لیا۔دراوڑوں کی بودوباش کے آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اول اول ان کا ذریعہ معاش صرف گلہ بانی تھا اور وہ پہاڑوں سے زیادہ نیچے آنے سے خوف کھاتے تھے اور میدانی علاقوں کی شدید گرمی سے بھی خائف تھے مگر بڑھتی ہوئی آبادی نے آخر ان کو دریاؤں کے کنارے بستیاں بسانے پر مجبور کر دیا اور مرورِ زمانہ نے انھیں کھیتی باڑی بھی سکھا دی۔دراوڑی قوم نے ہی ہندوستانی تمدن کی بنیاد رکھی ۔اور انھوں نے ہی اسے بام عروج تک پہنچایا برطانوی مورخ "Mekdoneld" کے مطابق دراوڑ قوم نے اتنی ترقی حاصل کر لی تھی کہ وادیٔ سندھ سے ان کے

تجارتی جہاز بابل ونینوا کی بندرگاہوں تک تجارتی سامان لے کر جاتے تھے اور اب مورخین کو اس بات کے شواہد بھی مل گئے ہیں کہ جب اہل مصر اپنا بڑا اہرام تعمیر کر رہے تھے اس وقت ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی تہذیب عروج پہ تھی اور وادیٔ سندھ سے دریافت ہونے والے آثار سے مورخین اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ سلام کی پیدائش سے تین ہزار سال قبل موہنجوداڑو تہذیب تمدنی طور پہ بالغ ہو چکی تھی اس مدت کا تعین ان نگینوں سے بھی لگا یا گیا ہے جو موہنجو داڑو سے دریافت ہوئے ہیں اور سمیریائی نگینوں سے مشابہ ہیں۔موہنجوداڑوں تہذیب کے مطالعے سے انکشافات کا ہجوم لگ گیا ہے جس نے ہندوستانی تہذیب پہ پڑے ہوئے بہت سے پردوں کو چاک کیا۔موہنجوداڑو کا تمدنی مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ معاشرہ ایک مہذب شہری معاشرہ تھا اور اس کی بودوباش میں آج کی بہت سی نزاکتوں کا عکس پایا جاتا ہے جیسا کہ ان کے غسل خانے اور شہری پانی کے نکاس کا بہترین اہتمام۔شہری سطح پر ان کے نتظامات پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ باقاعدہ منصوبے کے تحت شہر بسایا کرتے تھے جن میں صفائی اور حفظانِ صحت کے موثر انتظامات کیے جاتے۔موہنجو داڑو شہر کے آثار بتاتے ہیں کہ وہ مستطیل شکل پر تعمیر کیا گیا تھا اس کی گلیاں وسیع اور سیدھی تھیں جو شمالاً جنوباً تھیں اور شہر کی دوسری کم چوڑی گلیوں کو متوازی کاٹتی تھیں اور ہر گلی کے دونوں طرف نکاسی آب کے لیے زمین دوز نالیاں موجود تھیں جو ظاہراً نظر سے اوجھل تھیں تاہم ان میں مناسب مقامات پر سوراخ موجود تھے تا کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کی صفائی کی جاسکے اور وہ بندش سے محفوظ رہیں۔سر جان مارشل جن کا تعلق یورپ سے ہے ان کے مطابق موہنجوداڑو کے ہاں فالتو پانی کو کنٹرول میں رکھ کر شہر سے باہر نکالنے کا جو نظام ان لوگوں نے وضع کیا تھا وہ انیسویں صدی کے یورپی نظاموں سے بہتر تھا۔

ان کے ہاں مختلف رنگوں سے مزین شیشے کے ظروف بھی ملے ہیں جو ان کے اعلیٰ درجہ کے ذوقِ جمال کی گواہی دیتے ہیں۔شطرنج کے مہرے ان کی ذہانت پر دلیل ہیں تو دو پہیوں والی گاڑی بھی ان کے تمدن کی مضبوطی کو ظاہر کرتی ہے۔موہنجوداڑو سے برآمد ہونے والے سکے اب تک برآمد ہونے والے سکوں میں قدیم ترین ہیں۔اُن کے سونے اور چاندی کے زیورات اتنے دلکش ہیں کہ ان کے اوپر کی گئی پالش آج کے سنار کو بھی شرمندہ کر کے رکھ دے،ان کی چمک دمک دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ پانچ ہزار سال پہلے کسی نازک بدن کے لیے ڈھالے گئے تھے جو کسی کی محبت کا اظہار تھے تو کسی کی وفا پہ دلیل تھے۔معلوم ہوا ہے کہ وادیٔ سندھ کے ان قدیم باسیوں کا معاشرہ ایک زرعی معاشرہ تھا اور زراعت ہی وادیٔ سندھ کے باسیوں کا

اصل پیشہ تھا۔ان کے ہاں آب پاشی کا بہترین نظام موجود تھا تاہم موہنجوداڑو اس وقت صنعتی دور میں بھی قدم رکھ چکا تھا اور ان کی مصنوعات درآمد کی جاتی تھیں یہاں کے پارچہ باف بہترین قسم کا کپڑا بنتے تھے جو بابل اور ایشیا کے دوسرے معروف شہروں میں برآمد کیا جاتا۔ہندوؤں کو کسی زمانے میں بھی تاریخ نویسی سے دلچسپی نہیں رہی اور شاید یہ اسی فقدان کا نتیجہ ہے کہ ان کے حالات قدیم حملہ آوروں کے آثار کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔چینی سیاحوں کے بیانات، ہمہ منشیوں، یونانیوں اور عرب سیاحوں نے بہرحال ان تاریخی ادوار کو منور کرنے کی کوشش میں مدد کی ہے ان علاقوں کے مذہبی عقائد کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہوسکی ہیں ان کے مطابق وہ ماتا دیوی کی پوجا کیا کرتے تھے جو ان کی زمین کی زرخیزی کی ضمانت تھی اور ان کی فصلیں لہلاتی تھیں وہ اپنے جانوروں کی صحت وسلامتی کے لیے جانوروں کی قربانی بھی کیا کرتے تاکہ ان کی ماتا دیوی خوش رہے اور وہ معاشی طور پر آسودہ رہیں وہ قربانی والے جانور کے خون سے ماتا دیوی کے بت کو سرخ بھی کرتے تھے۔

اس طرح ہندومت نے جنم لیا جس کے بھگوانوں کی کثیر تعداد نے ایک ایسے گورکھ دھندے کو جنم دیا کہ کوئی ہندو بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے تمام خداؤں سے واقف ہے بلکہ مختلف علاقوں کے رسم ورواج اور مذہبی شعائر مختلف ہیں۔(۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ ق م) کی درمیانی صدیوں میں آریائی قبائل ایران افغانستان اور کوہ ہندوکش کی بلندیوں سے ہوتے ہوئے وادئ سندھ میں داخل ہوئے آریائی ایک وحشی قوم تھے جنہیں متمدن ہونے میں کئی صدیاں لگیں یہ لوگ فن تحریر کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے اسی لیے زمانے کی بہت سی صدیاں وقت کی راکھ تلے گم ہوگئیں۔

آریائی قوم اپنے آبائی علاقوں سے ترک سکونت پر کیوں مجبور ہوئی تاریخ اس بارے میں خاموش ہے مگر عام قیاس یہی ہے کہ وہ لوگ بھی خوراک کی تلاش میں سفر کرتے ہوئے وادئ سندھ کے زرخیز میدانوں میں پہنچے تھے اور یہاں آکر ان کے مقاصد بڑی حد تک پورے ہوگئے اس لیے وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔انھوں نے پندرہ صدیاں سندھ طاس میں گزار دیں تاہم بعض قبائل نے مشرقی ہند کی طرف پیش قدمی کی اور گنگا جمنا کے دوآبہ پر اپنا تسلط جمایا۔آریائی اپنی زبان میں دریا کو سندھو کہتے تھے سندھ کا نام انھیں کا دیا ہوا ہے اسی دریا کی نسبت سے وہ ملک کو سندھو کہتے تھے مگر جب ان کے کچھ قبائل گنگا جمنا کے میدانوں جا بسے تو انھوں وہاں اس کا نام ”آریہ ورت“ رکھا تاہم قدیم پرانوں میں ان علاقوں کو بھارت ورش لکھا گیا ہے۔جب ایرانیوں

نے سندھ کے میدانوں پہ یلغار کی تو وہ اپنی زبان کے مطابق دریائے سندھو کو ہندو اور سندھ کو ہند کہنے لگے جو یونانیوں اور رومیوں کا انڈیا بن گیا۔آریائی اپنے ملک کو صدیوں تک سندھ ہی کہتے رہے جب کہ غیر ملکیوں نے اس کے دو حصے کر ڈالے ہند اور سندھ اور عربوں کی آمد تک یہی تقسیم قائم رہی۔آریائی قبائل سندھ طاس پہ قابض ہو گئے۔ابتدا میں ان کا سماجی سیاسی نظام کیسا تھا اور انکے عقائد کیا کچھ تھے اس کا کچھ احوال رگِ وید میں موجود ہے اور صرف یہی واحد تاریخی اثاثہ ہے جس کی مدد سے ان کی معاشرتی اور مذہبی زندگی کا عکس کسی حد تک دیکھا جا سکتا ہے۔ہندو مذہب میں بعد کی کئی کتابوں سام وید اور یجر وید میں آریائی معاشرے کی زیادہ ترقی یافتہ صورت دکھائی گئی ہے۔جب آریاؤں نے گنڈک تک سارا ملک فتح کر لیا تو اتھر وید اور برہمن وید کا زمانہ نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔آریاؤں کا نظام معاشرت پدر سری تھا سردار اپنے اپنے علاقوں پر حکومت کرتے نوارد آریاؤں نے ملکی تمدن میں گھوڑے، رتھ، لوہے اور اگنی پوجا کا اضافہ کیا۔آریاؤں کا تمدن جب گنگا اور جمنا کے میدانوں تک پھیل گیا تو چھوٹے چھوٹے راجاؤں نے اپنی الگ الگ راجدھانیاں قائم کر لیں۔ان کا مذہبی اور عقائدی پس منظر بھی ارتقائی مراحل طے کرتا رہا۔جب بڑے بڑے شہر تعمیر ہونے لگے تو لوگوں کے مذہبی خلا کو پر کرنے کے لیے دیوی دیوتاؤں کے مندر بھی تعمیر ہونے لگے جانے کہاں سے پروہت بھی پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنی ذمہ داریوں سے ذرا بھی کوتاہی نہیں کی اور مذہبی امور سنبھال لیے۔پھر ویدوں کے بعد عہد شجاعت کا دور شروع ہوتا ہے جس میں مہابھارت کی مشہور جنگ لڑی گئی، اپشند ،آرنیک اور پران لکھے گئے۔وشنو اور شیوّ پوجا کی ابتدا ہوئی تاہم ان ادوار میں تمدن کے ذیلی امور بھی ترقی کی راہ پہ گامزن رہے، علم ہیئت، ریاضی، موسیقی اور مصوری کو ترقی حاصل ہوئی۔

ہندومت کا تاریخی ارتقاء اور عقائد

علامہ البیرونی ہندو معاشرے اور تہذیب کے متعلق اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ''تحقیق مالِلہند'' میں لکھتے ہیں کہ آریائی قبائل نے جب دراوڑوں کو شکست دے کر ہندوستان پہ اپنا قبضہ مستحکم کرلیا تو اس وقت تک وہ اپنے قدیم عقائد پر قائم تھے۔قدیم ویدوں میں اللہ تعالیٰ کے بارے ان کے نظریات توحید کے بہت قریب تھے اور علمائے معاصران کو موحد قرار دیتے ہیں ابتدا میں اللہ کے بارے میں ان کا نظریہ کچھ ایسا تھا۔وہ یکتا ہے ،وہ ازلی ہے نہ اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا، وہ اپنے افعال میں مختارِ کامل ہے۔وہ قدرت کا مالک ہے،دانا ہے،خودزندہ ہے، دوسری چیزوں کو زندہ کرنے والا ہے، مدبر ہے، اچھی چیزوں کو باقی رکھنے والا ہے، وہ اپنی بادشاہی میں یگانہ ہے نہ اس کی کوئی ضد ہے نہ اس کا کوئی مقابل۔نہ وہ کسی چیز سے مماثلت رکھتا ہے نہ کوئی چیز اس سے مماثل ہے۔ان کے عقیدہ توحید کے مزید شواہد ملاحظہ فرمائیے؛

وہ اپنی اولیت اور واحدنیت کے باعث تمام ماسوا سے مستغنی ہے وہ ہر قسم کے افکار سے منزہ ہے کیونکہ وہ تمام پسندیدہ اضداد اور ناپسندیدہ انداد سے ارفع و اعلیٰ ہے، وہ بذات خود عالم ہے اور ہمیشہ سے عالم ہے، کسی وقت بھی اور کسی حالت میں بھی جہالت اور لاعلمی اس کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی اور میں کل ہوں نہ ولادت سے میری ابتدا ہے نہ وفات سے میری انتہا ہوگی۔

یہ عقیدہ ان کے خواص اور علماء کا اس خالق اور پروردگار کے بارے میں تھا جسے وہ ایشور کہتے تھے۔تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد میں شرک در آیا۔اول اول تو ان میں یہ نقص پیدا ہوا کہ عقیدہ توحید کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ لوگ ہر اس جلیل القدر قوت جس سے وہ متاثر ہوں اور جس کی شرافت و کرامت

مسلمّہ ہو کو الہٰ کہنے لگے۔ یہاں تک کہ فلک بوس پہاڑوں، بڑے بڑے دریاؤں اور دوسری پر ہیبت قسم کی چیزوں کو بھی الہٰ کہا جانے لگا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ اصل خالق اور پروردگار نظروں سے اوجھل ہوتا گیا اور بہت سی دوسری قوتوں نے اس خلا کو پر کرنا شروع کر دیا محسوس اور فائدہ دینے والی اشیاء کو معبود مان لیا گیا۔ خداوند لاشریک کی بجائے ان کی پوجا کی جانے لگی، اُن کے نام پہ قربانی کی جانے لگی اور اُن کی شبیہ یا بت بنائے جانے لگے۔ قدیم آریائی قوم میں عوام اور خواص کے عقائد میں ہمیشہ فرق پایا جاتا رہا۔ عوام اپنی جہالت اور کم فہمی کی وجہ سے منتشر افکار و عقائد میں ملوث رہے اور بدستور پستی کی طرف گامزن رہے۔ قدیم آریاؤں کے مذہب کے بہت سے بنیادی نکات ان کی ویدوں یعنی رگ وید، اتھروید، یجروید اور برہمن وید میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ آریہ اولاً اصنام پرست نہ تھے ان کے دیوتا وہ فطری قوتیں تھیں جن کی طاقت کے مظاہر سے وہ خائف تھے یا وہ تصوراتی اشخاص تھے جو ان قوتوں کا مظہر سمجھے جاتے تھے، بت خانوں کی تعمیر اور ان میں رکھے بتوں کی پوجا تو بہت بعد کی بات ہے وہ اپنے تصوراتی دیوتا کے حضور عام طور پر اناج اور دودھ کی قربانیاں پیش کرتے۔ اس کے علاوہ جانور بھی قربان کیے جاتے تھے۔ گوشت ان دیوتاؤں کی قربان گاہ پر چڑھایا جاتا۔ اس کا بہترین حصہ پروہت کو دیا جاتا اور وہ یہ گوشت کھا کر اور ''سومہ'' شراب پی کر مدہوش ہو رہتے سومہ نامی شراب ایک پہاڑی بوٹی سے کشید کی جاتی۔ چونکہ وہ اپنے دیوتاؤں کے اوتار کو بہت طاقتور تصور کیا کرتے اس لیے یہ مشروب ان کی حیات اور فنا سے مبرا ہونے کا مظہر تھا۔ رگِ وید کے دیوتا قدرتی مظاہر کی علامتیں ہیں۔ اندر گرج کا دیوتا ہے جو بادلوں کو ہانک کر لاتا ہے اور انھیں برسنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگنی آگ کا دیوتا ہے۔ ہندی آریا بھی ایرانیوں کی طرح آگ کو مقدس خیال کیا کرتے اس کے علاوہ ''وایو'' ہوا کا دیوتا ہے جو اندر کا رفیق ہے ''رور'' طوفان کا دیوتا ہے ''یاما'' مردوں کا خداوند ہے اور موت کے بعد حساب کتاب اس کی ذمہ داری ہے اس کے معاونوں کو یم دوت کہا جاتا ہے۔ سوم شراب اور نشے کا دیوتا ہے اس طرح کُل تینتیس دیوتا ہیں جن میں صرف دو دیویوں کا ذکر ملتا ہے اوشا صبح کی دیوی اور پرتھوی جس کو دھرتی دیوی بھی کہا جاتا۔ [9*]

تاریخی پہلو سے ہندومت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ویدوں کا زمانہ جس میں چاروں وید مرتب کئے گئے یعنی رگِ وید، اتھر وید، یجر وید اور برہمن وید،
۲۔ اپنشدوں کا دور جس میں ابتدائی اپنشدوں کی تدوین کی گئی۔ درشنوں کو مرتب کیا گیا، رامائن، مہابھارت اور منوشاستر تالیف کی گئیں، بدھ مت، جین مت اور شیومت جیسے مذاہب کا ظہور ہوا۔
۳۔ سوتروں کا زمانہ جس میں مذہبی عقائد اور فلسفیانہ نظریات کو ایجاز و اختصار کے ساتھ سوتروں کی صورت مرتب کیا گیا۔
۴۔ پرانوں کا دور جس کا زمانہ ۵۰۰ء بیان کیا جاتا ہے ان میں کم وبیش چار لاکھ اشعار ہیں آج کل کے ہندوؤں کی اکثریت انھی پرانوں پر یقین رکھتی ہے۔

ہندوؤں کا معاشرتی اور سماجی نظام چاہے کیسا ہو ان کے ہاں مذہبی جوش اور ولولہ میں ایک طرح کی یکسانیت اور گرم جوشی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ آج کے ہندوستان نے سائنس صنعت وحرفت انفارمیشن ٹیکنالوجی اور دیگر کئی میدانوں میں ترقی کی کافی منزلیں طے کرلی ہیں مگر آج بھی وہ اپنے عقائد یا قدیم مذہبی نظام میں پائی جانے والی فرسودہ اور بے بنیاد رسومات کے بارے میں کسی بھی سطح پر نظر ثانی کو مناسب نہیں سمجھتا۔ شاید اسی لیے مشہور مغربی مورخ ''Leeban'' ہندو تہذیب کے بارے میں رقم طراز ہے کہ؛

''ہندو معاشرے میں مذہب اور اخلاق کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔ ہندوؤں کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ اقوام عالم میں سب سے زیادہ مذہبی ہیں تو دوسری طرف یہ نتیجہ بھی آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ اقوام عالم میں ہندو اخلاقی لحاظ سے سب سے پست ہیں اس لیے کہ ہندو اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے بعد خود کو تمام اخلاقی ذمہ داریوں سے مبرا خیال کرتا ہے وہ پانچ روپے کا ناریل اپنے بھگوان کے چرنوں میں توڑ کر زنا اور چوری جیسے بڑے جرائم سے بھی نہیں چوکتا۔ اس کے خیال میں اس کے ذاتی کردار اور اخلاق سے اس کے دیوتا کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہمسائے کی لڑکی کی عزت خراب کر دینے سے اس کا دیوتا ناراض نہیں ہوگا بلکہ وہ تب ناراض ہوگا جب وہ اس کی پوجا سے کوتاہی کرے گا۔ ہندومت میں دیوتا کو خوش رکھنا ہی اولیت رکھتا ہے جب کہ بہت سے دوسرے مشرقی مذاہب میں جو اخلاقی حدود وقیود بیان کی گئیں ہیں ہندو خود کو ان سے آزاد تصور کرتا

ہے۔منو دھرم شاستر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ چھوٹی چھوٹی مذہبی رسوم کا چھوڑنا گناہ عظیم تصور کیا جاتا ہے جس کی تلافی سخت جسمانی سزا اور بعض صورتوں میں موت بھی ہوسکتی ہے مگر چوری قتل اور زنا جیسے جرائم کے لیے نہایت معمولی سزائیں تجویز کی گئیں ہیں اس لیے کہ ان کی دیومالا میں ان کے دیوتا بھی ان جرائم میں ملوث رہے ہیں جیسا کہ بعض ہندو فرقوں میں جوا کسی فرض کی طرح کھیلا جاتا ہے۔ان کا اخلاقی نظام اتنا پست اور گنجلک ہے کہ بہت سے جرائم کی سزائیں مجرم کی ذات کے ساتھ بدل جاتیں ہیں جیسا کہ اگر کوئی برہمن کسی شودر کو قتل کردے تو اس کی سزا محض اتنی سی ہے کہ وہ بھگوان کے چرنوں میں کچھ بھینٹ کردے مگر یہی شودر اگر غلطی سے کہیں ان کی مذہبی کتاب کو سن لے تو اس کی زبان کاٹ دینا یا اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دینا عام سزائیں ہیں۔چنانچہ کسی گناہ کا شدید اور خفیف ہونا محض اس شخص کے سماجی رتبے پر ہے۔تمدن ہند میں علی بلگرامی لکھتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ اخلاق اور نیک چلنی اہل ہند میں ناپید ہے اگرچہ مذہب ان کے ہر دور میں زوروں پر رہا ہے ہندوؤں کے یہاں مذہب اور اخلاق کے درمیان پہلے ہی ایک وسیع خلیج موجود تھی جسے شیومت، شکتی مت اور تنترمت کے پجاریوں نے مزید وسیع کردیا اور عوام الناس کے رہے سہے اخلاق کو تباہ وبرباد کرکے رکھ دیا"۔

❑❑❑❑❑❑❑

نفس پرست پروہتوں اور مکار سادھوؤں نے ہر دور میں عام لوگوں کی عزت اور مال کے ساتھ خوب کھلواڑ کیا ہے۔دم مارگی سپمر داسوامی نارائن مت اور مادھومت کے گرو سب پہ بازی لے گئے اور انھوں نے مذہب کے پردے میں تسکینِ ہوس کا خوب سامان کیا ہے۔آج کل کا ہندو سماج انھی مذہب فروشوں کی گرفت میں ہے۔پھر ہندوازم میں عقائدی نظام کو کچھ اس طرح سے مرتب کیا گیا ہے کہ وہ ایک گورکھ دھندا بن کے رہ گیا ہے۔پنڈت رادھا کرشنن کے مطابق ہندوؤں کے فلسفہ اخلاق کو ان کے مذہب سے الگ نہیں کیا جاسکتا ان کے ہاں مذہب اور فلسفہ دونوں کا اصل اصول آواگون یا کرم سنسار کے چکر کا مسئلہ ہے جو شخص اس پر عقیدہ رکھتا ہے وہ ہندو ہے خواہ وہ خدا یا ایشور کا منکر ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ ویدوں کو الہامی نہ مانے۔جین اور بدھ

مت کو کھینچ تان کر جب ہندوازم کا حصہ ثابت کر دیا گیا تو گپتا خاندان کے عہدِ حکومت میں برہمن مت کا احیا عمل میں آیا لیکن اب اس تجدید میں رگ وید کی تعلیمات کا عمل دخل بہت کم ہو چکا تھا، قدیم دیوتاؤں کی جگہ نئے نئے دیوتا نمودار ہونے لگے جن میں سے بعض دراوڑوں کی دیو مالا سے لیے گئے تھے۔ اب کے برہما وشنو اور شیو کی تثلیث نے مقبولیت حاصل کر لی تھی اور پتھر سے تراشی ہوئی تری مورتی کا مظہر ابھر کے سامنے آ گیا ہندوؤں کے آج کے معاشرے میں مقبولیت اور پوجا کے استھان پر براجمان وشنو اور شیو کا ذکر نہ ویدوں میں ملتا ہے نہ منو شاستر میں موجود ہے بلکہ دھرم شاستر میں تو مورتی پوجا سے کراہت اور ممانت کا حکم موجود ہے مگر آج سارا ہندوستان بت پرست معاشرے میں ڈھل چکا ہے۔ علمائے مغرب نے ہندومت پہ جو تحقیق کی ہے اس کے مطابق تو شیو پوجا کرشن پوجا اور لنگ پوجا دراوڑی دیو مالا سے یادگار ہیں۔ ان دیوتاؤں میں جو مقبولیت شیو وشنو کرشن اور شکتی دیوی کو حاصل ہوئی وہ برہما کی پوجا کو میسر نہیں آ سکی۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے مطابق برہما کنول کے پھول سے پیدا ہوا تھا اس کے پانچ سر تھے مگر اس کے ایک سر کو شیو نے کاٹ لیا تھا کیونکہ برہما نے اس کی بیوی پاروتی کی عصمت دری کی تھی۔ برہما ہنس پہ سواری کرتا ہے اور اس کی بیٹی سرسوتی ہی اس کی بیوی ہے۔ برہما خالق ہے اس نے اپنے جسم کو جب دو حصوں میں تقسیم کیا تو عورت اور مرد کی پیدائش وقوع پذیر ہوئی۔ اس نے مرد کا نام زاج رکھا اور عورت کو شت روپا کا نام دیا گیا۔ وشنو پالنے والا ہے اور شیو فنا کا دیوتا ہے شیو کو مہا دیو اور مہا یوگی بھی کہا جاتا ہے۔

اس کے اور بھی متعدد نام مروّج ہیں جیسا کہ، مہا کال، لال جٹاؤں والا، بھوتیشور، وغیرہ ہندوا سے بھوت پریت کا آقا بھی مانتے ہیں۔ وہ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ڈالے بھوتوں کی فوج کے جلو میں بدمست ہو کر تیزی سے رقص کرنے لگتا ہے اس کے ہاتھ میں ترشول ہوتا ہے پانچ منہ تین آنکھیں اور ایک مست بیل بھی اس کے ساتھ ہوا کرتا۔ ناچنے کی حالت میں اس کا نام نٹ راج ہوتا اس کے گرد شعلوں کا چکر ہوتا اور پاؤں کے نیچے ایک مردہ عفریت کا جسم۔ بھوتوں کا یہ آقا دراوڑوں کی دیو مالا کا اہم دیوتا تھا اس کی بیوی کا نام پاروتی ہے جسے اُما، دُرگا، بھوانی دیوی بھی کہا جاتا ہے اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک میں کٹا ہوا سر ہوتا ہے باقی دو ہاتھ برکت دینے کے لیے دعائیہ انداز میں اٹھے ہوئے ہوتے ہیں اس کے ہونٹ لہو میں تر اور زبان باہر کو نکلی ہوئی ہوتی ہے اس کے گلے میں سانپ اور کھوپڑیوں کے ہار ہوتے ہیں چہرے اور سینے سے خون بہہ رہا ہوتا ہے مہربانی کی حالت میں اس کا نام مادرِ دنیا، درخشاں، شادماں، متوالی آنکھوں والی

،وغیرہ تاہم اسی دیوی کو حالت غضب میں دُرگا،خوفناک اور لال دامنوں والی بھی کہا جاتا ہے اس دیوی کا رنگ حقیقت میں گورا ہے اور وہ حسن و جمال کی پتلی ہے مگر غصے کی حالت میں اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے اس لیے اس کو کالی ماتا بھی کہا جاتا ہے۔آج اکیسویں صدی میں بھی کلکتہ میں کالی گھاٹ کے مقام پر اس دیوی کے مندر میں رکھی مورتی کا دامن کبھی خون سے خالی نہیں ہوتا اور کالی ماتا کے مندر میں مذبوحہ بکروں کا خون بہتا رہتا ہے۔اولاد کی خواہش مند عورتیں عقیدت کی انتہا میں ڈوبی اسے چاٹتی رہتی ہیں۔ابتدا میں دُرگا ماتا یا کالی ماتا کو صرف وندھیا کے وحشی قبائل پوجتے تھے پھر جب وہ شیو کی زوجہ بن گئی تو شیومت کے متوازی اس کا بھی ایک مت بن گیا اور اسے شکتی پوجا کہا جانے لگا۔مہابھارت میں کرشن لڑائی سے پہلے ارجن سے کہتا ہے دُرگا کی پوجا کرلو۔

بعض قدیمی فرقوں مثلاً دراوڑوں میں اسے دھرتی ماتا کا نام بھی دیا جاتا رہا ہے۔تنتر ادب اسی کے متعلق ہے۔ اس کے پجاری ذات پات کی تمیز نہیں کرتے اور ایک خاص پوجا کے دن سب لوگ مقررہ وقت پر کسی خاص جگہ اکھٹے ہو جاتے ہیں،شراب کے مٹکے کے پاس ایک جوان کنواری اور برہنہ لڑکی کو کھڑا کر کے اس کی یونی کی پوجا شروع کر دی جاتی ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ اس لڑکی میں شیو کی شکتی حلول کر گئی ہے۔پھر مرد اور عورتیں شراب پی کر بدمست ہو جاتے اور بے محابا اختلاط کرتے۔شیومت کے ساتھ لنگ پوجا کی روایت بھی وابستہ ہے جو دراوڑوں سے یادگار ہے۔لنگائت یا لنگ بمعنی اعضائے تناسل کے پجاری شیو لنگ کو مقدس مانتے ہیں اور دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔جنوب میں انھیں لنگ دھاری کہا جاتا ہے۔

نیپال سے لے کر بنارس اور کلکتہ سے لے کر مدراس تک ہر کہیں لنگ کے مرمریں مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مندروں کی وضع قطع بھی لنگ کے نمونے کی ہے۔ان مندروں کے دیوار و در پر جنسی اختلاط کے آسن واشگاف صورت میں نقش کئے گئے ہیں۔رامیشور کے مندر کے لنگ کو ہر روز گنگا کے پانی سے غسل دیا جاتا ہے۔اس پانی کو جو غسل کے دوران استعمال ہو خوش عقیدہ لوگ گراں قیمت پر خرید کر پیتے ہیں تاکہ ان کے ہاں نرینہ اولاد ہو۔لنگ پوجا کے دوران لنگ پر تیل گرا کر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔شیوراتری کے تہوار پر خاص اہتمام کے ساتھ لنگ پوجا کی جاتی ہے۔سر جان مارشل کے بقول شیو پوجا اور شکتی پوجا کی طرح لنگ پوجا بھی ہندوستان کا قدیم ترین مذہب ہے اور دراوڑوں سے یادگار ہے۔دم مارگیوں کا فرقہ بھی شیومت سے تعلق رکھتا ہے۔شکتی پجاریوں کی طرح یہ لوگ بھی رات کو اکٹھے مل بیٹھتے ہیں۔ان میں برہمن،

کھشتری، ویش، شودر اور چنڈال ہر ذات کی عورتیں اور مرد شامل ہوتے ہیں اور وہاں بھیرویں چکر چلتا ہے۔سب مل کر شراب پیتے ہیں اور اپنے دانتوں سے نوچ نوچ کر گوشت کھاتے ہیں پھر ماں بہن کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور ساری رات فسق و فجور میں گذرتی ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ بھیرویں چکر چل رہا ہو تو برہمن اور چنڈال سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔تاہم چکر کے خاتمے پر پھر ذات پات کا ازلی چکر شروع ہو جاتا ہے۔ وہ سب دوبارہ اپنے اپنے ورم میں واپس آجاتے ہیں۔ان کا ایک فرقہ چولی مارگی کہلاتا ہے۔وہ اس خاص رات کو اس طرح مناتے ہیں کہ تمام عورتیں اپنی چولیاں ایک جگہ اکٹھی رکھ دیتی ہیں پھر جس مرد کے ہاتھ میں جس عورت کی چولی آجائے وہ اس کے ساتھ صحبت کرتا ہے۔دم مارگی اور تنتر مت ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ہر عورت پاروتی کی طرح اور ہر مرد شیو کی طرح ہے اس لیے ہر عورت ہر مرد کے ساتھ سو سکتی ہے۔شیو بھگتی کا ایک اور فرقہ ویراسیوا بھی ہے جو مساوات کا قائل ہے۔ان کے مطابق لنگ سب انسانوں کو مساوات بخشتا ہے۔وشنو دیوتا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک شیش ناگ پر لیٹا پانی پر تیرتا رہتا ہے۔اس حالت میں اس کا نام نارائن ہے یعنی پانی والا دیوتا ہے۔

برہما اس کی ناف ہے اور شیو اس کی پیشانی سے پید ہوا تھا۔اس کی زوجہ کا نام لکشمی یا لچھمی ہے جو مال و دولت کی دیوی ہے۔دیوتاؤں اور اسروں نے سمندر کو بلویا تو دوسرے رتنوں کے ساتھ لچھمی بھی ہاتھ میں کنول کا پھول لیے ہوئے اس سے نکلی۔لکشمی رام چندر کے زمانے میں سیتا کے روپ میں ظاہر ہوئی اور کرشن کے وقت رکمنی کا قالب اختیار کیا۔رام کرشن وشنو کا اوتار ہے وشنو کا آخری اوتار کلکی ہوگا جو کلجگ کا خاتمہ کرے گا۔وشنو کے پجاری اپنے ماتھے پر عمودی تلک لگاتے ہیں جبکہ شیو بھگت کا تلک افقی ہوتا ہے۔وشنو بھگتوں کو نام دھاری بھی کہتے ہیں۔وشنومت برہمنوں میں زیادہ مقبول ہوا۔جنوبی ہند میں وشنو کو پیرومل بھی کہتے ہیں روایت یہ ہے کہ وشنومت کا آغاز راجہ بھوج کے زمانے میں ہوا تھا۔شٹھ کوپ نے اس کی بنیاد رکھی تھی اس کے بعد منی داہن یادنا چاریہ اور رامانج نے اس کی اشاعت کی۔

گجرات اور کاٹھیاوار میں اس فرقے کے پیرو کثرت سے پائے جاتے ہیں۔یہ لوگ اپنے سوامی یا گرو کو بطور عقیدت اور رغبت اپنی عورتیں پیش کرتے ہیں۔پھر مہابھارت ہے جس کا اہم نظریہ داسودیوا کرشن مت کا ہے جس کی ایک صورت گیتا میں دکھائی دیتی ہے۔گیتا میں بھگتی کا درس دیا گیا ہے اور اس کی نظموں میں کرشن بحیثیت ایک شخصی خدا کے دکھائی دیتا ہے جس سے محبت اور تعلق کا اظہار نجات کا باعث ہوسکتا ہے۔رامانج

چیتنیہ، ٹکارام اور کبیر وغیرہ بھگتی شاعروں نے اسی محبت کے گیت گائے ہیں۔ کرشن پوجا نے بہار اور بنگال میں دریاپتی چنڈی داس اور جے دیو جیسے شاعر پیدا کیے ہیں جن کے ہاں رادھا اور کرشن کے ازلی پریم کا ذکر والہانہ جوش وخروش سے پایا جاتا ہے۔ تاہم ویدوں اور گیتا کا عملی مذہب اب اپنی ابتدائی تاثیر سے محروم چکا ہے کیونکہ پرانوں میں تکوین اور تخلیق کے عجیب وغریب قصے بیان کیے گئے ہیں۔ رگِ وید میں اگنی اور وایو کا شمار اکابر دیوتاؤں میں ہوتا تھا مگر پرانوں میں ورن کو راون کا نوکر اور اگنی کو اس کا باورچی بتایا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وایو دیوتا کو اس کا خاکروب بنادیا گیا۔ پرانوں میں یہ لکھا ہے کہ ہر دور میں منو ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور ہر منو کی عمر ۴۳ لاکھ ۲۰ ہزار برس ہوتی ہے۔ منوسمرتی کے مولف کا نام منوسوایم بتایا گیا ہے پرانوں میں عقل کا دیوتا گنیش ہے جس کا پیٹ ہاتھی کے پیٹ جیسا ہے اور وہ چوہے پر سواری کرتا ہے بھمیا زمین کا دیوتا ہے جس کی پوجا کسان کرتے ہیں۔ تلسی اور پیپل کے درختوں کے علاوہ بھا گھاس کی پوجا پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اسی طرح سالک رام اور چنتامنی کے مقدس پتھروں کی پوجا پر بھی زور دیا گیا ہے۔ درختوں پہاڑوں اور دریاؤں کی پوجا پر بھی زور دیا گیا ہے۔ رگِ وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ بیان کی گئی ہے جو اب ۳۳ کروڑ تک جا پہنچی ہے۔ دیوتاؤں سے اخلاق باختگی کے سینکڑوں شرمناک قصے منسوب ہیں۔ مثلاً ایک رشی کی لڑکی نے سوریہ دیوتا کو بلانے کا منتر پڑھا تو دیوتا آ گیا اور اس نے پوچھا اے لڑکی تم نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ لڑکی نے جواب دیا میں نے تو یہ منتر صرف آزمائش کے لیے پڑھا تھا تو سوریہ دیوتا کہنے لگا اب میں آ گیا ہوں تو تیرے پیٹ میں اپنی یادگار چھوڑ کر جاؤں گا۔ لڑکی جھجکی تو اس نے کہا اے نازنین مت ڈر مجھ سے تیری دوشیزگی کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ اس اختلاط سے کرن پیدا ہوا جو مہابھارت کی جنگ میں پانڈوؤں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ یہ لڑکی پانڈو بھائیوں کی ماں کنتی تھی۔

مہابھارت اور پرانوں کے خرافات اب ہندو مذہب کے جزو لازم بن چکے ہیں پرانوں کے عہد میں جو آج بھی حاوی ہے یہ عقیدہ رونما ہوا ہے کہ دیوتاؤں کو پوجنا ان کو خوش رکھنا ہی اصل نیکی ہے اس طرح ہندو مذہب کا اخلاق سے رشتہ منقطع ہو کے رہ گیا۔ رگِ وید جس کا شمار ہندوازم کی ابتدائی کتابوں میں کیا جاتا ہے پرش منتر کے باب میں صرف ایک بار ذات پات کا ذکر آیا ہے اور وہ بھی شودر برہمن کا نہیں بلکہ اس میں صرف غیر آریاؤں کو مطعون کیا گیا ہے۔ جو ملکی باشندے تھے یعنی دراوڑ وغیرہ ان کو رگِ وید میں کافر گندے اور لنگ کے پجاری کہا گیا۔ رگِ وید کے زمانے میں ہون اور قربانی سے دیوتاؤں کی رضا مقصود تھی۔ وہ کھلے میدان

میں آگ جلا کر ہون کنڈ بناتے اور آگ میں گھی چاول وغیرہ ڈال کر منتر پڑھتے۔وہ اندر دیوتا پر بیل قربان کیا کرتے اور اس کی قربانی کا گوشت کھاتے۔شادی بیاہ کے موقع پر گائے ذبح کی جاتی اور اس کا گوشت مہمانوں کو کھلایا جاتا۔سب سے بڑی اور اہم قربانی سفید گھوڑے کی تھی جسے اشومید یگ کہتے۔گھوڑے کی قربانی سے پہلے بکری ذبح کی جاتی تاکہ وہ جا کر دیوتاؤں کو سفید گھوڑے کی قربانی کی خوشخبری دے سکے۔ پھر وہ سب قربانی کے گھوڑے کا گوشت کھاتے۔قربانی کے گھوڑے کو زمین پر لٹا کر اس کی ٹانگیں جکڑ دی جاتی تب پروہت اس کا سینہ چاک کر کے دھڑکتا ہوا دل کھینچ کر باہر نکال لیتا۔بعض شدید حالات میں وہ انسانی قربانی سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔[10*] رگِ وید کے بعد کے تین وید اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب آریائی پنجاب سے آگے بڑھ کر گنگا اور جمنا کے میدانوں میں بس گئے تھے اور ان کا مذہب ملکی باشندوں کی روایات سے مل کر نئی نئی صورتیں اختیار کرتا جا رہا تھا۔چنانچہ اب یجر وید میں گائے کو مارنا اور اس کا گوشت کھانا سنگین جرم قرار دے دیا گیا اور اس کی سزا موت تجویز کی گئی۔رگِ وید میں ناگ پوجا کا ذکر نہیں ملتا مگر یجر وید میں اس کی تلقین کی گئی اس کے علاوہ یجر وید میں رسوم وعبادات کے طریقے بیان کیے گئے۔

رگِ وید میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے پروہت یگیہ کا عمل کیا کرتے تھے۔اب یہ عقیدہ ابھر کے سامنے آیا کہ یگیہ کرنے سے دیوتاؤں کو حسبِ منشا کام پہ مجبور کیا جا سکتا ہے گویا اب پروہت دیوتاؤں پر متصرف ہو گئے تھے۔سام وید میں گانے بجانے کے اصول درج ہیں اور اتھر وید میں سحر وطلسمات کے منتروں کا بیان ہے جس سے امراض جسمانی کا بھی علاج کیا جا سکتا ہے اور محبوبہ کے دل کو بھی نرم کیا جا سکتا ہے۔بعض برہمن اتھر و وید کو الہامی نہیں مانتے اس لیے کہ یہ سراسر توہمات اور خرافات کا بے معنی دفتر ہے۔ویدوں کے اہم اور یقینی مذہبی خیالات کو اگر مختلف حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اہم امور کی ترتیب کچھ یوں بیان کی جا سکتی ہے۔

۱۔ قوائے فطری کی پرستش۔

۲۔ ان قوائے فطری کو دیوتا قرار دینا اور ان کے نام رکھنا۔

۳۔ روح کی بقاء کا اعتقاد۔

۴۔ پرکھوں یعنی بزرگوں کی پرستش۔

۵۔ کل عالم یعنی تمام انسانوں اور دیوتاؤں کو ایک بڑے دیوتا اندر کے تحت لانے کا میلان۔

۶۔ مذہب کو مادی قرار دینا یعنی دیوتا اور اس کے پجاری کے مابین غرض کے ایک تعلق کو اجاگر کرنا۔

انھیں ویدوں میں دیو مالا کا بیان ہے برہمنوں کی پوجا اور دیگر رسوم کا ذکر بھی کافی تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔تاہم وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ اس قدر پیچیدہ ہوتی گئیں کہ ہندومت کے علاوہ دنیا کے کسی اور مذہب کو اتنا گنجلک قرار نہیں دیا جا سکتا۔اس کے نتیجے میں پروہت جو اِن رسوم کی ادائیگی سے واقف تھے معاشرے پر پوری طرح مسلط ہو گئے۔کرم کانڈ میں برہمنوں کے مذہب کا رسمی و رواجی پہلو سامنے آیا ہے جس میں راہبانیت کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

تاہم کچھ وقت گذرنے پر برہمنوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جنہیں ترک دنیا کا شوق چرایا اور وہ گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں جا کر تپسیا (عبادت) کرتے تھے اور گیان دھیان میں اپنی عمر گذار دیتے تھے۔ان کے کچھ افکار ارنیک اور اپنشدوں میں ملتے ہیں یہ تپسوی اپنے چیلوں کو علوم باطنی کی تربیت بھی دیا کرتے تھے۔بعض محقق خیال کرتے ہیں کہ اپنشدوں کو مسیح علیہ سلام کی پیدائش سے ہزار سال پہلے لکھا گیا۔اپنشدوں میں ایک غیر مرئی اور صفات سے عاری روح کائنات کا تصور پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق برہما انتریامی ہے گویا برہما ہی کائنات ہے۔اُپنشدوں کی تعداد ایک سو آٹھ ہے ان کے مطالب بے ربط ہیں اور ان میں اوہام وخرافات کی بھرمار ہے۔اُپنشدوں کے مطابق مولفین کا پہلا سبق یہ ہے کہ انسانی عقل برہما کے ادراک سے عاری ہے۔حواسِ انسانی ناقص اور محدود ہیں اور عقل و علم کے سہارے روح کی حقیقت کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کتابی علوم کو بالائے طاق رکھ کے حواس کے دریچے بند کرے۔اسی سے باطن میں روشنی ہو گی ان کے مطابق روح جزو ہے اور کائنات کل اور جز کا کل سے ملاپ ہی منزل ہے جیسے بہتا ہوا دریا سمندر میں جا کر اپنی ہستی کھو دیتا ہے۔

چنانچہ ہندوازم کے عقائد اور ان کے رسم و رواج ایک نہ سمجھ میں آنے والا اور الجھا ہوا گورکھ دھندا ہے۔اس لیے کائنات کے بارے میں بھی ان کے خیالات حلق سے نہیں اترتے۔ان کے مطابق نظامِ کائنات گردشوں کے ایک لامتناہی تسلسل کا نام ہے جو ان کے دیوتا وشنو کی زندگی سے وابستہ ہے۔ان کی دیومالا میں کائناتی تصور کو بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ہر کائناتی دن کے آغاز میں وشنو ایک ہزار سروں والے شیش ناگ کی گود میں سویا رہتا ہے۔کائنات کی گردش کے ایک دن کے چکر کی مدت چار ہزار دو سو ملین سال

کے برابر بتائی جاتی ہے جس کو کالپا یا برہما کا دن کہا جاتا ہے۔شیوا کا ئناتی قدیم میں جھولا جھولتا رہتا ہے اس کی ناف سے کنول کا پھول اگتا ہے اور اس کی لپٹی ہوئی پتیوں سے برہما دیوتا جنم لیتا ہے جو خالق کائنات ہے جو جہان کی تخلیق کرتا ہے۔وشنو جاگ کر اس پہ حکمرانی کرتا ہے پھر کالپا کے اختتام سے پہلے وشنو ایک بار پھر سو جاتا ہے اور ساری کائنات اس کے جسم میں ضم ہو جاتی ہے۔ہم جس زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا آغاز تین ہزار ایک سو دو سال قبل مسیح میں ہوا تھا اور یہ کالپا مکمل ہونے پر ساری دنیا آگ اور طوفان سے تباہ ہو جائے گی۔ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ نیند سے بیدار ہونے پر وشنو اپنے تخت پر بیٹھتا ہے اور اس کے پہلو میں اس کی ملکہ لکشمی دیوی بیٹھتی ہے مگر جب کائنات کے امن وسکون اور تسلسل کو خطرہ لاحق ہو تو وشنو دیوتا تخت چھوڑ کر کبھی مکمل اور کبھی نامکمل صورت میں ظاہر ہو کر کائنات کو پیش آنے والی آفت سے نمٹ لیتا ہے۔وشنو کے آج تک ظاہر ہونے والے نامکمل مظاہر کی گنتی کرنا تو ناممکن ہے مگر آج تک وہ جن مکمل مظاہر میں نمودار ہوا ہے ان میں سے چھ اولین مظاہر میں وہ مچھلی ، کچھوا سور، شیر اور انسانی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔تاہم ہندو دیومالا اور ان کی عمومی زندگی میں وشنو کا ساتواں اور آٹھواں ظہور نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے جب وہ راما اور کرشنا کے روپ میں ظاہر ہوا جس کی پوجا بھارت کے طول وعرض میں پورے ذوق وشوق کے ساتھ کی جاتی ہے۔

وشنو کا نواں ظہور ’’بدھا‘‘ کے روپ ہوا اب وشنو کا ایسے روپ میں آنا جو نہ ویدوں کا قائل ہو نہ خدا کا ایک تعجب خیز امر ہے۔تاہم حقیقت یہ ہے جب بھارت میں بدھ مت کو زوال آیا اور برہمن پھر مذہب کی سادھی سجا کر بیٹھ گئے تو انھوں نے بدھ مت کو ہندو مت میں ضم کرنے کے لیے یہ نظریہ اپنایا کہ بدھا کوئی غیر تو نہیں وہ بھی ان کے وشنو ہی کا ایک روپ اور اوتار ہے اس لیے اس کی مورتی کو اپنے مندروں میں سجانا اور اس کی پوجا کرنا ہمارا حق ہے۔چنانچہ آریاؤں کا وہ سادہ سا مذہب جس میں جا بجا توحید کے نشانات بھی پائے جاتے تھے اور اس میں انسانی فلاح کا ایک موہوم تصور بھی موجود تھا گنگا جمنا کی سرزمین پر آ کر اتنا پیچیدہ اور گنجلک ہو گیا کہ اس کو بیان تک کرنا مشکل ہے وہ عجیب سے نظریات بے معنی رسم ورواج کا مجموعہ بن کے رہ گیا۔ دیوتاؤں کی فہرست کروڑوں تک جا پہنچی۔چنانچہ ان کے رسوم وعبادات ہر مقام اور ہر آبادی میں بدل جاتے ہیں۔ویدوں میں بیان کیے گئے قدیم اور اہم دیوتاؤں کی اہمیت بالکل گھٹ کے رہ گئی ہے اور نئے نئے دیوتاؤں نے مندروں میں اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ان کے معبودوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں

کروڑوں تک پہنچ گئی ہے بہرحال آج کے ہندوسماج میں وشنوشیوااور برہما مقبول دیوتاؤں کے طور پر پوجے جاتے ہیں۔

ہندومت کی بعض کتابیں

ہندومت میں آریاؤں کا قدیم ترین علمی سرمایہ ویدوں کی صورت میں موجود تھا۔ وید کا لفظی معنی علم اور دانشمندی بیان کیا جاتا ہے۔ ویدوں کے بارے میں اہل ہند کا عقیدہ ہے کہ یہ وہ کلام ہے جو ان کے دیوتاؤں کے دلوں پر القا کیا گیا۔ ان کے نزدیک یہ وید بہت مقدس ہیں اور انسانوں کی بقاء اور فلاح کے ضامن ہیں۔ اِن دیدوں میں قانون اور آدابِ معاشرت کے ساتھ ساتھ حمد، بھجن، منتر اور قربانی کے وقت کی دعائیں بیان کی گئیں ہیں۔ محبت پیدا کرنے والے افسوں، محبوب کا دل چھین لینے والے منتر اور سانپ کے کاٹنے کے موثر منتر بھی موجود ہیں۔ پھر دشمنوں کو تباہ کرنے کے لیے بھی منتر اور ہدایات موجود ہیں۔ ان ویدوں کے ساتھ اُپنشد بھی ہیں جن میں ہندومت کی فلسفیانہ بنیادیں استوار کی گئی ہیں۔ ان میں آواگون یا مشہورِ زمانہ عقیدہ تناسخ بیان کیا گیا ہے۔ اس عقیدے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انسان جب مرجاتا ہے تو اُس کو اِس جیون کے اخلاق و کردار کے حوالے سے نیا جسم عطا کیا جاتا ہے۔ انسان دوسرے جنم میں سانپ بچھو یا گدھا بھی ہوسکتا ہے۔ وہ نباتات یا جمادات کی کوئی صورت بھی اختیار کرسکتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے ایک انسان آواگون کے چکر میں سات زندگیوں تک مبتلا رہتا ہے آخر کا اس بار بار جینے اور مرنے کے تسلسل سے وہ اسی وقت نجات پا سکتا ہے جب روح مادہ کے قفس سے آزاد ہوجاتی ہے۔ تب وہ ہر قسم کے رنج والم سے آزاد ہوجاتی ہے اس طریقہ کار کو کرما کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ ویدوں کے علاوہ ان کے پاس دو طویل نظمیں بھی موجود ہیں جن کو رامائن اور مہا بھارت کہا جاتا ہے۔ اس دور کے ہندومت میں ان کو بہت اہم حیثیت حاصل ہے۔ پہلی نظم میں رام کہانی ہے کہ جب رام کی سوتیلی ماں کے کہنے پر اس کے باپ نے اسے جلاوطن

کر دیا تھا جس پر رام اپنی بیوی کے ہمراہ ویرانوں اور جنگلوں کی طرف چل دیا اور وہیں اس نے مستقل رہائش اختیار کر لی، وہیں سے اسکی بیوی سیتا کو لنکا کے راجہ راون نے اغوا کر لیا پھر رام نے لنکا پر چڑھائی کر کے اپنی بیوی کو آزاد کرایا۔ دوسری نظم میں اس لڑائی کا ذکر ہے جو کوروا ور پانڈوؤں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس کا ذکر گیتا میں بھی موجود ہے جو ہندومت کی ایک اور اہم کتاب ہے۔ ہندومت کی کتابوں میں فحاشی عریانی اور بے حیائی کے مناظر جا بجا سجے ہیں۔ ان کی دیو مالا سے چند منتخب اقتباس ملاحظہ کریں۔

''پانڈو کو شنتن کا بیٹا کہا جاتا ہے جو اپنے وقت کا بادشاہ تھا مگر شنتن کسی رشی کی بد عا کی وجہ سے اپنی عورتوں سے صحبت کرنے پر قادر ہی نہ رہا اس لیے اس نے اپنے ایک قریبی شخص بیاس بن پراشسر کو کہا کہ وہ اس کی بیویوں سے صحبت کر کے انھیں حاملہ بنائے اور اس کو بیٹے کا باپ بنائے۔ چنانچہ جب شنتن کی پہلی بیوی صحبت کے لیے بیاس کے پاس گئی تو اس کو کپکپی طاری ہو گئی اس لیے اسے جو بیٹا ہوا وہ کمزور اور زرد تھا۔ شنتن نے اپنی دوسری رانی کو بیاس کے پاس بھیجا تو رانی نے شرم کے باعث اوڑھنی سے اپنا منہ ڈھانپ لیا چنانچہ اس سے پیدا ہونے والا بچہ اندھا تھا۔ اب کے شنتن نے اپنی تیسری رانی کو صحبت کے لیے بیاس کے پاس بھیجا تو اسے تاکید کی کہ وہ بخوشی بیاس کے ساتھ ہم بستر ہو اور کسی قسم کی شرم وحیا کو اپنے پاس بھی نہ آنے دے۔ چنانچہ وہ ہنستے مسکراتے بیاس کے پاس گئی اور اس سے صحبت کی تو اس کے جو حمل ٹھہرا اس سے پانڈو پیدا ہوا جس نے اپنے کردار سے اپنی اصلیت کو ظاہر کر دیا۔ پانڈو پرلے درجے کا عیاش بدکردار اور مکار شخص تھا۔ پانڈوں کے چار بیٹے تھے مگر انھوں نے ایک ہی بیوی رکھی ہوئی تھی جو ایک ایک مہینہ ہر بھائی کے ساتھ گذارتی۔ ان کی دیو مالا میں مزید رقم کیا جاتا ہے کہ پراشسر جو بڑا زاہد اور پارسا تھا ایک دفعہ کسی کشتی میں سوار ہوا تو اس کا دل ملاح کی بیٹی پر آ گیا اور اس نے اس کو بہلا پھسلا لیا مگر کنارے پر اس برے فعل کے لیے کوئی اوٹ نہ تھی۔ چنانچہ اسی وقت وہاں ایک بیل اُگی جس نے ان دونوں کو ڈھانپ لیا اور انھوں نے اسی حالت میں اس فعل بد کا ارتکاب کیا۔ لڑکی کو حمل ٹھہر گیا اور بیاس پیدا ہوا جس کا ذکر ابھی اوپر گذرا ہے۔ بیاس کا شمار ان کے علماء اور فضلاء میں

ہوتا ہے آپ خود اندازہ کرلیں کہ جس قوم کے علماء اور فضلاء کی اخلاقی حالت ایسی ہو اس معاشرے میں عام آدمی کس اخلاق وکردار کا حامل ہوگا''۔

❑❑❑❑❑❑❑

ہندومت کی ایک اور مذہبی کتاب ''بشن دھرم'' کا ایک صفحہ دیکھئے۔

''جب چاند کا عکس پانی میں پڑتا ہے تو زمین کی چیزوں کے عجیب وغریب عکس بنتے ہیں جو کبھی خرگوش دکھائی دیتے ہیں تو کبھی پتلی کمر لچکاتی کوئی نازنین، ہندومت میں خیال کیا جاتا ہے کہ چاند نے پرجابت کی کئی بیٹیوں کو اپنے نکاح میں لے رکھا تھا تاہم ششِ لکش (چاند) ان میں سے صرف روہنی پر توجہ دیتا تھا اس لیے کہ اسے اس سے محبت ہوگئی تھی۔ اس کی باقی بیویاں اس ناانصافی پر کڑھتی رہتی تھیں اور بارہا اپنے باپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرا چکی تھیں مگر ان کا باپ پرجابت ان کو سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیتا۔ تاہم جب چاند کی زیادتیاں حد سے بڑھیں تو بیٹیاں ایک بار پھر فریاد لے کر باپ کے پاس پہنچیں اس وقت پرجابت کسی وجہ سے غصے میں تھا چنانچہ اس نے چاند کو بددعا دے دی اور اس پر لعنت کی جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر داغ نمودار ہوگئے۔ اب چاند کو ہوش آئی اور اس نے دیکھا کہ اس کا حسن تو داغدار ہو چکا ہے اس پر وہ پرجابت سے معافی مانگنے دھرتی پہ اترا۔ پہلے تو پرجابت نے اس سے کہا کہ وہ اپنی بددعا واپس نہیں لے گا تاہم چاند کی ندامت اور منت سماجت سے اس کا دل پسیج گیا اور اس نے چاند کو کہا کہ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ وہ آدھے ماہ تک اس کے داغ کو اندھیرے سے ڈھانپ رکھے گا۔ چنانچہ اب چاند اسی لیے ہر روز پورا نہیں نکلتا چاند نے پرجابت سے کہا کہ اس کے سابقہ گناہوں کی تلافی کس طرح ہوگی۔ تب پرجابت نے اس کے سامنے یہ صورت رکھی کہ تم ہر وقت ''مہادیو'' کے لنگ (عضو تناسل) کو اپنے سامنے رکھا کرو اور اس کی پوجا کیا کرو پس چاند نے ایسا ہی کیا۔''

❑❑❑❑❑❑❑

پرجابت کے اس قصے کی عملی شبیہ سومنات کے مندر میں ایک پتھر کی صورت موجود تھی۔اس لیے کہ سوم کے معنی چانداور نات کے معنی صاحب کے ہیں۔مہادیو کے لنگ کے اس مجسّے کو جو سومنات کے مندر میں نصب تھا روز غسل دیا جاتا۔دریائے گنگا کے خالص پانی سے غسل کے بعد کشمیر کے لالہ زاروں سے لائے گئے پھول لنگ پر نچاور کئے جاتے۔پھر تاریخ کی آنکھ نے اس منظر کو بھی محفوظ رکھا اور ہم تک پہنچایا کہ مہادیو کے لنگ کا یہی مجسمہ غزنی کی جامع مسجد کے باہر پڑا رہتا تھا اور لوگ اس کے ساتھ اپنے جوتوں کا کیچڑ صاف کیا کرتے کہ سلطان محمود غزنویؒ نے جب سومنات کا مندر فتح کیا تو وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

ہندوؤں کے ایک اور برہمن شنکر اچاریہ [11*] نے ویدانت مرتب کی۔شنکر اچاریہ نے خواص کے لیے فلسفیانہ بحثیں کیں اور عام لوگوں کے لیے ان کے معروف ومحبوب دیوتاؤں شیو،وشنو اور شکتی کی مناجات میں بجھن لکھے۔اس کے فلسفیانہ افکار اُپنشدوں گیتا اور ویدانت سوتر پر مبنی ہیں۔شنکر نے قدیم ادوار کی کتابوں سے منتشر اور متضاد افکار کو محو کیا اور انھیں مربوط ومنظّم شکل میں پیش کیا اس لیے کہ اُپنشدوں کا اندازِ بیان گنجلک تھا۔اگر ہم فلسفہ سے مراد عقلی استدلال لیں جو انسانی تجربات میں ربط وتعلق پیدا کرتا ہے تو اُپنشدوں کی تعلیمات کو فلسفہ قرار نہیں دیا جاسکتا اسی لیے شنکر اچاریہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اُپنشدوں کے نیم مذہبی اور نیم فلسفیانہ منتشر افکار کو ویدانت سوتر کی شکل میں مدون کیا۔

شنکر اچاریہ کا نظریہ بدھ مت کی طرح ہی ترکِ دنیا اور ترکِ خواہش کی دعوت دیتا ہے اور بہت سے معاملات میں وہ بدھ کی طرح ہی جبری اور قنوطی بھی ہے۔اس کے خیال میں آتما یعنی وِدّیا جہالت ہی کی وجہ سے سنسار چکر میں گرفتار ہوتی ہے اور دکھ بھوگتی ہے۔اس دکھ اور اذیت سے نجات اسی صورت ممکن ہے جب وہ اپنی اصلیت کو پہچان کر دوبارہ برہما میں جذب ہوجائے۔شاید اسی لیے ویدانتی فلسفے کو واحدیت کہا جاتا ہے کہ اس میں کائنات کی تشریح ایک ہی اصول پہ کی گئی ہے۔اس میں برہما ہی واحد اور ازلی حقیقت ہے۔وہ غیر مخلوق ہے اور کائنات کی اساس ہے وہی عناصر اربعہ میں موجود ہے اور اسی کی ذات میں سبب ومسبب اور معروض و موضوع جمع ہوگئے ہیں۔مادی دنیا تو محض ایک کھیل تماشا ہے۔

رامانج ''ویدانت'' کا دوسرا مشہور شارح ہے جس کے مطابق آتما اور برہما کی اصل ایک نہیں ہے اور خالق حقیقی تک رسائی علم سے نہیں بلکہ بھگتی (عشق) سے ہوتی ہے۔بعض اربابِ خیال کہتے ہیں کہ رامانج نے ویدانت سوتر کی جو ترجمانی کی ہے وہ شنکر اچاریہ کی تشریح کی نسبت زیادہ قرین صحت ہے۔رامانج شخصی خدا کا

قائل تھا اور شنکر اچاریہ کے نظریہ کے برعکس وہ موضوع اور معروض میں بھی فرق کرتا ہے یعنی خدا اور کائنات کو دو الگ الگ حقیقتوں کے طور پر تصور کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا نے کائنات پیدا کی اور ارواح کو الگ الگ پیدا کر کے ان کا کرم (مقدر) مرتب کیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی روح برہما (خدا) میں جذب نہیں ہو سکتی اس لیے کہ روح کو فنا ہی نہیں ہے مگر موت اسے سنسار چکر سے ضرور نجات بخش دیتی ہے۔

شنکر اچاریہ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے بعد میں اور بہت سے ہندو فلاسفہ نے ویدانت پر سائنس اور جدید فلسفے کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہندو دیومالا کے اثرات اتنے شدید تھے کہ عام لوگوں نے ان مباحث میں کچھ زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ وہ اپنے قدیم طریق پہ ہی کاربند رہے ہیں اسی لیے آج بھی پورے بھارت میں جہاں ہندوازم کی بنیادیں نہایت گہری ہیں بت پرستی بھی اسی ذوق شوق اور جاہلیت سے جاری و ساری ہے جیسے کہ ہزار سال پہلے تھی۔ وہ ہندو ڈاکٹر انجینئر یا سائنس دان جنہوں نے اپنے اپنے شعبے میں دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈالا ہوا ہے یا بھارت کا وہ دانشور طبقہ جس کی گہری اور زمانہ شناس سوچ اُن کے بین الاقوامی امور و تعلقات میں دیکھی جا سکتی ہے بھی اپنے صدیوں پرانے اور بوسیدہ مذہبی ڈھانچے پر مطمئن نظر آتے ہیں اور آج کے اس جدید دور میں بھی بت پرستی کے اسی مذہب کے پشتیبان بنے ہوئے ہیں۔ اللہ اِن کی راہنمائی ہدایت کی طرف کرے۔

بدھ مت اور جین مت

تین کروڑ بتوں کی پوجا کرنے والے اہل ہند کے سماج میں پھر وہ وقت بھی آیا جب بدھ کی تعلیمات نے برہن سماج کو دیوار کے ساتھ لگا دیا اور ان کی مذہبی اور سماجی برتری کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ مغرب کے دانشوروں کے مطابق تو معروف معنوں میں ہندوازم کو مذہب قرار ہی نہیں دیا جا سکتا بلکہ وہ تو الجھے ہوئے رسم ورواج کا ایسا مجموعہ ہے جس میں انسان کو انسانوں کا ہی غلام بنا دیا گیا ہے۔ انھوں نے انسانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے اس لیے کہ ان کے زعم باطل کے مطابق چونکہ برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوا ہے اس لیے وہ سب سے برتر انسان ہے اور تمام مذہبی مناصب اسی کے حصے میں آئے۔ دوسرے نمبر پر کھشتری ہیں جو برہما کے کندھوں اور ہاتھ سے پیدا ہوئے ہیں امورِ مملکت اور تجارت جیسے برتر مناصب ان کے حصے میں آئے۔ ہندوؤں کی آبادی کا کثیر حصہ شودروں پر مشتمل ہے جو برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے اور ان کو نیچ مخلوق قرار دے دیا گیا ان کو ویش بھی کہتے ہیں کھیتی باڑی اور دوسرے نیچ کام ان کے حصے میں آئے۔ ہندو ازم میں طبقاتی تفریق کی جتنی شدت پائی جاتی ہے کسی اور مذہب سے اس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔ برہمن اور کھشتریوں نے باہمی اجارہ داری کے تحت انسانوں کے ایک کثیر حصے کو رذیل مخلوق قرار دے کر ان پہ حکومت کرنا شروع کر دی۔ اور ان کے لیے سخت سزائیں مقرر کر دیں۔ شودروں کو شہروں میں بسنے کی اجازت نہ تھی بلکہ شہر کے کناروں پر ان کی غلیظ جھونپڑیاں آج بھی ہندوستان کی پہچان ہیں وہ نہ خود اپنی مذہبی کتاب کو پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی کسی ایسی محفل میں شریک ہو سکتے تھے جہاں وہ کتاب پڑھی جا رہی ہو، اگر کبھی یہ بات ثابت ہو جائے کہ کسی شودر کے کانوں میں ان کی مقدس کتاب کی آواز چلی گئی ہے تو سیسہ پگھلا کر اس کے کانوں میں ڈال دیا جاتا یا پھر اس کی زبان کاٹ دی جاتی۔ وید پڑھنے کی اجازت صرف برہمن کو تھی اور

اس کو سننے کی اجازت صرف کھشتریوں کو حاصل تھی۔ ہزاروں سال سے بھارت کا انسانی معاشرہ ظلم وستم اور ناانصافی کی اس چکی میں پس رہا ہے مگر انسانی حقوق کی محافظ تنظیموں کو کبھی اس کا خیال نہیں آیا۔ دوسری طرف کسی اسلامی ملک میں اگر کوئی کتا بھی کسی گاڑی کے نیچے آ کر کچلا جاتا ہے تو مغربی ذرائع ابلاغ اس کو بنیادی حقوق کی خلاف ورزی قرار دے کر واویلا شروع کر دیتے ہیں۔

یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا ہندوستان میں رائج ہندوازم دراصل برہمن ازم ہی ہے اس مذہب کی دلچسپ اور عجیب بات یہ ہے کہ برہمن کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی ہندو ایک خدا کی عبادت کرتا ہے یا متعدد خداؤں کی یا وہ کسی کو خدا مانتا بھی ہے یا نہیں۔ ان کے نزدیک بس یہی بات اہم ہے کہ وہ ہندوؤں کے رسم ورواج کے مطابق زندگی بسر کرتا ہو اور ان کے طریقے کی پیروی کرتا ہو۔ ہندوازم اپنے ہر اندر ہر قسم کے رسم ورواج اور عقائد کو ضم کر لیتا ہے خواہ وہ زمانہ قدیم کے جاہلانہ رسم ورواج ہوں یا عصر جدید کی مکروہ روایات۔ اس کے علاوہ ہندومت کے کوئی طے شدہ مقررہ اصول وضوابط اور عقائد بھی موجود نہیں ہیں جن پہ ایمان لانا ضروری ہو۔ ان کے ہاں اجتماعی عبادات کا کوئی تصور بھی موجود نہیں ہے البتہ ان کے ہاں برہمنوں کے بارے میں کچھ خاص معتقدات اور مخصوص طریقہ ہائے کار موجود ہیں جن کی پیروی سارے ہند میں کی جاتی ہے۔

برہمن عام ہندو سے صرف ایک ہی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ یہ مانے کہ برہمن ہی برتر انسان ہیں۔ صرف برہمن ہی انسان اور دیوتاؤں کے درمیان واحد واسطہ ہیں اور وہی ترجمان کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں اس لیے ہر معاملے میں برہمن کی پیروی کی جائے۔

ان کے ہاں دیوتاؤں کی خوشنودی کا تعلق قربانی پر تھا اور قربانی کی مقبولیت کا انحصار برہمنوں پر تھا اس لیے کہ صرف وہی لوگ صحیح طور پر قربانی کی رسم ادا کر سکتے تھے کیونکہ اگر کوئی عام آدمی خود سے قربانی کرنے کی کوشش کرے تو کسی غلطی کی صورت میں الٹا وہ کسی وبال کی زد میں آ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نظریہ کے اجاگر ہونے سے برہمن ازم کو بہت تقویت پہنچی اسی بنا پر برہمنوں کو تمام قوانین ملکی سے مستثنٰی قرار دے دیا گیا اور وہ غیر مشروط اطاعت اور بے پایاں تعظیم کے مستحق قرار دے دیئے گئے۔ بہت سا وقت اسی طرح گذر گیا برہمن کو قربانی سمیت جملہ مذہبی امور میں فوقیت حاصل تھی اس لیے ان کی مالی حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے لوگوں کو توہمات کے جال میں الجھا کر دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ رہے کھشتری تو وہ پہلے ہی امورِ سلطنت کے مالک تھے۔ چنانچہ یہ دونوں طبقات خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے مگر لوگوں کی اکثریت بدحالی اور غربت کی عمیق

گہرائیوں میں دفن تھی۔ان حالات نے معاشرے میں برہمنی استحصال کے خلاف ردعمل کی اس لہر کو جنم دیا جس کی ابتداء جین مت سے ہوئی اور انتہا بدھ مت پہ ہوئی۔ ہندوستان میں صدیوں تک لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ راسخ رہا کہ ان کے معاشرے میں پھیلی یہ طبقاتی تقسیم انسانوں کی پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ان دیوتاؤں کی طرف سے ہے جن کی وہ پوجا کرتے ہیں اس لیے کوئی اس استحصالی نظام کے خلاف آواز اٹھانے پر تیار نہ تھا اور ویسے بھی یہ ایک غیر فطری اور دشوار عمل تھا کہ کوئی اپنے مذہب اور صدیوں پرانی تہذیب کو چیلنج کر سکے۔

مگر آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب برہمن سماج نے انسانیت کو تذلیل اور رسوائی کی اس حد پہ جا کھڑا کیا جہاں یہ سوال مختلف ذہنوں میں انگڑائی لینے لگا کہ کیا واقعہ ہی یہ انسانیت سوز اور ظلم سے پر غیر فطری طرزِ معاشرت ان کے دیوتاؤں کی دین ہے یا اس کے پیچھے کسی اور کا مفاد پوشیدہ ہے۔ کچھ اس بات کا اثر بھی پڑا کہ ہندومت کے پوجا پاٹ کی رسمیں اس قدر سخت اور کرخت تھیں کہ بہت دیر تک ان سے نباہ انسانی طبع کے لیے دشوار ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ معاشرے کے کئی سلیم الطبع لوگوں نے حقیقت حال کی نشاندہی کی اور موجودہ طبقاتی تقسیم کو برہمن اور کھشتری کی ملی بھگت قرار دیا اور اس بات کا برملا اظہار کیا کہ موجودہ نظام مراعات یافتہ طبقوں کی آسائش کے لیے خود سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے خالقِ کائنات یا ان کے کسی بھگوان کا کوئی ہاتھ نہیں۔اب گاہے بگائے اس طرح کی کوئی آواز سنائی دے جاتی کہ برہمن سماج سے نجات ہی ہندوستان کے لوگوں کو دکھ کی اس دلدل سے باہر نکال سکتا ہے ان میں ایک گروہ نے جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے برہمنوں کی غیر مشروط اطاعت سے انکار کر دیا اور ویدوں کی تعلیمات سے بھی گریز کی راہ اختیار کی اور اپنی زندگی کی راہوں کو از سرِ نو متعین کرنے کی سعی کی۔ایسے میں ان کو کسی راہبر کی ضرورت تھی جو اس طبقہ کے خیالات کی ترویج کرتا اور ان کو مجتمع کر کے معاشرے میں بڑی تبدیلی کی بنا رکھتا۔ان کی اس ضرورت کو" مہاویر" نے پورا کیا اور جین مت کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا رکھی وہ غالباً چھٹی صدی عیسوی کے ایام تھے جب برہمنی استحصال اور ان کے بے پناہ تسلط کے خلاف ردعمل کا آغاز ہوا۔اب کھشتری بھی کسی حد تک برہمن کے احساسِ برتری سے نالاں نظر آتے تھے اور برملا اس بات کا اظہار کرتے کہ برہمن مذہب کے نام پر ذاتی اغراض کی پرورش کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف کئی ایک چھوٹی چھوٹی تحریکیں برپا ہو ہیں مگر برہمن ازم کے بے پناہ تسلط کے خلاف ٹھہر نہ سکیں۔ان میں چارواک، سنگایا، پورن کیشپ ، گوساں اور

کمبالین پیش پیش تھے۔وہ ویدوں اور خدا کے منکر تھے برہمن ان کو ناستک یا ملاحدہ کے نام سے یاد کرتے۔

وردھمن جسے عرف عام میں مہاویر کہا جاتا ہے گوتم بدھ سے پہلے ہو گزرا ہے۔وہ ۵۹۹ ق م میں مگدھ کے ایک راجہ کے گھر میں پیدا ہوا۔اس نے ویدوں کو غیر الہامی قرار دے دیا اور خدا کی ہستی کا انکار کیا۔اس نے یگیہ کی رسم کا بھی انکار کیا اور قوم کو قربانی سے منع کیا۔اس کی تعلیمات کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس تحریک کو نہ تو سراسر مادی تحریک قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ وہ حقیقی معنوں میں مذہبی تحریک تھی۔اگر چہ برہمن انھیں مادہ پرست قرار دیتے رہے ہیں مہاویر کے مطابق حقیقت کا ادراک صرف حواس خمسہ ہی سے کیا جاسکتا ہے۔جو کچھ بھی حواس خمسہ کی حد سے پرے ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں جیو اور آتما کا خیال واہمہ اور مافوق الفطری مخلوقات کا تصور فرضی ہے۔تمام مظاہر فطری ہیں اور صرف مادہ حقیقت ہے جسم ذرات سے مرکب ہے اور ذہن وہ مادہ ہے جو سوچتا ہے جسم سے الگ روح کا کوئی وجود نہیں انسان فانی ہے اور موت کے بعد مٹی میں مل جائے گا۔

بقاء اور روح کا عقیدہ وہم باطل اور مذہبی پروہتوں کا رچایا ہوا ڈھونگ ہے۔کائنات کو سمجھنے کے لیے خدا کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اس کے تصور کے بغیر بھی ازل سے موجود ہے۔انسان مذہب کو اس لیے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اس سے مانوس ہے۔اس لیے جب علم کی ترقی اہل مذہب کے عقائد کی نفی کرتی ہے تو اس سے ایک خلا جنم لیتا ہے جس کو پر کرنے کے لیے اہل مذہب پھر سے کوئی نیا مفروضہ تیار کر لیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں اخلاق خدا کے احکام کا محتاج نہیں۔معاشرے رسوم کا نام ہیں اور فطرت خیر و شر سے بے پرواہ ہے۔سورج رشیوں اور پاپیوں پر ایک ہی طرح چمکتا ہے اور زندگی کا واحد مقصد مسرت کا حصول ہے۔ان کے خیال میں کائنات خود سے موجود ہے اور کوئی اس کا خالق نہیں۔اس کی بنیاد عناصر اربعہ پہ ہے جو محسوسات کے دائرے کے اندر ہیں۔یعنی آگ ہوا پانی اور مٹی۔دوزخ اسی دنیا کی تکلیف اور جنت اسی دنیا کی راحت کا نام ہے۔تناسخ یا آواگون کا چکر خود برہمن کا مرتب کیا ہوا ہے تاکہ وہ عوام الناس کو اس میں الجھا کر خود عیش کر سکے۔جین مت کے پرچارک مہاویر کا نظریہ ابتداء میں ہندومت سے کافی فاصلے پر تھا مگر اس میں ارتقاء کی رفتار بھی بہت تیز رہی اور جلد ہی وہ ہندومت میں ضم ہو کے رہ گیا۔اس نے کہا کہ انسان حیوان شجر و حجر سب ذی روح ہیں اور اس روح کو مادی جسم کی قید سے آزاد کرانا ہی دراصل نجات ہے۔جین مت کے مذہبی پیشوا ترکِ ذات اور فنائے ذات کا درس دیتے ہیں۔وہ آبادیوں سے دور نکل جاتے اور کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں

حتیٰ کہ ان میں سے بعض بھوک اور پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے۔ان کے نزدیک اس کو مقدس موت تصور کیا جاتا۔ان کے مذہب کا دوسرا بڑا اور اہم اصول اہنسا (عدم تشدد) کہلاتا ہے۔یعنی وہ کسی انسان کی جان لینا تو کجا کیڑے مکوڑوں اور جڑی بوٹیوں کو تلف کرنا بھی بڑا گناہ تصور کرتے۔اسی لیے ان کے ہاں کھیتی باڑی ممنوع ہے کہ ہل چلانے سے زمین میں موجود کئی کیڑے مکوڑے مر جاتے ہیں۔جین مت کا مذہب جو دراصل کوئی مذہب نہیں تھا بلکہ برہمن سماج کے خلاف ردِعمل کی ایک تحریک تھی جلد ہی اپنی انفرادیت کھو بیٹھی اور اگر اسے بدھ مت کا سہارا نہ ملتا تو شاید اس کا ذکر بھی تاریخ عالم سے محو ہو جاتا۔

اس لیے کہ جین مت کے پیروکار پھر سے آواگون پر ایمان لے آئے اور کئی بتوں کی پوجا بھی کرنے لگے۔زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وہ ہندومت کی ہی ایک شاخ گنا جانے لگا اگرچہ ان کے نظریات ہندومت سے کافی مختلف تھے مگر خود انھوں نے بعد میں اپنے مصلح مہاویر کو اوتار کے درجے پر فائز کر دیا اور اس کی پوجا کرنے لگے۔اگرچہ نارنجی چولا پہنے آج بھی ہندوستان اور نیپال کے ویرانوں میں جین مت کا کوئی پیرو کہیں دکھائی دے جاتا ہے مگر حقیقت میں ان کے عقائد اب قصہ ءِ پارینہ بن چکے ہیں۔مگر ہم اس بات کا بھی انکار نہیں کر سکتے کہ انھوں نے ایک عرصے تک ہندوستان میں برہمن کے ہاتھوں یرغمال معاشرے کو ان کے تسلط سے آزادی دلائی رکھی۔اگرچہ بعد میں برہموں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار اور اثر و رسوخ بحال کرا لیا۔جین مت کے بعد بدھ ازم نے برہمن سماج کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور ایک بڑے انقلاب کی بنا رکھی۔بدھ ازم ہندومت سے اپنا دامن بچانے میں کامیاب رہا اور ہندومت میں ضم نہ ہو سکا۔اس کی یہ انفرادی حیثیت آج تک قائم ہے اور دنیا کے بہت سے ممالک میں اس کے پیرو بسے ہوئے ہیں۔

جین مت کے بعد اب ہم ہندومت پر بدھ ازم کے تاریخی اثرات کا اجمالی مطالعہ کرتے ہیں۔بلاشبہ ہندو تہذیب پہ بدھ مت نے جین مت کی نسبت زیادہ گہرے اثرات چھوڑے اور وہ ایک اثر آفریں تحریک کے طور پر ہندوستان کے افق پر ظاہر ہوا۔اس کے بانی کا نام گوتم یا گوتما رتھا۔ایک مغربی محقق "Trawling" اپنی کتاب "History of Religions" میں لکھتا ہے کہ بدھ کی تحریک ایک زندہ تحریک کے طور پہ ہمیشہ یاد رہے گی۔اگرچہ اس تحریک کو بعد میں ایک مذہب کی حیثیت حاصل ہو گئی مگر ہندوستان میں برہمن ازم کو جس طرح بدھ کی تعلیمات نے دیوار سے لگایا اس کی کوئی اور مثال ہندومت کی تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی۔اس وقت سارے بھارت میں قبائلی حکومتیں قائم تھیں گوتم کا باپ بھارت کے سرحدی علاقے میں

سا کیا نامی قبیلے کا سربراہ اور حکمران تھا۔اس نے گنگا کے شمالی کوہستانی علاقوں میں ایک مضبوط وفاق قائم کر رکھا تھا۔آج کل یہ علاقہ نیپال کا حصہ ہے۔جس وقت ایران میں زرتشت اپنے نظریات کی ترویج میں مصروف عمل تھا تب سا کیا قبیلہ کے راجہ کے گھر گوتم کا جنم ہوا۔گوتم کا سن پیدائش ۵۶۳ ق م بتایا جاتا ہے[12*] گوتم جو بعد میں روشن ضمیر اور بدھا کے نام سے تاریخ کے صفحات پر جلوہ گر ہوا۔گوتم نے اپنا بچپن ایک شہزادے کی طرح گذارا مگر وہ دوسرے انسانوں کو درپیش دکھوں کی وجہ سے پریشان رہتا۔وہ سنجیدگی سے انسانی مصائب کی وجوہات پر غور کرتا رہتا اور اس کی المناکی پہ کڑھتا رہتا۔ایک دن اس نے ایک جوگی کو دیکھا جو بہت خوش وخرم تھا۔گوتم نے اس سے اس کی خوشی کا راز جاننا چاہا تو اس نے بتایا کہ وہ اس لیے خوش ہے کہ اس نے اپنے دل سے ہر خواہش کو کچل دیا ہے۔اب چونکہ اس کے دل میں کوئی خواہش ہی موجود نہیں اس لیے آزردگی کا بھی کوئی جواز نہیں۔وہ جوگی کے اس نظریہ سے بہت متاثر ہوا کئی دن یونہی گم سم پھرتا رہا۔پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود کسی ایسے کامل کی تلاش میں نکلے گا جو اسے دنیا کے تفکرات اور آلام و مصائب سے نجات دلا کر سکون واطمینان کی دولت سے مالا مال کردے۔

چنانچہ ایک رات جب اس کے ضمیر پہ دنیا کے دکھوں اور مصائب والم کا بہت بوجھ تھا اس نے اپنی خوبصورت اور جواں سال بیوی اور اپنے کمسن بچے پر آخری نگاہ ڈالی اور محل کو خیر باد کہہ دیا۔وہ سالوں اپنے مقصود کی تلاش میں محوسفر رہا۔اس نے دشت دشت کی خاک چھانی اور دنیا کے دکھوں سے نجات کا راز تلاش کرتا پھرا۔اس نے برہمن فلسفیوں کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کی۔وہ جوگیوں سے ملا اور خود اپنی ذات کو بھی شدید ریاضتوں میں مشغول کردیا۔اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور بن باس اختیار کرلیا۔اس نے جان لیا کہ برہمن پنڈتوں یا جوگیوں سے اسے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ ان کے پاس گوتم کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔اب اس نے مراقبہ شروع کردیا۔وہ پہروں اسی حالت میں گذار دیتا۔وہ غور وفکر اور مراقبے کی ریاضت میں مشغول رہتا۔پھر اس کی زندگی میں وہ ناقابل فراموش لمحہ آ ہی گیا جس کی خاطر اس نے برسوں قبل بن باس لیا تھا۔

ایک طویل انتظار کے بعد جب ایک دن وہ شکستہ دل اور تھکا ماندہ بوڑھ کے ایک بڑے درخت کے نیچے مراقبے کی حالت میں موجود تھا اور غور وفکر کی عمیق گہرائیوں میں غرق تھا تو اس کے دل میں روشنی کی اِک لہر دوڑ گئی اور اسے دنیا کے دکھ والم کا حل نظر آ گیا۔بھارت کے صوبہ بہار میں دریائے گنگا کے کنارے جہاں بدھ کو یہ گیان حاصل ہوا اسے آج بھی "گیا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس کے بعد چالیس سال تک گوتم اپنے

خیالات کی ترویج واشاعت میں مصروفِ عمل رہا۔وہ اپنے شاگردوں اور چیلوں کو ہر اس حقیقت سے آگاہ کرتا رہا جو اس پر منکشف ہوتی رہی۔ گوتم بدھ نے اپنی باقی زندگی بھیک مانگ کر گزاری اور ہر لمحہ اپنے مشن کی تکمیل میں مشغول رہا۔اس نے اسی سال کی عمر پائی بدھ ازم کی نظریاتی اساس کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے

۱۔ دکھ (یعنی انسان کی ساری زندگی دکھوں سے عبارت ہے)

۲۔ دکھ سمووایا (اور ہر دکھ کے پیچھے خواہش ہے)

۳۔ دکھ نرودھ (جس نے خواہش پر قابو پالیا وہ دکھ سے بچ گیا)

۴۔ دکھ نرودھ مارگ (خواہش پہ قابو پانے کا راستہ جو بدھ نے دریافت کیا)

گوتم بدھ نے اخلاق اور طرزِ عمل کے آٹھ اصول بھی وضع کئے جن کی بنیاد علم، عمل اور تفکر پر رکھی تھی گوتم بدھ کو یاسیت کا امام اعظم بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ ان کے ہاں مایوسی کا ایک گہرا احساس ہر دم محسوس کیا جا سکتا ہے۔وہ عورت سے بری طرح بیزار اور بچوں کی پیدائش سے آزردہ نظر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان جنس کی غلامی میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے وہ بچے پیدا کرتا رہتا ہے جو دنیا کے لیے مزید دکھ کا باعث ہیں۔وہ مابعد الطبعیات کا بھی مخالف ہے اور الہٰیات کا بھی منکر ہے۔وہ انسانوں کو خواہش ترک کرنے اور سنسار چکر سے چھٹکارا پا کر نروان (نجات) حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اسے موت اور فنا کے تلخ احساس نے قنوطی بنا کر رکھ دیا تھا۔وہ کہتا ہے کہ آسمان پر زمین پہ سمندروں کی تہہ میں پہاڑوں کی کھو میں کہیں بھی موت سے مفر نہیں۔گوتم شعور اُنا اور روح کا بھی انکاری ہے اور کہتا ہے کہ موت کے ساتھ سب فنا ہو جائے گا۔اس کے باوجود اس کے خیال میں ایک جنم کا پاپ دوسرے جنم میں انسان کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔یہاں اس کی تعلیمات کا تضاد کھل کے سامنے آ جاتا ہے کیونکہ اگر موت کے ساتھ ہی روح شعور اور اُنا کو فنا ہے تو پھر دوسرے جنم میں پہلے جنم کے گناہ کی پاداش کا احساس کیسے ممکن ہے۔بدھ ذات پات کے مخالف ہیں اور برہمن کو ان کے ادب میں جا بجا غرض کا کتا کہا گیا ہے۔بدھ کہتا ہے انسان فطرتاً خود غرض ہے اور نروان کا پہلا قدم یہ ہے کہ وہ اس شدید جذبے پر قابو پائے۔بدھ نے الہٰیات سے اعتنا نہیں کیا اور کسی خالق کے وجود سے سکوت اختیار کیا ہے۔اس کی دلچسپیاں اکثر و بیشتر اخلاق تک محدود ہیں

اور بنیادی اخلاقی اقدار میں بھی اس کا نظریہ جین مت کی طرح منفی اور سلبی ہے اس کے نزدیک ہر وہ کام نیکی ہے جس سے خواہش کو کچلا جا سکے اور ہر وہ عمل بدی ہے جس سے اشتہا اور تمنا جنم لے۔ بدھ مت میں مراقبے کے سوا عمومی اور اجتماعی کسی عبادت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ بدھ ہمیشہ انفرادی نجات کی دعوت دیتے ہیں اجتماعی فلاح و بہبود کا انھیں کبھی خیال نہیں آیا۔ بدھ نروان سے مکمل فنا مراد لیتے ہیں۔

مشہور بدھ سوامی ناگ سین نے کہا کہ نروان کا لغوی معنی ہے بجھا دینا لہٰذا اس سے مراد ہے نیستی۔ بدھ مت نے برہمن ازم کو پورے بھارت سے وقتی طور پہ تباہ کر کے رکھ دیا لوگ برہمنوں کی مذہبی اجارہ داری سے اکتائے ہوئے تھے اور طبقاتی تقسیم نے ملک بھر میں ظلم و ستم کا جو بازار گرم کر رکھا تھا وہ اس سے دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان حالات میں بدھ مت ان کے لیے اپنی وسیع باہیں پھیلائے کھڑا تھا اور لوگ ظلم کے نشان ہندو مت سے نجات کے لیے جوق در جوق اس کی پناہ میں آ رہے تھے۔ بدھ مت نے ویدوں کا انکار کر دیا۔ قربانی کی ممانعت کر دی۔ ذات پات کو ختم کر دیا۔ تمام دیوتاؤں کا انکار کر دیا اور نجات کا ایک آسان راستہ لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جسے آبادی کی اکثریت نے قبول کر لیا۔ کل جہاں برہمن ازم کا اذیت ناک سماج تھا آج اسی ہندوستان میں اہنسا یعنی عدم تشدد اور طبقاتی تقسیم کی بجائے مساوات کا دور دورہ تھا۔ پھر بدھ ازم کو اشوک، کنشک اور ہرش جیسے عالی ہمت راجاؤں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی جس سے بدھ ازم کے فروغ کی رفتار بے پناہ تیز ہو گئی۔

اس لیے جلد ہی بدھ ازم سری لنکا سے لے کر برما اور ساٹرا تک پھیل گیا۔ پھر راجہ ہرش کے زمانے تک ہندوستان کے طول و عرض میں صرف بدھ ازم ہی اکثریت کا مذہب تھا۔ ۶۴۶ء تک بدھ ازم کابل، بدخشاں، پنجاب، سندھ، گجرات، مالوا، متھرا، تھانیسر قنوج، بنارس، پٹنہ، بنگال، کامروپ، مدارس اور مہاراشٹر میں پھیل چکا تھا اور ہر جگہ اسی کا چرچا تھا تاہم محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے (711ء) کے وقت برہمن اپنا وقار کافی حد تک بحال کرا چکے تھے اور بدھ مت کے پیرو فرقہ پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بدھ مت دراصل تو ایک اصلاحی تحریک تھی اور اسے ایک مذہب میں تبدیل ہوتے ہوتے دو صدیاں لگ گئیں۔ بدھ مت کے پیرو آج بھی دنیا میں موجود ہیں مگر اس دھرتی پہ جہاں بدھ ازم کا جنم ہوا وہاں آج زرد چولے والے بدھ کم ہی نظر آتے ہیں بلکہ ہندوستان کی دھرتی آج پھر بت پرستی اور برہمن ازم کی طبقاتی تفریق کی اسی آگ میں جل رہی ہے جس کے خلاف مہاویر اور گوتم بودھ نے یادگار جدوجہد کی تھی۔ بدھ مت کے اثرات

سے نجات پانے کے لیے ہندو پروہت نے ایک چال یہ بھی چلی کہ بدھ کو اپنے اوتاروں کی فہرست میں شامل کر لیا اور زور شور سے اس کی تبلیغ کی تاہم ایک فرقہ بدھ کی اساسی تعلیمات پہ ہی قائم رہا۔

قانون اور معاشرت

ہندوستان میں قانون کا ماخذ ان کے علماء کی وہ رائے تھی جو وقت کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ ہندومت نے اپنے پیروؤں کو کبھی کسی لگے بندھے قانون کا پابند نہیں بنایا سوائے اس کے کہ ایک عام ہندو دوسرے ہندوؤں ہی کی طرح زندگی کے مروجہ رسم ورواج کو اختیار کرے اوران بنیادی اقدار کا پابند رہے جو معاشرے کا عمومی طریق ہوں۔ وہ اپنے قانون میں گاہے بگاہے تبدیلیاں کرتے رہتے جن کے لیے ان کے ہاں علماء اور حکما کی کونسل موجود ہوتی جو ضرورت پڑنے پر پرانے قانون کو منسوخ کر کے اس کی جگہ بہتر قانون بنا دیتی۔ مذہب کے معاملے میں بھی ان کا چلن کچھ ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ گائے کا گوشت کھانا پہلے ہندومت میں ممنوع نہ تھا بلکہ سب اسے رغبت سے کھاتے۔ مگر بعد میں وہ شدت سے اس بات کے قائل ہو گئے کہ گائے ان کی ماں ہے اس لیے اس گوشت کا کھانا حرام ہے۔ علامہ البیرونی نے اپنی کتابِ تاریخ "**تحقیق ماللہند**" میں ان کی معاشرتی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے پہلے ان کا تمدنی نظام کتنی پست روایات پر استوار تھا۔

وہ لکھتے ہیں؛

"ہندو عام طور پر موسم گرما میں مادرزاد ننگے رہا کرتے تھے اور اپنے سر کو سورج کی تیز روشنی سے بچانے کے لیے اپنے ان بڑھے ہوئے بالوں کو استعمال کیا کرتے جن کو تراشنے کا ان کے ہاں کوئی دستور ہی نہ تھا۔ ان کی جٹاؤں میں جوؤں کے غول محوِ خرام رہتے اور وہ ان کو اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے نکالتے رہتے اور پھر ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھا لیتے۔ ان

کے ہاں غسل کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہ تھا جو لوگ دریاؤں یا ندی نالوں کے قریب تھے صرف وہی اس عیاشی کے متحمل ہو سکتے تھے۔عمومی طور پر ان کے ہاں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھانے کا کوئی رواج نہ تھا جس کا جب جی چاہا اس نے کھالیا اور جو کھانا بچ گیا اس کو دوبارہ استعمال کرنے کا رواج بھی نہ تھا۔شراب پینے کا رواج عام تھا جو گندے انگور اور مالٹے کوزمین میں دبا کر تیار کی جاتی اور بعض اوقات زہریلی ہو جاتی اور اِس کو پینے والے لقمہ اجل بن جاتے ۔پان کھانے کا بھی ان کے ہاں عام رواج تھا اور اس کے ساتھ وہ گائے کا پیشاب نہایت رغبت سے پیا کرتے ۔امرا کے ہاں البتہ غسل کا اہتمام موجود تھا لیکن وہ بھی الٹ اس لیے کہ وہ پہلے غسل کرتے اس کے بعد اپنی عورتوں سے صحبت کرتے۔جادو کا رواج بھی ہندو معاشرے کا ایک ایسا لازمہ ہے جس کے بغیر اس کی حقیقی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ہندو معاشرے میں کئی قسم کی شادیاں مروّج تھیں۔ایک قسم کی شادی میں آگ کے گرد چکر لگانے سے عورت اور مرد رشتہ ازدواج میں بندھ جاتے۔آج کل عموماً ہندوستان میں اسی قسم کی شادی کا رواج عام ہے۔قدیم ہندو معاشرے میں ایک شادی اس طرح کی بھی ہوتی تھی کہ لڑکی کا باپ یہ شرط طے کر لیتا کہ اس کی بیٹی جس بیٹے کو جنم دے گی وہ اس کے شوہر کا بیٹا نہیں کہلائے گا بلکہ وہ اس کا بیٹا کہلائے گا چنانچہ وہ اپنی بیٹی کا پہلا بیٹا لے اڑتا۔اس کے علاوہ ایک طریق یہ تھا کہ عورت کسی کے ساتھ مباشرت کرآتی اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد اس کے شوہر ہی کی اولاد تصور کی جاتی کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق زمین تو اصل میں شوہر کی تھی بیج چاہے جس نے بھی ڈالا ہو فصل کا مالک تو زمین کا مالک ہی ہوگا۔ان کے امراء کے ہاں یہ رواج بھی پایا جاتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اعلیٰ نسل کی اولاد کے لیے کسی عالی نسب کے ہاں حمل کے لیے لے جاتے اور اس طرح پیدا ہونے والی نسل پر فخر کیا جاتا۔شادی کا ایک اور طریقہ بھی ان کے ہاں مروّج تھا جو سراسر بہمیت پر مبنی ہے کہ کئی بھائی ایک ہی عورت کو اپنی بیوی بنائے رکھتے اور وہ ہر ماہ بعد دوسرے بھائی کی آغوش میں چلی جاتی۔اس سے معلوم ہوا کہ ہندومت کتنی پست اخلاقی اقدار کا عکاس ہے۔ان کے مذہب میں زنا کی کوئی خاص ممانعت نہیں پائی جاتی بلکہ پروہتوں کی

دیوداسیاں زنا کو عبادت کا ایک حصہ تصور کرتیں۔طبقاتی تفریق کی انتہاؤں میں الجھے ہندو معاشرے میں حقیقی عدل کا کوئی تصور موجود نہ تھا اس لیے کہ ایک ہی جرم کی سزا برہمن کے لیے نہایت ہی معمولی اور کسی اچھوت کے لیے نہایت عبرت ناک ہوتی۔کسی برہمن کے لیے اس بات کی کوئی پابندی نہ تھی کہ وہ کسی نیچ ذات کی خوبصورت عورت کے ساتھ ہم بستری کرے۔تاہم اگر کوئی شودر کسی برہمن عورت سے ملوث ہو جاتا تو اس کی کم سے کم سزا عبرت ناک موت تھی۔اسی طرح اگر کوئی برہمن کسی شودر کو قتل کر دیتا تو اس کی سزا صرف اتنی تھی کہ وہ چند گھنٹے بھوکا رہے۔برہمن سے قصاص نہ لیا جاتا بلکہ صرف ہلکے سے کفارے پر اس کو معاف کر دیا جاتا۔برہمن اگر کسی دوسرے برہمن کو قتل کر دے تو ان کا قانون اس کے معاملے میں صرف سکوت اختیار کرتا ہے اور معاملہ کو خدا کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔مگر اسی معاشرے میں شودر کے لیے شراب پینے گائے ذبح کرنے یا کسی برہمن عورت پر بری نظر ڈالنے کی سزا بھی موت تھی۔ان کے مندران کے اخلاق کا حقیقی عکس پیش کرتے ہیں جہاں عورت اور مرد کو مباشرت کرتے ہوئے مختلف آسنوں میں پینٹ کیا جاتا ہے یا ان کی اسی حالت کو مجسمہ سازی میں کمالِ فن سے اجاگر کیا جاتا ہے اور اس پہ فخر کیا جاتا ہے۔ان کی دیو مالا میں ان کے دیوتا خود جنسی آلودگی میں اس بری طرح آلودہ نظر آتے ہیں کہ نظر حیا سے جھک جاتی ہے۔تو جس مذہب اور معاشرے کے دیوتاؤں کا یہ حال ہو ان کے پجاریوں کی اخلاقی زندگی کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔اسی لیے ہندوستان کے بعض علاقوں میں رواج تھا کہ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو اس کو پہلی رات مندر میں پنڈت کے ساتھ گذارنی ہوتی تاکہ اس کی اولاد مذہب پرست ہو اور کبھی ہندومت سے باغی نہ ہو‘‘۔

□□□□□□□

ایک مغربی مفکر ’’Strabou‘‘ ہندو طرز معاشرت کے بارے رقم طراز ہے کہ؛

’’ٹیکسلا کی قدیم تہذیب میں بہت سے لڑکے اور لڑکیاں رات کے اندھیرے میں کسی ایک

جگہ اکھٹے ہوتے جہاں لڑکے لڑکیوں کا بدن کھول کر دیکھتے اور پسند آجانے پر لڑکا لڑکی کے گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار ڈال دیتا اور وہ ہنسی خوشی اپنی نئی زندگی کی شروعات کر دیتے اجتماعی شادیوں کا ذکر ابھی پیچھے گذرا ہے جو دراصل ان کی دیومالا سے ماخوذ ہے جیسا کہ پانڈووں کے احوال میں لکھا ہے کہ پانچوں پانڈو بھائیوں نے درپدی سے بیاہ کیا تھا اور وہ باری باری ایک ایک ماہ سب بھائیوں کے ساتھ بسر کرتی تھی اس قسم کی شادیوں کا رواج تبت، پنجیر، سوات اور لداخ وغیرہ میں بھی عام تھا"۔

❑❑❑❑❑❑❑

(Lebon) نے تمدن ہند میں لکھا ہے کہ نائروں میں ایک عورت کے متعدد خاوند ہوا کرتے اور ان سے پیدا ہونے والی اولاد اپنی ماں کے نام سے جانی جاتی اس لیے کہ درست طور پہ والد کا تعین کرنا دشوار ہوتا۔ ہندو معاشرے میں بیوہ عورت کو دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ اگرچہ مرد چار شادیاں کر سکتا ہے۔ ویدوں کے زمانے میں بیوہ عورت از خود سے چھوٹے بھائی کی ملکیت میں آجاتی تھی بعد میں بیوہ عورت کو شادی سے منع کر دیا گیا۔ اب اس کے لیے معاشرے میں عزت سے زندہ رہنے کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے وہ نہ سنگار کر سکتی تھی نہ کسی شادی کی تقریب میں شریک ہو سکتی تھی اور نہ ہی وہ سفید رنگ کے سوا کسی اور رنگ کا لباس پہن سکتی تھی۔ یہ سب اہتمام دراصل اس لیے کیے جاتے کہ وہ شوہر کی موت کے بعد زندہ رہنے کو ترجیح نہ دے اور اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ہی جل کے خاک ہو جائے۔ اس مذموم رسم کو ستی کا نام دیا جاتا۔ ایک مغربی مورخ (Neuoer) اس مذموم رسم پہ تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ بھی برہمن ازم کی وحشیانہ شکل تھی اور اس کے پیچھے بھی برہمن ہی کا مفاد پوشیدہ تھا۔ کیونکہ اگر کوئی بیوہ اپنے خاوند کی چتا پہ جل مرے تو اس کے تمام زیور برہمن کی جھولی میں ڈال دیئے جاتے اور وہ برہمن جو گائے کی پونچھ کا بال بھی بیکا نہ ہونے دیتے وہی برہمن اپنے ذرا سے مفاد کی خاطر ایک جیتے جاگتے انسان کو جلتے شعلوں کی نظر کر دیتے۔ بعض اوقات نوجوان بیواؤں کو ان کی مرضی کے خلاف گھسیٹ کر شوہر کی چتا پہ ڈال دیا جاتا اور کبھی کبھی کسی لڑکی کو چتا جلانے سے قبل ہی ان لکڑیوں سے باندھ دیا جاتا تا کہ وہ بھاگ نہ سکے۔ جو عورت اپنے شوہر کی چتا میں جلنے سے انکار کرتی معاشرے میں اس کا زندہ رہنا دشوار کر دیا جاتا اور اسے نیچ ذات کے لوگوں

کے حوالے کر دیا جاتا جہاں اس کے لیے عصمت فروشی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہتا۔ وہ ہر ایک کے لیے جائز ہوتی اور کسی کو انکار کرنا اس کے بس کی بات نہ رہتی۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر نے اس رسم کو ختم کرنے کی بہت کوشش کی تاہم اس مکروہ رسم کا خاتمہ انگریز دور میں جا کر ہوا۔ اگرچہ آج کا ہندو معاشرہ اس رسم سے جان چھڑا چکا ہے تاہم اب بھی کبھی کبھی کسی دور دراز کے پہاڑی علاقے سے کسی عورت کے ستی ہونے کی خبر آ ہی جاتی ہے۔ ہندومت میں بتوں کے ساتھ ساتھ تقریباً تمام مظاہر فطرت کی بھی پوجا کی جاتی ہے اس لیے دریائے گنگا اور جمنا بھی ان کے ہاں مقدس خیال کیے جاتے آج بھی مردوں کو جلانے کے بعد ان کی راکھ دریائے گنگا میں بہائی جاتی ہے۔

اگرچہ ویدوں کے زمانے میں مردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا بعض لوگ نروان کی خواہش میں ان دریاؤں میں ڈوب مرتے۔ ہندو معاشرے میں جب کوئی موت ہو جائے تو برہمن اور پنڈت کی بن آتی۔ ان کو مرغن غذائیں پیش کی جاتیں تا کہ وہ اطمینان سے شرادھ کی رسم ادا کر سکیں۔ اس لیے کہ برہمنوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ اگر جلد از جلد شرادھ کی رسم ادا نہ کی جائے تو مردے کی روح ان کے رشتے داروں کو پریشان کرنے لگتی ہے۔ عورت کا مقام ہندو معاشرے میں ہمیشہ سے پست رہا ہے۔ لڑکی کی پیدائش کے ذکر کو ویدوں میں نہایت حقارت سے بیان کیا گیا ہے۔ ہندو ادب میں بھی عورت کے ہرجائی پن بے وفائی اور اس کی متلون مزاجی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔

سنسکرت کی ایک تمثیل میں کہا گیا کہ؛

> ''عورت سے ہمیشہ محتاط رہو چاہے وہ کتنی ہی محبت کا اظہار کرے عورتیں سمندر کی موجوں کی طرح گریزاں ہوتی ہیں اور ان کی محبت شفق کی ان دھاریوں کی طرح بے ثبات ہوتی ہے جو غروبِ آفتاب کے وقت افق پر نمودار ہوتی ہیں وہ بڑے ذوق شوق کے ساتھ اس شخص سے لپٹی رہتی ہیں جس کے پاس دھن دولت ہو جب اسے چوس لیتی ہیں تو ان کی نظریں بدل جاتی ہیں''۔

❑❑❑❑❑❑❑

دوسری معاصر اقوام کی طرح ہندومت میں بھی مذہبی عصمت فروشی کو فروغ حاصل ہوا مندروں میں سینکڑوں

دیوداسیاں پروہتوں اور یاتریوں کی تسکین ہوس کا سامان کیا کرتیں۔ برہمن پروہتوں نے لوگوں کو اس الجھاوے میں الجھا رکھا تھا کہ جو شخص بھی اپنی بیٹی مندر کو بھینٹ کرے گا سورگ باش ہوگا یعنی جنت میں جائے گا۔ چنانچہ عام لوگوں کے شوق کا تو کیا کہنا راجے مہاراجے تک اپنی بیٹیاں مندروں کو بھینٹ کیا کرتے۔ مندر میں ایسی لڑکیوں کو رقص و موسیقی کی تربیت دی جاتی خود مندر کا ماحول ایک طرح کا جنسی اشتعال پیدا کرتا اس لیے کہ اپنے بھجنوں اور گیتوں میں پروہت اپنے دیوتاؤں کے جنسی کارناموں کو مزے لے لے کر سناتے۔

مندر کے دیوار و دران دیو مالائی کہانیوں کی عکسی تصویر ہوا کرتے جنہیں دیکھ کر یاتری اشتعال میں آجاتے اور معاوضہ ادا کر کے دیوداسیوں سے مستفید ہوتے۔ نوجوان دیوداسیاں عبادت سمجھ کر اس فرض کو ادا کرتیں اور معاوضہ پروہت کی جیب میں چلا جاتا۔ زیادہ حسین دیوداسیاں راجوں مہاراجوں کے ذوقِ جمال کی پرورش کرنے کے لیے نرتکیوں کا روپ دھارن کرلیتیں۔ ان کی تربیت کرنے والی کو نائکہ کہا جاتا جوان کو گانے بجانے ڈانس اور فنِ کشش و جذب کے دقیق نکات کی تعلیم دیتیں۔ اس طرح کام جوئی اور ہوس رانی کے متعلق اچھا خاصا ادب پیدا ہو گیا اور کام شاستر کا علم وجود میں آیا جس میں ایسے ایسے نفسیاتی جنسی رموز بیان کئے گئے ہیں جن پر آج تک قابل قدر اضافہ نہیں ہوسکا۔ ہندوؤں کی قدیم تاریخ میں ان کے بہت سے تہواروں کا ذکر ملتا ہے جن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ان کے مذہبی تہوار اور دوسرے ان کے فصلی تہوار۔ تاہم ہر قسم کے تہوار میں چند مشترک اقدار کی وجہ سے پہچان کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہ مذہبی تہوار ہے یا فصلی اس لیے کہ ہر تہوار کے موقعے پر زنا اور شراب کا اہتمام لازمہ تصور کیا جاتا۔ بسنت بیساکھی اور لوہڑی فصلی تہوار تھے جو فصل کے بونے اور کاٹنے کے موقع پر منائے جاتے ان تہواروں پر کھل کر شراب پی جاتی جوا کھیلا جاتا اور زنا کیا جاتا۔

ساون کی پانچ تاریخ کو ناگ پنجمی کا تہوار منایا جاتا جو قدیم ناگ پوجا سے یادگار ہے اس کے علاوہ ہولی کا تہوار ہے جو وسنتی دیوی کے اعزاز میں منایا جاتا ہے۔ شیوراتری کا تہوار ہے جو ماگھ کی چودھویں رات کو منایا جاتا ہے اور اس میں چوبیس گھنٹے کا روزہ رکھا جاتا ہے۔ چیت کی نو تاریخ کو برہمنوں کا الگ تہوار منایا جاتا ہے۔ اس دن وشنو رام کی صورت ظاہر ہوا تھا۔ درگا دیوی کے اعزاز میں درگا پوجا کا تہوار منایا جاتا ہے۔ دسہرے کے تہوار پر رام کے بن باس اس کے مصائب اور راون کی شکست کو ناٹک کی صورت میں پیش کیا جاتا

ہے۔دیوالی کی رات کو چراغاں کیا جاتا ہے اور مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے۔ہندو معاشرے کی مکمل تصویر پیش کرنا قدرے مشکل ہے تاہم مندرجہ بالا مباحث سے ایک بات ثابت ہو گئی کہ خالق کی تلاش میں اگرچہ ان کی دوسری معاصر اقوام کی طرح ہندومت نے بھی چوٹ کھائی مگر جس اخلاقی پستی اور سماجی بگاڑ کا شکار یہ معاشرہ ہوا اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کی جاسکتی ہے۔

تمدنی ارتقاء اور کلاسیکی آرٹ

ہندوستان کے معاشرے میں بے پناہ سماجی خرابیوں کے باوجود تمدنی ارتقاء کا سفر جاری رہا اور کئی پہلوؤں سے ان کی اپروچ کو مثالی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہندوؤں نے جن علوم کو ترقی دی ان میں علم طب، علم جوتش، علم ہیئت اور ریاضی شامل ہیں۔ جوتش اور علم ہیئت میں وہ بابلی روایات سے متاثر تھے اور انھی کی پیروی میں انھوں نے برجوں کی تقسیم کی اور علم تقویم کی بنا رکھی۔ آریائی قبائل جب ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہ قدیم آریائی زبان بولتے تھے جسے ویدک بولی کہا جاتا۔ وہ تحریر کے فن سے ناآشنا تھے تاہم جب وہ گنگا جمنا کے میدانوں میں بسے تو مقامی دراوڑ قبائل میں گھلنے ملنے سے سنسکرت کی بنا پڑی۔ پروفیسر (Bohlerr) کے مطابق قدیم ہند میں دو رسم الخط مروّج تھے ایک ''خروشتی'' جو پانچویں صدی قبل مسیح میں گندھارا یعنی مشرقی افغانستان اور شمالی پنجاب میں مستعمل تھا جو دوسری سامی زبانوں کی طرح دائیں سے بائیں لکھا جاتا۔ دوسرا رسم الخط ''براہم لپی'' کہلاتا تھا جو دراوڑی رسم الخط سے ماخوذ تھا اور بائیں سے دائیں لکھا جاتا۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے ملنے والے ایک سکے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ؁۸۰۰ ق م کے لگ بھگ فنیقی تاجر عراق کے راستے ہندوستان آتے رہتے تھے۔ پروفیسر (Bohler) کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ رسم الُخط ابتدا میں عرب تاجروں کے ذریعے ہی اہل ہند میں متعارف ہوا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سنسکرت میں صوتی تغیرات ہوئے اور اس نے اولین پراکرت یعنی پالی زبان کا روپ اختیار کر لیا۔ اشوک کے کتبوں اور بدھوں کی تعلیمات لکھنے تک زبان کے ابتدائی خدوخال مستحکم ہو چکے تھے۔ سنسکرت اس دور میں ابھی علمائے مذہب اور امراء کے ہاں ہی بولی جاتی تھی۔ عام لوگ بہت دیر تک اپنی مقامی زبانوں سے ہی منسلک رہے۔ بعد کی

زبانوں کا لب ولہجہ اور لغت پہ دراوڑی زبانوں کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے بلکہ آج بھی جنوبی ہند میں بولی جانے والی زبانوں تیلگو، تامل، ملیالم اور کنڑی زبانیں دراصل دراوڑی زبانوں کی ہی جدید شکل ہیں۔ اگر چہ ہندوستان میں کاغذ پہلی بار مسلمان لائے تھے مگر ہندوستانی اس سے بہت قبل فنِ تحریر سے آشنا ہو چکے تھے۔ ریاضی، علم ہیت اور فلسفہ میں بھی ہندوستانی علماء کی کاوشیں تاریخ کے صفحات پہ موجود ہیں۔

آریا بھٹ بہت بڑا ریاضی دان اور علم ہیت کا ماہر تھا۔ اس کے پیرو زمین کو گول مانتے تھے اور اس کی محوری گردش کا علم رکھتے تھے۔ آریا بھٹ نے ہی سب سے پہلے ہندو معاشرے کو یہ خبر دی کہ دن رات کی یہ تبدیلی کرہ ارض کی محوری گردش کا نتیجہ ہے۔ آریا بھٹ اور برہم گپت کسور اشاریہ بھی جانتے تھے اور عربوں نے یہ علم ریاضی انھی سے مستعار لیا تھا جسے محمد بن الخوارزمی نے بغداد میں رواج دیا۔ خود اہلِ عرب اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے نو تک حسابی رقوم لکھنے کا علم اہلِ ہند سے سیکھا تھا۔ مگر اس میں صفر کا اضافہ محمد بن الخوارزمی نے کیا تھا جس کے بعد علم ریاضی پر چھایا ہوا جمود ٹوٹا اور اس نے بے پناہ ترقی کی۔

البتہ نو تک گنتی کی رقوم اور کسور اشاریہ کے شواہد اشوک کے ہجری کتبوں میں بھی ملتے ہیں۔ تاہم علم ہیت کے ابتدائی خدوخال یونانیوں نے وضع کیے پھر علم ہیت اور علم نجوم کی الگ الگ شناخت پیش کی۔ ہندوؤں کی علم نجوم کے متعلق مشہور عالم تصنیف ''سدھانت'' کی بنیاد دراصل یونانی ہیت کے اصولوں پہ ہی رکھی گئی ہے۔ وَرامہر نے یونانیوں سے خوشہ چینی کا اعتراف کیا ہے۔ سدھانت میں گردشِ زمین کے علاوہ کشش ثقل کا نظریہ بھی اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ زمین اپنی کشش ثقل کے باعث اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ خلیفہ المنصور کے عہد میں ایک پنڈت سدھانت کا نسخہ لے کر بغداد پہنچا تو خلیفہ المنصور کے حکم سے اس کا عربی ترجمہ ابراہیم فرازی نے کیا۔ علامہ البیرونی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ قدیم ہندوستان کے لوگوں کو علم ہیت اور ریاضی کے علاوہ ایورویدک میں بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ ششرت اور چرک بڑے پائے کے طبیب تھے۔ ان کے دستورِ علاج کی افادیت کو آج تک تسلیم کیا جاتا ہے اگر چہ یہ کہا جاتا ہے کہ انسانی جسم میں دورانِ خون کا مطالعہ سب سے پہلے (Harway) نے کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی طبیبوں کو ساتویں صدی بکرمی میں بھی دورانِ خون کا علم تھا۔ وہ چیچک کا انجکشن بنانا جانتے تھے اور آتشک کا علاج پارے سے کیا کرتے۔ ہندوستان کے بیسیوں اطباء بغداد پہنچے اور وہاں انھوں نے طب کی دنیا میں کئی معرکے سرانجام دیئے جس کا عرب فراخ دلی سے اعتراف بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک عرب

مورخ جاحظ اس ضمن میں رقم طراز ہے کہ؛

”رہے ہندوستان کے باشندے تو ہم نے پالیا کہ وہ جوتش اور حساب میں بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ان کا ایک خاص ہندی خط ہے۔طب میں وہ طلسماتی کارکردگی کے حامل ہیں اور اس کے بعض عجیب بھید اُن کو معلوم ہیں اور بہت سی سخت بیماریوں کی دوائیں ان کے پاس ہیں۔مجسّمے بنانا رنگوں سے تصویر کھینچنا اور فن تعمیر میں ان کو کمال حاصل ہے پھر وہ شطرنج کے موجد ہیں جو ذہانت اور سوچ کا بہترین کھیل ہے“۔

❑❑❑❑❑❑❑

اس طرح آیورویدک کی بہت سی اصطلاحات اور مفردات کے نام عربی زبان میں رواج پا گئے اور آج تک جوں کے توں مستعمل ہیں،مثلاً اطرفیل،اسبغول،عرقِ گلاب وغیرہ۔اس کے علاوہ ہندی طب میں علم کیمیا سے ملتا جلتا ایک علم بھی تھا جس سے وہ اعادۂ شباب کیا کرتے۔کشتہ سازی اور جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں انہیں کمال حاصل تھا۔تانبہ پارہ اور شنگرف کو سونا چاندی جیسی دھاتوں میں اس طرح کشتہ کرنا کہ ان کی راکھ میں تاثیر پیدا ہو جائے انھی کا کارنامہ ہے۔پھر فن تعمیر میں ان کے کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں،اور ان کی مجسّمہ سازی تو ان کے فن تعمیر سے ہی وابستہ رہی۔موریہ خاندان کے عہد میں ہندوستان میں ایرانیوں اور یونانیوں کی پیروی میں پتھر کا استعمال شروع ہوا۔اس سے قبل اہل ہند اپنے مکان اور مندر مٹی اور لکڑی کے ساتھ بناتے تھے۔اشوک عہد میں سنگ تراشی کو عروج حاصل ہوا۔سارناتھ میں جہاں بدھ نے اپنا پہلا وعظ دیا تھا وہاں بہت خوبصورت ستون نصب ہیں۔اس دور کی فنی روایات کو سنگا اور آندھرا راجاؤں نے نہ صرف بحال رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دی۔اس زمانے میں بھڑھوت،سانچی اور امراوتی میں بدھ آرٹ بام کمال کو پہنچ گیا اور فن تعمیر کے جو اسالیب ظاہر ہوئے ان میں سٹوپا وہارا اور چھتری قابل ذکر ہیں۔انھیں بدھ ازم کی مذہبی روایات میں اہم مقام حاصل ہے۔سانچی کے دیوار و در پر جاتک کہانیوں کو جس طرح سے منقش کیا گیا ہے وہ خالص ملکی اسلوبِ فن کی نشاندہی کرتا ہے۔ان میں سانپ ہرن، ہاتھی اور شیر وغیرہ کے نقوش بڑے جاذبِ نظر ہیں۔سانچی کی یکشنیاں خاص طور سے بہت حسین ہیں ان کے جسم کے زاویوں کی نفس پرور رعنائی اور خطوط کے دائروں کی شگفتگی اور گداختگی کا ہندی سنگ تراشی میں کوئی جواب نہیں۔ہندوستان میں خاص طور

پہ بدھ عہد کو فن سنگ تراشی کے عروج کا زمانہ کہا جا سکتا ہے ان کے مجسمہ تراشی میں دو مکاتب فن نے بہت شہرت حاصل کی۔ گندھارا اور گپتا۔ کنشک نے مہایانہ فرقہ اختیار کیا تو گندھارا عہد کا آغاز ہوا۔ بدھ کی سعی کے تمام مراحل کو پتھر پہ نقش کر دیا گیا۔ جس نے نہ صرف بدھ ازم کو بلکہ بدھ کو بھی تاریخ کے صفحات میں زندہ رکھا۔ دوسری طرف گپتا فنِ سنگ تراشی میں متھرا کارلی اور سانچی کی روایات کا امتزاج ہوا۔ اور اس طرح ہندوستان میں کلاسیکی آرٹ نے جنم لیا۔ امراؤتی میں فنی ارتقاء کے تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ امراؤتی میں برہنہ نسوانی مجسّمے انتہائی دلکش ہیں۔ ان میں سانچی یکشنیوں کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔ سینے اور سرین کا ابھار توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے۔ اعضاء کی نگارش میں فطری لچک اور تناسب کا احساس ہوتا ہے۔ ان مجسّموں میں ہندوؤں کا جمالیاتی نصب العین پوری طرح منعکس ہوتا ہے۔ گپتا عہدِ فن میں بدھ کے مجسّمے خاص طور پہ خوش وضع ہیں۔ مراقبے میں بیٹھے ہوئے بدھ کے چہرے پر شانتی کی لطیف کیفیت کو بڑی چابکدستی سے تراشا گیا ہے۔

قدیم زمانے کے ہندو مصوروں کی تصویریں سنگویا کے ایک غار میں دریافت کی گئیں ہیں۔ مگر ان کی چتر ودیا کے صرف دیواری نقوش ہی ہم تک پہنچے ہیں۔ اس کے علاوہ اجنتا کے غاروں میں بدھ مصوری کے شاہکار موجود ہیں جن کی تصویر کشی غالباً گپتا عہد کے اوائل میں کی گئی ہوگی۔ دسویں غار کی تصویریں اسی عہد کی یادگار دکھائی دیتی ہیں۔ اجنتا کی تصویر کشی کا سلسلہ چالوکیہ کے عہد تک جاری رہا۔ اجنتا کے مصور یقیناً بدھ سوامی رہے ہوں گے اس لیے کہ ان کی نقش گری کا طریقہ بھی انوکھا تھا۔ ان کے ہاں پہلے دیوار پر دو بار چکنی مٹی کا لیپ کیا جاتا نچلا پرت وہ مٹی اور گائے کے گوبر کے آمیزے سے بناتے تھے جس سے دیوار کی سطح ہموار ہو جاتی، اب اس پہ سفید پرت چڑھائی جاتی پھر تصویر بنانے سے ایک رات پہلے دیوار کی سطح کو پانی سے خوب تر کیا جاتا تاکہ اس کی نم دار سطح پر معدنی اور نباتاتی رنگوں سے نقش ابھارنے میں آسانی ہو۔ اجنتا کے غاروں میں بنی یہ تصویریں بلاشبہ خط کشی کے لازوال نمونے ہیں جنھیں بغیر کسی ادنیٰ تأمل کے تاریخی خزائن قرار دیا جا سکتا ہے۔ جوان عورت کا نازک اور گداز جسم بادامی قطع کی لمبی اور متوالی آنکھیں ہاتھوں کی بلیغ حرکات اور مخروطی شمعی انگلیوں کے ذو معنی اشارے گھنیری زلفوں میں گوندھے ہوئے کومل پھول دیکھنے والوں کے دل موہ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ نیم برہنہ نسوانی حسن کے نقوش بھی فن مصوری میں اپنی ندرت اور چابکدستی کے لحاظ سے منفرد اہمیت کے حامل ہیں جن میں ہندو عورت اپنے حسن اور سندرتا کی تمام تر لطافتوں کے ساتھ جلوہ

گر ہے۔ جانوروں میں ہاتھی، شیر، بیل گھوڑے، ہرن اور بندروں کی تصویریں نہایت دلکش ہیں۔ اشوک کے بعد بدھ مت کا عروج زوال میں بدلا اور گپتا خاندان کا عہد شروع ہوا جس کے ساتھ ہی برہمن ازم کا احیاء بھی عمل میں آیا اور فن سنگ تراشی نے بھی انگڑائی لی اب شیو وشنو اور برہما کے بت تراشے جانے لگے۔ مندروں کی آرائش اور تعمیر میں اچھوتے اسلوبِ تعمیر کی تلاش جاری رہی جن کا عکس بھارت اور نیپال کے قدیم مندروں میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

فنِ تعمیر اور مجسمہ سازی کے بعد علم موسیقی میں بھی اہل ہند نے خاصا نام پیدا کیا اور انھوں نے بھی یونانیوں کی طرح موسیقی کے اصولوں کو ریاضیاتی اصولوں پر مرتب کیا۔ سام وید میں موسیقی کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ موسیقی اور ڈانس چونکہ ہندومت کا حصہ ہیں اس لیے بھی ہندو معاشرے میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ مندروں میں صبح شام دیوتاؤں کی مناجات میں بھجن گانے کا رواج ہے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ سنگیت کے قواعد وضوابط وضع ہوتے گئے۔ ہند میں فن تعمیر مجسمہ سازی اور مصوری کی طرح سنگیت نے بھی مذہب کے دامن میں ہی پرورش پائی۔ سنگیت میں ناچ اور نرت بھی شامل ہیں۔ اور دیوداسیاں دن میں دو مرتبہ دیوتاؤں کو رجھانے کے لیے ناچتی ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری پنڈتوں پر تھی۔ ہندوؤں کے ہاں موسیقی کے دو شعبے تھے یعنی لے اور تال۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو آدمی گرو کے سامنے زانوئے عقیدت طے نہ کرے وہ سور یا یا ایشور تک نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی سر میں وہ بلندی حاصل نہیں کرسکتا۔ ان کے ہاں گانے والوں کے کئی طبقے ہیں۔ سنگیت کے عالم کو پنڈت کہتے ہیں۔ اس کے بعد گنی کا درجہ ہے۔ جو اس سے بڑھ جائے اسے گندھرو کہا جاتا ہے۔ اس کے اوپر گائن کا اور سب سے اعلیٰ مقام نائک کو حاصل تھا جو بذات خود راگ ایجاد کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ انسانی آواز کو سات سروں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور یہ تقسیم سیاروں کی تعداد کو مد نظر رکھ کر کی گئی۔ سات سروں کو پھر بائیس شروتیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قدماء کے خیال میں تمام شدھ اور وکروٹ سُر اپنی الگ شروتیاں رکھتے ہیں۔ موافق اور ناموافق ہونے کے اعتبار سے سُروں کو ودادئ سموادی انوادی اور ودادی کہتے تھے۔ ودادئ سموادی میں سُروں اور راگ کا روپ نکھرتا ہے۔

جبکہ ودادئ ناموافق تصور کی جاتی۔ سُروں کے حوالے سے راگ راگنیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا۔ سمپورن آڈو اور کھاڈو۔ مثلاً بھیرویں سمپورن ہے اور مالکوس آڈو۔ سات سروں کی قدرتی ترتیب کو مورچھن کہا جاتا۔ مورچھن کے بعد جاتی اور جاتی کے بعد گرام راگ کا رواج ہوا۔ وقت گذرنے کے ساتھ

راگ دو حصوں میں تقسیم ہوگئے مارگ اور دیشی۔ جسے کلاسیکی اور جدید موسیقی بھی کہا جاتا ہے۔ سنگیت ودیا یعنی علم موسیقی میں سارنگ دیو کی کتاب سنگیت رتنا کر اور بھرت کی نٹ شاستر کو مستند تصور کیا جاتا ہے۔ شمال مغرب میں ہندوستانی موسیقی کا رواج تھا جب کہ جنوب میں کرناٹکی سنگیت مروّج تھا۔ راگ راگنیوں کو موسموں اور اوقات سے مخصوص کر دیا گیا۔ موسموں کے لحاظ سے راگوں کی ترتیب کو یوں بیان کیا گیا ہے۔ بھیرویں، سری بلاول، مالکوس، دیپک اور میگھ۔ قدیم ہند کے سازوں میں بنسری وین اور مردونگ مقبول تھے۔ مسلمانوں نے اہل ہند کی موسیقی میں خیال کا اضافہ کیا اور پکھاوج مردنگ کی صورت بدلی۔ انھوں نے اس کے دو حصے کر دیئے جس سے طبلہ کا دائیاں اور بائیاں وجود میں آئے۔ ادب کی دنیا میں اہل ہند شعر کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے مذہب فلسفہ فقہ اور دیومالا سے لے کر الجبرا ہیئت صرف ونحو جوتش اور طب جیسے خشک موضوعات بھی شعر کی زبان میں بیان کیے۔ نثر لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ ہندی شاعری کی تین اصناف قابل ذکر ہیں۔ رزمیہ شاعری، فلسفیانہ شاعری اور بھگتی شاعری۔ رامائن اور مہا بھارت رزمیہ شاعری کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔ ان طویل نظموں کے کردار معاشرے کے چلتے پھرتے عکس ہیں۔ مہا بھارت میں ہی گیتا کی مشہور نظم ہے جس نے بھگت شاعروں کو تحریک وتشویق کا سامان بہم پہنچایا۔ بھگت شاعروں نے رام چندر اور کرشن کو محبوب ازلی تصور کر کے ان سے والہانہ عشق کا اظہار کیا۔ یہی اسلوب بعد میں مسلمان صوفیا کی شاعری میں بھی اختیار کیا گیا۔ وسطی دور کے ہندی شعرا کے ہاں اسلوب میں وسعت پائی جاتی ہے اور وہ مذہب سے قدرے ہٹ کر دوسرے موضوعات کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ان کے ہاں فطرت نگاری کے شگفتہ نمونے ملتے ہیں اور انھوں نے برکھارت کے مناظر پہاڑوں وادیوں اور بنوں کی دلکش تصویروں کو الفاظ کا پیرہن دیا۔ پھر کوئل کی آواز، پپیہے کی حسرت بھری پکار، مور کی جھنکار نے ان کے کلام میں خالص ملکی فضا پیدا کر دی۔ اہل مغرب ہندی ادب کی لطافتوں سے تب واقف ہوئے جب ۱۶۵۱ء (Ebrahem rojer) نے پہلی بار مشہور شاعر بھرت ہری کے کلام کا ولندیزی زبان میں ترجمہ کیا۔

ہندی شاعری میں روایت پسندی اور اپنی رسموں کا اظہار دلکش انداز میں کیا گیا ہے جیسا کہ ایک لڑکی اپنے درد کو اپنے اس شوہر سے منسوب کرتی ہے جو پردیس میں ہے اور وہ اس کے فراق میں بے حال ہے اور یہ دراوڑوں کے مادری نظام معاشرہ سے یادگار ہے۔ ہندو عورت کی اپنے شوہر سے اظہار محبت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس لیے کہ ان کے ہاں شوہر کا رتبہ بیوی کے مقابل بہت بلند ہے اور اسے بھگوان

کا درجہ حاصل ہے۔اس لیے اسے ایک پاکیزہ جذبہ خیال کیا جاتا ہے اس طرح کی خودسپردگی اور خلوص کی مثالیں کسی اور قوم کی شاعری میں بہت کم دکھائی دیں گی۔دوسری اقوام میں عموماً شادی پر محبت کا خاتمہ ہوجاتا ہے جب کہ پاک و ہند میں شادی رومان کا آغاز تصور کی جاتی ہے۔قدیم ہندوؤں کے ہاں شاعری کی دو قسمیں مروّج تھیں ایک درشے (جو دیکھی جاسکے)اور دوسری سروے (جو سنی جاسکے) پہلی قسم کی شاعری کو عام لفظوں میں ناٹک کہا جاتا۔ہندو تاریخ میں ناٹک کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ناٹیۓ ،نرتیۓ ،ونرت یہ تماشے ہندواپسرائیں اور گندھرو دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے کیا کرتے۔ان میں سے صرف ناٹیۓ پر ہی ڈرامے کی تعریف صادق آتی ہے اس میں دیو مالا یا تاریخ کا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔مسلمان علماء نے خیال ظاہر کیا کہ ہندو ڈرامہ یونان سے متاثر ہے اور یہ سچ بھی ہے اس لیے کہ اس کا آغاز اجین اور مالوہ کے درباروں سے ہوا جن کے یونان کے شاہان سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔اس کی ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ جس طرح مذہب ہندوؤں کی زندگی کے ہر پہلو میں دخیل نظر آتا ہے ان کا ڈرامہ اس احساس سے عاری ہے۔ہندو ڈرامے میں زبان کے معیار پہ بھی خصوصی توجہ دی جاتی۔

ہندو ناٹک کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ناٹک متعلق المیہ نہیں ہے اس کا انجام عموماً طربیہ ہی ہوتا ہے جو اس لحاظ سے فکرانگیز بات ہے کہ وہ قوم جس کی سوچ پر یاسیت کے گھنے سائے چھائے رہے وہ کیونکر المیہ کی جانب متوجہ نہ ہوسکی ۔ہندو ناٹک ''کالی داس اور بھو بھوتی'' میں بام کمال تک پہنچ گیا۔ (Sir welliom jouns) نے 1789ء میں شکنتلا کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا جس سے گوئٹے اور ہر برڈ بہت متاثر ہوئے جس کے اثرات جرمنوں کی رومانوی تحریک پہ بھی پڑے ہندوؤں کے سیاسی اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ناٹک بھی رہس میں تبدیل ہوکے رہ گیا جو متھرا اور برج میں صدیوں تک مقبول رہا۔قدیم ہندوستان کی ادبیات میں ایک صنف جو عالمی ادب میں نفوذ کرگئی اس کی جاتک کہانیاں ہیں۔جاتک کا لغوی معنی ہے''جنم''۔ان کہانیوں میں گوتم بدھ نے اپنے گذشتہ جنموں کے حالات بیان کئے ہیں جب وہ ہرن، مور، ہاتھی یا بیل کے قالب میں وارد ہوا۔جاتک ادب کی قدامت چوتھی صدی قبل مسیح تک ثابت ہے۔پٹنہ میں بدھ ازم کی جو کونسل منعقد ہوئی اس میں جاتک کہانیوں کو مرتب کر کے پیش کیا گیا۔جاتک کہانیوں کا معروف مجموعہ''کرتک دمنک'' ہے جسے نوشیرواں کا ایک وزیر ایران لے گیا اسی لیے الف لیلہ میں بھی ان جاتک کہانیوں کا اسلوب محسوس کیا جاسکتا ہے۔یہی اسلوب لوک کہانیوں میں مستعمل رہا ہماری مقبول لوک

کہانیوں میں قصہ سیف الملوک، ہیر وراث شاہ شامل ہیں جن میں اگرچہ صوفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے اس کے باوجود وہ لوگوں میں مقبول ہیں۔ چنانچہ یہ اس برہمنی تہذیب کے ماضی کا وہ پہلو ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے دنیا کو اخلاقیات اور سماجیات کے میدان میں بہت کچھ دیا ہے۔ ہم اس بات کا فیصلہ قاری پہ چھوڑتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ منوشاستر کی پیرو قوم نے دنیا کو اخلاق کی دولت عطا کی یا جاہلیت کے اندھیرے کی طرف دھکیلا۔ سچ تو یہ ہے آریائی ہند کا موازنہ جب اس قوم سے کیا جاتا ہے جس نے ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے دور کا آغاز کیا تو یوں لگتا ہے کہ اس زمین پہ انسانوں کی بجائے جانور بستے تھے جس کے شواہد ان کی زندگی کے ہر پہلو سے جھانک رہے تھے چاہے وہ اخلاقی ہوں یا سماجی، معاشی ہوں یا عقائدی، فکری ہوں یا نظری حقیقت یہ ہے کہ محمد بن قاسم کی فتح سندھ (712ء) کے بعد برصغیر پاک و ہند ایک ایسی عظیم قوم سے متعارف ہوا جو ایک جامع اور بھرپور نظریہ حیات کی حامل تھی۔ عربوں کی آمد سے قبل ہندوستان کا معاشرہ برہمن ازم کے عروج کو دیکھ رہا تھا جس نے بدھ مت اور جین مت کو شکست دے کر دیس نکالا دے دیا تھا۔ مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے بعد اسلام نے لوگوں کے سامنے اپنا بے مثال فلسفہ حیات پیش کیا تو لوگ ششدر رہ گئے اور ان کے تصورِ مساوات نے لوگوں کو گروہ در گروہ راہ حق کا مسافر بنا دیا۔ اسلام اپنی منفرد تعلیمات کی بدولت ایک قلیل عرصے میں پورے سندھ پہ چھا گیا۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد مسلمانوں نے شمال مغرب کی طرف سے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا جو دیر تک قائم رہا۔ محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کے شاندار جنگی کارناموں نے قطب الدین ایبک کے لیے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی جو بعد میں پانی پت کے میدان میں بابر کے ہاتھوں ابراہیم لودھی کی شکست 1526ء سے مغلیہ سلطنت کے قیام پر منتج ہوئی۔

اپنے دورِ اقتدار میں سلاطینِ دہلی نے علوم و فنون کی بالعموم اور فن تعمیر کی بالخصوص صحیح معنوں میں سرپرستی کی۔ مسلمان بادشاہوں کو فن خوش نویسی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا ان کے عہد میں ان کے زیر سرپرستی نہ صرف فن خطاطی نے ترقی کی بلکہ ان میں سے اکثر خود بھی بلند پایہ خطاط تھے۔ اس سلسلے میں ناصر الدین محمود کی روشن مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ فن خطاطی کے علاوہ مسلم حکمرانوں نے فن تعمیر میں بھی گراں قدر اضافے کیے۔ تعمیرات میں انھوں نے وسطی ایشیا اور ایران کی روایات اور اسلوب کو اپنایا تعمیرات میں ان کا اہم کارنامہ اکہرے اور دوہرے گنبد کی تعمیر ہے کہ اس وقت برصغیر میں گنبد کی اس ساخت سے کوئی بھی واقف نہ

تھا۔فن تعمیر میں سلاطین دہلی نے شاندار روایات قائم کیں اور مغلوں نے انھیں جاری رکھا۔ برصغیر پاک و ہند میں مغل سلطنت کے استحکام کے بعد ہندوستان میں ایک نئے اور عظیم الشان دور کا آغاز ہوا جس نے ہندوستان کے باسیوں کو زندگی کے حقیقی رنگوں سے آشنا کیا۔ ہندوستان کے استحکام اور برتری کا یہ سنہری دور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک جاری رہا۔

> اہل چین غالباً دنیا کی وہ واحد قوم ہے جس نے بہ حیثیت قوم خالق کا انکار کیا ہے۔اگرچہ اُن کی صنعت و حرفت کی گونج آج ساری دنیا میں سنائی دے رہی ہے مگر میرے نزدیک وہ بے منزل مسافرت کے آزار میں ہیں۔

چین

چین جنوبی ایشیا کا عظیم ملک ہے۔اس کا تمدن اور تاریخ ہزاروں سال پہ محیط ہے۔قدیم زمانوں سے ہی چین کا ملک کئی حوالوں سے شہرت کا حامل رہا ہے۔جغرافیائی لحاظ سے چین کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جو آب و ہوا سطح زمین زرعی پیداوار اور طرزِ بود و باش کے حوالے سے کافی مختلف ہیں۔شمالی چین کے مغربی حصے میں زرد مٹی کی تہہ سطح مرتفع اور میدانوں پر یکساں پھیلتی چلی گئی ہے۔زرد مٹی کو ہوائیں اڑا کر لاتیں ہیں اور ان میدانوں میں بچھا دیتیں۔اس کے انتہائے مشرق میں شان تنگ کا علاقہ ہے جس میں تائی شان کا مقدس پہاڑ واقع ہے۔جنوبی چین کا بیشتر حصہ پہاڑوں اور وادیوں پر مشتمل ہے اور اس کی سطح تبت کی رفعتوں تک بلند ہوتی چلی گئی ہے۔چین کا سلسلہ کوہ مغرب سے مشرق کو پھیلا ہوا ہے جس کے مرکز میں کون لون کا

سلسلہ کوہ ہے۔سب سے بڑا پہاڑ سن لنگ ہے جو ساحل سمندر تک پھیلتا چلا گیا ہے اور کئی مقامات پر اس کی بلندی بیس ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہے۔مگر اس کے برعکس شمال مغرب میں چین کا ایک ایسا علاقہ بھی ہے جسے دنیا کا سب سے گہرا نشیب قرار دیا جاتا ہے اور اس کی سطح سمندر سے پانچ سو فٹ نیچے ہے۔چین میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں جن کے کناروں پہ صدیوں سے موجود آبادیوں کی معاش کا دارومدار ہے۔تین بڑے دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور مشرق کی طرف بہتے ہوئے سمندر میں جا گرتے ہیں۔شمالی چین میں ''ہوانگ ہو'' بہتا ہے اور اس سے سیراب ہونے والی زمین بہت ہی زرخیز ہے۔''ینگ سی'' ملک کے درمیانی حصے میں بہتا ہے اور چین کے سرخ میدانوں کو سیراب کرتا ہے اسے ایشیا کا سب سے بڑا دریا بھی کہا جاتا ہے۔جنوبی ملک کا اہم دریا ''سی کیانگ'' ہے جس کا دھانہ نہایت وسیع اور زرخیز ہے۔

انہی دریاؤں کے کناروں اور میدانوں میں چین کے اکثر باشندے آباد تھے۔چین کے شمال میں سخت گرمی پڑتی ہے مگر جنوب میں موسم معتدل رہتا ہے کیونکہ سمندر سے اٹھنے والی ہوائیں یہاں خوب بارش برساتی ہیں۔جس سے اس کے میدان سرسبز و شاداب دکھائی دیتے ہیں۔چین میں پہلے گھنے جنگل ہوا کرتے تھے جنہیں کثرت سے کاٹا جاتا رہا جس کی وجہ سے بعد میں اہل چین کو بڑے بڑے سیلابوں کا سامنا کرنا پڑا۔

چین بنیادی طور پہ ایک زرعی ملک ہے مگر اس کی بے پناہ آبادی کی وجہ سے اسے ہمیشہ خوراک کی کمی کا سامنا رہا ہے۔قدیم چین میں جب دو دوست ملتے تو وہ ایک دوسرے کو سلام کرنے کی بجائے کہا کرتے کہ؛

''کیا تم نے کھانا کھالیا ہے''؟

زرعی پیداوار میں چین کی اہم فصلیں گندم، جوار، مکئی، کپاس، ریشم، مٹر، گنا، سویابین، تمباکو، آلو اور دوسری کئی سبزیوں پر مشتمل ہیں۔اس کے علاوہ سیب، تربوز، نارنگی، کیلا، ناشپاتی، آڑو، شفتالو اور ایلچی جیسے پھل بھی بہ افراط پیدا کیئے جاتے ہیں۔جنگل کی پیداوار میں بانس کافور اور لکڑی قابل ذکر ہیں۔چین اپنے وسیع و عریض رقبے کی وجہ سے معدنی دولت سے ہمیشہ مالا مال رہا ہے،اس کی اہم معدنیات میں کوئلہ، لوہا، میگا نیز، ٹنگ سٹن، قلعی، سیسہ، نمک، پھٹکری اور سونے چاندی کی بڑی بڑی کانیں شامل ہیں۔چینی باشندوں کے قد نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں اس کے باوجود وہ سخت محنتی قوم کے طور پہ جانی جاتی ہے اور آج کی دنیا جانتی ہے کہ چین کے دو ارب ہاتھوں نے دنیا کی معیشت کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔صنعت و حرفت کے میدان میں اگر کسی مشرقی قوم نے اہل مغرب کو چیلنج کیا ہے تو وہ صرف چینی قوم ہے۔چینی قوم جفاکش اور کم سخن ہے وہ ہنس مکھ اور چاک

وچابند لوگوں پہ مشتمل ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں جرائم کی اوسط دنیا بھر میں کم مانی جاتی ہے۔چین کی سر زمین ارضی حسن سے مالا مال ہے اور ہر طرف ہرے بانس،شاہ بلوط،کافور اور سفیدے کے درختوں کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں۔بے شمار جھیلیں،ندیاں اور سر بفلک پہاڑ ارضی حسن کا نمونہ ہیں۔چین کے شہر گنجان آباد ہیں۔شمالی چین کا سب سے بڑا شہر پیکن ہے۔جس میں بڑے بڑے کشادہ باغات محلات اور معبد ہیں۔یہ شہر صدیوں تک چین کا دارالخلافہ رہا ہے۔

چین کی تاریخ بڑی حد تک اسی کے گرد گھومتی ہے۔اس علاقے کی بڑی بندرگاہ ٹین سٹین ہے اس کے علاوہ ''چی خواور سنگ تاؤ'' بھی بڑے شہر ہیں۔جنوبی چین کا علاقہ زیادہ گنجان آباد ہے اور اوسطاً ایک مربع میل میں سات سو افراد آباد ہیں۔مگر شہری علاقوں میں یہ اوسط بڑھ جاتی ہے اور دو ہزار افراد فی مربع میل تک جا پہنچتی ہے۔یہاں دریاؤں اور نہروں کا ایک جال سا بچھا ہے اور بڑے شہر انھی کے کناروں پہ آباد ہیں۔کہتے ہیں یہاں ایک لاکھ سے زائد نہریں ہیں جن کی وجہ سے دور دور تک جہاز رانی ممکن ہے۔یہاں دنیا کی سب سے بڑی نہر ''نہر کبیر'' بھی موجود ہے جسے پانچویں صدی قبل مسیح میں کھودا گیا تھا۔جنوبی چین کے اہم شہروں میں ''نین کنگ'' سب سے بڑا ہے اور اسے کئی دفعہ چین کا دارالسلطنت ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔

شنگھائی چین کی بیرونی تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور اس کا شمار دنیا کی چوٹی کی بندرگاہوں میں کیا جاتا ہے۔ہانگ چو کا شہر اپنے دامن میں قدامت سمیٹے ہوئے ہے اور یہاں بہت سے قدیم آثار پائے جاتے ہیں۔ہانکو ہن یانگ اور دو چانگ بھی جنوبی چین کے اہم اور بڑے شہروں میں شامل ہیں۔یہ شہر اگرچہ سمندر سے سینکڑوں میل دور ہیں تاہم بڑی بڑی نہروں کے ذریعے جہازوں کی ان شہروں تک آمد کو ممکن بنا دیا گیا ہے۔

تاریخ اور مذہب

اہل چین کو قدیم زمانے ہی سے تاریخ نگاری سے گہرا شغف رہا ہے اور ان کے تاریخ نگاروں نے اپنے ہر دور کو زندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں سرکاری سطح پر تاریخ کو مرتب کرنے کا اہتمام بھی موجود تھا۔ ان کے مورخ بغیر کسی خوف اور دباؤ کے التزام صحت کے ساتھ احوال و واقعات کو قلم بند کرتے۔ اگرچہ سچ لکھنے کے عوض ان کو کبھی کبھی بادشاہ وقت کے عتاب یا دیگر مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ اہل مغرب چین کو مورخوں کی جنت کہا کرتے۔ دنیا کی کسی اور قوم میں اتنے مورخ پیدا نہ ہوئے ہوں گے اور نہ ہی انھوں نے اتنی جامع اور سیر حاصل تاریخیں مرتب کی ہوں گی جتنی کہ چین میں لکھی گئیں۔ انھوں نے تاریخ نگاری کو ایک سائنس بنا دیا۔ چنانچہ تاریخ چین کی دو ہزار سالہ قدیم تہذیب و تمدن کے آثار دستاویزی طور پہ آج تک محفوظ ہیں صدیوں کی تشکیل و ارتقاء نے چینی معاشرے کو ایک جاندار تمدن عطا کیا۔ ہم چینی تاریخ کا آغاز اس دور کو قرار دے سکتے ہیں جسے کانسی کا زمانہ کہا جاتا تھا۔ اُس دور میں چین پہ ''ہسیا اور شانگ'' خانوادوں کی حکومت قائم تھی۔ یہ زمانہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ تحریر کا فن ایجاد ہو چکا تھا اور لوگ کاشت کاری کے رموز جان چکے تھے۔ سن اور ریشم سے کپڑے تیار کیے جاتے اور انھیں ہاتھ سے سی کر پہنا جاتا۔ کتا، سور، بھیڑیا اور گھوڑے پالتو جانور تھے۔ قدیم چین کے لوگ بھینس کا دودھ پینے کی بجائے اسے ہل میں جوتتے تھے۔ دیوتاؤں کے حضور انسان اور جانور کی سوختنی قربانی کی جاتی اور جنگی قیدیوں کو دیوتاؤں کے مندروں میں لے جا کر ذبح کر دیا جاتا۔ تاریخ کے بعض ادوار میں بادشاہ دور دراز کے علاقوں میں خصوصی مہموں کو روانہ کرتے کہ وہ غیر چینی باشندوں کو اغوا کر کے لائیں تا کہ ان کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا جا

سکے۔ وہ اپنے ہتھیار کانسی سے تیار کرتے جس میں تلوار خنجر اور برچھا وغیرہ شامل ہوتے انھوں نے لڑائیوں میں اپنی برتری کو قائم رکھنے کے لیے جنگی رتھ ایجاد کی جس نے ان کے لڑنے کی رفتار اور استعداد میں اضافہ کیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل چین ہی نے سب سے پہلے لوہے کو پگھلا کر اس سے ہتھیار بنانا سیکھا۔ اول اول لوہے کی تلوار کو جادو کی تلوار کہا جاتا۔ اس دور میں چین کا عمومی سماجی ڈھانچہ جاگیردارانہ تھا اور پورا ملک مختلف جاگیروں میں منقسم تھا جن پر سردار حکومت کرتے تھے۔ مگر ضرورت پڑنے پر وہ سب بیرونی حملہ آور کے خلاف شہنشاہ کے جھنڈے تلے متحد ہو جاتے۔ تاہم ''شاہ شی ہوانگ'' کے دورِ اقتدار میں پہلی دفعہ سارا چین ایک ہی حکومت کے تحت آیا اس لیے بجا طور پر ''شی ہوانگ'' کو چین کا پہلا شہنشاہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ نہایت حوصلہ مند اور بیدار مغز شہنشاہ تھا اس نے عظیم چین کے تصور کی بنیاد رکھی۔ اس نے چین کو تاتاریوں اور مغلوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دیوار چین تعمیر کی۔ شی ہوانگ کے بعد سات مختلف خاندان چین پر حکومت کرتے رہے جنہوں نے ملک کے نظم و نسق کو بہتری عطا کی۔ جس سے ملک مضبوط ہوا اور ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا تاہم ۱۲۳۶ء میں چنگیزی مغلوں نے چین پر قبضہ کر لیا۔

مشہور فاتح چنگیز خاں کا پوتا قبلائی خان وہ پہلا مغل شہنشاہ تھا جس نے چین پر حکومت کی۔ مغل تقریباً سو سال تک چین پہ قابض رہے پھر ایک ہونہار چینی شہزادے نے جس کا تعلق منگ خاندان سے تھا مغلوں سے اپنی سلطنت واپس لے لی اور مملکت کی بھاگ دوڑ دوبارہ چینیوں کے ہاتھ آ گئی۔ اس کے بعد کئی خاندان یکے بعد دیگرے چین پر حکومت کرتے رہے حتیٰ کہ ۱۹۱۱ء میں وہاں جمہوری انقلاب آ گیا پھر ۱۹۴۹ء میں چیئر مین ماؤزے تنگ کی سرکردگی میں اشتمالی اِنقلاب برپا ہو گیا اور ملک بھر میں اشتمالی معاشرہ قائم کر دیا گیا۔ آج کا چین اشتراکی نظریہ حیات کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے اور اس کے لوگوں کی جفاکشی اور محنت نے اسے اقوام عالم میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ چین کی مذہبی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا قدیمی مذہب آباء پرستی تھا ان کی تاریخ نگاری کے شوق نے اپنے بے شمار آباء کی فہرستیں اور شجرے فراہم کیے ہیں جنہیں وہ لوگ سنیت سنیت کر رکھتے تھے تاہم بعد کے ادوار میں اہل چین تین مختلف مذاہب کے پیرو رہے جن کی تفصیلات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔

تاؤمت

چین کے قدیم دور میں مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے اس خیال کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے کہ چینی حشر نشر یا حیات بعد ممات کے کسی بھی دور میں قائل نہیں رہے اور نہ ان کے مذہب کا کوئی نظام عبادت تھا۔ وہ اسی دنیا کی لذت اور حصول پہ کار بند رہے۔ تاؤ کے نزدیک یہ بات نا قابل فہم تھی کہ کوئی انسان موت کے بعد کی زندگی میں آسائش کے لالچ میں اس دنیا کی تمام لذتوں سے دست کش ہو جائے۔ جب کہ دیگر ممالک میں حیات بعد ممات کا تصور مذہب کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ ہندومت، یہودیت مزدائیت، عیسایت اور اسلام میں روح کی بقاء اور حیات بعد ممات کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اہل چین کے ہاں اس طرح کے عقائد کو کبھی پذیرائی حاصل نہیں ہوسکی۔ اس لیے تاؤمت یا کنفیوشس ازم کو مسلک یا مذہب کی بجائے دستورِ حیات یا دستورِ عمل کہنا زیادہ قرینِ صحت ہوگا۔ کہ دنیا میں مروّج مذاہب کی طرح چین میں اخلاقیات کو مذہب کا حصہ تصور نہیں کیا جاتا۔ تاؤمت میں اس امر پہ حیرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان سے اچھا سلوک کسی دیوتا کے خوف میں آ کر کرے۔ اگر چہ اس کی اچھائی کے لیے کسی دوسرے کا انسان ہونا ہی کافی ہے نہ کہ وہ بہشت کے لالچ میں اچھائی کیے جائے۔ وہ اخلاق کو مذہب سے الگ ایک مستقل بلذات طریقہ عمل سمجھتے تھے۔ تاؤمت کے بانی لاؤتسے کی باتیں اور کنفیوشس کے زیادہ تر افکار مادیت پہ دلیل کرتے ہیں۔ اور اسی زندگی میں مسرت کے حصول کی دعوت دیتے ہیں۔ تاہم اہل چین کے ہاں بھی بدھ مت کی آمد کے بعد راوجی مذاہب کا رنگ پیدا ہو گیا حتی کہ لوگ بتوں کی پوجا بھی کرنے لگے۔ تاہم اہل ہند کی طرح چین کے لوگ بتوں کی اندھی عقیدت سے بندھے ہوئے نہ تھے بلکہ بعض

اوقات جب ان کے ہاں قحط کی صورتِ حال پیدا ہوتی تو وہ اپنے بتوں کے گلے میں رسی ڈال کر اسے گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے اور اس سے یہ سوال کرتے کہ تو بارش کیوں نہیں برساتا؟ وہ اپنے بتوں کو گالیاں دیتے اور آخر میں کوڑے پر پھینک آتے۔ مگر جب بارش ہو جاتی تو وہ انھیں دھو کر اور خوشبو لگا کر پھر سے اپنے گھروں میں سجا لیتے۔

تاؤمت کی اشاعت سے قبل دوسری اقوام کی طرح ان کے ہاں بھی ایک مذہبی دیو مالا تھی جس میں کائنات کی تکوین و تخلیق کے احوال بیان کیے گئے ہیں۔ جس کے مطابق ابتدا میں ہر طرف انتشار تھا فساد تھا جس سے دو قوتیں نبرد آزما ہوئیں جو ''یانگ اور ین'' تھیں اور وہ دونوں مل کر محیط کل بناتی تھیں۔ یانگ آسمان، روشنی، گرمی، حرکت اور تذکیر کا اصول تھا توین ارض پہ تاریکی سکون خنکی اور تانیث کا اصول تھا۔ اہل چین ان دونوں کے باہمی ارتباط کو دائرے کی شکل میں ظاہر کرتے جس میں سفیدی اور سیاہی باہم پیوستہ ہیں۔ اول اول اس دائرے کو اہل چین کے ہاں وہی مقام حاصل تھا جو بودھوں کے چکر، آریاؤں کے سواستکا، عیسائیوں کی صلیب اور مسلمانوں میں ہلال کو حاصل ہے۔ تاہم بعد میں یہ دائرہ محض تزئین و آرائش کے لیے رہ گیا اور اس سے منسوب مذہبی دیو مالا خود سے متروک ہو کے رہ گئی۔ چینی دیو مالا میں آگے بیان کیا جاتا ہے کہ پھر بہت عرصے کے بعد یانگ اور ین سے ایک انسان نے جنم لیا جس کا نام ''پان کو'' تھا اس سے یہ کرہ ارض وجود میں آیا اس نے سورج، چاند اور ستاروں کو بنایا وہ بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ اس کا سر پہاڑوں کی صورت اختیار کر گیا اس کا سانس بادل بنا تو اس کی آواز رعد بن گئی اس کی نسیں دریا بن گئیں اس کی جلد اور بال جنگل بنے اس کے دانت اور ہڈیاں ان معدنیات کی صورت اختیار کر گئیں جو زمین میں دفن ہیں اور اس کا پسینہ بارش بنا اور جو کیڑے اس کے جسم پر رینگتے تھے وہ انسان تھے۔

تخلیق کے اس سارے عمل میں ایک اژدھے نے یانگ اور ین کی مدد کی چنانچہ اژدھا چینی معاشرے میں شہنشاہیت کی علامت بن گیا۔ ۱۹۱۱ء کے انقلاب سے قبل صدیوں تک ان کے جھنڈے میں زرد زمین پر سیاہ اژدھے کی شبیہ ہوا کرتی تھی چینیوں کا خداوند خدا ''شانگ تی'' تھا جو آسمان کا خدا تھا اور چینی الٰہیات کا شخصی خدا بھی۔ تاؤ کو وہ سریانی قوت کی صورت مانتے تھے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تاؤ ہر شے میں سمایا ہوا ہے اور اسے گھیرے ہوئے ہے۔ تاؤ تنہا ہے، غیر متغیر ہے نہ اسے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی آواز سنی جا سکتی ہے۔ تاؤ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے لیکن تاؤ خود کوئی چیز نہیں۔ نہ وہ عرض ہے، نہ وہ جوہر ہے۔ تاؤ غیر محدود

ہے۔نظام سماوی اور نوع انسانی کا اخلاقی عمل اپنی نوعیت کے لحاظ سے یکساں ہے اور اسی لغوی وحدت کو تاؤ مت میں راستہ کہا جاتا ہے۔جس کا مطلب ہے راستہ یا آسمانی راستہ۔لاؤتسے (۵۷۰ ق م) نے اسی تصور پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی اس کا کہنا تھا۔کہ تفکر اور تدبر ایک بے سود چیز ہے یہ عمل فائدے کی بجائے انسان کو نقصان پہنچاتا ہے۔تاؤ اس وقت ملتا ہے یعنی راستہ اس وقت ملتا ہے جب انسان غور و فکر کو خیر باد کہہ دے۔علم اور خرد سے دانش نہیں آتی بلکہ علم و دانش کا رستہ سکون اور عافیت کے لمحات ہیں۔چنانچہ اگر اس پہلو سے تاؤ مت کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بھی بدھ مت کی طرح گریز اور فرار کی دعوت ہی لگتا ہے شاید یہ عرفان و تصوف کی کوئی قدیم لہر تھی جس پہ اہل چین مکمل طور پہ مطمئن نہ تھے مگر اس دور میں ان کے لیے تاؤ مت سے گریز کی راہیں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔نظریاتی اور عملی لحاظ سے تاؤ مت کو ایک منفرد قسم کا لااُبالیانہ پن کہا جا سکتا ہے اس لیے کہ اس میں انسانی ارادے،قوانین حکومت شادی بیاہ وغیرہ سب سماجی رویے بے مصرف اور لاحاصل نظر آتے ہیں۔

پھر تاؤ مت میں مثالیت کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔تاؤ مت ایک منفی رویہ ہے اور انسان کو اس کی تمام ذمہ داریوں سے فرار کی راہ دکھاتا ہے جو مسائل کا حل نہیں بلکہ بے عملی اور کاہلی کی راہ ہے جس میں فلاح کی کوئی گنجائش نہیں۔تاؤ کے پیرو لوگوں کو غموں اور دکھوں سے دور ویرانوں میں زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتے تھے جہاں دکھ کا گذر نہیں ہوتا اور انسان خود فراموشی کی عافیت میں سر دیئے شب و روز بسر کرتا ہے۔وہ لوگوں کو دنیاوی ہنگاموں اور شور سے دور خلوت اور عزلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے اور ساتھ ہی ترکِ علائش کی تلقین کرتے۔لاؤتسے کا قول ہے کہ ''جو جانتا ہے وہ بولتا نہیں اور جو بولتا ہے وہ جانتا نہیں'' چنانچہ اس منفی رویے نے بدھ ازم کے ساتھ مل کر اہل چین کو معاشرتی تنزل میں مبتلا کر دیا۔پھر بدھ مت کی طرح جسے بعد میں خدا تسلیم کر لیا گیا خود لاؤتسے کو بھی اہل چین نے اپنا خدا بنا لیا اور اس کے ساتھ متعدد دیوتاؤں اور شیاطین کا اضافہ کر لیا۔قدیم چین میں مروّج مذاہب نے جس طرح کبھی بھی حیات بعد ممات کے تصور کو قبول نہیں کیا اسی طرح چینی فلسفے میں بھی منطق اور مابعد الطبیعیات سے کبھی اعتناء نہیں کیا گیا اس لیے چینی فلسفہ سراسر عملی اور افادی بن کے رہ گیا۔چینی فلاسفہ کبھی بھی حقیقت کبریٰ کی ماہیت پہ بحث میں شامل نہیں ہوئے اور نہ ہی انھوں نے اہل مغرب کے فلاسفہ ارسطو،کانٹ،ہیگل اور مارکس کی طرح کا کوئی نظام فکر پیش کیا۔چینی فلاسفہ صرف انسانی علائق اور قدروں سے بحث کرتے ان کی تمام فلسفیانہ جستجو کا محور یہ تھا کہ انسانی

زندگی کو کس طرح مسرت کے اس مدار میں داخل کیا جائے جہاں دکھ اور پریشانی نام کو بھی نہ ہو۔وہ اپنے تمام وسائل تو انائیاں اور علوم کو اس راہ میں جھونک دینا چاہتے تھے انھیں اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ انسان کہاں سے آیا ہے اور مر کے کہاں جائے گا۔ان کا اخلاقی اور مذہبی رویہ مروّج مذاہب سے کافی فاصلے پر تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے ہاں مذہب کوئی سنجیدہ مقام نہیں رکھتا تو درست ہوگا۔چنانچہ ان کے اس لاابالی پن کی دلیل یہ ہے کہ ان کو عقلیت پسند بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ نظام کائنات کو عقلیاتی نظام قرار دینے پر بھی اصرار نہیں کرتے بلکہ وہ صرف اس نہج کی عقل و دانش کے حصول کی دعوت دیتے ہیں جسے اختیار کر کے زندگی کی مسرتوں سے پوری طرح حظ اٹھایا جاسکے گویا ان کی مذہبی اور اخلاقی زندگی ایک ہی محور کے گرد گھومتی ہے اور وہ ہے ہر لحہ اور زیادہ سے زیادہ مسرت کا حصول۔چنانچہ ان کے ہاں یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ انسان کسی بھی صورت زندگی کی مسرتوں سے دست کش ہو جائے تاہم ان کے فلسفہ اخلاق میں معقولیت اور میانہ روی جیسے عوامل شامل رہے ہیں۔

کنفیوشس ازم

کنفیوشس کو چین کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا مفکر مانا جاتا ہے۔کنفیوشس ایک چھوٹی سی جاگیردارانہ ریاست میں پیدا ہوا جسے لو(lu) کہتے تھے۔سن پیدائش پانچویں قبل مسیح سے بیان کیا جاتا ہے۔وہ معاشرے کے اس طبقے میں پیدا ہوا جہاں ہر طرف محرومیاں تھیں، جہاں یاسیت کے ڈیرے تھے ۔اس نے ایک بوڑھے سپاہی کے گھر میں جنم لیا۔شعوری عمر تک پہنچتے پہنچتے بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔اس کا دروازہ ہر خاص وعام کے لیے کھلا رہتا اور اس کی سادہ سی باتیں لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہی تھیں۔اگر چہ کنفیوشس نے بھی اہل مغرب کے فلاسفہ کی طرح کوئی ایسا نظام فکر مرتب نہیں کیا جس میں الٰہیات، منطق، سیاسیات، اخلاقیات اور جمالیات کو ایک ہی مرکزی خیال کے تحت منضبط کیا گیا ہو۔بنیادی طور پہ وہ ایک سیاح تھا جس نے محض اس نیت سے سیاحت اختیار کی کہ کسی طاقتور حکمران کو اپنا ہم خیال بنائے اور اسے ان اصولوں کی طرف مائل کرے جو اس کے خیال میں ملک کی کثیر آبادی کے مسائل کا حل تھا۔مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور وہ ابدی نیند جا سویا۔مگر اس نے اپنے تلامذہ کی تربیت کچھ اس انداز سے کی تھی کہ انھوں نے کنفیوشس کے ساتھ اس کے افکار کو دفن نہ ہونے دیا۔چنانچہ انھوں نے نہایت محنت سے کنفیوشس کے افکار کو ملک بھر میں پھیلایا اور اپنے ہمنوا پیدا کیے۔رفتہ رفتہ کنفیوشش ازم کی معقولیت کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا بلکہ اسے دور دور تک اپنا بھی لیا گیا۔کنفیوشس ازم کو کسی بھی درجے میں مذہب نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی کبھی کنفیوشش نے اس کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔مگر اس کے باوجود کنفیوشس ازم اخلاق اور سیرت کا ایک ایسا ضابطہ ثابت ہوا کہ دو ہزار سال تک اہل چین اس کے زیر اثر رہے۔تاہم بیچ میں بدھ مت نے بھی

اپنا اثر دکھایا اور چین کی کثیر آبادی نے بدھ مت کو قبول کر لیا۔ایک چینی فلاسفر نے کنفیوسش ازم اور بدھ مت میں بین تفاوت پہ بحث کرتے ہوئے کہا تھا:

''انسان ایک زندہ اور متحرک مخلوق ہے اور اس کا ہر لمحہ تحرک سے مزین ہے۔حرکت ہی اس کی زندگی ہے وہ خوشی اور مسرت کا خوگر ہے مگر بدھ صرف موت کے بارے میں بات کرتا ہے وہ انسان کے مخفی معاملات میں تو کسی حد تک راہنمائی کرتا ہے مگر انسان کے ان امور کے بارے میں سکوت اختیار کرتا ہے جس کا سامنا انسان کو ہر وقت کرنا پڑتا ہے۔بدھ مت زندہ انسان کے بارے میں اظہارِ خیال نہیں کرتا بلکہ روحوں کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتا ہے وہ زندگی کی تلخیوں اور تنگنائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے حیرت انگیز اور مافوق العادات امور کو اپنی بحث کا موضوع بناتا ہے۔دریں اثنا بدھ ان اخلاقی اصولوں کو بھی بیان نہیں کرتا جن پہ چل کے انسان ایک اعلیٰ اقدار کے حامل معاشرے کا حصہ بن سکے۔بدھ ازم کی بیشتر تعلیمات خیالی ہیں اور ان پہ عمل سے انسان کے اندر یاسیت تو جنم لے سکتی ہے مگر اسے فعال شہری بنانے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔بدھ ازم صرف ان معاملات سے بحث کرتا ہے جو انسان کے پیدا ہونے سے پہلے اور مرنے کے بعد پیش آنے والے ہیں درمیان سے پوری زندگی ہی غائب ہو جاتی ہے اور وہ کسی ایسے اخلاقی یا تمدنی نظام کو بھی پیش نہیں کرتا جو انسان کو اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کے مثبت استعمال کی طرف مائل کر سکے اور انسان اپنی جدوجہد سے اپنی زندگی میں خوشی اور راحت کا سامان مہیا کر سکے۔بلکہ بدھ ازم تو انسان کو خوشی اور راحت سے دور رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔چنانچہ بدھ افکار محسوسات کے دائرے سے کہیں دور ان امور سے زیادہ بحث کرتا ہے جنہیں نہ آنکھیں دیکھ سکیں نہ کان سن سکیں جہاں فکر و نظر کے سب در بند ہوں''۔

□□□□□□□

اس کے برعکس کنفیوشس ازم انسان کو تحرک کی دعوت دیتا ہے وہ فرد اور ریاست کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ؛ ریاست ایک قدرتی ادارہ ہے جس کا فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کی خوشحالی اور مکمل نشوونما کی ذمہ

داری کا حق ادا کرے۔ وہ کہتا ہے کہ ریاست فرد کے لیے ہے نہ کہ فرد ریاست کے لیے۔ وہ اپنے اخلاقی اصول یوں وضع کرتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے لیے ہمدردی اور نیک برتاؤ کے جذبات کو پروان چڑھانا چاہیے۔ وہ کہتا ہے اخلاق حسنہ کا آغاز گھر سے ہوتا ہے جو بڑھتے بڑھتے پورے معاشرے پہ مثبت اثرات ثبت کرتا ہے۔ اس نے ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ تعلق کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ کنفیوشس حاکم اور رعایا، باپ بیٹے، بھائی بھائی، شوہر بیوی اور دوست دوست کے رشتے کو بہت اہمیت دیتا ہے۔

دراصل کنفیوشس ازم بھی ایک مادی فلسفہ ہے اور انسان کی لذت آفرینی کے گرد گھومتا ہے۔ اگرچہ اسے کچھ ایسے نظریات اور عقائد میں مغلوف کر دیا گیا تھا جو اسے ایک سراسر مادی نظریہ کہنے سے روکتا ہے۔ مثلاً یہ عقیدہ کہ بادشاہ آسمان کا بیٹا ہوتا ہے اور وہ ان ارواح کے درمیان جو عالم بالا میں سکونت پذیر ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو اس عالم آب وگِل میں زیست کر رہے ہیں یکساں شفاعت کا ذریعہ ہیں۔ اگرچہ وہ حیات بعد ممات کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں مگر بادشاہ کی شفاعت پہ یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کے کئی نظریات ان کے ہاں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے بادشاہوں کی حکومت کو استحکام بخشا اور وہ غیر معمولی عرصہ تک حکومت کرتے رہے کنفیوشس ازم میں کسی حد تک رجائیت بھی پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ کنفیوشس خود کو انسانی فطرت کا سب سے بڑا مبصر قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ ''میں نے ایک بھی شخص ایسا نہیں دیکھا جو نیکی کا بھی اتنا ہی خواہاں ہو جتنا کہ وہ حسن و جمال کا شیدائی ہوتا ہے'' اس کا سوچا سمجھا عقیدہ تھا کہ مناسب تربیت سے انسان کی مخفی تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

کنفیوشس کو الٰہیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی وہ اس پہ بات کرنے کو آمادہ تھا۔ وہ ہمہ گیر اتحاد کی جستجو کی دعوت دیتا تھا۔ کنفیوشس ازم کی تعلیمات صدیوں چینیوں کے دلوں پہ حاوی رہیں اور اس کے اقوال اور تحریروں کو نصاب میں شامل کر لیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی دانش اور تعلیمات لوگوں کے مزاجِ عقلی میں نفوذ کر گئیں اور انھوں نے ایک ایسی مستحکم تہذیب کو جنم دیا جس نے ملک کو صدیوں تک انتشار اور خلفشار سے محفوظ رکھا۔ چینی صدیوں تک دستورِ کنفیوشس کو مذہبی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ اس دستور میں تین نظموں کے مجموعے اور چار نثر کی کتابیں ہیں جو کنفیوشس اور اس کے کئی لائق شاگردوں کی سوانح اور افکار کی جدوجہد پر مبنی تھیں۔ قدیم زمانے میں بہت سے چینی طلبہ اور علماء کو ان کتابوں اور نظموں کا ایک ایک لفظ زبانی

یاد ہوا کرتا تھا۔تاہم وقت کی راکھ میں کنفیوشس ازم بھی بکھر کر رہ گیا اور اس کا ذکر اب صرف داستانوں میں ہی کیا جاتا ہے۔کیونکہ جمہوری انقلاب کے بعد اب چینی اشتمالی طرزِ زیست کو اپنائے ہوئے ہیں جس میں کسی ایسے عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں جو ان کی پیداوار کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔کنفیوشس کے پیرو کاروں نے بھی آخر اسے خدا بنا کر دم لیا اور اس کو ایک دیوتا کا درجہ دے کر اس کی پوجا کرنی شروع کر دی اور پھر اسے بھلا کر اپنی زندگیوں کا رخ کسی اور طرف پھیر لیا۔اگرچہ صدیوں تک کنفیوشس کو عزت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا مگر اس کے عروج کے زمانے میں بھی اس پہ تنقید کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔

چنانچہ ایک چینی مفکر یانگ چو کنفیوشس ازم پہ تنقید لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ انسانی زندگی دکھ بھری ہے اور اس کا مقصدِ حیات حصول لذت ہونا چاہیے۔یانگ چو بھی اپنے ہم عصروں کی طرح کسی خالق کے وجود سے انکاری تھا مگر اس بات کو بھی قبول کرتا تھا کہ انسان فطری قوتوں کے ہاتھ میں محض ایک کھلونا ہے اس لیے اسے اپنے مقدر کو قبول کر لینا چاہیے۔یانگ چو کنفوشس کے فطری نیکی ہمہ گیر محبت اور نیکوکاری کے فلسفہ کو احمقانہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اخلاق وہ دھوکا ہے جو چالاک اور عیار لوگوں نے سادہ لوح لوگوں کو دے رکھا ہے اور ہمہ گیر محبت کا خیال ایک واہمہ ہے۔زندگی کا اصل اصول ہمہ گیر نفرت اور حسد و بغض ہے۔وہ کہتا ہے کہ موت کے بعد کی نیک نامی کس کام کی اگر زندگی میں دکھ ہی دکھ ہوں۔

وہ کہتا ہے کہ میں خوش اخلاق لوگوں سے زیادہ برے لوگوں کو خوشحال دیکھتا ہوں جو زندگی کے لذائذ سے زیادہ فیض یاب ہو رہے ہیں اور صرف کوئی احمق ہی کنفیوشس کی طرح اخلاق کے چکر میں پڑیگا بلکہ اہل دانش دنیا کی مسرتیں امکانی حد تک سمیٹ لیتے ہیں۔پھر اس عہد میں جب چین میں اشتمالی معاشرہ قائم ہے اور چینی قوم ماؤزے تنگ کی قیادت میں متحد ہوئی ہے تب بھی کنفیوشس ازم پہ تنقید کا سلسلہ جاری ہے خود چیئرمین ماؤ زے تنگ نے بھی اس پہ کافی تنقید کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ کنفیوشس ازم میں روساء اور امرا کے طبقے کی حمایت کی گئی تھی اور عوام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔وہ کہتے ہیں کہ کنفیوشس کا ہمہ گیر محبت کا درس بھی گمراہ کن ہے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ استحصالی طبقے سے بھی محبت کی جائے اور انسان دوستی کا یہ تصور سراسر غلط ہے۔اس لیے کہ کسی بھی معاشرے میں ظلم سے نفرت اور اس کا استحصال کئے بغیر عدل اور انسان دوستی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔تاہم چین میں مختلف اوقات میں دیگر کئی نظام اعتقاد بھی مروّج رہے ہیں جیسے کہ بدھ مت جو پہلی صدی عیسوی میں چین میں متعارف ہوا۔بھارت سے بدھ مت کے مبلغین یہاں پہنچے اور انھوں نے

پوری تن دہی سے بدھ مت کا پرچار شروع کر دیا۔اگر چہ بدھ مبلغین کے لیے چین ایک اجنبی سرزمین تھی اور اہل چین کے لیے بدھ مت ایک اجنبی مذہب اس کے باوجود بھی نہ جانے کیوں چین میں بدھ مت نہایت تیزی سے پھیلا اور نہایت کم عرصے کے اندر ہی وہ چین کا سب سے بڑا مذہب قرار دے دیا گیا۔شاید اس میں اہل چین کی دلچسپی کے کئی پہلو موجود تھے کیونکہ بدھ مت میں ہر طبقہ کے لیے نجات کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود تھا۔اس لیے اس خلا کو پر کرنے کے لیے لوگ جوق در جوق بدھ مت کی طرف لپکے کہ ان کے ہاں مروّج کوئی بھی مذہب آخروی زندگی اور نجات کا قائل نہ تھا اس لیے لوگوں نے اس میں اپنی محرومیوں کا عکس کھوجا۔

اہل چین کے لیے اس میں سکون اور اطمینان کا یہ پہلو بھی موجود تھا کہ ان کے ہمسائے ہندو نظریہ تناسخ کے قائل تھے اور گوتم بدھ کی تعلیمات میں بھی یہ خوش کن منظر موجود تھا کہ اگر کوئی انسان پوری طرح مادی لذتوں سے اجتناب کرے اور گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں مراقبہ کرتا رہے تو اسے جلد نروان نصیب ہوگا۔بدھ نے کہا کہ چونکہ اکثر لوگ جوانی میں زندگی کی لذتوں میں بری طرح مشغول رہتے ہیں اور انھیں بہت کم فرصت ملتی ہے کہ وہ سوچیں کہ موت کے بعد ان کو کیا پیش آنے والا ہے۔لیکن جب ان کی عمر ڈھلتی ہے اور قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں تو انھیں طرح طرح کی بیماریاں اور پریشانیاں گھیر لیتی ہیں اور موت ایک خوفناک حقیقت بن کر ان کو ڈراتی ہے ایسے میں یہ سوچ ان پر غالب آتی ہے کہ اب کیا ہوگا۔مگر اس اہم سوال کا کوئی جواب چین کے مقامی مذاہب میں موجود ہی نہ تھا مگر بدھ مت میں اس کا جواب نروان کی صورت موجود تھا اس لیے بھی بہت سے لوگ بدھ مت سے منسلک ہو گئے۔

پھر ایک اور بات میں بھی اہل چین دوسری اقوام سے مختلف ہیں کہ ان میں کوئی بھی شخص ایک ساتھ کئی مذاہب کا پیرو ہو سکتا ہے اس طرح اگر کوئی چینی بدھ مت قبول کرتا ہے تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کنفیوشس ازم یا تاؤمت سے اپنا تعلق ختم کر لے بلکہ وہ اس تعلق کو بھی برقرار رکھ سکتا ہے اور نئے مذہب کے مزے بھی لے سکتا ہے شاید ہی کوئی دوسری قوم اس طرح کے الجھے ہوئے عقائد کی حامل ہو وہ سب مذاہب سے اپنی عقیدت کا رشتہ قائم رکھتے اور زندگی کی مختلف راہوں پہ پیش آنے والی مشکلات کا حل کسی بھی مذہب سے اخذ کر لیتے اس لیے اکثر اوقات یوں بھی ہوتا کہ اگر ان کے ہاں کوئی انتقال کر جاتا تو اس کے داہیں ہاتھ میں کنفیوشس کی کوئی کتاب بائیں ہاتھ میں تاؤ کی کوئی کتاب اور سینے پہ بدھ کی تعلیمات سے سجی کوئی کتاب

رکھ کر اس کو دفن کر دیا جاتا۔ چنانچہ ہندوستان جہاں بدھ نے جنم لیا جہاں بدھ کو گیان حاصل ہوا جہاں بدھ مت کی بنیاد رکھی گئی جب وہاں اس کا سورج غروب ہو رہا تھا تو انھی دنوں بدھ مت کا سورج چین میں طلوع ہو رہا تھا اور اسے نیا خون اور ولولہ بھی دستیاب ہو رہا تھا چین کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہوا کہ تقریباً پوری قوم ایک ہی عقیدے یعنی بدھ ازم کے سائے میں متحد ہوگئی۔ اگر چہ ماضی میں یہی قوم کئی منتشر اور علاقائی عقائد کی حامل تھی اور ان کے لوگ مختلف مظاہرِ فطرت کی پوجا کرتے تھے۔ دریاؤں، ہواؤں سے لے کر سمتوں یعنی مشرق اور مغرب بھی ان کے معبود تھے۔ ان کے ہاں دوسری اکثر اقوام کی طرح قربانی کا رواج بھی موجود تھا وہ جانوروں کی قربانی کرتے اور عام طور پر گوشت کو کھانے کی بجائے جلا دیتے۔ وہ اپنے دیوتاؤں کو شراب بھی بھینٹ کرتے جو ان کی پسندیدہ قربانی تھی۔ شانگ خاندان کے دورِ حکومت میں وہ دیوتاؤں پر انسان کی قربانی بھی کیا کرتے اگر چہ شانگ کو اپنے مہذب ہونے کا دعوی بھی تھا۔ تاہم وہ اپنے دیوتاؤں کے چرنوں میں عموماً غیر چینیوں کی قربانی کرتے جو دشمن سے جنگوں کی صورت میں ان کے ہاتھ آتے۔ اہل چین عموماً ایسے دیوتاؤں کی پوجا کرتے جو ان کے خیال میں بروقت بارشیں برسانے جنگوں میں دشمن کو شکست دینے اور عمدہ فصلیں اگانے کی طاقت رکھتا ہو۔ ان کا وہ دیوتا جس کے سپرد یہ سارے امور تھے اس کا نام ''شانگ ٹی'' تھا۔ قدیم چینی مذاہب کی تعلیمات سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ ان کے مذاہب کی بنیاد روحانیات یا اخلاقیات پر تھی۔ ان کے مذہبی رجحان کی ساری بنیاد مادیت پر ٹکی تھی اور ان کے سب مذاہب قلب کی روشنی، روح کا اطمینان یا اخلاق فاضلہ کی تعلیمات سے عاری تھے جس طرح بابل اور نینوا کے مذاہب تھے۔

تہذیب معاشرت اور فنون لطیفہ

قدیم چینی تہذیب اور اس کے نظامِ مملکت پہ بحث کرتے ہوئے مشہور مورخ ''مردوخ'' لکھتا ہے کہ اس زمانے کے چین کا شمار دنیا کے متمدن ترین ممالک میں ہوتا تھا۔ وہ فوجی طاقت اور علوم وفنون کی ترقی اور نظم و نسق کے لحاظ سے دنیا کا بہترین ملک شمار ہوتا تھا اور تاریخِ چین میں اس سے زیادہ اور کوئی درخشاں دور دکھائی نہیں دیتا۔ ''آرتھر والی'' کہتا ہے کہ تانگ خاندان کے دورِ حکومت میں چین بلاشبہ دنیا کا عظیم ترین اور متمدن ملک تھا۔ اہل مغرب نے اٹھارویں صدی میں چین کی تاریخ وتمدن میں دلچسپی لینا شروع کی جب فرانس میں خِردافروزی کی تحریک عروج پر تھی۔ فرانس کا ایک دانشوّر اہل چین کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ چین کے باشندے قدامت آرٹ عقلیت اور دانش وحکمت میں تمام ایشیائی تہذیبوں سے آگے ہیں۔ بعض اہل قلم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بہت سے پہلوؤں میں اہل چین یورپ کی مہذب اقوام سے بھی آگے تھے۔'' ''Waltare'' نے بھی چین کی تہذیب اور نظم ونسق کو اقوام عالم میں بہترین قرار دیا ہے۔ قدیم چین میں شاہی رنگ زرد تھا اور اژدھا شہنشاہیت کی علامت تھا۔ شہنشاہ اژدھے کی شکل کے تخت پر بیٹھتا تھا اور زرد رنگ کا ریشمی لباس پہنا کرتا تھا۔ سلطنت کا انتظام وزراء اور قابل اہلکاروں کے ہاتھ میں ہوتا تھا جنہیں مقابلے کے امتحانوں میں منتخب کیا جاتا۔ چنانچہ ان کے ہاں اعلیٰ عہدوں پہ وہی لوگ فائز ہوتے جن کی دیانتداری اور قابلیت مسلّم ہوتی، رشوت خوری اور بدیانتی پہ سخت سزائیں مقرر تھیں اور ان پہ عمل درآمد بھی ہوتا تھا۔ اگر کسی اعلیٰ حکومتی عہدیدار پہ رشوت کا الزام ثابت ہوجاتا تو اسے اس کے بیوی بچوں سمیت موت کی سزا دی جاتی اور اس کی جائیداد کو ضبط کرلیا جاتا۔ قدیم چین کے اس خوشحالی کے دور میں مکمل مساوات قائم تھی

اور تعلیم کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے تھے۔ مقابلے کے امتحان میں ہر ہنر اور پیشہ کا شخص شریک ہو سکتا تھا۔ یہ امتحان ایک کڑی آزمائش کا درجہ رکھتا تھا اور کامیاب ہونے والے لوگ ہی نظامِ مملکت میں اعلیٰ عہدوں تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ اس میں علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ امیدوار کے ذاتی اوصاف، قوتِ فیصلہ، حاضر دماغی اور پیش رفت کی صلاحیت کو بھی جانچا جاتا۔ چنانچہ اس کسوٹی سے صرف ممتاز اوصاف اور نمایاں قابلیت کے حامل افراد ہی کامیابی کی سند حاصل کرتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ملک میں خانہ جنگیوں اور کئی سیاسی انقلابات کے باوجود ملک کا نظم ونسق اور بنیادی انتظامی ڈھانچہ اپنی جگہ پر قائم رہتا تھا۔ کہتے ہیں صحافت کی بنیاد بھی قدیم چین کے دساتیر نے ہی فراہم کی کہ ان کے پرچہ نویس نہایت جرأت اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہنشاہ تک کی ذاتی خامیوں کو منظر عام پہ لے آتے۔

محتسب بے باک اور مستعد تھے اور اہلکاروں کے بارے میں براہ راست شہنشاہ کو پرچے لکھتے تھے۔ وہ عوام کی تمام مشکلات سے شہنشاہ کو آگاہ رکھتے اور شہنشاہ اہلکاروں کو عوامی فلاح کے منصوبوں پر عمل درآمد کا حکم دیتے۔ اہل چین کہتے ہیں کہ ان کی قوم پانچ مختلف نسلوں کے اختلاط پہ مشتمل ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد چینی پھریرے میں پانچ دھاریاں تھیں۔ سرخ قدیم چینیوں کے لیے، زرد ماؤنچوں کے لیے، نیلی مغلوں کے لیے، سفید ترکوں کے لیے اور سیاہ تبتیوں کے لیے۔ چین کے اکثر باشندے مغولی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے جو زردی، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں، سر کے سیدھے بالوں اور ترچھی آنکھوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ چین کے تمدن میں سات ہزار برسوں کا تسلسل ہے اور اِس کا شمار دنیا بھر کے قدیم ترین تمدنوں میں ہوتا ہے۔ علمائے آثارِ قدیمہ کے خیال میں یہ ۳۵۰۰ ق م سے بھی پہلے کا ہے۔ پیکن کی ٹیم کو جو انسانی کھوپڑی ملی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چین میں معلوم تاریخ سے صدیوں پہلے بھی انسان آباد تھا۔ اہل چین نے اپنے معاشرے میں تمام علوم وفنون کی سرپرستی سرکاری سطح پر کی۔ اہل چین حضرت مسیح علیہ سلام کی پیدائش سے پندرہ سو سال پہلے بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ چینی رسم الخط جب وجود میں آیا اس وقت دنیا کی شاید ہی کوئی دوسری قوم ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہو۔

چینی رسم تحریر دنیا کا وہ واحد رسم الخط ہے جس کی بنیاد حروفِ تہجی پر نہیں رکھی گئی بلکہ علامات پر رکھی گئی ہے۔ اس رسم تحریر کو خیال نگاری بھی کہا جا سکتا ہے یعنی چینی زبان اپنے الفاظ اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے کسی نہ کسی علامت خیال یا فنی و علمی تصور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس میں کسی ایک خیال یا ایک تصور کو ایک ہی لفظ

میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے چینی زبان سیکھنے کے لیے کم از کم تین ہزار علامتیں جاننے کی ضرورت ہے۔ اگر چہ اہل علم نے اس نوع کی تیس چالیس علامتوں کے لغات بنائے ہیں۔چین میں بے شمار بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں سب سے بڑی ''کوان '' تھی جسے غیر ملکی مندارین بھی کہتے ہیں۔لیکن تحریری زبان ملک بھر میں ایک ہی ہے۔جس کی وجہ سے ملک بھر میں لسانی یکجہتی پائی جاتی ہے اور یقیناً اسی لیے چین کے ایک سرے کا عالم ہزاروں میل دور کے عالم کی تحریر کو بغیر کسی دقت کے پڑھ لیتا تھا۔

بعد میں چینی زبان کے صوتی عناصر اہل جاپان کے ہاں بھی منتقل ہو گئے۔چینی زبان دوسری زبانوں کی طرح محض مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ وہ چینیوں کے جمالیاتی نصب العین کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔اہل چین قدیم زمانے سے ہی خوش نویسی اور نقاشی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھتے وہ جس قلم سے لکھتے ہیں اسی سے تصویر کشی بھی کرتے ہیں اس طرح چینی رسم تحریر اور نقاشی ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔چین کے باشندے قدیم تاریخی ادوار سے ہی خوش نویسی کو فنون لطیفہ میں شمار کیا کرتے تھے۔پھر چین میں ٹائپ چھاپے اور کاغذ کی ایجاد نے علوم و معارف کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔مشرقی چین میں بلاک کی چھپائی کا آغاز دسویں صدی کے اوائل میں ہی ہو چکا تھا۔سب سے پہلے بلاک سے کرنسی نوٹ چھاپے گئے چھاپے کی ایجاد تحریروں پر مہریں ثبت کرنے کی رسم سے ہوئی۔چنانچہ چینی زبان میں چھاپے اور مہر کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔بلاک کی چھپائی سے ''سونگ عہد'' کی اِحیا علوم کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی اور ہر موضوع پر بے شمار کتابیں چھپنے لگیں۔

اس طرح اطالیہ سے دوسو برس قبل ہی چین میں نشاطِ ثانیہ کی تحریک جنم لے چکی تھی۔بلاک کے رواج کے بعد مذہبی علمی اور ادبی کتب کے ساتھ ساتھ لغات اور قاموس کی ضخیم کتابوں کی اشاعت بھی وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔تاریخ کی ترتیب و تدوین کے علاوہ اس دور میں چینیوں نے فلسفہ سیر و سوانح فن طب،فن زراعت کے علاوہ شعر و سخن پر بھی خاصی توجہ کی تاہم عجیب بات ہے کہ انھوں دنیا کے دوسرے معروف علوم ریاضیات طبعیات اور منطق و استدلال اور مذہبیات کو چنداں اہمیت نہیں دی۔چھاپہ چینیوں کی ایسی عظیم ایجاد ہے جسے افادیت کے لحاظ سے بلا تعامل تحریر کے بعد دوسرے درجے پر رکھا جاسکتا ہے۔دنیا کی قدیم ترین مطبوعہ کتاب چھاپنے کا شرف بھی چین ہی کے پاس ہے۔اس کتاب کا نام''ہیرا سوترا'' بتایا ہے جو ایک بدھ سوامی کی تحریر تھی جس پہ اس کی تاریخ اشاعت ۱۱مئی ۸۶۸ء لکھی ہوئی ہے۔چین کے متعلق بجا طور پہ کہا جاسکتا ہے

کہ وہ اہل علم کا ملک ہے اور جہاں صدیوں سے اہل علم ہی حکومت کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ اہل مغرب کے فلاسفہ نے دل کھول کر اہل چین کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اس ضمن میں ''Waltear'' رقم طراز ہے کہ؛

''میں نے کنفوشس کی کتابوں کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور ان سے اقتباسات بھی لیے ہیں۔ میں نے ان میں پاکیزہ ترین اخلاق پایا ہے جس میں ہمارے ہاں کی ریا کاری کا شائبہ تک نہیں ہے۔'' ''Lab tenze'' کہتا ہے کہ ''اہل مشرق اور اہل مغرب کے فلسفوں میں ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ اہل مغرب کو اپنی اخلاقی پستی پر غور کرنا چاہیے اور اس کے لیے چین کے مفکرین کو یورپ مدعو کرنے کی ضرورت ہے تا کہ وہ انھیں مقاصدِ حیات سے آگاہ کر سکیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ اگر کسی دانشمند کو اقوام عالم کی نیکی جانچنے کے لیے منصف مقرر کیا جائے تو لامحالہ وہ اپنی رائے چینیوں کے حق میں مقدم رکھے گا۔ اہل چین قدیم زمانوں سے اپنے اخلاقی اور سماجی رویوں کو ترتیب دینے کی جس مشق سے گذرے ہیں دنیا کو اس سے راہنمائی لینے کی ضرورت ہے۔ بارود اور کاغذ کی ایجاد بھی اہل چین کی تمدنی برتری کا ثبوت ہیں۔ اول اول انھوں نے بارود کا استعمال مذہبی حوالے سے کیا۔ وہ ارواح خبیثہ کو خود سے دور رکھنے کے لیے بارود کے دھماکے کیا کرتے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

چین اس بات پہ فخر کرنے میں حق بجانب ہے کہ ان کے ہاں قدیم زمانوں سے ہی کاغذ کے استعمال کا رواج ہو گیا تھا۔ ابتداء میں توت کی چھال سے کاغذ بنایا جاتا تھا۔ پھر جب ہندوستان سے بدھ سوامی کپاس لائے تو وہ روئی سے کاغذ بنانے لگے۔ لفظ کاغذ چینی زبان کے لفظ کوکوذ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ روئی سے کاغذ بنانے کا طریقہ ترکمانستان والوں نے چینی قیدیوں سے سیکھا اور پھر ثمرقند میں بھی کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہو گئے تھے۔ ۷۰۴ء میں مسلمان ثمرقند پر قابض ہوئے تو انھوں نے بھی کاغذ بنانا سیکھ لیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے دمشق حلب اور بغداد میں بھی کاغذ سازی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اطالیہ والوں نے کاغذ

سازی کا یہ فن صقیلہ کے مسلمانوں سے سیکھا پھر رفتہ رفتہ پورے یورپ میں اس کا رواج ہو گیا۔ چین کے ناقدین ادب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کے اردگرد موجود تلخ حقائق کی نشاندہی کرتا ہے دوسرا وہ ادب جو انسان کو لطیف احساسات سے آگاہ کرے اس کی تفریح اور مسرت کا باعث بنے۔ ان کے نزدیک اول الذکر صنفِ ادب کو تشریحی اور معروضی ادب کہا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا موضوعی اور متغزلانہ ادب کہلاتا ہے۔ اہل چین تشریحی اور معروضی ادب کو فوقیت دیتے ہیں کہ اس سے انسانی فکر ونظر کی تربیت ہوتی ہے اور لوگوں کے اخلاق پر صالح اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ چین میں شاعری کے علاوہ ناول اور ناٹک کی اصناف بھی مقبول تھیں۔ اگرچہ چینی انھیں ادب عالیہ میں شمار نہیں کرتے۔ چینی ناولوں اور داستانوں میں قدیم اور وسطی زمانوں کے معاشروں کی عکاسی کی گئی ہے۔

جب کہ چینی ناٹک میں نثر نہیں بلکہ اپنی نوعیت کے حوالے سے وہ فی الاصل غنائیہ ہے جس میں اداکاری کی نسبت موسیقی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اہل چین قدیم زمانے سے ہی شاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ ان کے ہاں کبھی یہ رواج تھا کہ بعض شعرا صبح صبح ہی اُٹھ کے دس بیس نظمیں کہہ لیتے اور انھیں رنگ برنگے کاغذوں پر منتقل کر کے ایک بانس پر لٹکا لیتے اور بازار میں نکل جاتے۔ اہل ذوق ان نظموں کو فوراً ہی خرید لیتے۔ دوسرے فنون وعلوم کی طرح چینی شاعری بھی فطرت پرستی کی لطیف مثالوں سے مزین ہوتی۔ اہل چین کا خیال تھا کہ نظم کو بے حد مختصر ہونا چاہیے کیونکہ وہ ایک لمحہ کے جذباتی ایجاز کی تخلیق ہوتی ہے۔ طویل نظموں کو ناپسندیدہ خیال کیا جاتا اس لیے ان کی نظم ایک ہی تمثالی پیکر پیش کرتی تھی۔ چینی نقاد شاعر کے کردار اور اس کی نظم کے مابین گہرا اور محکم رشتہ مانتے تھے اور کہا کرتے کہ ایک اعلیٰ شاعر کے لیے اعلیٰ کردار کا مالک ہونا ضروری ہے۔ چینی شاعروں نے شاعری اور مصوری کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ شاعر وانگ کہتا ہے کہ اس کی ہر نظم ایک تصویر ہے اور اس کی ہر تصویر سے ایک نظم کا مکمل تاثر اخذ کیا جا سکتا ہے۔

اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ قدیم چینی غیر معمولی ذوقِ جمال اور اختراعی قابلیت کے مالک تھے اور تمام فنونِ لطیفہ میں یکساں قدرت و دسترس رکھتے تھے۔ ان کے فنِ تعمیر میں پگوڈا کو وہی مقام حاصل ہے جو ہندوؤں کے شکھر، بودھوں کے وہارا، یہودیوں کے ہیکل عیسائیوں کے کلیسا اور مسلمانوں کی مسجد کو دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ ایسی عمارت تعمیر کرتے جو عبادت گاہ بھی ہوتی اور فنِ تعمیر کا شاہکار بھی تصور کی جاتی۔ چین

میں قصبوں اور دیہات میں ہر کہیں پگوڈے دکھائی دیتے اور ان کی گھنٹیوں کی سریلی آواز دلوں کو موہ لیتی۔ چینی اپنی عمارتوں کو اونچے چبوتروں پر تعمیر کرتے تھے۔عمارت کہگل سے بنائی جاتی اور سامنے کے حصے میں پتھروں سے چنائی کی جاتی۔ مکانوں میں لکڑی کی خوبصورت اور منقش جالیاں دیواروں کا کام دیتیں۔دلانوں پر ستون تعمیر کیے جاتے جنہیں شنگرفی سرخ رنگ کیا جاتا اوران پہ شوخ رنگوں سے نقش و نگار بنائے جاتے وہ اپنی چھتوں کو بھی رنگتے تھے۔

شاہی محل کی چھتوں اور دیواروں کو زرد رنگ کیا جاتا جو شہنشاہیت کی علامت تھا۔چینی فن تعمیر کا عظیم کارنامہ دیوارِ چین کو قرار دیا جاتا ہے یہ دیوار تقریباً پندرہ سو میل لمبی ہے اور پہاڑوں جھیلوں وادیوں اور میدانوں سے گذرتی چلی جاتی ہے۔اس کی تعمیر تیسری صدی قبل مسیح میں شہنشاہ ہوانگ شی نے شروع کی تھی اور اس کے برجوں میں جابجا فوجی چوکیاں قائم کردی گئی تھیں۔اس دیوار کی تعمیر کا بنیادی مقصد ملک کو شمال کے وحشی ہنوں کے حملوں سے محفوظ کرنا تھا۔چنانچہ جب دیوارِ چین ہنوں کے حملوں کی راہ میں رکاوٹ بنی تو انھوں نے مغرب کارخ کیا اور روم کی سلطنت کو تہہ وبالا کرڈالا۔(Watare) نے دیوار چین کا ذکر کرتے ہو لکھا تھا کہ اس عظیم تعمیری کارنامے کے آگے فراعینِ مصر کے اہرام محض ملبے کا ڈھیر دکھائی دیتے ہیں۔چینی بت تراش بھی تھے اگر چہ بت پرستی کو ان کے ہاں وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جوانڈیا اور دیگر کئی علاقوں میں حاصل تھا۔چینی لکڑی اور سنگ مرمر کے مجسّمے تراشتے تھے۔آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو چین میں قدیم کھنڈروں سے جانوروں اور دوسرے دیوتاؤں کے سینکڑوں بت حاصل ہوئے ہیں۔چین میں بدھ کی اشاعت کے ساتھ ہی بت تراشی کا رواج عام ہوگیا تھا اور چینی سنگ تراش کانسی کے مجسّمے بھی ڈھالنے لگے۔وہ شبیہ نگاری کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہ کرتے تھے۔

ان کے دسویں صدی عیسوی کے بنائے ہوئے مجسّمے فطرت نگاری کے خوبصورت نمونے ہیں۔سونگ خاندان کے عہدِ حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی مذہبی مجسّمہ سازی کو بھی زوال آ گیا۔فن مصوری کا ذکر ہو چکا ہے کہ چینی مصوری اور خوش نویسی میں چنداں فرق نہیں کرتے تھے اور وہ جس موقلم سے لکھتے اسی سے تصویریں بناتے۔تحریر اور تصویر کے لیے وہ روشنائی کا لک گونداور تیل کا آمیزہ استعمال کرتے۔تاہم بعد میں دیگر رنگوں کا استعمال بھی رواج پا گیا چینی مصور سایہ اور تناظر کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور قدرتی مناظر کو متوازی سطح سے نہیں بلکہ بالائی سطح سے دیکھنے کے عادی تھے۔ان کے ہاں مصوری کا مقصد حقیقت کی نقاب کشائی کرنا نہ تھا

بلکہ اسالیب کے وسیلے سے گریزاں رنگِ مزاج کی ترجمانی کرنا تھا۔ وہ ہیئت کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اس کے لیے وہ رنگوں کی بجائے خط کشی کا اہتمام کرتے تھے۔ چینی مصوروں نے کبھی بھی محاکات (نقالی) سے اِعتنا نہیں کیا وہ حقیقت کی بجائے حسن کے ترجمان تھے اور شبیہ نگاری سے ان کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر پھولوں پرندوں درختوں اور کہساروں کی تصویر کشی کرتے تھے چنانچہ مشہور سیاح ابن بطوطہ ان کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

''فن تصویر کی پختگی اور کمال میں کوئی قوم چینیوں کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی نہ رومی نہ ان کے علاوہ کوئی اور قوم، کیونکہ یہ لوگ اپنے اس فن کی پختگی میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ چین میں جناب مسیحؑ کی پیدائش سے سینکڑوں برس پہلے مصوری اپنی ترقی یافتہ صورت میں موجود تھی سونگ شہنشاہوں کے دورِ حکومت میں اہل چین کا شوقِ تصویر کشی جنون کی صورت اختیار کرگیا تھا اور اس عہد میں مصوری نے بدھ اسلوب سے گلوخلاصی کرالی تھی اور وہ آزادانہ نشوونما پانے لگی تھی''۔

❑❑❑❑❑❑❑

شہنشاہ ہوئی تو سونگ خود بھی ایک بلند پایہ مصور تھا، اس کے عہد میں صفِ اول کے آٹھ سو مصوّر موجود تھے۔ تانگ عہد میں اس فن کو بڑی ترقی حاصل ہوئی تھی۔ اس زمانے کا عظیم مصور ''وتاؤتسی'' تھا جو ریشم، کاغذ اور دیوار پر مصوری میں یکساں مہارت رکھتا تھا۔ شمالی چین کے مصور آخر تک کلاسیکی روایات کی سختی سے پابندی کرتے رہے جب کہ جنوب میں رومانی میلان رونما ہوا جس میں جذبات کے بے محابہ اظہار پر زور دیا جاتا تھا۔ چین کا عظیم ترین مصور ''تاؤتزو'' تھا جس نے بودھوں کے معبد میں تین سو سے زیادہ نقوش بنائے تھے۔ چینیوں کا فطری مناظر سے عشق ان کے ادب، شاعری فلسفے اور مصوری میں بھی نفوذ کرگیا۔ انھوں نے قدرتی مناظر، پہاڑوں، جھیلوں، جنگلوں اور پھولوں کی بے مثال تصویریں بنائیں۔ ان کی اصطلاح میں منظر کشی کا نام پہاڑ اور پانی تھا۔ چینی مصوّر فطری مناظر کی بین ہی نقالی سے اجتناب کرتا تھا۔ وہ کسی منظر کو دیکھ کر پہروں اس پہ غور و تعمق کرتا اور جب تمثالی پیکر اس کی چشم تصور میں اتر آتا تو وہ اپنے موقلم کی چند تیز جنبشوں

سے اسے کاغذ یا ریشمی پارچے پر منتقل کر دیتا۔ان کے قدرتی مناظر میں انسان کو حقیر و صغیر دکھایا گیا ہے ایک مغربی مصور (C M JOUAD) لکھتا ہے کہ:

''چینی آرٹ بڑا سکون بخش ہے کسی کا قول ہے کہ عظیم ترین موسیقی آواز میں نہیں بلکہ سکوت میں مخفی ہے، چینیوں کی تصویریں اور منقش پارچے دیکھ کر میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ ان کی تصاویر میں ہمیشہ بڑے بڑے کوہستان اور جھیلیں دکھائی جاتی ہیں جن کے پس منظر میں انسان حقیر تنہا اور دھندلا سا دکھائی دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ چینیوں کو انسان کی نقاشی میں بالکل دلچسپی نہ تھی اور وہ اس کے جمالیاتی ممکنات سے بے پرواہ تھے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

چینی مصوری نے اسلامی دور میں بغداد ہرات اور تبریز کے مکاتبِ مصوری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔چنانچہ ایل خانی سلاطین کے عہدِ حکومت میں جب چین پر ان کے ہم نسل مغل حکمران تھے تو اسلامی ممالک اور چین کے مابین سفیروں تاجروں عالموں معماروں کاریگروں اور فنکاروں کی آمدورفت جاری رہتی تھی جس سے چینی مصوری کے اسالیب اسلامی ممالک میں رواج پا گئے۔
ایک مغل مورخ لکھتا ہے کہ:

''چینی مصور اور نقاش عہدِ عباسیہ کے اوائل میں کوفہ میں موجود تھے اور وہاں عربوں کو مصوری اور نقاشی سکھاتے تھے۔''

❑❑❑❑❑❑❑

پروفیسر آرنلڈ جو ایک مغربی مورخ ہے نے لکھا ہے کہ اہل ایران چینی مصوروں سے کتابوں اور اشعار کی تزئین میں مدد لیتے تھے جس کی وجہ سے اہل ایران کے اسلامی فن پر چینی مصوری کا اثر پڑنا شروع ہوا۔وہ اپنی تصویروں میں طبعی مناظر اور چینی مصوری کے خصائص داخل کرنے لگے۔اس میں شک نہیں کہ عہدِ مغول کی

اسلامی مصوری میں چین کا اثر جلی اور قوی نظر آتا ہے سبب یہ تھا کہ ان فاتحین نے چین کے بہت سے اہل فن کو بغداد میں سہولیات فراہم کر دیں تھیں اور ان کے عوض مسلمان صناع قراقرم بھیجے گئے۔ پروفیسر آرنلڈ کا بیان ہے کہ ہلاکو خان نے بہت سی تصویر دار کتابوں اور مصوروں کو ایران بھیجا۔ پھر مغلوں کی حوصلہ افزائی نے فن مصوری کو عالم اسلام میں اس درجے پر پہنچا دیا تھا جس کی نظیر اس سے قبل عالم اسلام میں نہیں ملتی۔ فن اسلامی پر ایران کی اس مصوری کا گہرا اثر پڑا اور اس کا عکس نہ صرف ہندوستان کے مغول آرٹ میں نظر آیا بلکہ اسلامی ادب میں بھی اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

قدیم زمانے سے ہی چینیوں کے پیش نظر دو مقاصد رہے ہیں دانش کا حصول اور حسن و جمال کی ترجمانی۔ چنانچہ جس طرح وہ دانش کے حصول کے لیے مابعد الطبیعات کو بے ثمر خیال کرتے تھے اسی طرح وہ حسن و جمال کے نظریاتی پہلو سے بھی بے توجہی اختیار کرتے اور اس کے صرف عملی اور افادی پہلو پر توجہ دیتے۔ ان کے ہاں فنکار اور کاریگر میں کوئی فرق نہ تھا اور وہ روزمرہ کی عمومی مصنوعات کی تیاری میں بھی جمالیات کے پہلو تلاش کر لیا کرتے تھے۔ ان کے اس ذوقِ جمال کا عکس ان کے برتنوں ملبوسات پردوں اور جالیوں میں ملتا ہے جن پہ بے مثال گل کاری کی گئی ہوتی۔ سونگ خاندان کے عہدِ حکومت میں اہل چین اپنے گھروں اور معبدوں کو خوبصورت اشیاء سے سجاتے جن میں نساجی دھات کے کام یشب تراشی کانسی لکڑی اور ہاتھی دانت کے کام میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مشہور عرب مورخ مسعودی ان کے تمدنی احوال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

> ''خدا کے بندوں میں اہل چین کی دستکاری اور نقش گری میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اور کوئی قوم ہاتھ کے کام میں ان پہ سبقت نہ لے جاسکتی تھی۔ باریک صنعات میں چینیوں کو ایسی مہارت تھی کہ کوئی دوسری قوم ان کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ اہل چین اگر کوئی چیز دیکھیں تو اس میں عیب ضرور نکالتے اور کہتے کہ ہمارے سواد نیا میں کوئی قوم دستکاری نہیں جانتی''۔

□□□□□□□

مشہور ایرانی مورخ جاحظ نے اس وقت کی دنیا کو یوں تقسیم کیا ہے:

”کہ چینی صناعت میں، یونانی حکمت میں ساسانی نظم مملکت میں اور ترک فنِ حرب میں کسی کو اپنا مقابل نہ جانتے تھے“۔

❑❑❑❑❑❑❑

ریشم سازی بھی خالصتاً چینی صنعت تھی وہ ریشم کے کیڑوں کو شہتوت کے درخت پر پالتے اور اس سے ریشم حاصل کرتے۔ کہتے ہیں ۵۵۲ء میں نسطوری راہبوں نے چین سے ریشم بافی کا طریقہ سیکھا اور اہل مغرب تک منتقل کیا۔ انگلستان میں اس کا رواج پندرہویں صدی میں ہوا۔ اہل چین کے ریشمی پارچہ جات منگولیا ،ترکستان، ایران، کابل، پنجاب، دلی، بنگال اور تبت سے گذرتے ہوئے بغداد تک پہنچتے تھے۔ کہتے ہیں شام کے بازاروں میں چین کا ریشم سونے میں تل کر بکتا تھا۔ رومہ میں بھی چینی ریشم بہت گراں جنس تھی اور صرف سلاطین اور امراء کو ہی میسر آسکتا تھا۔ چینیوں کے عملی ذہن نے جس طرح مابعدالطبعیات میں دلچسپی لینے کی بجائے اخلاق وعمل کو اپنا موضوع فکر بنایا تھا اسی طرح انھوں نے نظری سائنس ریاضیات اور طبعیات کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور ہمیشہ سائنس کے عملی اور افادی پہلو کو پیش نظر رکھا۔ چنانچہ اہل چین نے عملی سائنس کو اپناتے ہوئے عظیم ایجادات کیں جن میں سے بعض انقلاب آور ثابت ہوئیں۔ ان میں ٹائپ بلاک کی چھپائی اور کاغذ کی ایجاد کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ مگر بارود اور قطب نما کی طرف توجہ دلانا باقی ہے۔ اہل مغرب ان ایجادت سے عربوں کے واسطے سے روشناس ہوئے۔ ابتداء میں چینی بارود کو آتش بازی کے لیے استعمال کیا کرتے لیکن بعد میں جنگوں میں بھی اس کا استعمال رواج پا گیا۔ بارود تانگ عہد کی ایجاد ہے اور سونگ خاندان کے عہدِ حکومت میں اسے جنگی ہتھیار بنا دیا گیا۔ چینی میدان جنگ میں جلتی ہوئی ہوا ہیاں دشمن کی صفوں اور فرودگاہ میں پھینکتے تھے۔

چنگیز خان نے جب چین فتح کیا تو وہ بارود کی تیاری کے لیے چین سے کاریگر بھی اپنے ساتھ لیتا گیا جو اس فن کے ماہر تھے جن کی مدد سے اس نے دنیا کا سب سے پہلا توپ خانہ بنایا۔ وہ لوگ منجنیقوں سے اڑتی ہوئی آگ دشمن کی طرف پھینکتے۔ عربوں نے بھی بارودسازی کا ہنر چینیوں سے سیکھا تھا۔ مغرب میں اس کا رواج روجر بیکن کے زمانے میں ہوا۔ جس نے عربوں کی کتابیں پڑھ کر بارود بنانا سیکھا۔ صلیبی جنگوں میں پہلی دفعہ عربوں نے بارود کے موثر استعمال کو رواج دیا۔ وہ پہلے دشمن کی رسدگاہوں میں منجنیقوں سے خام تیل پھینکتے

پھر آگ لگے تیروں سے ان میں آگ لگا دیتے ۔ہندوستان میں پہلی دفعہ توپ خانہ ظہیر الدین بابر نے استعمال کیا ۔قطب نما بھی چینیوں کی انقلاب آور ایجاد ہے چینیوں نے اس سے بحری سفروں میں کام نہیں لیا مگر عرب جہاز رانوں نے اس کو سمندر میں سمتوں کے بھلاوے کے بہترین توڑ کے طور پہ استعمال کیا۔ عربوں کے توسط سے اہل مغرب اس ایجاد سے آشنا ہوئے اور بحری سفروں میں آسانی ہوگئی۔اس کی مدد سے میجی لان ،کولمبس اور واسکوڈے گاما نے نئی دنیائیں دریافت کیں۔قدیم چین کے سماجی معاشی معاشرتی تہذیبی تمدنی اخلاقی اور عقائدی حالات کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ اہل چین نے کبھی بھی کسی بھی زمانے میں خالق کی تلاش کو ایک امرِ سنجیدہ کے طور پہ نہیں لیا۔

شاید چین کی ہمیشہ سے بڑھی ہوئی آبادی نے اسے کبھی پیٹ کی بھوک کے علاوہ اپنی ذات کی کسی اور ضرورت اپنی زندگی کے کسی اور خلا کے بارے میں سوچنے کا وقت ہی نہیں دیا۔چین میں جمہوری اور اشتمالی انقلاب سے پہلے بھوک اور افلاس کا یہ عالم تھا کہ وہ کتے ،بلی ،گدھے ،سور اور چوہے تک کو کھا جاتے تھے۔جب کہ ان کی ہمعصر دوسری اقوام کے معاشی حالات بھی اگرچہ اتنے ہی برے تھے جتنے کہ چین کے مگر وہ اپنے عقائد اور مذاہب کے بارے میں بڑی حد تک سنجیدہ تھے چاہے ان کے مذاہب جیسے بھی تھے وہ ان سے منسلک رہے۔جب کہ اہل چین ہر دور میں خالق سے دوری اور زندگی کی بے ثباتی کے اہم تصور سے نابلد ہی رہے۔ کبھی ساری قوم افیون کے نشے میں ڈوبی رہی تو کبھی ساری قوم پہ کیمونزم کا سحر چھا گیا۔اِن دنوں پوری چینی قوم معاشی عسکری اور تجارتی بلندیوں کی تلاش میں ہلکان ہوئے جا رہی ہے میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے کہ اہل چین من حیث القوم خالق سے انحراف کی جس راہ پہ جا رہے ہیں وہ ایک بے منزل مسافت ہی تو ہے۔انسان کا مقصدِ زیست اگر انھی میدانوں میں کھو کے رہ جائے تو کیا وہ انسان کہلا سکتا ہے کہ یہ سب کام تو ادنیٰ سے ادنیٰ جانور بھی کر رہے ہیں۔

ہر جانور خود کو موسم کے شدائد سے بچاتا ہے اپنی خوارک تلاش کر لیتا ہے اپنی نسل کی بقاء کی جدوجہد کر لیتا ہے اور اگر یہی کام انسان کرے تو اس میں کوئی برائی نہیں مگر اس کو چند لمحے اپنی ذات کے دروں جھانک کر یہ سوال تو کرنے ہی چاہیے کہ میں کون ہوں؟ میں کیوں ہوں؟ میں کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے کہاں جانا ہے؟ کہ انسان اور جانور میں ایک بہت بڑا فرق عقل کی صورت رکھ دیا گیا ہے۔شاید پوری چینی قوم ابھی ذہنی بلوغت کی اس منزل سے دور ہے جہاں یہ سوال ہر نفس کا احاطہ کیے کھڑے ہوں یا شاید ان کے پاس وقت نہیں اللہ

ان پہ اپنا رحم کرے کہ روئے زمین پہ خالق کے وجود سے من حیث القوم اگر کوئی انکار کی ضد پر اڑا بیٹھا ہے تو وہ اہل چین ہیں۔

کہتے ہیں یونان دنیا کی پہلی خرد گاہ ہے جس کے بطن سے علم کے سوتوں نے جنم لیا۔ تو چلتے ہیں ارسطو افلاطون ،سقراط اور بقراط کے دیس میں تاکہ اُن کے تصور حیات سے کچھ آگاہی حاصل ہو سکے۔

یونان

یونان یورپ کے جنوب میں بحیرہ روم میں واقع ہے۔اس میں بحیرہ ایجن کے بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی شامل رہے ہیں ۔اہل یونان کے ہاں پہاڑوں کی اوٹ اور بلندیوں پر چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں آباد تھیں جو اگرچہ خودمختار تھیں مگر بیرونی حملے کی صورت میں وہ متحد ہو کر مقابلہ کرتیں۔قدیم زمانے میں یہاں کئی متمدن ریاستیں موجود تھیں جن کا ذکر تاریخ میں موجود رہا۔یہاں فریگیا،لیڈیا اور میسیا والوں کی راجدھانیاں تھیں۔ٹرائے کا مشہور شہر میسیا کی ریاست میں تھا پورا علاقہ دشوار گذار اور مختلف پہاڑی سلسلوں پر مشتمل تھا جس کی وجہ سے باہمی آمدورفت از حد دشوار تھی اور ایک ریاست کا دوسری ریاست سے باہمی رابطہ آسان نہ تھا۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہاں ایک متحدہ حکومت کا قیام ایک مشکل امر تھا۔بے شمار چھوٹی چھوٹی شہری

ریاستیں اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں بڑی حد تک آزاد تھیں۔ یونان کا موسم گرم اور مرطوب تھا مگر بارشوں کی کمی بھی نہ تھی اور سمندروں سے چلنے والی ہواؤں کی وجہ سے گرمی بھی قابل برداشت تھی اگرچہ یونان کا موسم گرما طویل ہوا کرتا۔ یونان کا نام ائیونین قبیلے کے نام سے منسوب ہے۔ یونان کے شمال میں مقدونیہ کی راجدھانی تھی جسے فلپ اور اس کے ناموّر بیٹے سکندر نے شہرت بخشی۔ یہ ایک عجیب سا احساس ہے کہ میں جہاں بیٹھ کر (ڈنگہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں) یہ الفاظ تحریر کر رہاں ہوں کبھی سکندر کی قلمرو میں شامل تھا۔ سکندر افغانستان سے پنجاب میں داخل ہوا اور فتح کے نشے میں چور اس کی فوجوں کا مقابلہ مقامی حکمرانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ سکندر نے نہ صرف یونان کی تمام شہری ریاستوں کو فتح کیا بلکہ اس کی فتوحات کا سلسلہ حربی تاریخ کا عنوان بن کے رہ گیا۔ یونان کے جنوب میں جزیرہ کریط تھا جہاں کے ترقی یافتہ تمدن نے یونانیوں کو حیرت زدہ کر رکھا تھا۔

جنابِ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے پندرہ سو سال قبل آریاؤں کے خانہ بدوش قبائل شمال کی طرف سے یونان میں داخل ہوئے یہ لوگ نیم وحشی اور تہذیبی رویوں سے عاری تھے۔ وہ کریط اور مائی کنی کی ریاستوں پر حملہ آور ہوئے۔ مشہور مورخ (Siplenger) نے ان شہری ریاستوں کو متمدن قرار دیا ہے۔ اہل کریط مصر کے خوشہ چیں تھے۔ مورخ انھیں مصری تمدن ہی کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ نوارد آریائی سخت جفاکش اور طاقتور تھے اور اہل کریط عیش پرست اور کاہل سو وہ مغلوب ہوئے اور آریاؤں نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مورخ (Hoomer) لکھتا ہے کہ آریاؤں نے ان کے نوے بارونق شہر تباہ کر دیئے اور ان میں آگ لگا دی ان کے تمدن کا بھی وہی حشر ہوا جو انھی آریاؤں کے ہاتھوں ہندوستان میں ہڑپہ تہذیب کا ہوا تھا۔

دورِ اول کے ان حملہ آوروں کو ایکین کہا جاتا ہے۔ ۱۶۰۰ق م سے ۱۳۰۰ ق م تک کے ایکین دور کو یونانِ قدیم کا عہدِ شجاعت کہا جاتا ہے۔ تقریباً ۱۱۰۴ ق م کے آس پاس مزید آریائی قبائل یونان پر حملہ آور ہوتے ہیں ان کو ڈورین کا نام دیا گیا۔ ڈورین کے پاس انسانی تاریخ میں پہلی بار لوہے کی بھاری اور تیز دھار تلواریں تھیں جب کہ مقامی قبائل کے ہاں ابھی کانسی کی تلوار استعمال کی جا رہی تھی۔ چنانچہ ڈورین کی ہتھیاروں میں برتری ان کی واضح فتح میں بدل گئی۔ انھوں نے شہری ریاستوں کو شکست دے کر انھیں وہاں سے بھگا دیا وہ بھاگ کر دور تک پھیلے ہوئے ایشیائی ساحلوں پر آباد ہو گئے۔ میکنی، ایکن، ڈورین اور ان کے

بعد آنے والے دیگر قبائل کے نسلی اختلاط سے جو نئی قوم وجود میں آئی اسے یونانی کہا جانے لگا۔ان یونانیوں نے ایتھنز، سپارٹا، تھیباس، کورنتھ اور آرگوس جیسے بڑے بڑے شہر بسائے۔اس کے علاوہ، اطالیہ، قبرص اور ایشیا کے ساحلوں پر بھی یونانیوں کی بستیاں قائم تھیں اور یہی بستیاں ترقی کرتے کرتے شہری ریاستوں میں بدل گئیں۔پانچویں صدی کے اوائل میں یونانیوں کو ایک بار پھر بیرونی حملہ آور کا سامنا تھا اور اب کی بار شہنشاہ ایران ان پر حملہ کرنے آرہا تھا۔اس حملے کی وجہ مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ یونانی شرپسندوں نے ایشیائی ساحل پہ بنے ایک ایرانی معبد کو مسمار کردیا تھا جس کی آڑ لے کر ایرانی یونان پر حملہ آور ہوگئے۔یونان کی شہری ریاستوں نے اگرچہ متحد ہوکر اہل ایران کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر اہل ایران کا حملہ شدید تھا اور طاقت کا توازن بھی ان کی طرف جھکا ہوا تھا اس لیے وہ فاتح رہے۔مگر یونانیوں کو اتنا وقت مل گیا کہ وہ فرار ہو سکیں۔چنانچہ انھوں نے ایتھنز کو خالی کردیا جب شہنشاہ ایران خشارشیا اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوا تو وہاں ہو کا عالم تھا۔ایتھنز اپنے وقت کا بارونق اور متمدن شہر تھا۔ایرانیوں نے اس کو آگ لگادی پورا شہر جل کر خاکستر ہوگیا۔

مورخ کہتے ہیں کہ جب سکندر نے ایران فتح کیا تو اس نے ایران کے دارالحکومت اصطخر کو محض اس لیے آگ لگائی تھی کہ اس کے دل میں ایتھنز کے جلنے کا دکھ موجود تھا۔یونانی جلد ہی سنبھل گئے اور انھوں نے اہل ایران کو ملک سے نکال باہر کیا۔ایرانی شہنشاہ خشارشیا کے بغیر اس کی فوج میں بدنظمی تھی اور وہ بے دلی سے لڑی۔سمندروں میں لڑی جانے والی اس جنگ کو جنگ سالامس کہا جاتا ہے جس میں ایتھنز کے سالار اعلیٰ **تھیمسٹو کلیز** نے زبردست تیاری کے ساتھ جنگ شروع کی اور ایرانی بحری بیڑے کو تباہ کرکے اپنے ملک کا کنٹرول دوبارہ سنبھال لیا۔ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد یونانیوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور وہ اپنی شہری ریاستوں کو بھی ایک متحدہ وفاق کے تحت لے آئے۔ایتھنز پر قبضہ کرنے کے بعد ان کا جنگی اور تجارتی بیڑہ طاقتور ہوگیا تھا اور ان کے تجارتی جہاز ہر کہیں دکھائی دینے لگے۔اہل ایتھنز مالا مال ہوگئے فتح و مسرت کے نشے میں سرشار ہوکے اہل ایتھنز نے ادب و فن تعمیر اور دیگر علوم و فنون میں درخشاں کارنامے سرانجام دیئے۔پریکلیز کے عہد کو یونان کا سنہری دور قرار دیا جاتا ہے مگر اس کے انتقال کے بعد اہل ایتھنز اور سپارٹا والوں کے درمیان جنگ چھڑگئی۔سپارٹا والے غالب رہے اور ایتھنز کی آزادی کا سورج غروب ہوگیا مگر اہل سپارٹا زیادہ دیر تک ایتھنز پر قابض نہ رہ سکے اس لیے کہ ان کے ہمسائے مقدونیہ میں جنرل فلپ اپنی طاقت

کو بدستور بڑھا رہا تھا اور کئی شہری ریاستوں کو فتح کر چکا تھا۔ آخر کار ۱۳۱۰ھ ق م کو شاہ مقدونیہ فلپ نے ایتھنز پر چڑھائی کر دی اور جنگِ قیرونیہ میں یونانیوں کی متحدہ فوج کو شکست دے کر ایتھنز کو اپنی مملکت میں ضم کر لیا اور قدیم یونان صفحہ تاریخ سے غائب ہو گیا شاہ فلپ مشہور فاتح سکندر اعظم کا باپ تھا۔

سیاسی اور معاشی حالات

یونان کی سرزمین ایسی تھی جس میں بڑے پیمانے پر کاشت کاری ممکن نہ تھی۔ پہاڑوں کے درمیان وادیوں میں اور ڈھلوانوں پر کسانوں کی محنت سے کچھ زرخیز میدان وجود میں آگئے تھے جہاں وہ گندم، انگور، نارنگی اور زیتون کاشت کرتے۔ شدید جاڑے میں بھی کہر انہیں پڑتا تھا اس لیے گرم آب وہوا کی بعض فصلیں بھی کاشت کی جاتیں۔ دریا چھوٹے چھوٹے اور تیز رفتار تھے اس لیے آب پاشی ممکن نہ تھی۔ لوگ کھیتوں کو عموماً کنوؤں سے پانی دیا کرتے وہاں اکثر کھیت پہاڑ کی ڈھلوان پہ ہوتے جہاں ان کی بھیڑ بکریاں اپنی خوارک حاصل کیا کرتیں۔ خزاں کے موسم میں فصل بوئی جاتی اور مئی میں کاٹ لی جاتی۔ موسم گرما میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے اندرونِ ملک بھی پانی کمیاب ہوجاتا۔ چنانچہ تاریخ کے کسی دور میں بھی اہل یونان زرعی حوالے سے خود کفیل نہ ہوسکے بلکہ ان کی خوشحالی کا تمام تر انحصار بیرونی تجارت پر تھا اور اسی جغرافیائی ماحول سے یونان کے عظیم تمدن نے جنم لیا۔ بحیرہ روم کے ساحل پہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے محنتی اور مہم جو شہری بحری تجارت کا پیشہ اختیار کرتے تاہم بحری قزاقی بھی اہل یونان کا محبوب مشغلہ تھا۔ قدیم یونان میں عام آدمی کی معاشی حالت نہایت دِگرگوں تھی اور ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ بڑے ساہوکار سے سود پر قرض لے۔ اس لیے کہ یونانی معاشرے میں سودی لین دین معمول کی بات تھی۔ شرح سود عموماً ساہوکار ہی مقرر کرتا۔ عام آدمی ساہوکاروں کے اس چکر سے اپنی موت کے بعد ہی نجات پاتا اس لیے کہ اس معاشرے میں کم ہی ایسا ہوتا کہ کوئی شخص اپنا سود اور اصل زر کما کر ساہوکار کو واپس کرسکے۔ چنانچہ قرضدار

خواہ جلد ہی اپنی شخصی آزادی کھو دیتا یا اسے اپنی جائیداد سے ہاتھ دھونے پڑتے اور وہ ساہوکار کے کھاتے میں منتقل ہو جاتی۔ حالات زیادہ تنگ ہوں تو ساہوکار اپنے مقروض سے ادائیگی کے سلسلے میں بغیر کسی معاوضے کے برسوں بیگار لیتا رہتا اور اسے اس عذاب سے تبھی نجات ملتی کہ یا تو وہ بوڑھا اور اپاہج ہو جاتا یا اس کی اجل اسے نجات دلا دیتی۔ غربت نے ایک انتشار کو جنم دیا اور یونانی معاشرہ طبقاتی تقسیم تلے دھنستا چلا گیا۔ غریب بے اطمینانی کا شکار تھے غیر ملکی تجارت نے بھی طبقاتی تقسیم کی بنیادوں کو تقویت بخشی۔ اب ایک طرف وہ خوشحال طبقہ تھا جو بحری جہازوں کا مالک تھا یا ان جہازوں پہ تجارت کرنے والے بڑے بڑے تاجر تھے تو دوسری طرف سماجی جبر و استحصال کا شکار وہ طبقہ تھا جو غریب کسانوں بافندوں، کمہاروں، لوہاروں اور ملاحوں پر مشتمل تھا۔ ایتھنز کی تین لاکھ آبادی میں سے نصف غلام تھے اور جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ قدیم یونان کے سیاسی حالات کو بھی قابل فخر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے اس لیے صدیوں تک ان کے ہاں ریاست کے بنیادی ڈھانچے کا تصور تک موجود نہ تھا۔ لوگ آزاد شہری ریاستوں میں منقسم بغیر کسی قائدے اور قانون کے ایک آمرانہ نظام کے تحت زندگی بسر کرتے تھے۔

تمام بنیادی انسانی حقوق شہر کے حاکم اور اس کے حواریوں کے لیے تھے اور عام آدمی کی قسمت میں صرف حکم کو ماننا اور سر جھکانا ہی لکھا تھا۔ سپارٹا اور ایتھنز کی ریاستوں میں عورت کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے اور اس کا کام صرف بچے پیدا کرنا تھا۔ ان کا معاشرہ ذات پات کے سخت اور شدید نظام میں جکڑا ہوا تھا اور ملکی باشندوں کو عام طور پر تین گروہوں میں تقسیم کیا جاتا۔ ریاست کے اصل شہری ان کو قرار دیا جاتا جو فوج یا طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے وہ کوئی کام نہ کرتے تھے سوائے اس کے کہ قومی خزانے سے وظائف حاصل کریں اور انھیں عیاشیوں میں اڑا دیں۔ دوسرا طبقہ کسانوں اور معمولی پیشوں سے منسلک افراد پر مشتمل تھا۔ جبکہ تیسرا اور کثریتی طبقہ غلاموں پر مشتمل تھا جن کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے جو غلام پیدا ہوتے مزید غلاموں کو جنم دیتے اور دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ وہ عام شہری جن کو سیاسی حقوق اور ریاست کی دیگر مراعات حاصل تھیں وہی اصل شہری قرار دیے جا سکتے ہیں۔ سپارٹا کے شہریوں کو سخت عسکری تربیت سے گذارا جاتا اور ان میں سے جو لوگ اس تربیتی معیار پر پورے نہ اترتے ہوں ان کے ساتھ عبرتناک سلوک کیا جاتا۔ جسمانی لحاظ سے کمزور اپاہج یا بیمار کو شہر سے باہر لے جا کر کسی غار میں پھینک آتے تا کہ یا تو وہ سردی سے مر جائے یا کوئی درندہ اسے تنہا پا کر پھاڑ ڈالے ورنہ بھوک اور پیاس سے تو اس کی موت ہو ہی جاتی۔ سپارٹا کی ریاست

کے ہر شہری پر فرض تھا کہ وہ اپنے بچے کو ریاست کی ملکیت تصور کرے اور سات سال کا ہو جانے کے بعد اسے ریاست کے حوالے کر دے تاکہ اس کی فوجی تربیت کا آغاز ہو سکے۔ بچے کی تمام تر تربیت ریاست کے قوانین اور سرکاری نگرانی میں کی جاتی۔ اسے عسکری علوم کے ساتھ حبِ وطن اور قومیت کا درس بھی دیا جاتا۔ گانا اور کشتی بھی سکھائی جاتی اور چوری کرنے کے گُر بھی ان کی تربیت کا حصہ ہوتے۔ لڑکیوں کی تربیت کا بھی خاطر خواہ انتظام موجود ہوتا تاکہ وہ صحت منداور ہونہار سپوت جنم دے سکیں جو ریاست کا سرمایہ تصور کیے جاتے۔ اگرچہ یہ تمام انتظامات ریاست کے لیے مفید اور مثبت تھے مگر اہل یونان نے اپنے اس جنگی جنون میں زندگی کے دوسرے بہت سے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا اور وہ فوجی لحاظ سے طاقتور ہونے کے باوجود معاشی پس ماندگی کا شکار رہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ حکمرانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے نظام سلطنت کو بدل کر رکھ دیا۔ اب متعلق العنان بادشاہوں کا دور جاتا رہا اور (HOOMER) کے دورِ حکومت کے بعد اقتدار بادشاہوں سے بتدریج امراء کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ بنیادی حکومتی ڈھانچے میں بے پناہ تبدیلیاں کی گئیں اب چند افراد کا مجموعہ حکومت کے اختیارات کو بانٹ کر استعمال کرتا اور عام لوگوں کی فلاح کے لیے منصوبے ترتیب دیتا۔ رفتہ رفتہ جمہوری نظام حکومت کا ڈھانچہ وضع ہونے لگا اور ایتھنز کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ مسیح علیہ السلام کی آمد سے پانچ صدیاں قبل ہی دنیا کی پہلی جمہوری ریاست کے طور پہ سامنے آئی جس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ عوام کی حکومت عوام کی فلاح کے لیے۔

مذہبی اور عقائدی احوال

قدیم یونانیوں کے مذہب کو آسانی کے ساتھ کثرت پرستی کا مذہب قرار دیا جا سکتا ہے اور دیوتاؤں کا ایک بہت بڑا خاندان ان کی عقیدتوں کا مرکز تھا۔ دھند اور بادلوں میں لپٹی کوہ اولپس کی برف پوش چوٹیاں ان کے دیوتاؤں کا مسکن تھیں ان کا سب سے بڑا دیوتا زوس تھا جو بادلوں کو اکٹھا کرتا اور انھیں برق و رعد کے نیزے سے چھید کر بارش برساتا۔ زوس کے دو بھائی بھی تھے جن کے نام ہیڈس اور پوزی دوں تھے۔ تاہم یونانیوں کی قدیم دیو مالا میں درج دیوتاؤں کی طویل فہرست میں جو اہمیت زوس اور اس کی بیوی ھیرا کو حاصل تھی وہ کسی اور دیوتا کو نصیب نہ ہو سکی۔ ان کا دیوتا زوس صاحبِ اولاد تھا اور اس کی اولاد نرینہ میں اریس اپالو ،ہرمیس اور فیٹس کے نام ملتے ہیں جبکہ ایتھنیا، افروڈائٹی اور ارٹیمس اس کی بیٹیاں تھیں۔ زوس اگرچہ مختارِ متعلق دیوتا تھا تاہم تقدیر کی تین دیویوں پر اس کا بس بھی نہیں چلتا تھا۔ کہتے ہیں ان میں سے ایک دیوی قسمت کا دھاگا بنتی تھی دوسری دیوی اسے انسانوں میں تقسیم کرتی تھی اور تیسری دیوی اس دھاگے کو کاٹ دیتی تھی۔ سمندوروں پر زوس کا بیٹا پوزی دوں حکومت کرتا تھا۔ زمین پر زوس کا دوسرا بیٹا ہیڈس حکمران تھا۔ جبکہ زوس کا تیسرا بیٹا اپالو نور اور صداقت کا دیوتا تھا۔ اپالو ایک باکمال مغنی بھی تھا اور اپنے سروں سے لوگوں کو مسحور رکھتا۔ اریس جنگ کا دیوتا تھا اور ہرمیس زوس کا خاص ایلچی تھا۔ ہیس ٹیس زوس کی کنواری اور باعصمت ہمشیرہ تھی جس کے معبد میں صبح و شام آگ جلتی رہتی تھی اور چھ کنواری دیوداسیاں ہر وقت اس آگ کی حفاظت پر معمور رہتیں۔ زوس کی بیٹیوں کو بھی مناسب اختیارات سے نوازا گیا تھا۔ ایتھنیا اور آرٹیمس زوس کی کنواری

بیٹیاں تھیں۔ ایتھینا زراعت اور تہذیب و تمدن کی دیوی تھی۔ [13*] اسے پاتھیناس بھی کہا جاتا تھا اور ایتھنز کا شہر اسی کے نام پر بسایا گیا۔ افروڈائٹ حسن و عشق کی دیوی تھی جو مردوں اور عورتوں کے دلوں میں ہیجان انگیز جذبات کو پروان چڑھاتی تھی۔ یونانی دیوتا عام لوگوں کے معاملات میں بری طرح دخیل تھے اور ان کا محبوب مشغلہ امرت پینا اور اپنے پیروکاروں کے معاملات میں مداخلت کرنا تھا۔ زوس اور اس کا بیٹا اپالو حسین دوشیزاؤں کے عشق کے مبتلا رہتے اور دیوی افروڈائٹی اپنے بیٹے ایریس کے ہاتھوں پریشان ہر وقت کسی نہ کسی سے عشق کر کے اپنے غم کو غلط کرنے کو کوششوں میں مگن رہتی۔ قدیم یونانی دیو مالا میں انگور اور شراب کے دیوتا دیونیسس کا قصہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ ان کے دیوتا زونیسس نے اپنی جان کی قربانی دے کر بنی نوع انسان کو بچالیا تھا۔ چنانچہ وہ اس کی موت اور احیاء کو اپنے مذہبی شعائر میں شامل کرنے لگے۔

وہ اس کی عبادت یوں کرتے کہ جب موسم بہار میں پھول کھلتے اور کونپلیں پھوٹتیں تو اہل یونان کی عورتیں گھروں سے نکل کر پہاڑوں کا رخ کرتیں۔ وہاں وہ دن رات شراب پیتیں اور نشے میں جھومتیں ناچتیں دیوانہ وار ایک جلوس نکالتیں اور راستے میں آنے والے کسی بکرے یا بیل کو دیوتا دیونیسس کا اوتار سمجھ کر پکڑ لیتیں اور اسے زندہ ہی اپنے دانتوں سے چبا جاتیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح دیوتا ان کے اندر حلول کر جاتا ہے۔ چنانچہ اسی سے ملتا جلتا ایک تصور قدیم عیسائیت میں بھی پایا جاتا تھا جو بعد میں کلیسائے روم کے عشائے ربانی کی صورت میں نمودار ہوا جس میں روٹی کو جناب مسیح علیہ السلام کا گوشت سمجھ کر کھایا جاتا اور شراب کو ان کا خون سمجھ کر پیا جاتا۔ یونانیوں کے مذہب میں کئی پراسرار پہلو بھی موجود تھے جن کی توجیح کرنا مشکل ہے۔ مثلاً دمیتر کی پوجا جس کے ساتھ کئی اسرار وابستہ تھے دمیتر کی پوجا خفیہ جگہوں پہ کی جاتی اور اس میں صرف منتخب افراد ہی حصہ لے سکتے تھے۔ یونان کے مشہور فلاسفی پلوٹارک نے اپنی کتابوں میں ان پراسرار رسوم کا ذکر کیا ہے جو دمیتر کی پوجا کے حوالے سے حیرت کا سامان فراہم کرتی تھیں۔ دمیتر کی پوجا کا مرکزی خیال یہ تھا کہ انسان مر کر دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔ پلوٹارک ان منتخب افراد میں شامل رہا تھا جو دمیتر کی پوجا کیا کرتے۔ اہل یونان اپالو دیوتا کی خاص تعظیم کرتے اور اس کی رائے کو خصوصی اہمیت دی جاتی۔ وہ ان کے ہاں شگون کا دیوتا بھی تھا اس لیے وہ جنگ یا کسی اور بڑی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے اپالو دیوتا سے شگن حاصل کرتے۔ ان کا جنگی دیوتا ایریز تھا جس سے فتح کی توقعات باندھے رکھتے۔ ہر شہر اور ہر آبادی کے

مذہبی تہوارا اگر چہ یکساں نہ تھے مگر اہل یونان کے ہاں جو بڑے مذہبی تہوار منائے جاتے اس میں سب لوگ شریک ہوتے۔کھیلوں کا میلہ ان کے اس مزاج کا عکاس تھا جس کے تحت ان کے ہاں انسانی صحت اور جسم کی خوبصورتی پر خاص توجہ دی جاتی۔ان کا سب سے بڑا تہوار اولیمپیا تھا۔جو ہر چار سال بعد منایا جاتا اس تہوار میں کھیلوں کے مقابلوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اگر چہ کھلاڑی اپنے دیوتاؤں کے خاص نشان لیے میدان میں اترتے۔یہ تہوار صدیوں سے نہیں بلکہ ہزاروں سال سے منایا جارہا ہے۔آج کی جدید دنیا میں اس کو اولمپک مقابلوں کا نام دیا گیا ہے۔تاریخ کا یہ تسلسل حیرت انگیز ہے کہ جس وقت میں یہ الفاظ تحریر کر رہا ہوں اسی وقت بیجنگ میں اولمپک مقابلوں کا آغاز ہو رہا ہے۔

یونان میں عارفی مت بھی بڑا مقبول تھا جس کا بانی عارفیوس نامی موسیقار تھا۔یہ کڑی ریاضتوں کا راستہ تھا اور اس کے پیرو ترکِ لذات کے قائل تھے۔یہ مذہبی خیال اہل یونان کے عمومی مزاج کے خلاف تھا اس لیے اسے معاشرے میں زیادہ پزیرائی حاصل نہ ہو سکی۔عالمگیر اخلاقی انحطاط کی اس رو میں اہل یونان بھی پوری رغبت سے بہہ رہے تھے جس میں اخلاق کو مذہب کا حصہ تصور نہیں کیا جاتا تھا۔چنانچہ اہل یونان کا مذہب بھی اخلاقی حدود و قیود سے آزاد تھا۔فحاشی اور بے حیائی عام تھی معاشرہ زنا،خاص طور پہ ہم جنسی کا خوگر تھا۔مرد تو مرد عورتیں بھی عورتوں سے ملوث رہتیں۔لنگ (عضو تناسل) کی پوجا کا عام رواج تھا۔

دیونیسس کے تہوار پہ عورتیں لنگ کے مجسمے گلے میں لٹکائے جلوس نکالتیں اور فحش گیت گاتیں۔ان کی دیومالا میں ایک تباہ کن سیلاب کا ذکر بھی ملتا ہے جو بابلیوں سے مستعار لگتا ہے۔یونانی روایت کے مطابق اس سیلاب میں صرف ایک شخص دیوکیلین اور اس کی بیوی ہی زندہ بچ سکے اور روح زمین پر باقی تمام انسان لقمہ اجل بن گئے۔دیوکیلین اور اس کی بیوی کے ہاں ایک بیٹے نے جنم لیا جس کا نام انھوں نے ہیلن رکھا اور بعد میں ہیلنی ایک اصطلاح بن گئی جو یونانیوں کے لیے استعمال ہوتی۔ہیلن ازم کو آکسفورڈ ڈکشنری میں بھی جگہ دی گئی اور ہر اس باشندے کو ہیلنی کہا جاتا جو قدیم یونانی تہذیب سے محبت کا دعویدار ہوتا۔یونانی دیومالا میں پرومیتھس کا کردار بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے اور لوگ بڑی دلچسپی سے ان قِصوں کو روایت کرتے جو دیوتاؤں کی حالاتِ زندگی کے متعلق ہوا کرتے۔ان کو ''Mythos'' کہا جاتا۔لفظ Mythology اسی سے مشتق ہے جس سے قصوں کا علم مراد لیا جاتا ہے۔پرومیتھس کو یونانی معاشرے میں اس لیے خاص اہمیت حاصل تھی کہ اس نے دیوتاؤں کے مسکن سے آگ چرا کر انسان کو دی تھی۔یوتازوس نے غصے میں آ کر

اس کو ایک بلند چٹان سے باندھ دیا اور ایک گدھ کو اس پہ معمور کیا جو اس کا دل وجگر نوچ نوچ کر کھایا کرتا۔اگلے دن پرومیتھس کا دل وجگر ٹھیک ہو جاتے اور زیوس کا گدھ پھر انھیں نوچنے کے لیے آ جاتا۔ پرومیتھس عذاب کی اس حالت میں بھی زیوس کے خلاف بغاوت کے نعرے لگا تا رہتا۔آخر ہرکولیز نے اسے اس عذاب سے نجات دلائی اس قصے میں اِنسان کی حوصلہ مندی اور اس کے عزم راسخ کا ثبوت ملتا ہے۔پنڈورا بکس بھی خالصتاً یونانی اصطلاح ہے جو آج تک بہت سے معاشروں اور زبانوں میں مستعمل ہے۔حتیٰ کہ اردو کے لیے بھی یہ اسلوب اجنبی نہیں پنڈورا بکس دراصل یونانی دیو مالا کے اس واقعہ کی یادگار ہے جب یونانی دیوتاؤں نے تمام برائیوں کو ایک بکس میں بند کر دیا تھا مگر پنڈورا نامی عورت نے اسے کھول دیا جس کی وجہ سے برائیاں پورے جہان میں پھیل گئیں۔

چنانچہ اس واقعہ سے متاثر ہو کے قدیم یونانی شاعر''ہیزرڈ'' نے ایک طویل نظم کہی جس میں اس نے عورت کو مجسم شر قرار دیا۔ویسے بھی یونانی دیو مالا کے مطابق دیوتا زیوس نے عورت کو ایک برائی کی صورت میں انسان کو عطا کیا۔دوسری معاصر اقوام کی طرح اہل یونان کے ہاں بھی آگ کو مقدس خیال کیا جاتا اور اس کی پوجا کی جاتی کیونکہ قدیم یونانی معاشرے کی بنیاد بھی حملہ آور آریاؤں نے ہی رکھی تھی اور آریائی جہاں بھی گئے آگ کی پوجا کو رواج دیا۔ چنانچہ یونان کے ہر گھر ہر شہر میں مقدس آگ جلتی رہتی۔اس کے علاوہ یونانی حیات بعد ممات کے بھی قائل تھے۔

وہ مردے کے منہ میں ایک سکہ رکھ دیتے ان کے خیال میں اس سے مردے کو آسانی ہوتی کبھی کبھی قبروں پہ کھانے پینے کی اشیا بھی رکھ دیتے تا کہ ان کے عزیزوں کی روحیں اپنا پیٹ بھر سکیں۔موت کے بعد انسانی روح ہیڈس دیوتا کی زمین دوز تاریکیوں میں کھو جاتی۔عظماء اور حکماء کی روحوں کے لیے ایسین کا میدان تھا جو ان کے خیالوں کی جنت تھی۔یونانیوں کا سب سے مقدس مندر ڈلفی میں تھا جس کے دروازے پہ یہ الفاظ کندہ کرائے گئے تھے کہ''اپنے آپ کو جانو''یونانیوں کا مذہب دیو مالائی قصوں اور رسوم وعبادات پر مشتمل تھا اور اس میں نہ الہام کا معروف تصور موجود تھا نہ کوئی دستورِ اخلاق اس لیے کہ ان کے دیوتا انھی کے طرح انسان تھے اور عام انسانوں کی طرح عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ایک دوسرے کے حسد میں مبتلا رہتے اور ایک دوسرے کے دست وگریباں چاک کرتے۔اہل یونان ذاتی نجات کے قائل نہ تھے بلکہ اپنی بہترین صلاحیتیں اور کوششیں ریاست کی بہبود کے لیے وقف کرتے۔البتہ تقدیر پر ان کا یقین بہت محکم تھا ان کے

خیال میں دنیا کے سب انسانوں پر تقدیر کا اٹل قانون مسلط ہے جس سے گریز کی کوئی بھی صورت ممکن نہیں۔لیکن وہ اہل ہند کی طرح یاسیت کا شکار ہونے کی بجائے مردانہ وار تقدیر کا مقابلہ کرتے تھے۔یونانیوں کے اسی اندازِ نظر نے ان کے ادب میں عظیم المیہ کے تصور کو جنم دیا۔

فلسفہ اور فلاسفر

یونان کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اس کی سرزمین نے دنیا کو بہت سے نابغہ روزگار فلاسفر حکماء اور فضلاء عطا کیے جنہوں نے علم وحکمت کی وہ قندیلیں روشن کیں جن کی روشنی میں انسان نے تہذیب وتمدن کا سفر تیز رفتاری سے شروع کیا۔ جب سارا یورپ جہالت اور توہم پرستی کے تہہ در تہہ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا تب یونان کے اہل فلسفہ دنیا کو ریاست اور سماج کی بنیادیں فراہم کررہے تھے۔ یونان کی فضاؤں میں علم فلسفہ کے ابتدائی خدوخال وضع کیے گئے اور عظیم دانش کی بنیاد اس نہج پہ اٹھائی گئی جس میں انسانی فلاح اور بھلائی کے سنگِ میل تراشے جاسکیں۔ بلاشبہ اس متاعِ فخر میں اہل یونان کا کوئی شریک نہیں کہ انھوں نے بقراط، سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے بڑے دانشور اور حکماء دنیا کو عطا کیے جن کی علمی کاوشیں آج کی متمدن تہذیب کا بیش قیمت اثاثہ ہیں، جن کے تفکر کی لَو سے یورپ ایشیا اور شمالی افریقہ کی دور افتادہ بستیاں تک جگمگانے لگیں۔ چنانچہ یونانی فلاسفہ کے علوم کے احیاء نے اہل مغرب اور دیگر اقوام کو ازمنۂ وسطیٰ کی ان اتھاہ تاریکیوں سے نجات دلائی جن میں انسانیت کی سسکیاں تھیں، تمدنی جبر تھا، مذہبی استحصال تھا، معاشی

پسماندگی تھی، سماجی بندشیں تھیں اور اخلاقی انحطاط تھا۔یونانی فلاسفہ نے انسانی معاشروں کو سائنس اور جدیدیت کی وہ راہ دکھائی جس پہ آج کے متمدن اور مہذب معاشروں کی بنیادیں رکھی ہیں انھوں نے سائنس فلسفہ تاریخ اور ادب کے وہ پہلو روشن کیے جنہوں نے آگے چل کر انسانی معاشروں میں فرد کے سماجی اور تمدنی رویوں کو جلا بخشی۔ جہاں تک یونانی فلاسفہ کے اجتہادِ فکر کا تعلق ہے وہ اپنے معاصرین میں بھی منفرد تھے اور علوم کی بے پناہ ترقی کے باوجود آج بھی ان کی انفرادیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ یونانی فلاسفہ ہی تھے جنہوں نے اپنے معاشرے کو بنیادی جمہوریت کی اقدار سے روشناس کرایا اور تاریخ عالم میں پہلی جمہوری ریاست کی بنا رکھی۔

اگرچہ وہ جمہوری ریاست اپنے بہت سے پہلوؤں میں ناقص تھی مگر تاریخ عالم میں پہلی مرتبہ عوام کی حکمرانی کا جو تصور پیش کیا گیا اس نے صدیوں سے مقہور و مظلوم عوام کے ذہن و دماغ میں بنیادی حقوق کا تصور پیدا کیا۔اگرچہ اشتمالیت کے بنیادی تصورات بھی اہل یونان کے فلاسفہ ہی کی دین ہیں۔اہل یونان کی اولیّات نہایت گراں قدر ہیں جس میں انھوں نے سائنس اور فلسفے کے بنیادی موضوعات کو قدیم مذہبی اوہام اور دیو مالا کی خرافات سے الگ کیا اور انھیں تحقیقی بنیادوں پر مرتب کیا اور فطری مظاہر کی عملی توجیح کی۔اہل یونان کے حکماء کی فلسفیانہ بصیرت کا یہ عالم تھا کہ اب تک فلسفے میں جو کچھ بھی لکھا گیا یا لکھا جا رہا ہے وہ انھی کے افکار کی تشریح و توضیح ہے۔انھوں نے مابعد طبعیات، منطق، جدلیات، سیاسیات اخلاقیات، جمالیات، نقدِ ادب ،طب اور ہندسہ جیسے علوم کی تحقیقی نقطہ نظر سے تدوین کی۔ادبیات میں وہ رزمیہ کے بانی ہیں اور تمثیل نگاری کے مخترع ہیں۔پھر فلسفہ تاریخ کے مبادیات بھی انھوں نے مرتب کیے فنِ تعمیر اور سنگ تراشی میں ان کے حسین شاہکار صدیوں سے اربابِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔انھوں نے اعتدال تناسب اور توافق کو حسن و جمال اور ادبی فنی تخلیقات کا محور قرار دے کر ایک ایسی روایت قائم کی جو ہمیشہ اہل علم کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی رہے گی۔اہل یونان کے علماء حکماء اور اہل فکر و فلاسفہ کا فکری اجتہاد اور علمی خدمات معلوم انسانی تاریخ کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ذیل میں اہل یونان کے چند معروف اہل فلسفہ کے حالات و شذرات پیش کیے جاتے ہیں۔

طالیس (۶۴۰)

طالیس کوفلسفہ کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے۔ طالیس ۶۴۰ء ق م میں یونان کے شہر ملیٹس میں پیدا ہوا۔ مورخین ملیٹس کی شہری ریاست کو فلسفے اور سائنس کا گہوارہ بتاتے ہیں۔ یہاں کے باشندوں نے مصر سے جیومیٹری اور طب کا علم حاصل کیا اور اہلِ بابل سے علم ہیت کا اکتساب کیا۔ طالیس کو سائنس، علم ہیت اور ریاضی کا موسس خیال کیا جاتا ہے۔ بعد میں اقلیدس نے جیومیٹری میں اس سے خوشہ چینی کی۔ طالیس بہ یک وقت فلسفی بھی تھا اور سائنس دان بھی۔ چنانچہ اسی عہد سے سائنس اور فلسفے کے باہم مربوط ہونے کے تصور نے جنم لیا۔ یہی وجہ ہے کہ یونان میں آخر تک یہ دونوں اصناف ایک دوسرے سے وابستہ رہیں۔ یونانی سائنس کے معروضات منطق وجدلیات ہی کے قیاس پر مبنی تھے۔ طالیس کا سب سے اہم کارنامہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اول اول اسی نے علم ہیت کو علم نجوم سے جدا کیا تھا۔ اس نے ۵۸۵ء ق م میں پہلی مرتبہ سورج گرہن کی پیش گوئی کی جو درست ثابت ہوئی۔ طالیس کا شمار عہدِ عتیق کے چند گنے چنے دانشوروں میں کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ نظریہ اسی نے پیش کیا کہ کائنات کی بنیاد پانی رکھی ہے۔ چنانچہ پہلی دفعہ نظام کائنات کی ایک ایسی تشریح کی گئی جو مذہبی اثر سے آزاد تھی۔ طالیس نے کائنات کی تخلیق کو دیوتاؤں سے منسوب کرنے کی بجائے اس کی علمی و تحقیقی توجیح کرنے کی کوشش کی۔ طالیس کے بعد اس کے ایک شاگرد ''انا کسی مینڈر'' نے اسی طبیعی روایت کی پاسبانی کی۔ رفتہ رفتہ یہ اندازِ نظر اہل علم میں اتنا مقبول ہوا کہ صرف دو صدیوں میں سائنس اور فلسفے کی تدوین عمل میں آ گئی۔

❑❑❑❑❑❑❑

فیثا غورث

فیثا غورث اہل یونان کا ایک اور بڑا مفکر تھا جس نے فلسفہ ریاضی اور موسیقی کی مبادیات فراہم کیں۔فیثا غورس کا تعلق کروٹونا کی شہری ریاست سے تھا۔اس نے مشہور فلاسفر افلاطون سے صدیوں قبل عورت اور مرد کی مساوات کا نظریہ پیش کیا۔وہ کہتا ہے خالق نے عورت کو مرد سے کمتر پیدا نہیں کیا تو ہم اس کو کمتر کیسے سمجھ سکتے ہیں اور ہر حال میں اس کے حقوق مردوں کے مساوی ہونے چاہییں۔اسی لیے اس کے مکتب میں عورتیں اور مرد مل کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔اس نے اپنے طلبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا ''ظاہر یہ اور باطنیہ'' وہ اپنے خاص طالب علموں کو الگ سے خفیہ تعلیم دیتا تھا۔وہ باطنیہ گروپ کو مقدم رکھتا تھا۔فیثا غورث اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے کرہ ارض کو گول کہا۔سورج اور چاند گرہن کی عملی تشریح کی وہ موسیقی سے بیماروں کا علاج کیا کرتا۔ فیثا غورث نے ہی سب سے پہلے علم موسیقی کو ریاضیاتی بنیادوں پر استوار کیا۔وہ علم موسیقی سے دماغی امراض ،خفتان ،مالیخولیا، مراق اور سودا جیسے امراض کا علاج کیا کرتا۔اس کے افکار میں پہلے پہل اِلٰہیات اور ریاضیات کا امتزاج عمل میں آیا۔وہ تناسخ ارواح کا بھی قائل تھا۔اگرچہ دیونیسس مت کی اصلاح عارفیوس نے کی تھی مگر فیثا غورث نے حقیقی معنوں میں عارفی مت کی از سر نو تنظیم کی۔اس کے واسطے سے عارفیوس کے افکار افلاطون کے فلسفے میں بھی بار پا گئے۔وہ اعداد کو کائنات کے تخلیقی عناصر سمجھتا تھا۔وہ جفت اور طاق اعداد کے تضاد سے قدرتی مظاہر کی تشریح کرتا تھا۔ افلاطون کے امثال میں اعداد کا یہی تصور شکل پذیر ہوا۔

□□□□□□□

ہیر یقلتس

یونانی فلاسفہ میں ہیر یقلیتس کے علوم کو جو مرکزیت حاصل ہوئی وہ اس لیے منفرد ہے کہ جدید زمانہ کے فلاسفہ نے اس کے نظریہ اضداد سے بے انتہا راہنمائی حاصل کی یوں لگتا ہے ہیگل، مارکس سپنگلر، برگساں اور نطشے نے جیسے ہیر یقلیتس کے نظریات اور خیالات ہی کی توجیح و تشریح کی ہو۔ ہیر یقلیتس کے فلسفے کو یونانی ذہن و دماغ کی عظیم تخلیق کہا گیا ہے۔وہ کہتا ہے کائنات کی اصل پانی نہیں بلکہ آگ ہے جسے وہ ''یزدانی آگ'' بھی

کہا کرتا۔اس کے نظریات میں کائنات کے متعلق جس تغیر مسلسل کے اشارات ملتے ہیں اس کی ترجمانی برگساں نے کی ہے اوراس کے جنگ وجدل کے ازلی وابدی اصولِ ارتقاء کی حقیقی تشریح نطشے اور سپنگلر نے کی۔جبکہ اس کے نظریہ اضداد کی جدید تشریح ہمارے زمانے میں کارل مارکس اور ہیگل نے کی ہے۔ ہیرقلیتس کی یزدانی آگ کے فلسفے نے صدیوں دنیا پہ حکمرانی کی اور زرتشی مذہب غالباًاسی کے افکار سے متاثر تھا جن کے آتش کدے سینکڑوں سال تک خطہ ارض پر انسانی گمراہی کا سامان کرتے رہے حتیٰ کہ دنیا اسلام کی روشنی سے منور ہوئی اورانھی دلوں کو فتح کیا جواس آگ کے بری طرح اسیر تھے۔پھر تاریخ نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اسی آگ کے پجاری خوداپنے آتش کدوں پہ پانی ڈال رہے تھے کہ ان کے دل اب اس آگ کی روشنی کے طلبگار نہ تھے بلکہ ان کی راہنمائی حقیقی نور سے کردی گئی جوان کے سکون دل کے لیے کافی ہوگئی۔

❑❑❑❑❑❑❑

پارمی نائدیس

پارمی نائدیس بھی اپنے زمانے کا عجیب فلسفی تھا کہ اس کے افکار کی حقانیت اوراثرات آج تک دنیا کے کئی معاشروں میں محسوس کیے جاتے ہیں۔پارمی نائدیس ہی وہ فلاسفر ہے جسے وحدت الوجود کے نظریے کا پہلا شارح کہا جاسکتا ہے۔پارمی نائدیس ہی سے دنیائے فلسفہ میں مابعدالطبیعات کے دَور کا آغاز ہوا۔اس نے ہیرقلیتس کے نظریہ تغیر پہ شدید تنقید کی اوراس کے نظریات کے برعکس اپنے تخیلات کی بنا رکھی۔اس نے دعویٰ کیا کہ دنیا کی ہر چیز ثابت اورقائم ہے اورتغیر کے تسلسل نامی کسی شئے کا کائنات میں کوئی وجودنہیں۔اس نے کائنات میں مثالیّت کا نظریہ بھی پیش کیا اس لیے اس کو مثالیت کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے۔پارمی نائدیس کے فلسفہ نے ہی ظواہراورحقائق کی تفریق اورغیر مرئی حقائق اورغیر حقیقی ظواہر کے اس نزاع کو جنم دیا جو کانٹ کے ہاں اپنے نقطہ عروج کو پہنچا۔پارمی نائدیس شاعر بھی تھا اوراس نے فطرت پہ اپنے خیالات کو بہت خوبی

سے اپنی نظم ''فطرت'' میں بیان کیا ہے۔ پارمی نائدیس نے بیان کیا ہے کہ آغاز وانجام پیدائش ومرگ اور کون وفساد صرف ظاہر میں ہوتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کائنات واحد ہے اور واحد کا نہ آغاز ہوتا ہے نہ انجام ہوگا۔ صرف اس کا وجود ہے، تکوین وتخلیق محض واہمہ ہے۔ ناوجود کہیں نہیں اور وجودِ واحد کائنات میں ہر جگہ محیط ہے اور ساکن ہے۔ حرکت تغیر وتبدل بھی فریبِ نظر ہے۔ پارمی نائدیس کا تصورِ وحدت الوجود بعد میں تصوف کے راستے اسلام میں بھی جگہ پا گیا۔ صوفیا کے ہاں اس نظریے کو خاص پذیرائی حاصل ہوئی۔ وحدت الوجود کے اس تصور نے اسلام میں راہبانیت کو بھی داخل کیا جو اسلام کے خالص تصور سے سراسر اجنبی چیز تھی۔

❑❑❑❑❑❑❑

دیما قریطس

لیوکپس کا مقام بھی یونانی فلسفہ میں احترام سے لیا جاتا ہے وہ پارمی نائدیس کے افکار سے متاثر تھا۔ اجل نے لیوکپس کو زیادہ وقت نہ دیا مگر وہ اپنے افکار اپنے ہونہار شاگرد دیما قریطس تک منتقل کرنے میں کامیاب رہا۔ لیوکپس میلٹس کی شہری ریاست میں پیدا ہوا مگر علم کی تلاش اسے لیے گھومتی رہی۔ بہت عرصے کے بعد اس کی ملاقات پارمی نائدیس سے ہوئی۔ مگر اب پارمی نائدیس کے پاس وقت کم تھا اور وہ بسترِ مرگ پہ تھا۔ تاہم لیوکپس نے پارمی نائدیس سے کسبِ فیض حاصل کیا مگر وہ خود ایک مہلک اور جان لیوا بیماری کا شکار تھا۔ اس لیے اس نے اپنے افکار دیما قریطس کو تفویض کیے لیوکپس کی موت کے بعد دیما قریطس نے اپنے استاد کے تصورِ کائنات کو مربوط انداز سے پیش کیا تو دنیائے فلسفہ میں تہلکہ مچ گیا اس لیے کہ دیما قریطس نے پہلی مرتبہ نوعِ انسانی کو ایٹم کے وجود کی اطلاع فراہم کی اور اپنا یہ تخیل پیش کیا کہ کائنات مادے کے ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہے جن کا مزید تجزیہ ممکن نہیں۔ اصطلاح میں اس ذرے کو ایٹم کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ عربوں نے اجزائے لایتجزیٰ کیا۔ دیما قریطس نے بتایا کہ یہ ایٹم متحرک اور متصادم رہتے ہیں۔ دیما قریطس کو مادیت کا امام بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ مابعد الطبیعات کا قائل نہ تھا اور اس کے خیال میں انسانی جسم کی طرح اس کی روح بھی ایٹموں کا مرکب ہے اور ان سے الگ روح کا کوئی وجود

نہیں۔ دیما قریطس فطرت میں ہر نوع کی مقصدیت اور غایت کا منکر ہے اور ہر مسبب کو کسی سبب کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اس نے کہکشاں کے بارے میں کہا کہ وہ ستاروں کا جھرمٹ ہے۔ اس کے مقولوں میں پختہ دانش اور خرد کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہ کہتا ہے کہ خوشی کا سرچشمہ انسان کے باطن سے جنم لیتا ہے نہ کہ مال و متاع سے۔

❑❑❑❑❑❑❑

ایمپی و کلیس

ایمپی ویکلس نے اول اول انسانی ارتقاء کے بارے میں ایک تخیلاتی نظریہ پیش کیا جس نے ڈارون کے ہاں ایک علمی نظریہ کی شکل اختیار کی۔ ایمی ویکلس ایک منطقی آدمی تھا اس نے اپنے نظریات کی بنیاد روایتی مذہبی تخیل سے ہٹ کر ٹھوس سائنسی حقائق پر رکھی جس سے اس کے معاصر مذہبی حلقے خفا ہو گئے۔ اس کے خیالات معاشرے کے عمومی تصورات سے بغاوت کی حد تک دور تھے۔ وہ برملا کہتا ہے کہ دریائے نیل میں پانیوں کی روانی کا کسی دیوتا سے کوئی تعلق نہیں بلکہ حبشہ میں ہونے والی بارشوں اور بلند پہاڑی سلسلوں میں برف پگھلنے سے دریا میں طغیانی آتی ہے۔ ایمپی ویکلس کے نظریہ ارتقاء میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا ارتقاء حیات کی اسفل صورتوں سے ہوا تھا۔ اس نے انسان کے دورِ وحشت سے تہذیب تک کے سفر کے تمام ارتقائی مراحل پہ بھی روشنی ڈالی ہے اور کائنات کی تشریح بھی کی ہے جس کے مطابق کائنات خاک ہوا پانی اور مٹی سے مل کر بنی ہے اور یہی عناصر اربعہ کائنات کی بنیاد ہیں۔ یہی تخیل بعد میں ایک مذہبی تصور میں بدل گیا جس کے متعلق فیثاغورس کا ایک شاگرد پیرو فلولاس کہتا ہے کہ سیارے زمین کے گرد نہیں گھومتے بلکہ زمین دوسرے سیاروں کی طرح ایک مرکزی اور ''مقدس آگ'' کے گرد گھومتی ہے۔ اُناغورس کہتا ہے کہ چاند کی سطح ٹھوس ہے جس پہ پہاڑ اور وادیاں ہیں۔ چاند خود سے روشن نہیں بلکہ وہ سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے اور زمین کا سب سے قریبی سیارہ ہے۔ ایمپی وکلیس کہتا ہے کہ انسان وحوش کی صف سے اس لیے جدا ہوا کہ وہ اپنے دو پاؤں پہ کھڑا ہو گیا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ کام کرنے کے لیے آزاد ہو گئے اور وہ دوسرے جانداروں سے بہت

آ گے نکل گیا حتیٰ کہ اس نے انسانی تہذیب و معاشرت اور سماج کے ابتدائی خدوخال وضع کیے۔

❑❑❑❑❑❑❑

سقراط

یونان کے فلاسفہ میں عظمت کے جن جہانوں کو سقراط نے چھوا وہ کسی اور کا مقدر نہ تھا کہ تاریخ کے اس تاریک دور میں علم کے ایک پیاسے نے اپنے جنوں کی سچائی پر آنچ نہ آنے دی اور ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ زہر کا پیالہ اپنے حلق سے اتار لیا۔ سقراط کو پہلے شہید فلسفہ کا خطاب دیا گیا۔ چوتھی صدی قبل مسیح کو فلسفہ یونان کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس سے قبل فلاسفہ کے افکار و نظریات منتشر اور غیر منظّم تھے۔ سوفسطائیوں نے ہر طرف شکوک و شبہات پھیلا رکھے تھے۔ عہدِ سقراط سے قبل یونانی فلاسفہ کائنات کے مظاہر اور اس کی تکوین و تخلیق کے آفاقی مسائل پر غور و فکر کرتے تھے۔ سقراط کے دور میں سوفسطائیوں کا زور تھا جنھوں نے زبان و بیان کے بنیادی اسلوب وضع کیے۔ فصاحت و بلاغت کے مبادیات کا تحقیقی مطالعہ کیا اور منطق اور جدلیات کو ترقی دی۔ فکری مغالطوں کی نشاندہی کے طریقے بھی انھوں نے ہی وضع کیے۔ سوفسطائیوں نے اہل فکر کی نگاہیں آفاقی مسائل سے ہٹا کر انسانی مسائل پر مرکوز کردیں۔ سقراط کا اپنا انداز بھی سوفسطائیوں جیسا ہی تھا لیکن اس نے موضوعیت کی مخالفت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بعض صداقتیں اور قدریں ایسی بھی ہیں جو سراسر معروضی ہیں اور انسان کے ذہن و قلب سے ماوراء ازلی اور ابدی وجود رکھتی ہیں۔ سقراط کے ہاں بھی آفاقی مسائل کو پس پشت ڈال کر اخلاقی اور سیاسی مسائل سے بحث کی گئی اور کائنات کی بجائے انسان کو موضوع فکر بنایا گیا۔ سقراط نے کائنات کی ماہیت کے بارے میں جو خیالات پیش کیے ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظواہر کے پس پردہ ایک حقیقتِ اولیٰ کا قائل تھا اور اَناغورس کی طرح وہ بھی یہ سمجھتا تھا کہ ایک ہمہ گیر ذہن ہر ذی حیات میں نفوذ کیے ہوئے ہے۔ سقراط جدلیات میں زینو کا خوشہ چیں ہے اور یہ جدلیات افلاطون کے واسطے سے ارسطو تک پہنچی تھیں جس نے انھیں منطق کی صورت عطا کی۔ سقراط کے

یہاں فلسفہ الٰہیات یا مابعد الطبیعات پر مشتمل نہ تھا بلکہ اخلاقیات اور سیاسیات پر محیط تھا۔ سقراط کے نظریات اور تصوراتِ کائنات شروع سے اہل مذہب کے ہاں ناپسندیدہ قرار دیئے گئے تھے تاہم بعد میں اس پہ قوم کے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا الزام بھی لگایا گیا۔ اس پہ ایک اور الزام یہ تھا کہ وہ قومی دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا بلکہ ان کی توہین کرتا ہے۔ اس کے سائنسی افکار کو پہلے ہی مردود قرار دیا جا چکا تھا۔ چنانچہ اس پہ مقدمہ قائم کیا گیا اور عدالت کی طرف سے اسے یہ اختیار دیا گیا کہ یا تو وہ اپنے افکار و نظریات سے انکار کر دے یا پھر موت کے پیالے کو منہ سے لگا لے۔ سقراط نے علم کی برتری کی خاطر زہر کا پیالہ پی لیا اور تاریخ کے دریچوں میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔

□□□□□□□

افلاطون

دنیائے فلسفہ میں افلاطون کو مثالیت پسندی کا شارح اول مانا جاتا ہے۔ یونان کے فلاسفہ میں افلاطون کا مقام بہت بلند ہے اور اس کے افکار کو وقت کے اہلِ دانش میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ افلاطون سقراط کا شاگرد تھا اور اس نے سقراط کے افکارِ پریشان کو باقاعدہ ایک نظام فکر کی صورت میں مرتب و منضبط کیا۔ اس کی تشریح و توضیح کی افلاطون کے نظریہ مثالیت میں بیان کیا گیا ہے کہ امثال ازلی و ابدی ہیں غیر متحرک ہیں اور دنیا میں جتنی بھی اشیاء دکھائی دیتی ہیں وہ سب امثال کے عکس ہیں اور مثلِ اعلیٰ ہی حقیقتِ اولیٰ ہے مثل حقیقی ہے، مادہ غیر حقیقی ہے اور اپنے وجود کے لیے مثل کا محتاج ہے۔ تمام مادی اشیاء فریبِ نظر کا کرشمہ ہیں اور امثال کا ادراک باطنی قوت یا اشراق سے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر افلاطون کو اشراقیت کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ افلاطون نے خدا کو ''خیر محض'' کہا ہے اور مکالمات میں سقراط کی تین اعلیٰ اقدار خیر، حسن اور صداقت سے مفصل بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیکی کی طرح حسن بھی توافق و تناسب ہی کا دوسرا نام ہے۔ عشق حسن کا

تعاقب کرتا ہے اور خیر محض کی محبت ہی دراصل عشق حقیقی ہے۔افلاطون کی مثالیت کا اہل مذہب کے ہاں پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔اس وقت کا حکمران ''ولی آگسٹائن'' اسے فلاسفہ کا مسیح کہا کرتا تھا۔اتحاد واشراقیت کے تصورات تصوّف میں شامل ہو گئے۔چنانچہ فلاطینوس نے اشراقیت کے نام پر افلاطون ہی کے اشراق کی نئے سرے سے تدوین کی مگر افلاطون عمر کے آخری حصے میں فیثا غورس کے نظریات کے زیر اثر رہا۔چنانچہ اس کے ہاں بھی تناسخ ارواح کا تصور در آیا۔مکالماتِ افلاطون دنیائے ادب وفلسفہ کے شاہکار تصور کیے جاتے ہیں۔اس کی دیگر تصنیفات میں ''سمپوزیم اور فیدو'' شامل ہیں جن میں عشق افلاطونی کا اعلیٰ تصور پیش کیا گیا۔ ''جمہوریہ'' میں اس نے سیاسی فلسفہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ''قوانین'' میں سپارٹا والوں کی کڑی تادیب کی پیروی پر زور دیا گیا ہے۔افلاطون کے ہاں اس کی خیالی ریاست کا جو تصور پایا جاتا ہے اس میں اشتمالی نظام ومعاشرت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔وہ املاک کے ساتھ عورت کے اشتراک کا بھی قائل تھا۔اس نے اپنی مثالی ریاست سے موسیقاروں شاعروں اور اداکاروں کو جلاوطن کر دیا تھا کہ اس کے خیال میں موسیقی اور شاعری کے فنون نوجوانوں کے عزم وحوصلہ کو کمزور کرتے ہیں۔سیاسیات میں اس کا مسلک یہ تھا کہ جب تک زمام حکومت فلسفی بادشاہوں کے ہاتھ میں نہیں دی جاتی اس وقت تک معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ ناممکن ہے۔افلاطون کے سیاسی اور معاشرتی استدلال کا مقصود عدل وانصاف کا قیام تھا۔ہر شخص کا اپنی استعداد کے مطابق معاشرتی فرائض کو انجام دینا ہی دراصل عدل ہے۔افلاطون کی درسگاہ کو اکیڈمی کہا جاتا تھا جہاں صدیوں تک افلاطونی افکار کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

❑❑❑❑❑❑❑

ارسطو

ارسطو کی ذات پہ فلسفہ یونان کے اس عظیم دور کا خاتمہ ہو گیا جس نے بنی نوع انسان کو علوم کی ان جہتوں سے آشنا کیا جن سے وہ کبھی بھی آشنا نہ تھا۔یونان کے فلاسفہ نے تہذیب وتمدن اور ریاست کے وہ خدوخال مہیا کیے جن پہ آج کی جدید دنیا کی جمہوری حکومتوں کی بنا رکھی ہے۔انھوں نے معاشرے فرد اور ریاست کے

مابین اختیارات کی تقسیم کی۔ بنیادیں فراہم کیں اور انسان کو متمدن سماج مہیا کیا۔ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا اور افلاطون سقراط کا شاگرد تھا اس طرح یونان کے ان عظیم فلاسفروں نے دنیا کے فکری اور عملی انداز کو بدل کے رکھ دیا۔ یہ بات بلا تعامل کہی جاسکتی ہے کہ جو دنیا سقراط افلاطون اور ارسطو کے عہد سے پہلے تھی اور جو تاریکی ان کے عظیم فلسفیانہ تصورات کے وقت دنیا کے طول وعرض پہ چھائی ہوئی تھی اس دنیا کو ان بزرگ فلاسفہ نے بدل کر رکھ دیا۔ اب دنیا اوہام اور مذہبی جبر کے اس تسلط سے باہر آرہی تھی جس نے ان کے معاشروں اور سماج کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ارسطو اپنے استاد افلاطون کے برعکس تحریر میں رنگینی اور خیال آفرینی کا قائل نہ تھا۔اس کا اسلوبِ بیان بالکل سادہ اور کسی حد تک خشک تھا۔وہ عقل اور دل کا قائل تھا اور اس نے اپنے استاد کے نظریہ مثالیت پہ معرکہ آرا نقد لکھا اگرچہ وہ بھی افلاطون کی طرح مثالیت پسند ہی تھا مگر اس کی مثالیت میں حقیقت پسندی کا عنصر موجود تھا۔ارسطو نے کہا کہ افلاطون کا یہ دعویٰ کہ امثال سراسر غیر مادی ہیں غلط ہے۔مثل کو مادے سے جدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ مثل مادے ہی میں مضمر ہے اور اسی کا حصول مادے میں حرکت پیدا کرتا ہے جو عملِ ارتقاء کا باعث بنتا ہے۔

ارسطو نے روح کی تعریف میں کہا کہ روح کسی ذی حیات کا وہ حرکی عنصر ہے جو اسے اپنی ہیئت کی تکمیل پہ اکساتا ہے اور جسم کے ساتھ روح کا تعلق ایسا ہی ہے جیسا کہ آنکھ کا بصارت کے ساتھ۔اس نے روح کے تین مندارج بیان کیے ہیں، نامیہ، حسی اور ناطقہ وہ کہتا ہے کہ جس طرح روح جسم کی ہیئت ہے اسی طرح خدا کائنات کی ہیئت ہے۔ارسطو شخصی خدا کا قائل نہ تھا بلکہ وہ اسے علت العلل یا محرکِ غیر متحرک کہتا ہے۔ارسطو کو دنیائے فلسفہ میں منطق، جدلیات، جمالیات اخلاقیات اور سیاسیات کا مدون سمجھا جاتا ہے۔اخلاقیات میں اس نے اعتدال کا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ انسان بالطبع مسرت کا طالب ہے اور اعلیٰ مسرت صرف فلسفیانہ تفکر اور تعمق ہی سے میسر آسکتی ہے اس کے خیال میں اخلاق اور سیاسیات باہم گروابستہ ہیں اور جو شخص اچھا شہری نہ ہو وہ با اخلاق نہیں ہوسکتا۔مسرت حظ ولذت سے مختلف ہے اگرچہ مسرت میں حظ کا عنصر لازماً موجود ہوتا ہے المیہ کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ المیہ رحم اور خوف کے جذبات کو ابھار کر ان کی تنقیح کرتا ہے۔آرٹ کے بارے میں ارسطو کا خیال تھا کہ وہ محض نقالی ہے۔مذہب میں وہ روح کی بقاء کا منکر تھا۔ارسطو کا اندازِ نظر اپنے استاد کی نسبت زیادہ تحقیقی اور حقیقت پسندانہ ہے۔وہ حیاتیات حیوانیات اور ارضیات میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ارسطو نے پڑھے لکھے لوگوں کی سہولت اور فہم کے لیے فلسفے پر ستائیس

مکالمات لکھے جو وحشیوں کی ترک وتاز میں تلف ہو گئے۔اہل یونان کے ہاں فلسفہ اور تاریخ کو محفوظ رکھنے کا رواج تو موجود تھا مگر ارسطو اور دوسرے فلاسفہ کی بہت سی تحریریں ہم تک نہ پہنچ سکیں۔اس کے باوجود اس وقت خطہ ارض پہ کوئی اور ایسی قوم موجود نہ تھی جو فلسفہ ہیت نجوم اور طب میں اہل یونان کی مسابقت کا دعویٰ کر سکتی۔چنانچہ ارسطو ہو یا اس کے دیگر ہم عصر فلاسفہ ان کی علمی جستجو کو خراج تحسین پیش نہ کرنا بخیلی ہو گی کیونکہ اس وقت عام آدمی اتنا بالغ نہ تھا کہ وہ فلسفے کی دقیق زمین پر حاشیہ آرا ہو سکے۔چنانچہ یونانی قوم کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اس کے فلاسفہ نے نہ صرف دیگر علوم میں انسانیت کی راہنمائی کی بلکہ جمہوری نظام حکومت بھی انھیں سے یادگار ہے جو آج بھی ایک مقبول نظام حکومت مانا جاتا ہے۔[*14]

یونانی فلاسفہ پہ تنقیدی نظر

دنیا میں علوم کی ہزاروں قسمیں اب تک دریافت ہو چکیں ہیں جن کی مدد سے حضرت انسان نے اپنے شب و روز میں بہتری لانے کی کوشش کی ہے مگر درحقیقت وہ اس علم خاص کی تلاش میں ہی مگن رہا جو نہ صرف اس کے لیے مادی ترقی کے دروازے کھول دے بلکہ اس کی روح کو بھی سکون مہیا کرے۔ یہی وجہ ہے روز اول سے انسان نے جہاں اپنے مادی مطالبات کی طرف توجہ مبذول رکھی ہے وہیں اس نے اپنے بطون میں موجود اس خلا کو بھی محسوس کیا ہے جو دراصل اس سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم کرے کہ کوئی اس کا خالق ہے کوئی اس پہ نگران ہے جو شب و روز اس پہ اپنی رحمت کا سایہ کیے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ کسی دور کا انسان بھی مذہب سے خالی نہیں رہا اور اس نے ہمیشہ اپنی امیدوں کا دامن کسی پر اسرار اور ماورائے ہواس طاقت سے وابستہ رکھا ہے چاہے وہ خالق کی تلاش میں کامیاب رہا یا ناکام اس نے خالق کو کھوجنے کا سفر ہمیشہ جاری رکھا ہے چاہے وہ اسے مظاہر فطرت میں کھوجے یا پتھر کے بتوں میں یا آگ کے شعلوں میں اس عکس کو تلاش کرنے کی کوشش کرے جو اس کے دکھوں کا مداوا کر سکے جو اس کی مسیحائی کا دم بھرے۔ انسان

تمدنی ارتقاء کی جانب بڑھتا رہا مگر فکری طور وہ تشنہ لبی کا شکار رہا۔اہل مغرب کا دعویٰ ہے کہ یونانی فلاسفہ نے انسان کے اندر فکری انقلاب بپا کیا اور اس کو تہذیب وفکر کے بلند مناصب عطا کیئے اگرچہ میں یونانی فلاسفہ کی جدوجہد سے انکاری نہیں ہوں مگر ان کے افکار پڑھنے کے بعد یقیناً اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ان کی فکری اساسات اتنی متاثر کن نہیں ہیں کہ ان پہ لب کشائی نہ کی جاسکے۔ یونانی فلاسفہ کے اندر بے پناہ تضادات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسان نے جب بھی اپنی راہنمائی خود کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے خالق کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر کسی خود ساختہ نظام حیات کے تحت زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ منزل سے بہت پرے ہی ہانپنے لگتا ہے اور جلد ہی کسی نئے نظریے کے تحت سفر زندگی شروع کر دیتا ہے چنانچہ یونانی فلاسفہ کے افکار سے بھی تاریخ کے صفحات پر کچھ ایسے ہی نقوش ابھرے ہیں اس لیے یونانی فلسفہ پڑھتے ہوئے بھی انسانی عقل کی نارسائی کا احساس ہر قدم پہ آپ کا احاطہ کیے رہتا ہے۔

ابونصر فارابی جسے یونانی فلسفہ کا بہترین ترجمان تصور کیا جاتا ہے یونانی فلسفہ میں موجود تضاد کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ افلاطون سے کسی نے ریاست کے بنیادی خدوخال دریافت کیے تو اس نے جواب دیا کہ سب سے پہلے تو لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر دو جن میں سے دو گروہ معاشرے پہ حکمران ہوں جو فوج اور انتظامیہ پر مشتمل ہوں۔اس نے ان دو طبقوں کو معاشرے کے تمام وسائل کا نگہبان بنا دیا اور کہا کہ ان دونوں طبقات پر خصوصی توجہ دی جائے ان کو بے پناہ اختیارات اور وسائل مہیا کر دیئے جائیں۔مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے ریاست کی سب سے بڑی اکثریت یعنی عوام کے حقوق کی بات تک نہیں کی اور انسانی مساوات کی اس بری طرح نفی کی کہ حیرت ہوتی ہے کہ دنیائے فلسفہ کا شہنشاہ اس قدر بے عدل بھی ہوسکتا ہے مگر اس کی بے عدلی اور بے اعتدالی کے دیگر بہت سے ثبوت بھی دستیاب ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی فلاسفہ بھی قوم پرستی کے تعصب میں اس بری طرح مبتلا تھے کہ ان کے مطابق صرف یونانیوں کو ہی اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ دنیا پر حکمرانی کریں کیونکہ روئے زمین پر صرف وہی سردار ہیں اور باقی سب قومیں غلام ہیں۔افلاطون مزید کہتا ہے کہ حکومت کو بڑے بڑے مذہبی میلوں اور تہواروں کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ ملک کے ممتاز افراد ملک کی ممتاز عورتوں سے ہم بستر ہوں اور ان سے بہترین بچے پیدا ہوں جو ریاست کا سرمایہ تصور کیے جائیں۔اس بات کا بھی اہتمام کیا جائے کہ کسی عورت کو اس کا اپنا بچہ دودھ پلانے کے لیے نہ دیا جائے نہ کسی مرد کو یہ بات معلوم ہو کہ فلاں اس کا بیٹا ہے اس طرح افلاطون معاشرے سے خاندانی نظام کو

یکسر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ افلاطون جیسے فلسفی کے یہ خیالات پڑھ کر سر چکرانے لگتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جس کے علم وحکمت کا ڈنکا ایک عالم میں بجتا رہا ہے؟ کیا یہ وہ شخص ہے جس کو دنیا حکیم اور شاہ دانش کے نام سے جانتی ہے وہ انسانی نفسیات کے بنیادی علم سے اتنا بے خبر بھی ہو سکتا ہے۔ افلاطون کی فلاسفی کا ایک اور پہلو پیش کرتا ہوں جس میں وہ حکیم کی بجائے کسی جلاد کے روپ میں سامنے آتا ہے۔

''افلاطون بڑھتی ہوئی آبادی کا حل یوں پیش کرتا ہے کہ جب عوام اور لشکر ایک معتدل حد سے بڑھ جائے تو جسمانی طور پہ اپاہج اور کمزور افراد کو قتل کر دیا جائے جس لڑکے کا اخلاق برا ہو اور وہ بیمار جس کے تندرست ہونے کی کوئی امید نہ ہو اسے بھی معاشرے پہ بوجھ تصور کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے تا کہ مثالی شہر کی آبادی معتدل رہے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

پتہ نہیں یہ افلاطون کی سادہ لوحی ہے کہ اس کا فکری جبر کہ وہ اتنی آسانی سے اپنے شہریوں کے قتل کا حکم جاری کر رہا ہے۔ یونانی فلاسفہ کے ہاں عدل وانصاف کا تصور بھی انتہائی بودا ہے جس کے مطابق معاشرے کے مختلف طبقات کو ایک دوسرے پر ترجیح دی گئی ہے۔ چنانچہ افلاطون کا شاگرد ارسطو اپنی مشہور زمانہ کتاب ''السیاست'' میں لکھتا ہے کہ:

''کسی بھی قانون کو کسی معاشرے کے تمام افراد کے لیے یکساں قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ان کا مساوی انطباق صرف ان افراد پہ ہو سکے گا جو نسب اور قابلیت کے لحاظ سے بھی یکساں ہوں اور رہا حکمران طبقہ تو وہ تو خود ہی قانون بنانے والے ہیں ان کو دستور کا پابند کس طرح بنایا جا سکتا ہے اور یہ بات عدل کے سراسر خلاف ہے کہ کسی سردار کو کسی عامی کے بدلے میں قتل کیا جائے یا اسے کوئی اور سزا دی جائے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

قوم پرستی کے تعصب میں بری طرح مبتلا دوسرے حکماء اور فلاسفہ کی طرح ارسطو بھی کچھ یوں رقم طراز ہے کہ:

''وہ دنیا کی اقوام کے خصائل کا احاطہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مشرقی لوگ ماہر فن تو ہیں مگر بزدل ہیں، مغربی لوگ شمالی یورپ کے لوگ بہادر ہیں مگر ان میں ذہانت اور سیاسی سمجھ بوجھ نام کو بھی نہیں ہے باقی رہے یونانی تو وہ ان سب خصوصیات کا مرقع ہیں۔ چنانچہ اس سے ارسطو یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ صرف اہل یونان ہی اس قابل ہیں کہ وہ دنیا کی راہنمائی کرسکیں اور باقی ساری دنیا پہ حکمران رہیں''۔

❑❑❑❑❑❑❑

چونکہ اہل یونان کی فلاسفی ہمارا موضوع نہیں ہے بلکہ ہم محض چند اشارات کے ذریعے یہ بات باور کرانا چاہتے تھے کہ انسان کا خالق ہی انسان کے لیے قوانین وضع کرنے کا حق دار ہے اور انسان نے جب بھی خالق کے بنائے ہوئے قانون سے روگردانی کی ہے تو قوم پرستی کے نشے میں ڈوبا کوئی نہ کوئی ہٹلر دنیا کو آتش کدہ بنا کے رکھ دیتا ہے جس کے ذکر سے ہی انسان کی فکری پستی سے اٹھنے والا التعفن ماحول کو ناخوشگوار احساس دے جاتا ہے ایسا ہی کچھ ماجرا یونانی فلاسفہ کے ساتھ بھی ہوا۔

📖📖📖

ادب اور معاشرہ

یونانی معاشرہ میں جہاں علم وفلسفہ نے عروج کے مراحل طے کیے وہیں سائنس تاریخ اور فنون وادب میں بھی ان کی دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ بقراط علم طب کا بانی تھا تو ہیروڈوٹس ایسا مورخ تھا جس کی تاریخ آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے وہ پریکلی کا معاصر تھا اس نے مصر بابل اور فنیقیہ کی سیاحت کی اوران ممالک کے تمدن کا بھرپور نقشہ کھینچا۔ بقراط نے علم طب قدیم مصریوں سے سیکھا جو اس علم کے کمالِ فن تک پہنچے ہوئے تھے۔ مشہور حکیم جالینوس بقراط کا شاگرد تھا جس نے اپنے استاد کے مکالمات اور مشاہدات قلم بند کیے۔ آج بھی یونانی علم طب میں بقراط اور جالینوس کی طبی روایات کی پیروی کی جاتی ہے۔ قدمائے یونان نے فلسفہ تاریخ اور علم طب کے علاوہ فنون لطیفہ میں بھی ایسے شاہکار پیش کیے جن کا تذکرہ آج تک موجود ہے۔ شعر وادب میں یونانیوں کی دلچسپی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ شاعری میں ہومر کو رزمیہ کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے ہیلن آف ٹرائے کی جنگ کے مناظر بڑے پرشکوہ انداز سے پیش کیے ہیں۔ ارسطو کو ہیزیڈ اور ہومر کی نظمیں بہت پسند تھیں اور مشہور شاعر پنڈار کے گیت بھی اس کے دل کو بھاتے تھے۔ ہیزیڈ کے اسالیبِ بیان نے اہل مغرب کے احیاء العلوم کے دور کے شاعروں کو متاثر کیا۔ یونانیوں کی عطائی شاعری بڑی دلکش تھی جزیرہ لزباس کی شاعرہ سیفو کی نظموں میں عشق وجنوں کی ترجمانی بڑی مشاقی سے کی گئی ہے۔ سیفو ایک غیر متوازن شخصیت کی حامل خاتون تھی اس نے لزباس نامی شہر میں فنونِ لطیفہ کی تدریس کے لیے ایک ادارہ کھول رکھا تھا جس کی حسین طالبات سے سیفو عشق کیا کرتی تھی۔ اس نے اپنی محبوباؤں کے فراق میں بہت سی دلدوز نظمیں لکھیں جنہیں اہل یونان قیمتی سرمایہ تصور کرتے تھے۔ اگرچہ تاریخ میں لزباس کے اس

ادارے سے قبل بھی ان معاشروں میں ہم جنس پرستی موجود تھی مگر سیفو کی نظموں میں جس طرح اس موضوع کو سمویا گیا اس کے بعد سے اس فعل بد کو اصطلاحاً Lesbin کہا جاتا ہے۔آکسفورڈ کے ادارے نے اپنی ڈکشنری میں Lesbian کے معنی اسی رعایت سے شامل کئے ہیں یعنی ہم جنس پرست عورتیں۔اہل یونان موسیقی کے بھی دیوانے تھے ان کی موسیقی میں بربط کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ان کا ایک ساز LYRIC تھا جس کی رعایت میں ساز کے ساتھ گائی جانے والی ہر نظم کو LYRIC کہا جانے لگا۔دیہات میں الغوزہ بجاتے تھے اہل سپارٹا کے ہاں اجتماعی ناچ کا بہت رواج تھا۔ان محفلوں میں سقراط بھی شریک ہوا کرتا وہ کہتا تھا کہ اس سے جسم کی ورزش ہوتی ہے۔خود موسیقی کا لفظ بھی یونانی زبان سے ماخوذ ہے۔

اہل یونان عارفیوس کو مثالی موسیقار قرار دیتے تھے اور اپی لیس فن مصوری میں ان کے ہاں امام تصور کیا جاتا ۔دیگر جن فنون نے یونان کے آرٹ کو ضرب المثل بنایا تھا وہ ان کی تمثیل نگاری اور سنگ تراشی پر مبنی تھی۔ یونانیوں کے مجسّمے تناسبِ اعضاء اور حسن و جمال کے مثالی نمونے سمجھے جاتے تھے۔یونانی ورزش اور کھیل کود کے شیدائی تھے اور جسم کے خطوط کی راعنائی کو برقرار رکھنے کا بہت اہتمام کرتے تھے۔انھوں نے اپنے دیوتاؤں کے مجسّمے اپنے ہی خوبصورت جسموں کو نظر میں رکھتے ہوئے تراشے تھے''ڈسکس والا اور وینس ڈی میلو'' مردانہ اور نسوانی حسن کے شاہکار مجسّمے تھے۔مصری یک رخے مجسّمے تراشا کرتے تھے مگر یونانیوں نے اپنے مجسّموں کو ہر رخ اور ہر زاویے سے دکھایا ہے اس لیے ان کی سنگ تراشی میں مصریوں کی نسبت زیادہ لچک اور نفاست پیدا ہو گئی تھی۔یونانی عورتیں اپنی خواب گاہوں میں اپالوزوس اور ایراس کے مرمریں مجسّمے رکھا کرتیں تا کہ ان کے ہاں بھی خوبصورت بچے پیدا ہوں۔

پریکلیز کے عہد حکومت میں یونانی مجسّمہ سازی اپنے عروج کو پہنچ گئی۔اس دور کے مجسّمے اپنے خطوط کی دلاویزی کی وجہ سے خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔پریکلز نے ہی ایتھنز میں عظیم معبد ''پارتھےنوس'' کی تعمیر شروع کرائی جس کے در و دیوار پر حسین اور برجستہ نقوش کندہ کئے گئے ۔اس معبد کو تو وقت کی راکھ اپنے ساتھ بہا کر لے گئی مگر اس کی دیواروں کے کچھ ٹکڑے آج بھی برٹش میوزم میں موجود ہیں اور اس دور کے اہل فن کی چابک دستی کے گواہ ہیں۔یونانی ڈرامہ کی بنیاد مذہب اور دیو مالا پر رکھی گئی تھی جس کا مرکزی خیال عموماً المیہ ہوا کرتا۔یونانی ہی ڈرامہ کے اولین موجد ہیں [15*]۔جس کی داغ بیل چھٹی صدی قبل مسیح میں ڈالی گئی۔یونانی تمثیل کے عناصر ترکیبی تین تھے عمل شاعری اور موسیقی اگر چہ وہ عمل کو مقدم رکھتے۔عام طور پر

دیونیسس کے معبد کے قریب ہی ایک تھیٹر میں یہ ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ایکٹر اپنے چہرے پر نقاب رکھا کرتے وہ ڈرامے اتنی کثرت سے کیا کرتے کہ شاذونادر ہی کوئی تمثیل دوبارہ پیش کی جاتی۔ایسکلیس اور سوفوکلیز ان کے مشہور تمثیل نگار تھے جنہوں نے اپنی کاوش سے یونانی تمثیل میں جان ڈال دی تھی۔یونانی تمثیل کا بنیادی موضوع انسانوں اور دیوتاؤں کے مابین باہمی آویزش یا مقدر کے خلاف انسانی کشمکش کو اجاگر کرنا تھا[16*] ۔ایسکلیس کا مشہور ڈراما قیدی پرومیتھس بھی سراسر ایک مذہبی تمثیل تھی۔یونانی ڈرامے میں شاعری عمل موسیقی اور رقص کا ایک ایسا حسین امتزاج پیش کیا گیا جس کا جواب آج تک نہیں دیا جاسکا۔آج کا تھیٹر بھی انھی بنیادی روایات پر استوار ہے جو یونانیوں نے تمثیل کے اولین دور میں وضع کی تھیں۔بعدازاں ایسکلیس نے اخلاق اور مذہب جیسے عمیق ترین مسائل پر بھی طبع آزمائی کی۔وہ دیوتاؤں کے وجود مسئلہ شر حب الوطنی اور انسانی ذمہ داری جیسے عظیم موضوعات کو زیر بحث لایا اور تمثیل کے پیرائے میں اپنے معاشرے کی راہنمائی کی۔

اس کے خیال میں دیوتا عادل اور غالب ہیں اور انسان پر ان کی اطاعت واجب ہے۔گناہ موروثی ہوتا ہے لیکن انسانی شخصیت بھی اس کی ذمہ دار ہوتی ہے۔سوفوکلیز کردار نگاری پر زیادہ زور دیتا ہے اور اپنی نفسیاتی بصیرت کی وجہ سے آج تک اس کے لٹریچر میں لوگوں کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ایسکلیز روائتی اخلاق کا حامی تھا مگر سوفوکلیز اس سے اعتناء نہیں کرتا تھا۔فرائیڈ کے ہاں بعض کردار سوفوکلیز ہی سے اخذ شدہ ہیں چنانچہ یہ ایک لازمی امر تھا کہ ان تمثیلات کا عکس معاشرے میں بھی دیکھا جائے اس لیے معاشرے کی اخلاقی حالت بھی ان کے تمثیل نگاروں جیسی ہی تھی اور سچ بات تو یہ ہے کہ کسی عقیدے اور نظریے کے بغیر اہل یونان جیسی فلسفی قوم بھی فکری لحاظ سے بھیڑوں کے ایک بڑے گلے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔

ایران

ایران کو پہلے فارس کہا جاتا تھا۔اس ملک کی تاریخ وتہذیب اقوام عالم میں اتنا ممتاز مقام رکھتی ہے کہ اس کے ذکر سے پہلو تہی ممکن ہی نہیں۔ایران کا قدیم تمدن اپنے اندر اتنے متنوع پہلو لیے ہوئے ہے کہ حیرت سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ایران مختلف مذاہب اور مختلف اقوام کا مجموعہ تھا۔ایران براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔اس کے شمال میں بحر کیسپین اور جنوب میں خلیج فارس واقع ہے۔ایران کا رقبہ ہمیشہ سے زیادہ اور آبادی کم رہی ہے۔عمومی طور پر ایران کی سرزمین سطح مرتفع پر مشتمل ہے مگر شمال میں کوہ ابرز دیوار کا کام دیتا ہے۔ایران کی سب سے بلند چوٹی دمامند ہے جو ہمالیہ کے بعد ایشیا کا دوسرا بلند ترین پہاڑی سلسلہ ہے۔اس کے مشرق میں لق ودق صحرا ہیں سب سے بڑے ریگستان کو لوط کہا جاتا ہے۔پہاڑی چوٹیاں سارا سال برف سے ڈھکی رہتی ہیں مگر کم بلند پہاڑوں پر گھاس وغیرہ اگتی ہے جس پر بھیڑ بکریاں پالی جاتی ہیں۔پہاڑوں کے دامن میں تازہ اور خنک پانی کے بے شمار چشمے ہیں۔ایران میں آبادی کی ابتدا انھی چشموں پر رکنے والے قافلوں سے ہوئی تھی۔تاہم جس زمانے کے ایرانی تمدن سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اس کا رقبہ

اورحالات آج کے ایران سے کافی کچھ مختلف تھے۔موجودہ دور کی بہت سی آزاد مملکتیں اس وقت ایران کا حصہ تھیں۔چنانچہ تیسری صدی عیسوی کا ایران ایک وسیع وعریض ملک تھا اور افغانستان، بلوچستان سویانہ، بلخ اور عراق سلطنت ایران کا ہی حصہ تھے۔پرشیا جس کو فارس کہتے ہیں اس وقت ملک کا جنوب مشرقی صوبہ تھا۔
بعدازاں یہ سلطنت، بلوچستان، کچ، مکران، غور، بامیان ہندوکش، سیستان، زابلستان، خراسان، ماوراءالنہر، رشت، اصفہان، مازندران، استرآباد، گرمان، فارس، لارستان، خوزستان، افغانستان کابلستان، پنجاب، کردستان، شیروان، بابل، موصل اور دیار بکر تک وسعت اختیار کرگئی۔ایران کو ایران اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ آریاؤں کا ملک تھا جنہوں نے دو ہزار قبل مسیح میں اپنے علاقوں سے ہجرت کی۔ان کے کچھ قافلوں نے تو مغرب کا رخ کیا اور یونان تک جا پہنچے اور کچھ ایران اور ہند کے وسیع سبزہ زاروں میں رک گئے اور اس کو اپنا مسکن بنالیا۔اس وقت انسانی ہجرت کا بنیادی سبب رزق کی تلاش ہوا کرتا تھا اس لیے جہاں کہیں حالات موافق ہوتے لوگ وہیں اپنا پڑاؤ ڈال دیتے۔ان قبائل کا خروج اور آبادکاری کا عمل صدیوں جاری رہا یہ اس زمانے کی بات ہے جب بابل، مصر اور فنیقیہ وغیرہ تمدن عروج وزوال کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔اِن دنوں عراق پر اشوریوں کی حکومت تھی چنانچہ جس طرح ہندوستان میں وارد ہونے والے آریائی قبائل وادئ سندھ کے ہڑپائی تمدن سے فیض یاب ہوئے اسی طرح اشوری تمدن نظام حکومت مذہب اور فنون نے ان ایرانی قبائل کو بھی متاثر کیا۔
مغربی مورخ (Spaiegal) کا خیال ہے کہ ۱۰۰۰ ق م تک اشورائی اثرات ان آریائی قبائل کے معاشروں میں بہت دور تک نفوذ کر چکے تھے اور ان سے اپنی پہچان چھین کر ان کو اپنے رنگ میں رنگ چکے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب ان قبائل نے تہذیب سے آشنائی حاصل کی تو ان کے معاشروں میں ان علاقوں کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کئے جاسکتے تھے جہاں وہ ہجرت کے بعد مقیم ہوئے۔رفتہ رفتہ ان خانہ بدوش قبائل نے ہجرت کی روِش کو خیر باد کہا اور شہر تعمیر کر کے رہنے لگے اس طرح ایرانی تاریخ کا آغاز ہوا۔سب سے پہلے دور کو میڈیا کہا جاتا ہے۔میڈیائی دور کو ہامنشی خاندان نے ختم کیا۔میڈیا کا پایہ تخت ہمدان تھا جس کے متعلق روایت ہے یہ روئے زمین پہ یہ سب سے قدیم شہر ہے جو آج تک موجود ہے۔ہامنشی خانوادے کے سربراہ کورش کبیر نے میڈیائی بادشاہ اسٹیاگس کو شکست دے کر ملک پہ قبضہ کرلیا۔کورش کبیر ایک عظیم فاتح تھا اور اس نے چند برسوں میں ہی لیڈیا سے لے کر ترکستان تک کے تمام ملک فتح کر لیے۔بابل کی تسخیر اس کا

سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہودی اسے نجات دہندہ سمجھتے تھے کیونکہ کورش کبیر نے ہی انھیں اہلِ بابل سے رہائی دلا کر فلسطین جانے کی اجازت دی تھی۔ کورش کبیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا کمبوجیہ تخت پر بیٹھا لیکن وہ اپنے باپ کی طرح قابل اور فتین نہ تھا اس لیے جلد ہی اس کا ملک زوال پذیر ہو گیا۔ کمبوجیہ نے مصر اور شمالی افریقہ پر حملہ کیا مگر شکست کھائی جس کی وجہ سے اس کی فوج کمزور ہو گئی اور اس کے لیے اپنا ملک بچانا بھی ممکن نہ رہا اور ہمانشیوں نے اس سے تختِ ایران واپس حاصل کر لیا۔ اب کے تاج دارا یوش کے سر پہ رکھا گیا جو ایک اہل حکمران تھا اس نے اپنی سلطنت کو بہت توسیع بخشی اس کے زمانے میں گندھارا وادیٔ سندھ اور کشمیر کے کچھ علاقے بھی ایرانی عملداری میں چلے گئے تھے۔

آثارِ قدیمہ کو ملنے والے بہت سے کتبوں میں دارا یوش کی اصلاحات کا ذکر ملتا ہے اس نے اپنی وسیع سلطنت میں سڑکوں کا جال بچھا دیا تھا ان پر سرائیں اور کنویں تعمیر کرائے اس کے پر امن عہد میں مملکتِ ایران کی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوا اور ایرانی تاجروں کے قافلے چین سے لے کر مصر تک رواں رہتے۔ چنانچہ اس کے عہد کو نظم و نسق کی عمدگی اور ملکی ترقی کے لحاظ سے بے مثال قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے ہی سب سے پہلے ایران میں سونے اور چاندی کے سکوں کی ڈھلائی کا اہتمام کیا۔ ایرانیوں اور یونانیوں کی تاریخی چشمک کا آغاز بھی اسی عہد میں ہوا جب یونانی لٹیروں نے ساحل ایشیا پر قائم ایک ایرانی معبد کو لوٹ کر اس کو آگ لگا دی تھی۔ جس پر دارا یوش نے یونان پر چڑھائی کر دی اگرچہ اس مہم میں دارا یوش کامیاب رہا مگر جلد ہی سکندر اعظم ایک غبار کی طرح اٹھا اور دنیا پر چھاتا چلا گیا۔

دارا یوش کی سلطنت بھی اس عظیم آندھی کا سامنا نہ کر سکی اور اس طرح ایران سے ہمانشی خاندان کا دورِ حکومت بھی اختتام پذیر ہوا مگر جس طرح تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ سکندر ایک آندھی کی طرح آیا اور گذر گیا اور راستے میں آنے والی ہر چیز کو نیست و نابود کرتا چلا گیا۔ سکندر نے کسی مفتوح علاقے میں اپنی عملداری کو استحکام دینے کی کوشش نہیں کی اور جلد ہی خود بھی موت کی آغوش میں جا سویا۔ اس لیے سکندر کے بعد کا ایران کئی چھوٹے چھوٹے صوبوں اور ریاستوں میں منقسم ہو کے رہ گیا۔ مقامی وار لارڈز نے جا بجا اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں۔ بابل اور شمال مغربی ایران یونانیوں کے ہی قبضے میں رہا اور سیلوکس وہاں کا حکمران تھا جبکہ پارتھیا جو خراسان اور استر آباد کے صوبوں پر مشتمل تھا پر بدستور ایرانی حکومت کرتے رہے۔ پارتھی ہمانشیوں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے تاہم کئی مورخین نے انھیں اشکانی بھی کہا ہے۔ پارتھی خاص طور پہ

بڑی سخت جان اور جنگجو قوم تھے۔مگر عرب انھیں طوائف الملوک ہی کہتے رہے۔پھر اردشیر نامی ساسانی حکمران نے ہامنشیوں یا پارتھیوں کے اس خاندان سے طاقت کے زور پر عنانِ حکومت چھین لی اور ایران میں دولت ساسانیہ کی بنیاد رکھی۔اردشیر ایک بلند ہمت بادشاہ تھا اس نے کئی نئے شہر تعمیر کرائے، ملک میں آب پاشی کو رواج دیا جس سے ملک کی زراعت اپنے شاندار دور میں داخل ہو گئی۔اردشیر کے بعد دولت ساسانیہ کے دیگر بادشاہوں میں سے جن کو تاریخ کے صفحات میں جگہ ملی ان میں شاہ پور اعظم نوشیروان اور خسرو پرویز شامل ہیں۔شاہ پور اعظم بڑا خوبصورت اور شجاع نوجوان تھا۔وہ جنگ کے دوران ہمیشہ اگلی صف میں لڑا کرتا جس سے اس کے لشکروں کے حوصلے بلند رہا کرتے۔اس نے روم کے قیصر ''ویلزین'' کو شکست دی اور اسے گرفتار کر لیا۔

نوشیرواں کو تاریخ عالم کے مشاہیر میں شامل کیا جاتا ہے اس نے عدل وانصاف کی شاندار روایات قائم کیں اور رومیوں کو تابڑتوڑ شکستیں دیں۔وہ علوم وفنون کا سرپرست تھا اور اسے بزرگ مہر اور بروزیہ جیسے لائق وزیر بھی دستیاب ہو گئے جس کی وجہ سے اس کے دور کو ایران کا مستحکم اور پر امن دور کہا جاتا ہے۔نوشیرواں کے بعد خسرو پرویز نے تختِ ایران سنبھالا خسرو پرویز نے تاریخ کے ایوانوں میں اپنی عیاشی کے حوالے سے جگہ پائی۔خسرو پرویز ایک بری شہرت کا بادشاہ تھا جس کی عیش وعشرت تمثیل بن کے رہ گئی۔مشہور مورخ طبری کے مطابق خسرو پرویز کے حرم میں بارہ ہزار حسینائیں موجود تھیں اور یہ وہی بدبخت خسرو پرویز تھا جس نے نبی کریم ﷺ کے نامہ مبارک کو چاک کرنے کی گستاخی کی جس کی پاداش میں وہ خود موت کے اندھیرے کی نظر ہو گیا اور اس کی سلطنت ٹکروں میں بٹ گئی۔خسرو پرویز کے بعد یزدگرد ایران کے بڑے حصے پر حکمران ہوا مگر یزدگرد کے عہد حکومت میں ہی ایران سے دولت ساسانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور ملک اہل عرب کے تسلط میں چلا گیا۔جنگ قادسیہ میں یزدگرد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے شکست کھا کر بھاگ گیا تب ایران میں مجوسیوں کے آتش کدے ٹھنڈے پڑ گئے اور پورے ملک پر توحید کا پرچم لہرانے لگا۔

اہلِ ایران کے عقائد اور مذاہب

قدیم ایرانیوں کے مذاہب کو مزدائیت یا مجوسیت کہا جاتا ہے تاہم مجوسیت سے بھی قبل آریاؤں میں ستارہ پرستی کا رواج موجود تھا جس کو صائبیت کا مذہبی نام دیا جاتا جو دراصل بابلیوں کا مذہب تھا۔عہدِ قدیم میں جب ستارہ پرستی کا رواج ہوا تو صائبین سات ستاروں کی مورتیاں بنا کر اپنے معبدوں میں رکھتے تھے۔آریہ قوم ابتدا میں ظواہر پرستی کا شکار تھی،روشنی،شفاف آسمان،آگ،ہوائیں اور حیات بخش بارشیں ان کے مقدس معبود تھے جن کی پوجا کی جاتی۔ظلمت اور قحط سالی کو ملعون اور ناپسندیدہ تصور کیا جاتا۔ابتدا میں ان کے مذہبی افکار وعقائد کی بنیادیں عناصر طبعی،اجرام فلکی اور قدرتی طاقتوں کی پرستش پہ استوار ہوئی تھیں تاہم ان کے عقائد میں ارتقاء کا عمل جاری رہا اور نئے نئے معبودان کی پرستش کے دائرے میں جگہ پاتے رہے۔حتیٰ کہ اہل ایران پہ حکمرانی کرنے والے بادشاہ بھی ان کے ہاں قابل پرستش تصور کئے جاتے کیونکہ عام طور پہ ان کے ہاں اس تصور کو فروغ حاصل ہوا کہ ان کے شاہانِ شاہ کو حکومت خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہے اور اس میں کسی انسانی تدبیر کا کوئی عمل دخل نہیں۔بادشاہ عموماً مذہبی حلقوں سے اچھے تعلقات استوار کرتا اور ان کے معاملات میں مداخلت نہ کرتا کیونکہ انھی لوگوں نے عوام کو یہ بات باور کرانا ہوتی تھی کہ ان کا بادشاہ اللہ کی طرف سے قوم کو انعام کی صورت عطا کیا گیا ہے اس لیے قوم پہ لازم ہے کہ وہ نہ صرف اس کی اطاعت کرے بلکہ وہ لائق پرستش بھی ہے۔اس طرح عام لوگوں کے دل میں بادشاہ کے خلاف بغاوت کا شائبہ تک جنم نہ لیتا اور بادشاہوں کے خاندان مذہبی حلقوں کی ملی بھگت سے صدیوں عوام پر حکومت کرتے رہتے۔سورج ان کا خداوند خدا تھا اور وہ دو ابدی خداؤں کی متوازی طاقتوں کے پیرو تھے جس میں ایک کا نام آہورا مزدا تھا جو خیر کا

دیوتا تصور کیا جاتا جبکہ اس کے مقابل اہرمن شر اور بدی کا دیوتا تصور کیا جاتا۔ان کا تصور یہ تھا کہ دنیا میں موجود تمام دکھ، بیماری، پریشانی اور برائی کا ذمہ دار اہرمن دیوتا ہے اور مزدا دیوتا خوشحالی نیکی اور اصلاح کی طاقتوں کا منبع ہے۔تاریخ کے مختلف ادوار میں ایران کی دھرتی نے بہت سے مذاہب اور عقائد کا مشاہدہ کیا جن کی اجمالی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

زرتشت

زرتشت ایران کی وسیع سلطنت کے ایک صوبے آذر بائیجان کا رہائشی تھا اور اس کی پیدائش یورومیا کے مغربی کنارے پر موجود ایک قصبے میں ہوئی تھی [17*]۔ زرتشت ایک غور وفکر کرنے والا آدمی تھا اس کا اکثر وقت تنہائی میں گذرتا۔ وہ اپنے دور کے مصائب اور مسائل پر غور کرتا رہتا پھر اس نے صابئیت کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ اسے عجیب وغریب خواب دکھائی دینے لگے جس سے اس نے باور کیا کہ اسے قوم کی طرف نبی مبعوث کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نے صائبیت میں اپنے خیالات کے مطابق تبدیلیاں کیں اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ ابتدا میں اسے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگ اس کی دعوت پر توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ پہلے دس سالوں میں اس کے حلقہ ارادت میں صرف ایک شخص داخل ہوا۔ وقت اور معاشرے نے زرتشت کے صبر کا کڑا امتحان لیا مگر وہ اپنے مذہبی افکار پر قائم رہا۔ اس نے سلسلہ دعوت کو بغیر کسی غرض کے جاری رکھا۔ وہ اپنی دعوت کے سلسلہ میں سفر میں تھا جب اس کی ملاقات صوبہ خراسان کے حاکم وستاسپ سے ہوئی جس نے توجہ کے ساتھ اس کی دعوت سنی اور غور کے لیے وقت مانگا۔ تاہم اس کے افکار سے وستاسپ کی ملکہ شدید متاثر ہوئی اور اس کے دین کو قبول کرلیا۔ وستاسپ کا ایک وزیر اور اس کے گھر والے بھی زرتشت کے مذہب میں داخل ہوگئے۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ مشہور عرب مورخ مسعودی کا خیال ہے کہ زرتشت نے اپنی دعوت کا آغاز سکندر اعظم کے ایران پر حملے سے تین سو برس قبل کیا تھا۔ صوبہ خراسان کے حاکم وستاسپ نے جب زرتشت کا مذہب قبول کرلیا تو لوگ تیزی سے زرتشت کی طرف راغب ہوئے اور پورے ملک میں گاہے بگاہے اس کو سندِ قبولیت حاصل ہونے

لگی۔اگرچہ وہ دور پارتھیا کے ہامنشیوں کا بھی عہدِ عروج تھا اس لیے زرتشت کے پہلو بہ پہلو متھرا پرستی وغیرہ کے صابئی فرقے بھی رواج و قبول پاتے رہے۔تاہم ساسانی عہدِ حکومت میں جب زرتشت کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا تو چھوٹے چھوٹے فرقوں کو بدعتی قرار دے کر اس کا قلع قمع کر دیا گیا۔زرتشت کے بارے میں شہرستانی لکھتا ہے کہ ''زرتشت'' جب تیس سال کا تھا تو اس نے اپنی دعوت کا آغاز کیا اور خود کو اللہ کی طرف سے لوگوں کے لیے نامزد پیغمبر قرار دیا۔

زرتشت کی تعلیمات کا بنیادی محور توحید تھا وہ لوگوں کو مظاہر فطرت کی پوجا سے روکا کرتا اور ان کو خدائے واحد کی پرستش کی دعوت دیتا۔چنانچہ زرتشت کا پیغام خدا پرستی اور انکارِ شیطان پر مبنی تھا۔وہ لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی المنکر کی دعوت دیتا اور ان کو ناپاک کاموں سے دور رہنے کی تلقین کرتا۔زرتشت کی تعلیم تھی کہ نور و ظلمت دو متضاد قوتیں ہیں اور ہمہ وقت برسرِ پیکار ہیں اسی طرح یزداں اور اہرمن عالم کے موجود ہونے کے سبب ہیں۔باری تعالیٰ نور و ظلمت کا حقیقی خالق ہے،وہ واحدہ لاشریک ہے اور کوئی اس کی مثل اور نظیر نہیں ہے۔نور کا وجود اصلی اور حقیقی ہے اور ظلمت کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ نور کی ضد سے خود نور کی وضاحت درکار تھی گویا ظلمت کا وجود طبعًا ہے۔زرتشت نے لوگوں کو قدیم دیوتاؤں کی پوجا سے منع کیا اور اھورا مزدا (آقائے دانش) کی پرستش کی دعوت دی۔زرتشت کی کتاب کا نام ''ژند'' ہے مگر کتاب سے زیادہ اس کی شرح نے شہرت پائی جو ''اوستا'' کے نام سے مشہور ہے۔روایت ہے کہ اسے ہامنشیوں کے عہد میں مرتب کیا گیا مگر ہامنشیوں کے زوال کے ساتھ ہی اوستا کے بہت سے حصے زمانے کی دستبرد کی نظر ہو گئے اور بہت ہی قلیل حصہ محفوظ رہ سکا۔زرتشت کی تعلیمات اور اس دور کے مذہبی فشار کے متعلق مشہور مغربی مورخ (Well deurant) رقمطراز ہے کہ:

''اہل ایران کے ہاں زرتشت کی دعوت سے قبل پورا معاشرہ شرک اور فسق و فجور میں الجھا ہوا تھا اور مذہبی پروہتوں نے پورے معاشرے کو اپنا یرغمال بنا رکھا تھا کہ ان کے قدیم عقائد میں ہر شخص کے لیے ضروری تھا کہ وہ کئی خداؤں پہ ایمان لائے ان کا سب سے بڑا خدا سورج دیوتا تھا جس کو ''مترا'' کہا جاتا اس کے بعد کثرت سے پوجی جانے والی دیوی کا نام ''انیتا'' تھا جو زمین اور زرخیزی کی دیوی تھی ''ہوما'' اس مقدس بیل کو کہا جاتا جو ایک دفعہ

مر گیا تھا اسے دیوتاؤں نے پھر سے زندہ کیا تو اس نے انسانوں کو پینے کے لیے اپنا لہو پیش کیا تا کہ اس کو دوام حاصل ہو جائے (اگر چہ ہر دور کے انسان کی یہ شدید خواہش رہی ہے مگر انسان کو کبھی بھی دوام حاصل نہ ہو سکا اور وہ کائنات کا سب زیادہ ناپائیدار جاندار ہی رہا) وہ لوگ جب اس بیل کی عبادت کرتے تو پہلے خوب جی بھر کے شراب پیتے اور مست ہو جاتے تب اس بیل کی پوجا کرتے یہ شراب ہوما نامی ایک بوٹی سے تیار کی جاتی جو ایران کے پہاڑوں کے دامن میں بہ کثرت اگتی تھی، زرتشت اکثر اپنے معاشرے کی اس عقائدی اور اخلاقی حالت پہ کڑھتا رہتا پھر اس دکھ نے اسے بے قابو کر دیا اور اس نے مجوسی مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اپنی پوری طاقت سے اعلان کر دیا کہ سارے جہان میں صرف ایک ہی خدا ہے جو پرستش کے لائق ہے اور وہ اہورامزدا ہے جو نور اور آسمانوں کا خدا ہے"۔

❑❑❑❑❑❑❑

زرتشت نے کہا کہ اہورامزدا خالق ہے، مختارِ متعلق ہے، حاضر و ناضر ہے، غیر مرئی ہے، جسمانی مفہوم میں وہ نور ہے اور اخلاقی مفہوم میں وہ صداقت ہے، آفتاب آسمان پر اور آگ زمین پر اہورامزدا کے نوری مظاہر ہیں اس لیے پاک ہیں اور بت پرستی ایک بڑا جرم ہے۔ ایک اور مغربی مورخ (Hero Doteus) لکھتا ہے:

:

"اہل فارس دیوتاؤں کے بت نہیں بناتے تھے اور نہ ان کے ہاں قربان گاہ کا تصور تھا وہ ان چیزوں کو حماقت خیال کرتے تھے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یونانیوں کی طرح یہ عقیدہ نہ رکھتے تھے کہ انسان اور دیوتا دراصل ایک ہی ہیں"۔

❑❑❑❑❑❑❑

"مارکھم" نے بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

''کہ تاریخ عالم میں ایرانی وہ واحد قوم ہیں جنہوں نے کسی بھی دور میں بت پرستی کو اختیار نہیں کیا۔زرتشت نے اپنی دعوت کے اصول وضع کرتے ہوئے کہا کہ کائنات میں روزِ اول سے نیکی اور بدی کی جنگ جاری ہے اور ہمیشہ سے دو ہی قوتیں فعال کردار ادا کرتی آئی ہیں دوسرے لفظوں میں وہ سمجھتا تھا کہ یہ دنیا ایسی جنگاہ ہے جہاں خیر یا نور اور شر یا ظلمت میں ایک معرکہ بپا ہے جس میں انسان پہ یہ اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نور اور نیکی کی قوتوں کا ساتھ دے اس لیے کہ مقدر میں یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ آخری فتح نور یا صداقت ہی کی ہوگی۔ مجوسیت کی رو سے ہر ہزار برس کے بعد ایک ہادی اعظم کا ظہور ہوتا ہے جس کی دعوت اگلے ہزار برسوں تک ہدایت کا سرچشمہ خیال کی جاتی ہے''۔

□□□□□□□

زرتشت کا دعویٰ تھا کہ اس کا مذہب الہامی ہے اور اس پہ فرشتے اترتے ہیں اور اس کے احکام اور شریعت اسی الہام پہ مبنی ہیں۔بعض مجوسیوں نے زرتشت کی تعلیمات کو ثنویت کا رنگ دینے کی کوشش بھی کی ہے ان کو زوانیہ بھی کہا جاتا ہے۔جن کے خیال میں زمان کی دیوی کے توام بیٹے تھے جن کے نام ہرمزد اور اہرمن تھے اِن کی پیدائش سے پہلے اسے یہ خوف ہوا کہ ان میں سے جو پہلے پیدا ہوگا وہ زمین و آسمان کی حکومت پہ قابض ہو جائے گا اور دوسرا محروم رہ جائے گا وہ اسی سوچ میں تھی کہ اہرمن اپنی خباثت اور مکاری کے باعث دیوی کا پیٹ چاک کر کے باہر نکل آیا شریف اور پاک ہرمزد سے پہلے زمین و آسمان کی حکومت پر قابض ہو گیا۔اہرمن کی ماں نے اس کی قسمت میں ایک تبدیلی کی کہ نو ہزار برس بعد اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ہرمزد حکمران ہوگا۔شر کے پردے چاک ہو جائیں گے اور چہار سو خیر اور نور کا دور دورہ ہوگا۔تاہم راسخ العقیدہ مجوسی اس نظریہ کو نہیں مانتے تھے۔زوانیہ کے علاوہ ایک اور فرقے کیومرث نے اس تصور کو دیو مالائی انداز میں پیش کیا ان کے مطابق انسانوں کا باوا آدم جو خیر و شر کے فتنے میں پڑ کر قتل ہوا اس کے خون سے ایک مرد اور عورت پیدا ہوئے جن سے نسل انسانی کا آغاز ہوا اسی بنا پر مجوسی مذہب میں سگے بہن اور بھائی کے درمیان شادی کو جائز سمجھا جاتا تھا۔زرتشت کے الہامی صحیفہ اوستا کا زمانہ کم وبیش وہی ہے جو ہندی آریاؤں کی رگ وید کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔زرتشت کی الہامی کتاب ژند اور اس کی

شرح اوستا تو آج بالکل ناپید ہو چکی ہیں تاہم ژند کی ایک شرح ''پاژند'' بھی شاہ پور اعظم کے زمانے میں ایک مولف ''آذر بذ مہر سپند'' نے مرتب کی تھی جس کے کچھ حصے بہت بعد تک اپنی اصل حالت میں موجود رہے زرتشت کی ایک کتاب ''گاتھا'' بھی بعد کے زمانوں تک موجود رہی جو دراصل دعائیہ گیتوں پر مشتمل تھی۔

اس میں زرتشت نے خداوند کریم کی بارگاہ میں جس وارفتگی سے اپنی نیازمندیاں پیش کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ زرتشت کو اس امر پہ شرح صدر حاصل تھا کہ وہ لوگوں کے لیے اللہ کا نبی مبعوث کیا گیا ہے اس کا ثبات عزم اس بات پہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس نے لوگوں کو بہت سے معبودوں کے چنگل سے آزاد کرا کے ایک خدا کی بارگاہ تک لے جانے کا تہیہ کیا ہوا تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی اسی مقصد کے حصول کے وقف کی ہوئی تھی۔زرتشت کے ہاں مابعدالطبعیات کا بھی ایک واضح تصور موجود تھا۔اس نے اپنی تعلیمات میں لوگوں کو حشر نشر موت کے بعد کی سختی اور جزا وسزا سے آگاہ کیا۔اس نے نیک لوگوں کو بہشت کی نوید دی اور برے لوگوں کو عذابِ جہنم سے ڈرایا۔مجوسیوں کے نزدیک موت کے چار دن بعد انسانی روح کے محاسبے کا آغاز ہوتا ہے اور نیک روح کا استقبال ایک حسین دوشیزہ کرتی ہے جب کہ بدروح کو ایک بدصورت بڑھیا ڈراتی ہے۔ مجوسیت یعنی زرتشت کے مذہب کے بنیادی اصول تین ہیں ہمتا یعنی پاک خیالی، ہختا بہ معنی پاک الفاظ اور ہوورشتا یعنی پاک عمل۔

اس کی رو سے انسان مادی اور روحانی عناصر سے مل کر بنا ہے اس کا جسم فانی ہے اور موت صرف اسی کو ہے جب کہ روح غیر فانی ہے۔عقل انسان کی سب سے اعلیٰ میراث ہے اس کے بعد ضمیر اور ہمزاد کی روحانی قوت کے مدارج ہیں۔انسان ہر طرح آزاد ہے اور فاعلِ مختار ہے اس لیے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔اسے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وہ نور یا صداقت کا ساتھ دے چاہے تو ظلمت اور باطل کی حامی بھرے۔مجوسیت میں تولد وتکاثر کی دعوت دی گئی ہے اور رہبانیت کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ روزے سے بھی منع کیا گیا ہے کہ اس سے انسان کے اندر کمزوری پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نہ تو کھیتی باڑی کر سکتا ہے اور نہ ہی طاقتور اولاد پیدا کرنے پہ قادر رہتا ہے۔اوستا میں کھیتی باڑی کو سب سے پسندیدہ پیشہ قرار دیا گیا ہے اور خیال کیا گیا ہے کہ اہورا مزدا کو کھیتی باڑی بہت پسند ہے کائنات کے بنیادی عناصر کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ وہ پانی مٹی آگ اور ہوا سے بنی ہے اسی لیے ان کے ہاں بہتے

ہوئے پانی میں کپڑے دھونا یا غسل کرنا منع ہے۔وہ شمع کو کبھی بھی پھونک مار کے نہ بجاتے کہ اس سے گناہ لازم آتا ہے۔وہ مٹی اور ہوا کو بھی مقدس خیال کرتے اور اپنے مردے زمین میں دفن نہ کرتے بلکہ اس کو کسی اندھے کنویں میں لٹکا دیتے جہاں چمگادڑوں اور چیلوں کے ساتھ دوسرے جانور اس کا گوشت نوچتے رہتے۔ مجوسی کتے اور اودھ بلاؤ کو مقدس مانتے اور خیال کرتے کہ اہورامزدا کو ان سے محبت ہے۔مجوس اپنے پندرہ سالہ لڑکے کو گستی باندھنے کی رسم ادا کرتے اور آگ کی تقدیس میں غلو کرتے۔ان کے آتشکدوں میں دن رات آگ بھڑکتی رہتی جن کی نگہداشت پر ہیر بذ متعین ہوتے جو مقررہ وقت پر ان آتش کدوں میں خوشبودار لکڑیاں پھینکتے رہتے۔آذر بائیجان میں بے پناہ آتش کدے تھے۔مجوسیوں کی بہشت کوہ البرز میں واقع ہے جس میں نیک ارواح چنیود کے پل سے گذر کر داخل ہوتیں اور بد روحیں اس پل پر سے کٹ کٹ کر دوزخ میں جا گرتیں۔مجوسیوں کا مشہور عقیدہ ہے کہ قیامت کے قریبی زمانے میں شاہ بہرام آئے گا جو ان کا بول بالا کرے گا۔زرتشت نے بالآخر تمام قدیم خداؤں کو ایرانی عبادت گاہوں سے نکال باہر کیا اور اب صرف اہورامزدا یعنی خداوندِ حکیم وخبیر کی واحدنیت ہی ایرانیوں کا مذہب تھا۔

چونکہ اب ملک کی طاقتور سیاسی پشت پناہی بھی زرتشت کو حاصل تھی اور ساسانی شہنشاہیت نے مجوسیت کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دے دیا تھا اس لیے مجوسیت نے سرعت سے دوسرے تمام عقائد کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔اس وقت زرتشتی مذہب کی دوصورتیں پہلو بہ پہلو مروّج تھیں ایک صورت تو یہ تھی کہ جس طرح اہورامزدا نیکی اور خیر کا خدا تھا اس حیثیت کے مقابل اہرمن کو برائی کا منبع بھی تسلیم کر لیا گیا تھا۔یعنی بہ یک وقت دو قادر متعلق خداؤں کا عقیدہ مروّج تھا اور وہ دونوں ہی غیر فانی تھے اگرچہ ایک کی نسبت خیر اور دوسرے کی شر کے ساتھ وابستہ تھی۔خیر اور شر کی یہ جنگ ہی مجوسی مذہب کا محور تھی جب کہ زرتشت کی دعوت خیر کی قوتوں کا ساتھ دینے اور اس کی بالادستی پر مبنی تھی۔بعض مورخین نے رائے دی ہے کہ زرتشت ایک ہزار قبل مسیح میں پیدا ہوا جب کہ بعض کے نزدیک وہ چھ سو ساٹھ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ایرانیوں اور تورانیوں کے درمیان ایک جنگ میں جب زرتشت اپنی عزت اور ناموری کے عروج پر تھا تو اسے قتل کر دیا گیا جسٹس محمد کرم شاہ صاحبؒ کے مطابق زرتشت ایک قربان گاہ پر اس وقت مارا گیا جب اس کے گرد اس کے عقیدت مندوں اور امتیوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔پھر جس طرح بہت سے دوسرے انبیاء اور مصلحین کی تعلیمات کو بھلا دیا گیا اور ان میں تحریف راہ پا گئی اسی طرح مجوسیوں کے ہاں بھی رفتہ رفتہ زرتشت کا اصل تصورِ دین او جھل ہوتا رہا اور

مجوسی پھر سے گمراہی کے ان اندھیروں کو چل دیئے جن سے انھیں زرتشت نے نجات دلائی تھی۔صدیوں بعد جب اہل عرب دین کی اصل روشنی اور محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام لے کر ایران کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے تو زرتشت کا عقیدہ توحید مجوسیت سے غائب ہو چکا تھا اور اب وہ سراسر شرک میں ملوث تھے۔چنانچہ باوجود اپنی بے پناہ طاقت کے وہ مٹھی بھر اہل عرب کے ہاتھوں مغلوب ہوئے اور ایران اسلام کی روشنی سے منور ہو کے رہ گیا اور پھر اس سرزمین پہ کبھی کوئی آتش کدہ روشن نہ ہوا اور توحید کا ابدی پھریرا آج تک سرزمین ایران پہ پوری تمکنت کے ساتھ لہرا رہا ہے الحمدوللہ

متھرامت

ایران کے قدیم مذاہب میں متھرامت کو بھی خاص مقام حاصل تھا کیونکہ ایک صوبہ پارتھیا جو آج کے خراسان اور استر کی حدود میں واقع تھا ساسانی خاندان کی قلمرو سے باہر تھا اگرچہ وہ مضبوط ساسانی حکومت کو خراج ادا کیا کرتے۔ متھرامت ایرانی ہندی دور سے یادگار ہے اور زرتشت سے بہت پہلے صائبیت کے دور میں متھرا مت کے پجاری سورج اور اناہتا دیوی کی پوجا بڑے ذوق شوق سے کیا کرتے تھے۔ زرتشت نے صائبیت کو منسوخ کیا تو ان دیوتاؤں کی پوجا کو بھی زوال آ گیا۔ ہامنشیوں کے بعض کتبوں میں متھرا اور اناہتا دیوی کا ذکر ملتا ہے، ارتاخشرشیا دوم نے جب پارتھیا کی عنان حکومت سنبھالی تو اس نے متھرا اور اناہتا کی پوجا کا احیاء کیا اور اس مذہب نے بھی سنبھالا لیا۔ ابتدا میں متھرا کا درجہ اہورامزدا اور اہرمن کے بین بین تھا اور وہ نور اور کثرت کا دیوتا تھا تاہم ارتاخشرشیا کے زمانے میں وہ رّب الافواج بن گیا۔ ہر مہینے کا ساتواں اور سولھواں دن ان کے مذہب میں مقدس خیال کیا جاتا۔ چنانچہ ایران میں مجوسیت کے پہلو بہ پہلو متھرامت بھی پھیلتا رہا اگرچہ مجوسیت نے متھرامت کا تعاقب جاری رکھا۔ مگر پارتھیا کے علاقے میں متھرامت کی رسوم کو ہی مقبولیت حاصل ہوئی اور عوام میں اس کی جڑیں گہری ہوتی رہیں۔ متھرامت کے پجاریوں کا عقیدہ تھا کہ متھرا نے نوع انسانی کی نجات کے لیے اپنے خون کی قربانی دی تھی متھرا کے دوش بدوش اناہتامت بھی رواج پا گیا۔ بیل متھرا کا اور گائے اناہتا کا مقدس جانور بن گئی۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ متھرامت ان رومی لشکریوں میں بھی پھیل گیا جو ایران کی سرحدوں پہ تعینات تھے ان کے واسطے سے یہ مت رومۃ الکبریٰ میں بھی نفوذ کر گیا اور عیسائیت کی اشاعت کے ابتدائی دور میں عیسائیت کا زبردست حریف بن گیا قریب تھا

کہ متھرا امت تیسری اور چوتھی صدی میں عیسائیت پر غالب آجاتا مگر مسیحی پیشواؤں کے مذہبی جوش وخروش اور مسلسل قربانیوں کے سبب آخری فتح عیسائیت کے حصے میں ہی آئی مگر اتنا ضرور ہوا کہ متھرا امت کے کئی مذہبی شعار عیسائیت میں بار پاگئے جن میں سب سے مشہور کرسمس کا تہوار ہے متھرا کے پجاری دسمبر کے آخری ہفتے میں جب آفتاب موسم سرما کے چنگل سے آزاد ہوجاتا تو وہ متھرا کا جنم دن مناتے تھے۔روایت ہے کہ کرسمس اسی تہوار کی بدلی ہوئی صورت ہے۔علاوہ ازیں جناب مسیح علیہ السلام کے منجی اور شفیع ہونے کا تصور بھی متھرا مت سے لیا گیا ہے اگرچہ یہ محض ایک تاریخی روایت ہے جس کی کوئی سند دستیاب نہیں ہوسکی۔چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ ایران کا معاشرہ ہمیشہ مختلف عقائد میں منقسم رہا۔

مانویت

متھرا مت کے بعد مانویت کے اسرار نے اہل ایران کو اپنے زیر تسلط رکھا جس کا بانی ابتدائے عمر میں زرتشت کا پیرو تھا۔اس کا نام مانی تھا اور وہ ایرانی نژاد بابلی تھا۔وہ بابل میں ۲۱۵ء میں پیدا ہوا۔مانی نے دراصل ایک نیا مذہب مرتب کرنے کی کوشش جو اس کے نام کی مناسبت سے مانویت کہلایا[18*]۔مانی نے بدھ مت عیسائیت اور زرتشت کے افکار کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے درمیان موجود افتراق کو ختم کر کے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔مانی کے مطابق زرتشت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بدھ سب پیغمبر تھے اس لیے ان سب کی تعلیمات پر ایمان لانا ضروری ہے۔عرب مورخ یعقوبی نے اس کی تعلیمات اور عقائد کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔یعقوبی کے مطابق مانی کا پورا نام مانی ابن حماد تھا اور وہ شاہ پور ابن اردشیر کے عہد میں ظاہر ہوا۔اس نے شاہ پور کے عقیدے (مجوسیت) پر شدید تنقید کی اور اسے ایک باطل مذہب قرار دیا وہ براہ راست شاہ پور اعظم سے ملا اور اسے اپنے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہا۔مانی کہتا تھا کہ کائنات میں متصرف ازلی و ابدی عناصر دو ہیں۔نور اور ظلمت،خالق دو ہیں خالق خیر اور خالق شر،نور و ظلمت میں سے ہر ایک پانچ صفات یعنی رنگ،ذائقہ،بو،لمس اور صورت سے متصف ہیں انھی کے ذریعے وہ سنتے ہیں اور انھی کے ذریعے دیکھتے اور علم حاصل کرتے ہیں۔کائنات میں جو بھی عنصر یا عمل مثبت ہے اس کا منبع نور ہے اور جو کچھ انسان کے لیے مضر اور برا ہے اس کی نسبت شر سے ہے۔ابتدا میں یہ دونوں عناصر الگ الگ تھے مگر بعد میں وہ ایک دوسرے سے مل گئے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ

پہلے کچھ نہ تھا پھر حوادث نے جنم لیا۔ظلمت کی طرف سے آمیزش کی ابتدا ہوئی کیونکہ قبل ازیں وہ ایک دوسرے سے ایسے ہی متصل تھے جیسے کہ دھوپ اور سایہ۔اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز کے بغیر وجود میں لانا ممکن نہیں۔آمیزش کی ابتدا ظلمت کی طرف سے ہوئی جس کا سبب یہ ہے کہ ظلمت ونور کی آمیزش آخر الذکر کے لیے مضر تھی نا ممکن ہے کہ ابتدا نور نے کی ہو کیونکہ نور فطرتاً خیر ہے۔اس بات کی شہادت کہ خیر اور شر ازلی وابدی ہیں اس سے ملتی ہے کہ اگر ایک شے کا وجود تسلیم کیا جائے تو اس سے متضاد افعال پیدا نہیں کئے جا سکتے۔مثلاً آگ گرم اور جلتی ہوئی چیز ہے اس لیے وہ چیزوں کو جلا تو سکتی ہے انھیں ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔چنانچہ اس لیے جو چیز باعث خیر ہو وہ شر پیدا نہیں کر سکتی اور جو چیز باعث شر ہو اس سے خیر کا پیدا ہونا عبث ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ دونوں عناصر زندہ اور عامل ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ ایک عنصر کا نتیجہ خیر ہے اور دوسرے کا شر۔اگرچہ زرتشت اور مانی دونوں کی الٰہیات ثنویاتی ہیں مگر ان دونوں کے بیچ ایک فرق ایسا ہے جس نے دونوں میں بعد المشر قین پیدا کر دیا تھا۔زرتشت کے خیال میں دونوں ابتدائی ارواح فعال ہیں مگر مانی کے ہاں قوتِ نور منفعل ہے اور قوت ظلمت فعال ہے جیسا کہ یعقوبی نے کہا ہے کہ خیر اور شر کی آمیزش میں قوت شر نے مسابقت کی تھی یہ مانی کا عقیدہ تھا۔چنانچہ اس کی الٰہیات سے جو اخلاقیات متفرع ہوئی وہ یہ تھی کہ نور کو ظلمت سے الگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔اس کے لیے مانی نے تجرد، ترک دنیا اور نسل کشی کی ترغیب دی۔تا کہ نہ زیادہ لوگ پیدا ہوں اور نہ ہی زیادہ شر پھیلے۔

زرتشت کی تعلیم اس کے برعکس تھی اس لیے کہ وہ اپنے لوگوں کو راہبانیت سے دور رکھتا اور زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کرنے کی تلقین کرتا۔چنانچہ مانی کی اس راہبانہ روش کے باعث مجوسی اس کے دشمن بن گئے اور ساسانی شاہ ہرمز نے کہا کہ یہ شخص دنیا کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔سچ یہ ہے کہ مانی کے افکار یاسیت کی طرف مائل تھے جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ بدھ سے بہت متاثر تھا۔اگرچہ بدھ مت کی اشاعت ایران میں اشوک عہد کے بعد ہوئی تھی اور اس کی ابتدا خراسان کے صوبے سے ہوئی۔بدھوں نے جا بجا اپنی خانقائیں قائم کر رکھیں تھیں اور بلخ ان کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں کے پرمک کشمیری الاصل تھے جو بعد میں برامکہ کے نام سے جانے گئے۔برامکہ اور بدھ سوامی تجرد اور ترکِ علائق کی زندگی گذارتے تھے۔چنانچہ یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچی کہ مانی نے ترک دنیا کا منفی عقیدہ بدھوں سے ہی مستعار لیا تھا۔مانویہ دن میں چار مرتبہ نماز پڑھتے تھے

اور بت پرستی کے قائل نہ تھے۔ جھوٹ، لالچ، قتل، زنا، چوری، سحر و ساحری اور ریاکاری سے منع کرتے تھے۔ وہ ہر مہینے سات روزے رکھا کرتے۔ مانی نے اپنی کتاب کے لیے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا اس کی اپنی کتابیں شاہ پورکاں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ مانی کی کتابیں سونے اور چاندی کے حروف سے لکھیں گئیں تھیں بعدازاں جب اس کی کتابوں کو جلایا گیا تو سونا چاندی ان میں سے پگھل پگھل کر گرتے تھے۔ ایک ایرانی روایت کے مطابق مانی بہت بڑا مصوّر بھی تھا۔

وسطِ ایشیا کے غوری بھی مانی کے پیرو تھے۔ ان کے شہر خوچہ سے آثارِ قدیمہ کو ملنے والی بہت سی پرانی اشیا میں چند نادر کتابیں بھی شامل ہیں جن میں بہت خوبصورت تصاویر ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ مانی کے ہاتھ سے نکلے ہوئے شاہکار ہیں۔ مانی کی دعوت کے آغاز پر اگرچہ ایران کے بادشاہ شاہ پور نے اس کا مذہب قبول کرلیا تھا لیکن مذہبی حلقہ بھی بہت طاقتور تھا اور اس کے سربراہ موبدِ موبداں نے مانی کی شدید مخالفت کی جس کی تاب نہ لاکر مانی ہندوستان بھاگ گیا۔ بعدازاں اس کے کچھ ساتھیوں نے اسے پیغام بھیجا کہ ایران میں اب حالات سازگار ہیں اور وہ واپس چلا آئے اور مانی ہندوستان سے ایران چلا آیا مگر اسے واپس بلانے کی سازش دراصل ایران کے بادشاہ بہرام اول نے کی تھی۔ چنانچہ بادشاہ بہرام اول نے مانی پر بہیمانہ تشدد کرایا اور بعد میں اس نے مانی کو قتل کرادیا۔

مانی کے قتل کے بعد اُس کے ماننے والوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا۔ مانویت کے ماننے والوں کی کچھ تعداد ایران سے ہندوستان ہجرت کرگئی اور کچھ ایران میں ہی زیرِزمین چلے گئے اگرچہ کسی حد تک مانویت کا خاتمہ کردیا گیا لیکن ان کے عقائد صدیوں تک دوسرے مذاہب پر اثر انداز ہوتے رہے۔ بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانے میں کئی اشخاص ایسے تھے جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے تھے مگر بہ باطن مانویہ تھے۔ عرب مورخین نے ان کا ذکر کیا ہے۔ صاحب الفہر ست میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ جعد بن درہم بشار بن برد اور ابن الزیات مانویہ تھے۔ اس زمانے میں مانویہ کو زندیق کہا جاتا تھا اور ان کا کھوج لگانے کے لیے خلیفہ منصور نے باقاعدہ ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کا نام صاحب الزنادقہ تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مانی کا اہرمن مشرق و مغرب کے فلسفے اور ادبیات میں نفوذ کر گیا جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ مانی اہرمن یا شر کو کائنات کا فعال عنصر مانتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہماہمی ہے وہ اہرمن ہی کی کارفرمائی ہے۔ بعد میں یہی تصور ہمیں ملٹن کے شیطان، گوئٹے کے میفسٹوفیلس اور اقبال کے تصورِ ابلیس کی صورت میں واضح

دکھائی دیتا ہے۔مانویت نے عیسائیت پر بھی گہرے نقوش چھوڑے اور کلیسائے روم میں ولی آگسٹائن کے توسط سے جو اوائل عمری میں مانوی رہ چکا تھا رہبانیت نے بار پایا۔عیسائی راہبان اور مسلمانوں کے ہاں صوفیہ کے عقائد پر بھی مانویہ کی نفس کشی اور ترکِ علائق کی تعلیم کا اثر ہوا۔مشاہیر میں سے ابولعلا مصری،ابو القاہیہ،عمر خیام بھی مانی کی قنوطیت سے متاثر ہوئے۔اڈمان نے مانی کو صوفیا میں شمار کیا ہے تاہم اس نے مانی کو ملحد صوفی کہا ہے۔اگرچہ مانویت اور اس کے عقائد وقت کی راکھ کے نیچے دبتے چلے گئے مگر کسی نہ کسی صورت میں آج بھی ایران اور پاک و ہند کے باشندوں پر اس کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مزدکیت

مزدکیت دراصل اس فلسفہ اور تصورِ زندگی کو کہا جاتا ہے جسے مزدک نامی ایک شخص نے پیش کیا۔ جسے ایرانی معاشرے میں ایک مذہب کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ علامہ طبری کے مطابق مزدک نیشاپور کا رہنے والا تھا [19*]۔ جس نے دنیا میں پہلی دفعہ اشتراکیت کا بنیادی فلسفہ پیش کیا۔ ایران کے معاشرے میں طبقاتی تقسیم اور مذہبی جبر نے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور پورا معاشرہ اخلاقی انحطاط کا شکار تھا۔ زنا عام تھا حتیٰ کہ محرمات سے زنا پہ بھی کوئی قدغن نہ تھی۔ سگی بہن کے ساتھ شادی کرنے کا رواج عام تھا اور بادشاہ تک اس میں ملوث تھے۔ شراب کو عام مشروب کے طور پہ استعمال کیا جاتا جس سے رہا سہا اخلاقی حجاب بھی چاک ہو جاتا۔ مزدک نے اپنا فلسفہ شاہ قباذ کے دور میں پیش کیا اور خود شاہ قباذ سے ملاقات کی۔ اسے اپنے افکار کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی جس میں ابتدائی طور پر وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ مزدک کا نقطہ نظر یہ تھا کہ خالق نے تمام انسانوں کو برابر پیدا کیا ہے تو پھر دنیا بھر کے معاشروں میں بپا اس نسانی تفریق کا کیا مطلب ہے جس کے تحت ایک انسان کو تو زندگی کی تمام تعیّشات حاصل ہوں جب کہ اس کا دوسرا بھائی روٹی کے ایک نوالے کے لیے بھی ترستا رہے۔ مزدک کہتا ہے کہ شر کی بنیادیں تین ہیں جنہوں نے انسانی زندگی پہ اتنے دوررس اثرات چھوڑے ہیں کہ اگر ان تین برائیوں سے بچا جائے تو کسی بھی معاشرے میں انقلاب بپا ہوسکتا ہے اگر چہ وہ تینوں چیزیں خالق نے خود انسان کی فطرت میں جمع کی ہیں اور وہ تین چیزیں رشک، غصہ اور لالچ ہیں۔ جنہوں نے انسانی معاشرے میں طبقاتی تقسیم کی بنا رکھی اور ان کو اس احساس محرومی کے حوالے کر دیا جس کا تدراک اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ یا تو انسان مایوسی کے اتھاہ سمندر میں گر جائے یا پھر اپنی

پوری قوت کو استعمال کرتے ہوئے معاشرے میں انقلاب بپا کرنے کی جدوجہد کرے۔ مزدک نے لوگوں کو انسانی مساوات کی طرف دعوت دی اور ہر ایسے عمل کی نفی کر دی جو ایک انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت بخشے۔ مزدک نے اپنے فلسفہ کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے کہا کہ انسانی زندگی کی ابتدا سے ہی ذاتی ملکیت کا تصور اسے اپنے بھائی کا استحصال کرنے پر اکساتا رہا۔ عورت پر کلی تسلط کے تصور نے ہی انسان کو دوسرے انسان کا خون بہانے پر قائل کیا۔ چنانچہ ان دو چیزوں نے انسانی معاشروں میں طبقات کی وہ دیواریں کھڑی کر دیں جن کو پاٹنا آسان نہ رہا اور معاشرے طبقاتی سطح پر منقسم ہوتے چلے گئے۔ مزدک کہتا ہے کہ اگر تمام انسان مساوی ہیں تو ایک عورت کو یہ حق کس طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ محض ایک شخص کی باندی بن کے رہ جائے اور باقی سارا معاشرہ اس کے حسن سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اس لیے مزدک کے خیال میں انسانی معاشروں میں نکاح کا جو عمومی تصور پایا جاتا ہے اس نے ایک بڑے بگاڑ کو جنم دیا ہے اور انسانی فطرت کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ وہ اس بزم عیش و طرب میں پوری طرح تمتع کرے۔ قریب تھا کہ شاہ قباذ اس کے افکار قبول کر لیتا اور ایرانی معاشرہ ایک نئی ابتلاء میں جا گرتا مگر شاہ قباذ کا بیٹا خسرو جو بعد میں ایران کے عظیم بادشاہ نوشیرواں عادل کے نام سے مشہور ہوا نے نہ صرف یہ کہ مزدک کی شدید مخالفت کی بلکہ اپنے باپ کو بھی ان مضمرات سے آگاہ کیا جو مزدکیت کے پردے میں چھپے تھے۔ مزدک سے قبل اگرچہ افلاطون نے بھی عورت کی انفرادی ملکیت کی نفی کا تصور پیش کیا تھا مگر اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی تھی۔

مزدک کہتا ہے کہ لالچ اور غصہ ایسے طاقتور جذبے ہیں جو آگ کی طرح تیزی سے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور ان پر بند صرف اسی صورت باندھا جا سکتا ہے جب نہ کوئی جائیداد کسی مخصوص شخص کی ملکیت ہو اور نہ ہی کوئی عورت کسی ایک بستر کی قیدی ہو۔ چنانچہ مزدک نے اپنے اس خیال خام کو معاشرے پہ نافذ کرنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا جس میں اشتراکِ نسواں اور اشتراکِ جائیداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ایرانی معاشرے میں اس وقت اخلاقی اقدار کی پہلے ہی کوئی قیمت نہ تھی۔ دوسری طرف عوام اپنے احساس محرومی کی آخری حدوں کو چھو رہے تھے۔ اگرچہ بادشاہ تک تو ان کی رسائی نہ تھی مگر وہ دیکھتے کہ معمولی سے معمولی حکومتی اہلکار کی زندگی میں بھی دولت کی اتنی فراوانی تھی اور تعیش کے اتنے رنگ تھے جو شاید ان کو کبھی حاصل نہ ہوں سکیں گے تو ان کے اندر ایک ردعمل جنم لیتا جس کو وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھے۔ مگر جب مزدک کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی تو ان کے اس پوشیدہ احساس کو نام بھی مل گیا اور جواز بھی۔ چنانچہ لوگ اس حسین تصور میں

ہی جینے لگے جس کے تحت ان کو محل کی ان عورتوں تک رسائی حاصل ہو گی جن سے قربت کا تصور ان کے خوابوں کی رسائی سے بھی دور تھا اور انھوں نے کبھی ان محلوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کی تھی۔ مگر مزدک کی تیز اور طاقتور آواز اب ان کی پشت پر تھی اور لوگوں کا ایک انبوہ تھا جو مزدک کا پیرو تھا۔ مزدک نے لوگوں کی اکثریت کو متاعِ مشترک میں بدل دیا اور اس کے لیے اس نے بنیادی معاشرتی اقدار کی عمارت مسمار کر دی (well Deurant) نے اپنی کتاب (The age of faith) میں مزدکیت کا مختصر ذکر کیا ہے جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ:

"۴۹۰ء کے قریب مزدک نے اپنا فلسفہ حیات لوگوں کے سامنے رکھا جسے بعد میں مزدکیت کے نام سے شہرت حاصل ہوئی مزدک جو ابتدا میں زرتشت کا پیرو تھا اور مجوسیت کے ایک مذہبی پیشوا کے طور پر جانا جاتا تھا نے دعویٰ کیا کہ وہ خدا کا فرستادہ ہے اور اسے پرانے عقیدہ کی تبلیغ کے لیے بھیجا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام مرد مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور کوئی آدمی دوسرے سے زیادہ کسی چیز کی بابت حقِ ملکیت نہیں رکھتا اس لیے کہ جائیداد اور شادی انسان کی ایجاد کردہ ہیں اور یہ بہت بڑی غلطیاں ہیں تمام چیزیں اور تمام عورتیں تمام مردوں کی مشترکہ ملکیت ہونی چاہیں تاکہ وہ سب مشترکہ طور پہ ان سے استفادہ وحظ حاصل کر سکیں۔ مزدک نے چوری زنا محرمات سے بدفعلی کو جرائم کی فہرست سے نکال دیا۔ اگرچہ ان کے ساتھ قبل ازیں نکاح کی اجازت تھی اور کہا کہ دراصل یہ اعمال جائیداد اور شادی تصورِ ملکیت کے خلاف فطری حجابات ہیں غریبوں اور احساس محرومی میں مبتلا طبقات نے مزدک کی تعلیمات کو خوشگوار حیرت سے دیکھا اور جوق در جوق اس کی پیروی کرنے لگے۔ مزدک کہتا ہے کہ وہ خود اس امر پہ ششدر رہ گیا جب اس نے جانا کہ اس کے پیروؤں میں ایک طاقتور بادشاہ بھی شامل ہو گیا ہے جو شاہ ایران تھا۔ شاہ قباذ کے مزدقیت قبول کرتے ہی مزدک کے پیرو طاقت پکڑ گئے اور انہوں نے اپنے نظریات کے نفاذ کے لیے اب طاقت کا استعمال شروع کر دیا۔ مزدک کے ماننے والے گروہ در گروہ شہروں میں پھیل جاتے اور لوٹ مار کرتے۔ وہ معاشی طور پہ آسودہ طبقے کو اپنا نشانہ بناتے اور ان کی

املاک لوٹ لیتے اور ان کی عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ جن امراء نے بادشاہ قباذ کی توجہ مزدکیت کے بڑھتے ہوئے فتنے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ قباذ نے ان کو قید و بند کی صعوبتوں میں ڈال دیا دور دور تک مزدک کے ماننے والے تباہی مچانے لگے۔ امیر آدمیوں کی بیویاں اور کنیزیں ان کی غارت گری کا نشانہ بنتیں۔ مزدکین نے بہت سے اموال اور جائیدادوں پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا اور لوگ ان کی جارحیت سے خائف تھے۔ تاہم موبدان کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث شاہ ایران قباذ کو مزدکیت کی حمایت سے ہاتھ اٹھانے پڑے۔ آخرکار اس نے اپنی حکومت بھی مزدکیت کی حمایت میں گنوادی۔ اس کے امراء اور مذہبی موبدان نے اس کے بیٹے نوشیرواں کو اپنا بادشاہ چن لیا۔ قباذ کو قید کر دیا گیا۔ نوشیرواں نے مزدکیت کے پیروؤں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اس نے مزدک کو زمین میں زندہ دفن کرا دیا"۔

❑❑❑❑❑❑❑

ایک اور مورخ (Nuladiuk) آج کے نظام اشتراکیت اور مزدک کے سوشلزم کے مابین مشترک اور متفرق نکات پہ بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"موجودہ اشتراکیت اور سوشلزم کو جو چیز مزدک کی تعلیم سے چیز جدا کرتی ہے وہ مزدک کا مذہبی ذہن ہے جو اختراع تو وضع کرتا ہے مگر جواز اسے الٰہیات سے فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ اس کے افکار صرف ایک نظریے کے طور پہ نہ مانیں جائیں بلکہ انھیں بطور ایک عقیدہ اپنایا جائے تاکہ اس کی تعلیمات طویل عرصہ تک زندہ رہ سکیں۔ مزدک کا خیال تھا کہ ہر برے کام کا باعث حسد غصہ یا لالچ ہے اور یہی تین رذائل ایسے ہیں جنھوں نے خدا کی مرضی اور حکم کے خلاف مساواتِ انسانی کا خاتمہ کر دیا ہے اور اس مساوات کا از سر نو قائم کرنا ہی اس کی دعوت کا اصل مقصد ہے۔ رہبانیت کا عنصر جو مانی کی تعلیم کے اجزائے کبار میں تھا مزدک کے مذہب میں اگرچہ اس درجہ کی شدت نہیں پائی جاتی تاہم مزدکیت

میں بھی وہ اس حد تک ضرور موجود تھا کہ اس میں خونریزی اور گوشت خوری سے منع کیا گیا تھا مگر مجوسیت کے ہاں ہر قسم کی رہبانیت اور اس کے لوازم انسان کے لیے نقصان دہ ہیں چنانچہ ان سے فرار اور دوری ہی اہل مجوس کا وطیرہ رہی ہے"۔

❑❑❑❑❑❑❑

عرب مورخ علامہ ابن اثیر نے "**الکامل**" میں بھی اس ننگ انسانیت تحریک کے اسباب وواقعات سے بحث کی ہے علامہ فرماتے ہیں کہ:

"شاہ ایران قباذ بن فیروز کے دور میں مزدک کا ظہور ہوا اور اس نے اپنی بدعات کی طرف لوگوں کو دعوت دینا شروع کی۔ اس نے بعض امور میں زرتشت کی تعلیمات کو مدنظر رکھا اور بعض کے بارے میں جدید نقطہ نظر پیش کیا۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ دین ابراہیم علیہ السلام کا دین پیش کرر ہا ہے۔ اس نے محرمات سے زنا اور دوسری کئی معاشرتی برائیوں کو عام کیا۔ اس نے اموال واملاک عورتوں غلاموں اور کنیزوں پر تمام لوگوں کو مساویانہ حقوق عطا کر دیئے۔ مزدکیت نے ملک کے بہت بڑے حصے کو کسی وبا کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لوگوں نے دوسروں کی بیویوں کو اپنے گھروں میں ڈال لیا اور اپنی بیوی خوشی سے کسی اور کو سونپ دی۔ مزدک نے اپنے لوگوں کی مدد سے بڑے لوگوں کی جائیداد اپنے قبضے میں کر لی اور اسے اپنے دل کی خوشی کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں تقسیم کرتا رہتا۔ کوئی اس کی بات موڑنے کو تیار نہ تھا اسے ایک غلبہ اور شان نصیب ہوگئی جس کا اس نے غلط فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ مزدک پرلے درجے کا بے حیا اور بے باک انسان تھا اور اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی دعوت کے بنیادی اجزا ہی انسان کی ہزاروں سالہ تاریخ کے خلاف تھے۔ اس نے مروّج سماجی ڈھانچے کی ان بنیادوں سے انکار کیا جن کی تعمیر میں نسل انسانی نے اپنے ہزاروں سال گنوا دیئے تھے۔ مزدک کے ماننے والوں پر لازم تھا کہ

انسان کو بطور خوراک صرف انھیں چیزوں پر اکتفاء کرنا چاہیے جو زمین سے اگائی جاتیں ہیں یا حیوانات سے حاصل کی جاتیں ہیں۔مزدک نے انسان کے لیے ہر قسم کے ذبیحے کو حرام قرار دے دیا''۔

❑❑❑❑❑❑❑

کمینہ اور رزیل خصلت لوگوں کی بہت بڑی تعداد اس کے ساتھ تھی جس نے ایرانی معاشرے کو اپنی بنیادوں سے ہلا دیا۔نوشیرواں عادل نے جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو مزدک نے چاہا کہ جس طرح اس نے نوشیرواں کے باپ کو باتوں میں لگا کر متاثر کیا تھا اسی طرح وہ نوشیرواں کو بھی اپنے آئینے میں اتار لے گا۔ مزدک جب نوشیرواں کے دربار میں داخل ہوا تو وہ اپنے ایک گورنر منذر بن السماء کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جس کو اس کے باپ قباذ نے اس لیے اس کے عہدے سے معزول کر دیا تھا کہ اس نے قباذ کے حکم پر مزدک کی پیروی سے انکار کر دیا تھا۔نوشیرواں نے مزدک کو دیکھا تو آگ بگولہ ہو گیا اور اسے مخاطب کر کے کہا کہ اے زمین کے بوجھ تو ابھی تک زمین کے اوپر ہی ہے حالانکہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ تو زمین کے نیچے چلا جائے ۔چنانچہ نوشیرواں کے حکم سے مزدک کو زمین میں زندہ دفن کر دیا گیا نوشیرواں کی فوجوں نے صرف ایک دن میں ایک لاکھ سے زائد مزدکیوں کا قتل عام کیا جس پر ایران کے مذہبی موبدان اور امراء نے شاہ ایران خسرو کو نوشیرواں کے لقب سے مقلب کیا۔

اب معاشرے کو مزدکیت سے نجات حاصل ہو چکی تھی اور لوگوں کی غصب شدہ جائیدادیں اور ان کی بیویاں ان کو واپس دلوا دیں گئیں تھیں۔اس طرح اہل ایران بہ مشکل اس فتنے سے ابھرے جس نے ایران کی اخلاقی اور سماجی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا عمل شروع کر رکھا تھا۔علامہ ابن خلدون اور دوسرے مورخین نے بھی مزدکین کی تباہ کاریوں کا احوال تفصیل سے لکھا ہے۔مانی کی طرح مزدک کی تعلیمات بھی صدیوں تک باقی رہیں اور اس کے ماننے والے کسی نہ کسی حال میں خود کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔اگرچہ اب ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی۔نظام الملک اپنی کتاب ''**سیاست نامہ**'' میں لکھتا ہے کہ مزدک کی تعلیمات بہت سے اسلامی فرقوں میں بھی نفوذ کر گئیں تھیں۔شلغمانی، بابک اور مقنع جنھوں نے دورِ عباسی

میں بار بار علم بغاوت بلند کیا دراصل مزدک کی طرح اشتراکیتِ املاک اور اباحتِ نسواں کے قائل تھے۔
باطنیہ کے اکثر فرقوں میں مزدکی عقائد کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔

سیاسی اور معاشرتی حالات

دوسرے بہت سے ماعصر معاشروں کی طرح ایران میں بھی شاہی طرزِ حکومت قائم تھی اور صدیوں تک ملک پہ ایک ہی خاندان حکومت کرتا رہتا۔ بادشاہ کے وجود کے ساتھ بہت سی ایسی پراسرار روایات کو بھی جوڑ دیا جاتا جس سے سادہ لوح عوام کے لوحِ قلب پہ یہ تصور ثبت ہو کے رہ جاتا کہ بادشاہ کو یہ تاج یہ عزت اور یہ شان و منزلت خود اللہ نے عطا کی ہے۔ اس لیے جہاں بادشاہ کی اطاعت ضروری ہے وہیں مذہبی عقیدت اور روحانی جذبات کے بہاؤ کا رُخ بھی بادشاہ کی طرف ہو جاتا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ بادشاہ کے احکام پوری عقیدت سے معاشرے میں اس طور پہ نافذ ہوتے جیسے کسی پیغمبر کے احکامات ہوں۔ دوسری طرف بادشاہ کو یہ اطمینان حاصل رہتا کہ عوام کے کسی حلقے سے اس کے خلاف بغاوت کا کوئی عنصر رونما نہ ہوگا اس لیے کہ لوگ اس معاملے پہ پختہ یقین رکھتے تھے کہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کا تصور بھی ایک بڑا گناہ ہے جس سے ان کی زندگی اور آخرت تباہ ہو سکتی ہے۔ تاہم بادشاہ کے قریبی حلقے اور اس کے حواری اس بات سے واقف ہوتے تھے کہ بادشاہ کی اصل حقیقت کیا ہے اور وہ سارا روحانی اسرار جو بادشاہ کی ذات کے ساتھ منسوب ہے محض ایک افسانہ ہے۔ اس لیے عام طور پہ بغاوت محل کے اندر ہی سے اٹھتی اور اس کے پیچھے بادشاہ کے بھائی اور بیٹے ہوتے۔ چنانچہ ساسانی خاندان کے حکمرانوں کو اپنے خاندان کے افراد سے ہر لمحہ یہ خطرہ لاحق رہتا کہ ان میں سے کوئی بغاوت نہ کردے۔ اس لیے مرنے والے بادشاہ کا بیٹا جب تختِ شاہی پر بیٹھتا تو اپنے خاندان کے ان تمام افراد کو جن سے اسے مستقبل میں بغاوت کا خدشہ لاحق ہوتا قتل کرا دیتا۔ (Wel t
deran) نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ تاریخ عالم میں اپنے عدل کے حوالے سے شہرت حاصل کرنے

والے ایرانی بادشاہ نوشیرواں عادل کے اپنے ذاتی عدل کا یہ حال تھا کہ جب اس نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اس نے اپنے سترہ بھائیوں کو قتل کرایا اور اپنے ان بھائیوں کے کم عمر اور معصوم بچوں تک کو نہ چھوڑا اور ان کو بھی قتل کرادیا۔ مگر پھر بھی اسے اطمینان حاصل نہ ہوسکا۔

شاہی محل میں اس کے لیے چالیس مختلف کمروں میں بستر لگائے جاتے تاکہ اگر اس کے خلاف بغاوت ہوتو اسے مناسب وقت مل جائے اور قاتل اس کی خواب گاہ تک نہ پہچان سکے۔ بعض اوقات بادشاہ کے یہ چالیس بستر بھی اس کے منتظر ہی رہتے اور وہ کسی ادنیٰ سپاہی کی پتھریلی کوٹھری میں سورہا ہوتا۔ مگر ایرانی تاریخ کے جس عہد سے یہاں بحث کرنی مقصود ہے وہ چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ ہے جب عرب میں نبی کریم ﷺ کی پیدائش مبارک ہوئی اور عرب میں اس عظیم انقلاب کی بنا رکھی گئی جس نے دنیا کی جغرافیائی سماجی اخلاقی تہذیبی اور عقائدی اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ ایران پر اس وقت ساسانی خاندان حکمران تھا۔ اس خاندان کی شہنشائیت کا موسس اور بانی اردشیر تھا جس نے ہخامنشی خاندان سے اقتدار چھینا اور ساسانی حکمرانی کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس سے قبل بہت سے خاندان ایران پر حکومت کر چکے تھے مگر ساسانی خاندان کی حکمرانی پہ ایران سے شہنشاہیت کا اختتام ہوگیا اور ایران پر اہل عرب کی حکومت قائم ہوگئی۔

ایران میں اسلام کی آمد سے قبل ان کے عقائدی اور مذہبی احوال بیان کیے جا چکے ہیں۔ یہاں ان کے معاشرتی اور سیاسی احوال پر ایک اجمالی نظر ڈالی جارہی ہے۔ مورخین کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ نویں صدی قبل مسیح میں آریائی نسل کے قبائل نے ایران کی طرف سلسلہ ہجرت کا آغاز کیا اور ان کے کچھ قبائل جنوبی روس کے برف زاروں سے نکل کر مغربی ایران کے سلسلہءکوہ زاغروس کے وسطی علاقہ میڈیا میں آباد ہوئے اور اسی جغرافیائی نسبت سے یہ لوگ ماد کہلائے۔ اسی نسل کی ایک اور شاخ مشرقی ایران میں وارد ہوئی اور یہ لوگ کرمان اور فارس کے صوبوں میں رکے اور بعد میں اسی کو اپنا دیس بنالیا۔ ایرانی ابتدا میں مظاہر پرست تھے پھر زرتشت کی دعوت کے بعد ان کے عقائد میں زبردست تبدیلی واقعہ ہوئی۔ مگر زرتشت کے لیے کسی طور بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ حکمران خاندان کی سیاسی پشت پناہی کے بغیر اپنے خیالات ونظریات کی ترویج کرسکتا۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ زرتشت دس سال تک دعوت وتبلیغ میں مشغول رہا مگر لوگوں نے اسے درخورِ اعتناء نہ جانا حتیٰ کہ اسے ساسانی خاندان کی سیاسی پشت پناہی حاصل ہوئی اور اس کے افکار نے معاشرے میں نچلی سطح تک بار پایا۔ اردشیر نے اگرچہ زرتشت کے نظریات کو تسلیم کرلیا تھا اور مجوسیت کو ایران کا سرکاری مذہب

بھی قرار دے دیا تھا مگر اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ اردشیر نے زرتشت کے نظریہ توحید کو بغیر کسی شرط کے اپنا لیا تھا۔صورت حال کچھ یوں تھی کہ ایران میں حکمران کسی بھی شاہی خاندان کے لیے ان مذہبی طاقتوں کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا جو موبدانِ موبد کہلاتے تھے۔موبدان کے اثر ورسوخ کا یہ عالم تھا کہ وہ بادشاہ کو نہ صرف مشاوّرت فراہم کرتے بلکہ بہت سے معاملات میں اپنے نقطہ نظر کو منوا کر اٹھتے۔

چونکہ بادشاہ کی تاجپوشی کا حق بھی موبداں کو حاصل تھا اس لیے بادشاہ ہمیشہ ان مذہبی طبقات کی خوشنودی کا طالب رہتا مگر عام طور پہ شاہ ایران کو متعلق العنان حکمران تصور کیا جاتا اور اس کی زبان سے نکلی ہر بات قانون تصور کی جاتی۔وہ ہر چیز پہ قادر تھا سوائے اس بات کے کہ وہ اپنا دیا ہوا حکم واپس نہ لے سکتا تھا۔عوام کو بادشاہ سے روحانی عقیدت بھی تھی اس لیے وہ بادشاہ کو سجدہ بھی کرتے۔شاہانِ ایران بہت قیمتی لباس زیب تن کیا کرتے جن میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے ہوتے۔چنانچہ جب کبھی بادشاہ کسی پہ خوش ہوتا تو اسے اپنی خلعت عطا کرتا یعنی اس وقت اس نے جو لباس پہنا ہوا ہوتا وہ اس شخص کو عطا کر دیا جاتا جس نے بادشاہ کو خوش کیا ہوتا اور وہ خوش نصیب عمر بھر کے لیے فکرِ معاش سے آزاد ہو جاتا کہ بادشاہ کا لباس لاکھوں روپے کا ہوا کرتا۔بادشاہ کا لباس تیار کرنے لیے خاص کارخانے ہوا کرتے جہاں تافتہ اور زربفت کے پارچے نہایت اہتمام سے تیار کئے جاتے۔بادشاہ کی دولت اور خزانوں کا اندازہ لگانا ایک مشکل کام تھا۔طیسفون جسے بعد میں مدائن کہا جانے لگا کے خزانوں کی چار دانگِ عالم میں دھوم تھی۔

علامہ طبری اور دوسرے مورخین مثلاً ثعلبیؒ وغیرہ نے خسرو پرویز کے سات خزانوں کا ذکر کیا ہے جن کی وسعت مبالغہ کی حدوں کو چھوتی تھی۔ایران کے بادشاہوں کی تعیش کا ذکر افسانہ لگتا ہے مگر مورخین نے پورے اعتماد کے ساتھ اسے حقیقت بتایا ہے۔سب سے عجیب تختِ تاکدیس تھا [20*]۔جس پر سونے اور لاجورد کا گنبد بنا ہوا تھا اس گنبد میں آسمان ستاروں برجوں اور سات اقلیموں کی اشکال بنائیں گئیں تھیں۔علاوہ ازیں ایک آلہ تھا جس سے وقت کا حساب معلوم کیا جاتا۔فردوسی نے شاہنامے میں ایک عجیب قالین کا ذکر بھی ہے جو طیسفون (مدائن) کے ایوان میں بچھایا جاتا۔اسے فرشِ زمستاں کہا جاتا وہ ساٹھ ہاتھ لمبا اور ساٹھ ہاتھ چوڑا تھا قالین کسی سرسبز باغ کی مثل تھا جس پر روشیں جدولیں نہریں اور رنگارنگ پھولوں والے پودے بنائے گئے تھے۔درختوں کی شاخیں سونے چاندی کے تاروں اور جواہرات سے بنائی گئی تھیں۔اس قالین کو کئی مورخین نے تختِ بہار کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔چنانچہ ایک مغربی مورخ (Mukareyes) لکھتا ہے

کہ تاریخ کے ایوانوں سے اس امر کی مثال مشکل ہی سے پیش کی جاسکتی ہے جس طرح شاہان ایران نے دادِ عیش میں شب و روز گزارے۔ مورخین نے فرشِ بہار کی تفصیلات بیان کرتے ہوا لکھا ہے کہ بادشاہ اپنے امراء کے ساتھ خزاں کے دنوں میں اس تخت یا قالین پر بیٹھ کر شراب پیا کرتا جس کی زمین سونے کی تھی اور جس پہ جابجا جواہرات اور موتیوں سے گلکاری کی گئی تھی، چمن میں پھل دار درخت تھے، درختوں کی لکڑی سونے کی پتے حریر کے اور کلیاں چاندی کی تھیں یہ دولت وثروت کا وہ حیرت انگیز کرشمہ تھا جو زمانے نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔ ریاست کی بے پناہ آمدنی کو بادشاہ اور اس کے حواری جس بے دردی سے اڑاتے اس کی تفصیلات بھی حیرت انگیز ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں، پچاس ہزار اصیل گھوڑے اور درجنوں محلات تھے جن میں سامانِ تعیش اور زر و جواہرات آنکھوں کو خیرہ کرتے تھے۔ بادشاہ متعلق العنان اور آمر تھے جو عوام پہ بے پناہ ٹیکس عائد کرتے اور انھیں اپنی عیاشیوں میں صرف کرتے۔ بہت کم بادشاہ ایسے تھے جن کو کبھی عوامی فلاح اور بہبود کا بخار چڑھا ہو۔ علامہ طبری اپنی شہرہ آفاق کتاب " **تاریخ الامم والملوک**" میں ایرانی بادشاہوں کی سیاہ کاریوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "خسرو کے حرم میں تین ہزار بیویاں تھیں اور ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں تھیں جو اس کی خدمت کرتی تھیں اور اس کی رقص و سرور کی محفلوں کو زینت بخشتیں۔ اس کے خدمت گذار غلاموں کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی، سواری کے لیے نو ہزار اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور سات سو قیمتی ہاتھی تھے۔ بارہ ہزار بار برداری کے خچر تھے جو بادشاہ کے قافلے کا سامان عیش اٹھاتے۔ جواہرات سونے اور قیمتی ظروف کی گنتی آسان نہ تھی[21*]"۔

❑❑❑❑❑❑❑

علامہ ابن اثیر اپنی کتاب " **الکامل** " میں ابن جریر طبری کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ایرانی بادشاہوں کی دادِعیش کی تفصیلات بہت طویل ہیں بادشاہ نشہ آور ادویات کا استعمال کرتے اور جنسی قوت کو بڑھانے کے لیے جتن کرتے رہتے کیونکہ ان کے وسیع حرم ان کی ہوس کو ہر دم مہمیز عطا کرتے اور وہ غیر انسانی شہوت میں ملوث رہتے جس کے لیے انھیں غیر معمولی طاقت کی ضرورت پڑتی وہ افیون کے بھی رسیا تھے اور شراب تو ان کے ہاں پانی کی طرح پی جاتی۔ خسرو پرویز کی تین ہزار بیویاں تھیں اور ہزاروں لونڈیاں تھیں جو حرم شاہی کی زینت تھیں شاہانِ ایران عوام الناس کی بہو بیٹیوں کو اپنے حرم میں داخل کرنا اپنا حق تصور کرتے تھے اور ان کے محلوں میں سینکڑوں پری جمال لڑکیاں ان کی تسکینِ ہوس کے لیے موجود رہا کرتی تھیں جن کی حفاظت پر خواجہ سرا معمور رہتے جو ان کو ناز و ادا کی تربیت دیتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ خشارشیا تاجدارِ ایران کے لیے کسی نئی حسینہ کی تلاش شروع ہوئی تو ساری ریاست میں شاہی حکم جاری ہو گیا کہ ریاست کی تمام کنواری حسینائیں اور جادو نگاہ عورتیں ''لا'' کے ایوانِ شہر یاری میں خواجہ سراؤں کی زیر نگرانی جمع ہو جائیں تاکہ انھیں بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار کیا جا سکے۔ بادشاہ کی خلوت میں پیش ہونے سے پہلے ہر حسینہ کے لیے لازم تھا کہ وہ چھ مہینے تک خواجہ سراؤں کے زیر نگرانی رہیں تاکہ انھیں خلوت کے آدابِ شاہی سے آشنائی حاصل ہو سکے۔ ان چھ مہینوں میں اس لڑکی کو مرُ اور لوبان کی دھونی دی جاتی اور اس کے جسم میں عود اگر اور دوسری خوشبویات کو داخل کیا جاتا اس سارے اہتمام کے باوجود کوئی خوش نصیب حسینہ ہی ایک سے زیادہ بار شبستانِ شاہی میں طلب کی جاتی اور اکثر کنیزوں کی عمریں عالم حسرت اور آرزو میں سسک سسک کر بیت جاتیں۔ فراعین مصر کی طرح اہل ایران بھی بعض اوقات اپنی حقیقی بہن یا بیٹی کو اپنی بیوی بنا لیتے اس لیے کہ مجوسیت میں یہ رشتہ جائز تصور کیا جاتا۔ چنانچہ ایرانی شاہ بہمن نے اپنی بہن ہما سے شادی کی تھی اور ارتا خشارشیا نے یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیوں سے شادی کی تھی۔ ایرانی بادشاہوں کے شاہانہ تکلفات اور فضول خرچیوں کا درست اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے اس لیے کہ ساسانی خاندان کے آخری چشم و چراغ یزدگرد کو جب مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور گرفتاری کے خوف

سے بچنے کے لیے جب وہ میدان چھوڑ کر بھاگا تو وہ اپنے ساتھ ایک ہزار باروچی ایک ہزار گویئے ایک ہزار چیتوں کے محافظ ایک ہزار بازدار لے کر مدائن سے بھاگ نکلا"۔

❑❑❑❑❑❑❑

اہل ایران کی سیاسی اور مذہبی زندگی کے بنیادی ڈھانچے پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد اب ہم اہل ایران کی سماجی اور معاشرتی اقدار پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اہل ایران کی معاشرتی زندگی کو کسی بھی حوالے سے متاثر کن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ معاشرے میں عام آدمی کی حالت دِگردوں تھی۔ ایرانی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ ایران کا عام آدمی ایک پست زندگی گذارنے پر مجبور تھا۔ ایرانی معاشرہ طبقاتی تقسیم کا شکار تھا اور مختلف دائروں میں منقسم تھا طبقہ اشرافیہ اور عام آدمی کے طرزِ زندگی اور معیارِ زیست میں اتنا فرق تھا جس کا تصور ہی لرزا کر رکھ دے۔ ایک طرف تو رزق اور سامانِ تعیش کی اتنی فراوانی نظر آتی ہے کہ انسان خود کو خدا سمجھنے لگے جبکہ دوسری طرف وہ بہیمانہ عزلت اور پس ماندگی تھی کہ انسانیت جس سے شرما شرما جائے ان مختلف طبقات کے درمیان ایسی محکم حد بندیاں موجود تھیں جو نظر نہ آنے کے باوجود بھی آسانی سے عبور نہ کی جاسکتی تھیں۔ عام آدمی معاشرے کے جس طبقے میں پیدا ہو وہ عمر بھر اسی سے وابستہ رہنے پر مجبور تھا اور اس کی جدوجہد کا ثمر کسی اور کی جھولی میں جا گرتا۔ وہ تمنا کے باوجود ترقی کی کسی سیڑھی پر قدم نہ رکھ سکتا تھا اس لیے کہ اس کے راستے میں مذہب اور سماجی اقدار ایک بلند دیوار کی صورت اس کی راہ روکے کھڑی تھیں۔ کسی کو اپنا آبائی پیشہ ترک کرنے کی اجازت نہ تھی۔

اس لیے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی موچی کے گھر میں پیدا ہوا ہے تو یہ اہورامزدا کی دانش ہے اور انسان کو کوئی حق نہیں کہ وہ خالق کی منشا کے خلاف جائے۔ چنانچہ اب زندگی بھر اس کے مقدر میں جوتے مرمت کرنا ہی لکھا ہے اور ہر انسان کو اپنے مقدر کے لکھے پر صبر کرنا چاہیے۔ مذہبی اعمائے دین لوگوں کے ذہن میں اس بات کو راسخ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے کہ ان کے مصائب اور تکالیف اہورامزدا کی منشا سے ہیں اور لوگوں کو اپنے خالق کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھنا چاہیے اور جو پیشے ان کے آباء نے اختیار کئے تھے وہ خدائی فرمان کے تحت ان میں تقسیم کیے گئے تھے اس لیے کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آباء کے پیشے سے راہ انحراف اختیار کرے۔ ایرانی معاشرے کی بنیاد دو ستونوں پر قائم تھی ایک نسب اور دوسری

جائیداد، طبقہ اشرافیہ اور عوام الناس کے درمیان نہایت محکم حدود قائم تھیں اور دونوں کی ہر چیز میں امتیاز تھا سواری میں، لباس میں مکان میں، باغ میں، عورتوں اور خدمت گاروں میں طبقہ اشرافیہ کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل تھے اور ان کی جائیدادوں کی محافظت حکومت وقت کا ذمہ تھی۔ اگر چہ عام آدمی کے لیے اس طرح کے مواقع پہلے ہی مفقود تھے کہ وہ امراء کی ہم سری کا دعویٰ کر سکیں مگر ایرانی قانون نے بھی ان کی راہ میں عجیب و غریب رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں جن میں ایک قابل ذکر رکاوٹ یہ تھی کہ عام طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص دولت رکھنے کے باوجود طبقہ اشرافیہ کی جائیداد کا خریدار نہ بن سکتا تھا۔ عام طور پر معاشرے میں نچلے طبقے کے افراد کو تعدد ازواج کی اجازت بھی نہ تھی اور وہ عمر بھر ایک ہی بیوی کا ساتھ گزارا کرتا۔

اولاد کے بارے میں ان کے ہاں دستور تھا کہ اگر کسی کے گھر لڑکا پیدا ہو تو طرح طرح سے خوشیاں منائیں جاتیں اور مذہبی رسوم ادا کی جاتیں بچے کو نظر بد سے بچانا ضروری خیال کیا جاتا جس کے لیے صدقے دیئے جاتے اور اس بات کا اہتمام کیا جاتا کہ اسے ماں کے سوا دوسری عورتوں کے سائے سے بھی بچایا جائے کیونکہ شیطان عورت کے ساتھ ہوتا ہے وہ بچے کے اندر منفی رجحانات کو پروان چڑھا سکتا ہے اور بچہ بڑا ہو کر معاشرے کا ناسور بن سکتا ہے۔ شیطان کو بچے سے دور رکھنے کے لیے آگ اور روشنی کا اہتمام کیا جاتا۔ تاہم لڑکی کی پیدائش پر کسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا جاتا بلکہ نومولود اور اس کی ماں سے سرد مہری کا رویہ اختیار کیا جاتا۔ لڑکی کو دنیاوی تعلیم سے دور رکھا جاتا تاہم لڑکی کی مذہبی تعلیم اس کی ماں کی ذمہ داری تصور کی جاتی۔ لڑکی کی شادی پندرہ سال تک کر دی جاتی۔ اس کے شوہر کا چناؤ اور شادی کے اخراجات باپ کی ذمہ داری تھی۔ ایران میں محرمات سے شادی کے رواج کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے نچلے طبقے کے کئی بد بخت باپ اس رسم کا ناجائز فائدہ اٹھاتے اور اپنی بیٹیوں کی شادی کے اخراجات سے بچنے کے لیے انھیں اپنے ہی گھر ڈال لیتے۔ نچلے طبقے میں محرمات کے ساتھ نکاح کا رواج اتنا عام تھا کہ وہ ایرانی جو زرتشی مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب سے منسلک تھے انہوں نے بھی اس رواج کو اپنا لیا تھا۔

ایران کے عیسائیوں کے ہاں بھی اس شرمناک رسم نے رواج پا لیا تھا اور رزتشتیوں کی دیکھا دیکھی وہ محرمات کے ساتھ شادی کرنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ امر ان کی شریعت کے بالکل برعکس تھا۔ ایرانیوں کے ہاں ازدواجی زندگی کے کئی دیگر تصورات بھی موجود تھے جو نہ صرف یہ کہ شرمناک تھے بلکہ ان سے ایرانی معاشرے کی درست اخلاقی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اپنے دوست کی مالی حالت کو سہارا

دینے کے لیے اپنی بیوی اس کے حوالے کر دیتا کہ وہ اس سے پیشہ کرائے اور اپنے مالی حالات کو درست کرے۔اس دوران اس عورت کے ہاں جو اولاد ہوتی وہ پہلے شوہر ہی سے منسوب کی جاتی۔اس طرح کی وحشت ناک رسموں میں عورت کو اعتماد میں نہ لیا جاتا اور نہ ہی اس کی رضامندی کو کوئی اہمیت حاصل ہوتی۔

معاشی لحاظ سے ایرانی سوسائٹی میں نچلے طبقے کی فلاح کے لیے کوئی منصوبہ سازی نہ کی جاتی اور وہ بدحالی میں سسکتی رہتی۔اس پہ مستزاد وہ ٹیکس تھے جو بادشاہ کی طرف سے ان پہ گاہے بگاہے لاگو کیے جاتے۔ملکی دولت کے تمام تر بہاؤ کا رخ امراء،روساء،فوجی جرنیل اور طبقہ اشرافیہ کی طرف تھا جب کہ ایران کا عام آدمی جس میں کاشتکار،دستکار،مزدور اور دوسرے نیچ پیشوں سے وابستہ لوگوں کی اکثریت شامل تھی ان کے مقدر میں صرف مفلسی اور محرومی لکھی تھی جس کو اہورامزدا کی منشا قرار دے کر انھیں حالات پہ قانع رہنے کا درس دیا جاتا۔

محرومیوں اور مفلسی کا شکار عام ایرانی صدیوں چکی کے اس دو پاٹوں میں پستے رہے اور دور دور تک نویدِ صبح کی کوئی کرن ان کی منتظر نہ تھی اور نہ کوئی ان کا پرسان حال تھا۔حتیٰ کہ بادشاہ کی طرف سے عوام کے لیے مستقل سردمہری کا رویہ اس معاشرے کا امتزاج تھا۔بادشاہ یوں بھی عام آدمی کی رسائی سے بہت دور تھا اور شاذونادر ہی کوئی عام آدمی باشاہ کے دیدار سے مستفیذ ہوسکتا۔یہ بادشاہوں کی آمرانہ ملوکیت ہی تھی جو انھیں یہ احساس دلاتی رہتی کہ عوام میں ان کے دوست کم اور دشمن زیادہ ہیں اس لیے بادشاہ اور عوام کے درمیان مطلوبہ فاصلہ برقرار رکھنے کے سو سو جتن کیے جاتے اور بادشاہ کو اپنی ذات کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات کرنے پڑتے۔جب بادشاہ کے مقربین خاص بھی دربار میں شرکت کے لیے جاتے تو انھیں بہت سے تکلّفات کو مد نظر رکھنا پڑتا اور شاہی دربار میں مروّج شاہی آداب کا خاص خیال رکھا جاتا تاکہ بھولے سے کوئی عام آدمی بادشاہ کے نزدیک نہ جاسکے۔

چنانچہ جو شخص بادشاہ کے حضور حاضر ہوتا اس کو قدیم ایرانی دستور مدنظر رکھنا پڑتا جس کے مطابق جونہی اس کی نظر بادشاہ پہ پڑتی اسے سجدہ کرنا پڑتا۔دربار میں داخلے کا قاعدہ یہ تھا کہ محل کا دربان بادشاہ کے پاس آکر نہایت آہستگی سے اطلاح کرتا کہ فلاں شخص شرفِ بازیابی چاہتا ہے اس کا مقصدِ ملاقات یہ ہے اور وہ قابل اعتماد آدمی ہے۔چنانچہ بادشاہ اپنے ہاتھ کی جنبش سے نوارد کو اذنِ ملاقات بخشتا۔اب ملاقات کے لیے آنے والا شخص دربار میں داخل ہوتا اور اپنی آستین سے ایک سفید رومال نکالتا اور اسے اپنے منہ پہ باندھ لیتا بادشاہ کے سامنے اس رومال کا باندھنا بادشاہ کی جلالت اور تقدیس کا اعتراف تصور کیا جاتا۔قریب آکر وہ شخص فوراً

سجدے میں گر پڑتا اور جب تک بادشاہ اسے اٹھنے کی اجازت نہ دیتا وہ یونہی زمیں بوس پڑا رہتا۔بعض اوقات صورت حال اس قدر دلچسپ ہو جاتی کہ اہل دربار ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے اس لیے کہ بادشاہ اکثر اوقات نشے کی حالت میں ہوتا اب اس کے سامنے زمین پر کئی لوگ سجدہ تعظیمی میں پڑے ہیں اور خود بادشاہ کو اونگھ آ گئی ہے۔سجدہ میں جانے والے جانتے ہیں کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر اگر اب انہوں نے اپنے سر کو اٹھایا تو ممکن ہے ان کا سر ہمیشہ کے لیے کاٹ دیا جائے۔دوسری طرف بادشاہ کے معتمد خاص جب یہ جان جاتے کہ اب بادشاہ مزید دربار کرنے کے قابل نہیں رہا تو وہ پردہ گرا دیتے پھر کئی گھنٹوں کے بعد کسی دربان کو سجدے میں گرے ان ملاقاتیوں کا خیال آتا تو وہ انھیں اٹھا کر توہین آمیز انداز میں دربار سے رخصت کر دیتا۔لوگ اس اذیت کو اس لیے برداشت کرتے تھے کہ بادشاہ سے ملاقات کا سامان برسوں کی محنت سے حاصل ہوتا اور وہ اس موقع کو کھونا نہ چاہتے تھے اس لیے اس قسم کی انسانی اہانت ان درباروں کا خاصہ رہی ہے۔شاہی تخت ہال کے ایک سرے پر پردے کے پیچھے رکھا جاتا۔اعیانِ سلطنت اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار پردے سے مقررہ فاصلے پر بیٹھتے درباریوں کی جماعت اور دوسرے ممتاز لوگوں کے درمیان ایک جنگلہ حائل رہتا۔اچانک صدا لگائی جاتی اور بادشاہ تخت پر جلوہ گر ہوتا۔

بادشاہ اور درباریوں کے درمیان کئی پردے حائل ہوتے تاہم جب موٹا پردہ ہٹا دیا جاتا تو دیبا کے تکیے پر ٹیک لگائے زربفت کا بیش قیمت لباس پہنے تخت پر جلوہ افروز بادشاہ کو دیکھا جا سکتا تھا۔ایرانی بادشاہ شاہی تاج کا خاص اہتمام کرتے اور دربار کے خاص خاص لوگ ہی اس امر سے واقف ہوتے کہ بادشاہ دراصل اس تاج کو پہنے ہوئے نہ ہوتا کیونکہ تقریباً دو من وزنی اس تاج کا سر پہ پہننا ممکن ہی تھا [22*]۔جس پہ سونا چاندی زمرد یاقوت اور دوسرے موتی مرصع ہوتے۔دراصل وہ تاج ایک بہت باریک مگر مضبوط زنجیر سے چھت کے ساتھ بندھا ہوتا۔بادشاہ جب تخت پر جلوہ گر ہوتا تو وہ اپنا سر تاج کے عین نیچے رکھتا جس سے دیکھنے والوں کو شبہ گذرتا کہ بادشاہ نے تاج پہن رکھا ہے۔خسرو اول ہرمزد کے تاج کے بارے میں روایت کیا جاتا ہے کہ سونے کے اس تاج پہ ہیرے اور جواہرات بڑی تعداد میں مرصع تھے۔تاج کے اطراف میں سُچے موتیوں کی لڑیاں تھیں جن سے روشنی جب منعکس ہوتی تو بادشاہ کے اردگرد روشنی کا ایک ہالہ بناتی جس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں فرحت وحیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔دوسری طرف ایران کا وہ عام آدمی تھا جس کے نصیب میں ابدی محرومی لکھ دی گئی تھی ایران کی ساسانی مملکت کا سرکاری مذہب مجوسیت تھا اور زرتشت کے ہاں

زراعت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ان کی مذہبی کتابوں میں بھی اس پیشہ کو مقدس گردانا گیا تھا اس کے باوجود ایرانی کسان کی حالت بڑی قابل رحم تھی جس کی وجہ بادشاہ کی آمریت اور ٹیکسوں کا بوجھ تھا۔کسان سارا سال اپنی زمینوں سے بندھے رہتے مگر اس کے باوجود بادشاہ کے ہرکارے ان سے جبری بیگار بھی لیتے۔جب بادشاہ کی فوج کسی میدانِ جنگ کے لیے روانہ ہوتی تو نہ صرف یہ کہ راستے میں آنے والے کسانوں پر ان کی خدمت لازم تھی بلکہ ان کی فصلیں بھی بادشاہ کے لشکریوں کے پاؤں تلے روندی جاتیں اور وہ سوائے کفِ افسوس ملنے کے کچھ نہ کرسکتے کہ وہ زبان کھولنے یا احتجاج کرنے پر قادر نہ تھے بلکہ ان کے ذمہ یہ ڈیوٹی ہوتی کہ وہ بادشاہ کی فوج کے پیچھے پیچھے گھسٹتے چلے آئیں اور ان کا ہر حکم بجالائیں۔اس پہ مزید ستم یہ کہ کسانوں کی ان تمام خدمت گذاریوں کے باوجود شاہی خزانے میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا نہ کوئی تنخواہ نہ وظیفہ اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی اجرت۔وہاں عام طور پہ جاگیردرانہ نظام پایا جاتا بڑا زمیندار خود کو چھوٹے کسان کی زندگی اور موت کا وارث خیال کرتا اور اس سے کسی قسم کی رعایت برتنے کا روادار نہ تھا۔معمولی کسان کا بڑے جاگیردار سے رشتہ غلام اور آقا کے رشتے سے بھی بدتر تھا۔کسان کی فصل اگر کسی سال معمول سے اچھی ہو جاتی تو وہ اپنی اس خوشی کو منانے کا قطعی حقدار نہ تھا کیونکہ جاگیردار نت نئے ٹیکسوں کے ساتھ آموجود ہوتا اور کسان کی محنت کو اپنی جھولی میں ڈال کر چلتا بنتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ بہت سے کسان کھیتی باڑی سے دلبرداشتہ ہو جاتے اور بادشاہ کی فوج میں داخل ہو جاتے جہاں ان کی سانس کچھ آسانی سے نکلتی اگرچہ انھیں بادشاہ کی بے مقصد اور خون ریز جنگوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔

عام ایرانی آدمی کے ساتھ عدل کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا۔حصولِ انصاف کے لیے ضروری تھا کہ آدمی کا تعلق شاہی دربار یا بادشاہ کے امراء کے ساتھ ہو۔نوشیرواں کا عدل مشہور تھا مگر اس کا عدل بھی ایک خاص دائرے میں ہی محدود تھا یہ اور بات کہ مغربی مورخین نے اسے حقیقت سے بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔چنانچہ نوشیرواں عادل نے جو معاشی پالیسی اپنی قوم کے لیے وضع کی وہ اس کے عدل کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہے۔محصول اور لگان وصول کرنے کا جو طریقہ اس نے وضع کیا اس کا عدل سے تو کیا تعلق وہ تو سراسر بہمیت پہ مبنی ایک ایسا نظام تھا جس میں انسانیت سسکیاں لے رہی تھی اس نے محصولات کا سارا بوجھ اس طبقے پر لاد دیا تھا جو پہلے ہی مجبوریوں اور محرومیوں کے شکنجے میں کسا ہوا کراہ رہا تھا۔اگرچہ بادشاہ کے درباریوں نے ہمیشہ کی طرح اس نظام جبر کو بھی عوامی اصلاحات کا نام دیا۔اس نے اپنے عوام کے

لیے محصولات کا جو نظام دیا اس کے مطابق بادشاہ اور اس کا سارا خاندان ایران کے دوسرے سات بڑے اور خوشحال خاندان بادشاہ کے امراء عظماء فوج سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی بادشاہ کے ذاتی ملازم اور دولت کی ریل پیل میں آلودہ مذہبی موبدان ہر قسم کے ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے دیئے گئے۔ اب رہ سہہ کے صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو احتجاج کی قدرت نہ رکھتے ہوں اور اپنی زندگی کی سانسوں کو برقرار رکھنے کا خراج ادا کرتے رہیں۔ چنانچہ یہ ہے اس معاشرے کی اصل تصویر جسے تاریخ میں نوشیرواں کے عادل معاشرے کے طور پہ یاد کیا جاتا ہے۔ تاہم جبر کے ان نظاموں نے جب اسلام کے حقیقی عدل کا ذائقہ چکھا تو انھیں روشنی کی وہ کرن نظر آئی جس کے وہ صدیوں سے منتظر تھے وہ دیوانہ وار اس نظام حق کی چھتری تلے جمع ہوئے اور صدیوں کی بادشاہیاں پل بھر میں تاریخ کے صفحات سے رخصت ہو گئیں۔

فن و ادب

اہل ایران علوم وفنون کے دلداہ تھے اور تمام اصنافِ ادب سے وابستہ تھے۔فنونِ لطیفہ میں شعر و ادب ،فن مصوری،سنگ تراشی اور علوم موسیقی نے ان کے ہاں ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے۔مگر ایران کے قدیم علوم وفنون کے بہت سے ذخیرے جنگ و جدل کی نظر ہو گئے اور یہ تباہی اس قدر مکمل تھی کہ ساسانی عہد کا ایک شعر بھی ہم تک نہ پہنچ سکا جس سے اس دور کے ایرانی ادب کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جا سکتی۔پھر جب اہل عرب کے ہاتھوں ساسانی مملکت کا خاتمہ ہوا تو اس وقت بھی علوم وفنون کا بہت سا ذخیرہ ضائع ہو گیا۔علامہ ابن خلدون نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ کے مقدمے میں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ نے حضرت عمرؓ کے حکم سے مدائن کے شاہی کتب خانے سے دستیاب ہونے والی ہزاروں کتابیں دریا میں بہا دیں یا انھیں آگ لگا دی گئی۔اس کے باوجود بھی ایران کے بہت سے امیر خاندانوں کے ذاتی کتب خانوں سے کئی ادبی شہ پارے بعد کے زمانوں تک پہنچے اور لوگوں نے ایرانی علوم وفنون سے آگاہی حاصل کی جن میں کتاب التاج،خوتائی نامہ،کارنامک اردشیر پاپکاں،کتاب زریر،ہزار داستاں،خسرو کواذان اور اس کا غلام وغیرہ شامل ہیں۔فردوسی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے شاہنامہ مرتب کرنے میں ان میں سے کئی قدیم کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔بغداد کے بیت الحکمت میں برامکہ کی سرپرستی میں کچھ تاریخی اور افسانوی ادب کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔کئی کتابوں کے مسودات کو ابن المقفع نے عربی زبان میں منتقل کیا جب کہ مشہورِ زمانہ تصانیف رستم و اسفندیار اور بہرام نامہ کا عربی میں ترجمہ جبلہ بن سالم نے کیا۔ایک اور کتاب بیلیکین کا رزمیہ ترجمہ بھی کیا گیا ان ترجموں میں سے سب زیادہ شہرت الف لیلی کے حصے میں

آئی جو دراصل ہزار داستاں کا عربی ترجمہ تھا۔شہرزاد اور اس کی بہن دنیازاد کے مرکزی کردار ہزار داستاں ہی سے لیے گئے ہیں بعد میں کئی ایرانی لوک قصوں کو بھی عربی میں منتقل کیا گیا جنہوں نے کافی شہرت حاصل کی۔ ان میں قصہ شہرزاد، ادب وثعلب، اور بہرام نروسی شامل ہیں۔شاہان ایران عام طور پہ علم دشمن نہ تھے اس لیے کہ ان کے ہاں زبان و ادب کے حوالے سے ایک خاص تہذیبی تصور موجود تھا۔چنانچہ وہ علوم وفنون کی سر پرستی کرتے۔نوشیرواں اپنی علم دوستی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا۔اس نے اپنے ایک اہم وزیر بروزیہ کو اس مقصد کے لیے ہندوستان بھیجا تا کہ وہ اسے ہندوستانی علم وفن سے آگائی بہم پہنچائے۔بروزیہ ہندوستان سے بادشاہ کے لیے قصہ کلیلہ دمنہ اور شطرنج کا عجیب وغریب کھیل لے کر ایران پہنچا۔شطرنج کے کھیل کو ایران میں اتنی پذیرائی حاصل ہوئی جس کا بیان کرنا مشکل ہے خاص طور پہ بادشاہ اس سے بہت متاثر تھا۔اس کے علاوہ نوشیرواں نے کئی سنسکرت یونانی کتابوں کا بھی پہلوی زبان میں ترجمہ کرایا۔چنانچہ علوم فنون میں ایرانی حکمرانوں کی دلچسپی اور سر پرستی کا دور دور تک شہرہ تھا۔

ایرانی موسیقی کے بھی دلداہ تھے اور علم موسیقی کو ایران کے علمی اور شاہی حلقے میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ ایک ایرانی روایت ہے کہ موسیقی الہامی علم ہے جسے انسانوں تک منتقل کرنے کی ذمہ دار ققنس نامی پرندے کو سونپی گئی جو خود بہت بڑا موسیقار ہے۔اس کی چونچ میں سات بڑے سوراخ ہیں اور ہر سوراخ سے ستر راگ نکلتے ہیں۔اس افسانوی روایت کے پردے میں سپتک اور راگنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ان کے ہاں شادیوں پر موسیقی کا رواج تھا اور گویئے سازندوں کی مدد سے اس موقع پر مختلف راگوں کا اہتمام کرتے۔ان کے ہاں ایک ساز ''رود'' نامی بھی مروّج تھا جس میں تار کے بجائے بکری کے بچے کی خشک اور بٹی ہوئی آنت استعمال کی جاتی۔ایرانی شہنشاہ کیکاؤس کے جشن تاج پوشی پر ماژندرانی گانے کا ذکر آیا ہے۔بربط کے علاوہ ان کے ہاں دف چنگ اور بانسری کے آلات بھی موسیقی کے لیے استعمال کیے جاتے۔شاہانِ ایران کے محلوں کے دروازے پر ہر روز پانچ مرتبہ نوبت بجائی جاتی اور اس چوکی کا سب سے اہم ساز شہنائی تھا۔ایرانی شاہوں بہرام گور اور خسرو پرویز کے زمانے میں علم موسیقی کو بہت ترقی حاصل ہوئی۔بہرام گور رقص وسرور کا شیدائی تھا اس نے علم موسیقی کی شُدبُدھ رکھنے والے بارہ ہزار ہندوستانیوں کو اپنے دربار میں مدعو کیا اور ان سے علم موسیقی کے رموز جانے۔موسیقی میں خسرو پرویز کی سرگرمیاں بھی قابل ذکر ہیں اور اس کے دربار سے وقت کے مانے ہوئے موسیقار وابستہ تھے۔باربد اور نگینا کا تعلق پرویزی دربار ہی سے تھا[*23] جنہوں نے فن

موسیقی کو کمال عروج تک پہنچایا اور بہت سے نئے راگ ایجاد کیے۔نوائے باز بد ایرانی ادب میں ضرب المثل بن چکی تھی۔ایرانی موسیقی بھی ہندی سنگیت کی طرح ریاضیاتی اصولوں پر مبنی تھی اور اس کے بارہ مقامات کو علم نجوم کے بارہ برجوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔بہت سے مقامات سادہ اور بسیط راگوں پر مشتمل تھے۔ان مقامات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور دن رات کی مناسبت سے چوبیس راگ مرتب کئے گئے جو موسیقی کے بنیادی اصول ٹھہرے اور جن پر آج کی موسیقی کی بنا رکھی گئی ہے۔اہل ایران نے بسیط راگوں کے علاوہ دو راگوں کو ملا کر مرکب راگ بھی بنائے جنہیں اصطلاح میں آہنگ کہا جاتا۔ان میں سے چھ نام آج تک زندہ ہیں جن کی ترتیب یوں ہے سلمک، گردانیہ، نوروز، گوِشت، مارہ اور شہناز۔

اس کے علاوہ ایرانیوں نے بہت سی راگنیوں کا اجرا بھی کیا جن کے نام بہت دلکش ہیں۔جیسے بہارِ نشاط، دلبر، شادبار، شباب، فانوس، بادِ نوروز اور دل انگیز وغیرہ۔عجمی موسیقی میں علم عروض کی سترہ بحریں ہیں جنہیں ہندی میں تال کہا جاتا۔ایرانیوں کے سامانِ موسیقی میں بربط دف، چنگ اور نے مشہور ہیں۔نے کو ہمارے ہاں بانسری کہا جاتا ہے۔ان کے جنگی ساز علیحدہ سے مرتب کئے جاتے اور میدان جنگ میں اپنی افواج کے حوصلوں کو برقرار رکھنے کے لیے ان کے ہاں جنگی باجے دہل کوس اور قرنا مروّج تھے وہ چنگ کو مضراب سے بجایا کرتے۔بربط میں چار تار ہوا کرتے جو اخلاط اربع کے لحاظ سے مختلف رنگوں کے ہوا کرتے۔تنبورہ تاروں کا ساز تھا اور کمنبہ رباب کے مشابہ تھا۔فن تعمیر میں بھی ایرانی یدِطولیٰ رکھتے تھے۔قدیم ایرانیوں کو فن تعمیر کی روایات بابل اور اشوریا سے ورثے میں ملی تھیں جن پر انہوں نے خوبصورت اضافے کیے۔قدیم ایران میں حکمران خاندانوں کی تفصیلات گذر چکی ہیں تاہم جن خاندانوں نے فن تعمیر میں دلچسپی لی ان میں ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے نام قابل ذکر ہیں۔ہخامنشیوں کا دارالسلطنت اصطخر اور ساسانیوں کا دارالحکومت طسیفون (مدائن) کا شمار اپنے زمانے کے حسین ترین شہروں میں ہوتا تھا۔

اصطخر کو سکندر اعظم نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔چنانچہ خسرو نوشیرواں کے مشہور طاقِ کسریٰ کے کھنڈر آج تک سامانِ عبرت بنے ہوئے ہیں۔سکندر کے حملے کے بعد فن تعمیر کے ہزاروں ماہرین ایران سے ہندوستان بھاگ گئے۔شاید اسی لیے چندر گپت موریا کے عہد کی ہندوستانی تعمیرات میں ایرانی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ایرانیوں نے پاٹلی پتر میں لکڑی کے گنبد بنائے جن کا اس سے قبل ہندوستان میں کوئی تصور نہ تھا۔ایرانی کاریگروں نے ہندوؤں کو پتھر تراشنے اور اس کے عمارتی استعمال کے طریقے سکھائے۔چنانچہ پاٹلی پتر

کے آثار میں اصطخر کی وضع کے ستون دکھائی دیتے ہیں۔سارناتھ کے قریب ایرانی ساخت کے ستون ملے ہیں جن کے سروں پر چار شیر ایک دوسرے کی طرف پشت کئے بیٹھے ہیں۔بھوپال کے مشرقی دروازے پر سانچی سٹوپا کا آتش کدہ مخدوش حالت میں آج بھی موجود ہے جس کی لاٹوں پر اشوک نے ہدایات کندہ کرائی تھیں۔

یہ اسلوب ایران کے حجری کتبات سے ماخوذ ہے۔بازنطینی فن تعمیر میں گنبد نے رواج پایا تو دراصل وہ ایرانی وضع ہی کی جدید شکل تھی جو بعد میں مسلمانوں کی مذہبی عمارات کی شان قرار پائے۔بیل اور ببر شیر کے علامتی مظہر سراسر ایرانی ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں گپتا عہد کی تعمیرات میں بھی ایرانی فن تعمیر کا رنگ غالب ہے۔ چنانچہ ایران کے طاقِ بوستان اور اجنتا کے غاروں میں منقش جانوروں کے عکس میں بے پناہ مماثلت پائی جاتی ہے۔افغانستان میں دخترِ نوشیرواں کے نقوش بھی ایرانی وضع کے ہیں۔شاہانِ ایران سر بفلک محل تعمیر کراتے تھے۔ان کی دیواروں پر دربار اور شکار کے مناظر کندہ کئے جاتے۔اگرچہ دیواری مصوری کے بہت کم نمونے زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ سکے۔اہل ایران کی فن مصوری میں مانی اور اس کے پیروؤں کو استاد مانا جاتا تھا۔مانی ایک مذہب مانویت کا بانی بھی تھا جس کا ذکر گزر چکا ہے خود بھی نامور مصور تھا جس کی تصاویر میں ایرانی آرٹ کی فطرت نگاری کے شگفتہ نمونے ملتے ہیں۔انھی میں شبیہ نگاری کے وہ اسالیب بھی دکھائی دیتے ہیں جو بعد میں استاد کمال الدین بہزاد اور اس کے شاگردوں کی خصوصیات بن گئے۔ہرات اور تبریز کے مکاتب فکر میں انھیں روایات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

فنونِ صغیرہ میں بھی ایرانیوں نے بڑے بڑے حسین نمونے پیش کئے ہیں۔ساسانی عہد کے جو پارچہ جات بعد کے زمانوں تک پہنچے ان کے معائنے سے اہل ایران کے لباس کا عمدہ ذوق جھانکتا ہے۔وہ نساجی کے نہایت دلاویز نمونے تھے۔ایرانی تافتہ زربفت اور کمخواب بننے میں مہارت رکھتے تھے اور ان کے بُنے ہوئے پارچے بازنطین اور دیگر مغربی ممالک میں بہت گراں قیمت سمجھے جاتے تھے۔ان میں عنقا وغیرہ کے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ساسانیوں کے دورِ حکومت میں نہایت نفیس قالین بنے جاتے تھے جو دنیا بھر میں مشہور تھے۔گل دار اقلیدسی نمونے جو بعد میں ایرانی قالین کی خصوصیات بن گئے اور دنیا بھر میں شہرت پائی۔علاوہ ازیں ایرانی کاریگر دھات کے منقش کام ہاتھی دانت کے کام اور سنگِ مرمر کی تراش خراش میں بھی ماہر تھے۔ بازنطین کے قیاصرہ کے محلوں میں شوخ رنگوں کے جو بیل بوٹے بنائے جاتے تھے وہ ایرانی الاصل ہی تھے۔

قیاصرہ کے تاج بھی ایرانی وضع ہی کے بنائے جاتے تھے۔اہل ایران کے ہاں تہذیبی روایات بھی خاصی مستحکم تھیں اورایرانی تمیز وشائستگی کا پیکر سمجھے جاتے تھے۔چنانچہ(Hero dotess)نے اپنی شہرہ آفاق تاریخ میں ان کے طرزِ تخاطب اور آدابِ گفتگو کا ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے:

''کہ ہخامنشی خاندان کے شہنشاہ کمبوجیہ نے ایک دن دربار سجا رکھا تھا تو اس نے اپنے وزیر باتدبیر سے پوچھا کہ ایرانی رعایا کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔وزیر نے جواب دیا کہ لوگ تو جہاں پناہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں البتہ کچھ کم بخت کہتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ شراب بہت پیتا ہے۔وزیر کی اس بات سے شراب کے نشے میں دھت بادشاہ آگ بگولہ ہوگیا اور کہا کہ دیکھو یہ تمہارا جوان بیٹا میرے سامنے کھڑا ہے میں اس پہ تیر چلاؤں گا اگر تیر ٹھیک اس کے دل کے پار ہوگیا تو ایرانیوں کا خیال میرے بارے میں درست نہیں ہے اور اگر میرا نشانہ چوک گیا تو پھر اہل ایران ٹھیک کہتے ہوں گے۔چنانچہ تیر کمان میں رکھا گیا اور وزیر کے بیٹے پر چلا دیا گیا۔وزیر کا جوان بیٹا وہیں ڈھیر ہوگیا۔کمبوجیہ نے حکم دیا اس کا سینہ چاک کیا جائے۔فوراً حکم کی تعمیل کی گئی اور زخم کو جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تیر مقتول کے عین دل میں پیوست تھا یہ دیکھ کر بادشاہ باغ باغ ہوگیا اور کہا دیکھا میرے بارے میں ایرانیوں کے خیالات درست نہیں ہیں اور میں اپنے پورے ہوش وحواس میں ہوں۔اس پہ وزیر جس کے بیٹے کی لاش زمین پر پڑی تھی فوراً کہہ اٹھا کہ ایسا بے خطا نشانہ صرف جہاں پناہ کا ہی ہوسکتا ہے۔''[*24]

□□□□□□□

ایرانیوں کے ایک دشمن امیانوس نے جو رومی افواج کا سربراہ تھا کہا کہ ایرانی قول کے پکے ہیں اور عہد سے کسی صورت پہلو تہی نہیں کرتے۔وہ اعظم شاہ پور کے مقابل رومی افواج کو لڑا رہا تھا ایرانی اخلاق اور عادات کے حوالے سے اعلیٰ تھے۔بیان کیا جاتا ہے تمام تر اخلاقی قباحتوں کے باوجود ایران میں قحبہ گری کا عام رواج نہ تھا اور پورے ایران میں کہیں بھی کوئی قحبہ خانہ نہ تھا۔حکمران عادل منصف تھے۔بادشاہ کے بعد موبدِ

موبداں کا احترام کیا جاتا جو مذہبی رسوم کے ساتھ ساتھ فال گیری بھی کرتے اور طلسم و نیرنگ سے بھی کام لیتے۔ چنانچہ جب شاہ ہرمزا چانک انتقال کر گیا تو موبداں نے اس کے بڑے بیٹے کو تختِ ایران کے لیے ناموزوں قرار دے دیا۔ اتفاق سے بادشاہ کی ایک کنیز امید سے تھی موبدِ موبداں نے پورے اعتماد سے شاہی تاج اس کنیز کے پیٹ پر رکھ دیا اور عبوری طور پہ رسم تاج پوشی ادا کر دی گئی۔ چند مہینوں کے بعد اس کنیز نے شاہ پور اعظم کو جنم دیا جو ایران کا نامور بادشاہ ہوا اور اس نے ہر مقام پر رومی افواج کو شکست سے دوچار کیا۔ اسی طرح موبداں نے ایرانی شاہ کو ایک طلسمی جھنڈا عطا کیا اور دعویٰ کیا کہ اس کی موجودگی میں شاہ کی افواج ہمیشہ فاتح رہیں گی۔ اس جھنڈے کا نام درفش کاویانی تھا جس پر سونے کے پانی سے طلسمی الفاظ لکھے گئے تھے چنانچہ ایک عرصہ تک درفش کاویانی کی وجہ سے ایرانی افواج فاتح رہیں۔ آخر کار جنگِ قادسیہ میں درفش کاویانی عربوں کے ہاتھوں سرنگوں ہوا اور نہ صرف موبداں کا طلسم دم توڑ گیا بلکہ خود موبدِ بداں کا ذکر بھی داستانوں تک محدود ہو کے رہ گیا۔ اہل ایران کے قدیم تمدن میں بہت سے تہواروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایرانی میلوں ٹھیلوں کے بے حد شوقین تھے۔ نوروز اور مہرگان ان کے خصوصی تہوار تھے جو بہار اور خزاں کی آمد پر منائے جاتے تھے نوروز کو خاص جوش وخروش سے مناتے تھے جو آج بھی کئی قدیم قبائل میں قائم ہے اور آج تک عید نوروز اکیس مارچ سے چار اپریل تک بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے جس کے دوران سارا کاروبارِ زندگی معطل ہو جاتا ہے۔ قدیم ایرانی یہ ہفتے عیش و عشرت میں گذارتے تھے وہ چمنستانوں میں جا کر سیر و تفریح کرتے پیتے پلاتے گاتے بجاتے اور ناچ کی محفلیں بپا کرتے۔ ان ایام میں ہفتِ سین کا دسترخوان بچھایا جاتا اور یہ دسترخوان سات ایسی چیزوں پر مشتمل ہوتا جو حرف "س" سے شروع ہوتی ہوں جیسے کہ سیب، سرکہ اور سیر وغیرہ۔

اہل ایران نوروز دیدنی کا بھی اہتمام کرتے اور اس دن اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کے لیے جاتے۔ ان کے لیے تحائف لے جاتے وزراء اور دربارِ شاہی کو بھی تحائف دیئے جاتے جو عام طور پہ دوگنا کر کے لوٹا دیئے جاتے۔ مہرگاں کا تہوار خزاں کی آمد پہ منایا جاتا اور یہ تہوار متھرا دیوتا سے یادگار تھا۔ ایرانی معاشرہ توہم پرستی کی طرف بھی مائل تھا اس لیے وہ تیرہ کے ہندسے کو منحوس خیال کرتے آج بھی اگر وہ گنتی کر رہے ہوں تو تیرہ کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ تیرہ فروری کو نحس خیال کیا کرتے اور پورا دن گھروں سے باہر گزارتے۔ الغرض ایران کے قدیم تمدن نے دنیا خاص طور پہ مشرق وسطیٰ پر بے پناہ اثرات

چھوڑے ہیں اور مسلمانوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ بنو عباس کے عہدِ تمدن کو عربی تمدن کا دورِ زریں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس تمدن کی تشکیل میں عربوں کا حصہ برائے نام تھا اور یہ ایرانی تمدن ہی کی ایک فرع تھی۔ بنو عباس نے انتظام مملکت مالگذاری کے طریقے اور ڈاک کی ترسیل وغیرہ ساسانیوں ہی سے اخذ کئے تھے اور اس عہد کے اکثر علماء، فقہا، فلاسفہ، سائنس دان اور ادباء عجمی نژاد ہیں جیسا کہ ابن المقفع جس نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کیا تھا۔ مشہور موسیقار ابراہیم موصلی، اسحٰق موصلی، سیاط اور زریاب وغیرہ ایرانی ہی تھے۔ ان کے علاوہ بھی سرزمین ایران کے بہت سے نامور سپوتوں کو تاریخ کے صفحات میں جگہ ملی ہے جن میں عربی عروض کا موجد خلیل ابن احمد، علم نحو کا ماہر سبایہ نحوی، اولین سیرت نگار ابن اسحٰق، معروف فقیہہ نعمان بن ثابت (امام ابوحنیفہ کے نام سے مشہور ہیں)، جامع مولقات کے مولف حماد بن صابور، الکسائی نحوی، معروف شاعر ابو نواس، بشار ابن برد، فلاسفہ میں بوعلی سینا البیرونی، اخوان الصفاء، مشہور محقق علامہ طوسی، متکلمین میں سے امام غزالی، امام رازی، اہل تصوف میں صوفی شاعر اور شیخ عطاء رومی، سنائی، حلاج، شہاب الدین سہروردی، مورخین میں سے علامہ جعفر محمد بن جریر ابن طبری، علامہ دینوری، علامہ بلاذری، اور المسعودی شامل ہیں۔ محدثین میں سے امام محمد بن عبداللہ بخاری، اور امام مسلم شامل ہیں۔ یہ سب ایرانی الانسل ہیں جنہوں نے ہر میدان میں اہل عجم کی علمی صلاحیتوں سے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈالے رکھا۔ چنانچہ عباسیوں کے زوال اور سقوطِ بغداد کے بعد یہی تمدن مغلوں اور ترکوں کے توسط سے مصر تر کی عراق شام خراسان ماوراء النہر افغانستان اور ہندوستان تک پھیل گیا۔ سلجوقی اور عثمانی سلاطین نے ایشیائے کوچک میں اس کی آبیاری کی۔ محمود غزنوی اور ظہیرالدین بابر اسے ہندوستان میں لائے۔ چنانچہ ہندوستان، پاکستان ترکی، عراق، افغانستان کی موسیقی، شاعری، فن تعمیر، فلسفے، تصوف، معاشرت، آدابِ محفل لباس کی وضع قطع اور چمن بندی پر ایرانی تمدن کے گہرے اثرات آج بھی باقی ہیں جن کا احساس اپنے اندر مشرقیت کا عکس لیے ہوئے ہے[25*]۔

ساسانی سلطنت کا خاتمہ

نبی کریم محمد ﷺ چونکہ سلسلہ انبیاء کے آخری نبی تھے اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی دعوت کو حدود و قیود اور زمان و مکاں کی قید سے آزاد رکھا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا اور قیامت تک جو شخص رسول اللہ پہ ایمان لے آئے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن پاک میں نبی پاک ﷺ کی عالمگیر نبوت کی گواہی اس طرح پیش کی گئی ہے کہ فرمایا گیا کہ:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيراً وَنَذِيراً وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ O

القران الحکیم (سورۃ سبا ۳۴ ۔آیات ۲۸)

ترجمہ؛

”ہم نے تجھے تمام انسانوں کے لیے بشارت پہنچانے والا اور ڈر سنانے والا رسول بنا کر دنیا میں بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے“۔

مزید ارشاد ہوا:

هُوَ الَّذِىْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ۔

القران الحکیم (سورۃ فتح ۴۸ ۔ آیات ۲۸)

ترجمہ:

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو روشن دلائل اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ اسے سب دینوں پہ غالب کردے۔

❑❑❑❑❑❑❑

مزید ارشاد ہوا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ○

القران الحکیم (سورۃ الانبیاء ۲۱ ۔ آیات ۱۰۷)

ترجمہ:

اور ہم نے تجھے (ﷺ) کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

❑❑❑❑❑❑❑

مزید ارشاد ہوا:

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ○

القران الحکیم (سورۃ الاعراف ۲۱ ۔ آیات ۱۵۸)

ترجمہ:

اِن سے کہہ دو کہ اے نسلِ انسانی کے بچو میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں۔

❑❑❑❑❑❑❑

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نبوت کے ان ابتدائی ایام میں جب ابھی اہل مکہ بھی پوری طرح آپ ﷺ کے پیام

اور دعوت سے آشنا نہ ہوئے تھے اس وقت بھی نبی کریم ﷺ نے دیگر اقوام اور ادیان کے لوگوں میں دین اسلام کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ، حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ اور عداس نینوائی رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ ابتدا میں ہی اسلام کی اس عالمگیر برادری کے ارکان بنے جن کا تعلق حبش، یونان، ایران اور وسطِ ایشیا سے تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی مکرم ﷺ کو دشمن (قریش) سے ذرا فرصت ملی تو آپ ﷺ نے اطرافِ مدینہ کے اہم حکمرانوں کو بھی دعوتِ دین سے مشرف فرمایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے شاہ حبشہ، قیصر روم، کسریٰ ایران، والیٔ نجد ثمامہ بن اثال ، والیٔ غسان حبلہ، والیٔ شام فروہ بن عمرو خزاعی، والیٔ دومتہ الجندل اکیدر، والیٔ یمن ذی الکلاع حمیری کی طرف دین کی دعوت کے سلسلے میں وفود اور خطوط روانہ کیے۔ یہاں ہم صرف اس خط کا ذکر کریں گے جو نبی پاک ﷺ کی طرف سے عبداللہ بن خدامہؓ کسریٰ پرویز شاہ ایران کی طرف لے کر گئے تھے۔ خسرو پرویز نصف مشرقی دنیا کا شہنشاہ تھا اور زرتشتی مذہب کا پیرو تھا۔ جیسا کہ ایران کے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ خسرو پرویز پرلے درجے کا بدکردار اور عیاش آدمی تھا اس لیے اللہ نے اس کے دل کو ہدایت قبول کرنے کی توفیق عطا نہ فرمائی اور اس بدبخت نے نبی کریم ﷺ کا نامہ مبارک غصے میں آ کر چاک کر دیا۔

نامہ مبارک کا متن پیش خدمت ہے۔

> ”اللہ رحمان و رحیم کے نام سے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کسریٰ بزرگِ فارس کے نام
> سلام اس پہ جو سیدھی راہ پہ چلتا ہے اور خدا اور اس کے رسول محمد ﷺ پہ ایمان لاتا ہے اور اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں (محمد ﷺ) تجھے خدا کے پیغام کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ میں خدا کا سچا رسول ہوں اور مجھے جملہ نسلِ آدم کی طرف مبعوث کیا گیا ہے تا کہ جو کوئی زندہ ہے اُسے عذابِ الٰہی کا ڈر سنا دیا جائے اور جو انکار کرے اس پہ حجت تمام ہو تو مسلمان ہو جا سلامت رہے گا ورنہ سب اہل مجوس کا گناہ تجھ پہ پڑے گا“

❑❑❑❑❑❑❑

خط سننے کے بعد خسرو پرویز نے رعونت سے اپنے درباریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ میری رعایا کا ایک ادنیٰ

شخص مجھے خط لکھتا ہے اور مجھ سے پہلے اپنا نام لکھتا ہے۔ اس کو فوراً گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس نے یمن کے گورنر باذان کے پاس اپنا فرمان فوجی دستے کے ساتھ بھیجا کہ اہل عرب میں سے اس شخص کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کیا جائے۔ گورنر یمن باذان نے اس دستے کے ساتھ اپنا ایک فوجی دستہ بھی شامل کر دیا جس کا سربراہ بانو یہ نامی شخص تھا۔ باذان نے بانو یہ کو ہدایت کی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے حالات پہ کڑی نظر رکھے اور واپسی پر اسے پوری تفصیلات سے آگاہ کرے۔ اگر آپ ﷺ تمہارے ساتھ کسریٰ کے دربار میں جانے سے انکار کریں تو تم نے سختی نہیں کرنی پھر میں خود معاملات کو دیکھ کر فیصلہ کرونگا۔

ادھر نبی مکرم ﷺ کا قاصد آپ ﷺ کے پاس واپس پہنچا اور خط پھاڑنے کا سارا ماجرہ بیان کیا تو اس پہ نبی ﷺ نے ایک مختصر مگر پر ہیبت جملہ ارشاد فرمایا! (مزّق مُلکہ)۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنی قوم کے فرمانِ سلطنت کو چاک کر دیا ہے۔ چنانچہ زبانِ مبارک سے نکلے ان لفظوں کو حقیقت بننے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور تاریخ کے صفحات سے شاہ کسریٰ کی وہ زردشت ریاست کسی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اس عظیم الشان سلطنت کا کوئی نشان تک باقی نہ رہا جس نے اس زمانے میں بارہا یونان اور رومہ جیسی متمدن اور مضبوط ریاستوں کو ریگدا تھا۔

دوسری طرف شاہ کسریٰ کا فوجی قافلہ جب ایک شان سے حدودِ عرب میں داخل ہوا تو اہل طائف نے اس بات پہ خوشیاں منائیں کہ اب مسلمانوں کی شامت آگئی ہے اور شاہ کسریٰ نے ان کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چنانچہ باذان کا یہ فوجی دستہ مدینہ پہنچا اور اس کو نبی مکرم ﷺ کے دربار میں پیش کر دیا گیا۔ آپ ﷺ نے ان کو فرمایا کہ آج وہ آرام کریں اور کل پھر حاضر ہوں۔ دربارِ نبوی کی مخصوص فضاء میں جو سادگی اور وارفتگی تھی وہ باذان کے وفد کو بے چین کرتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک لفظ کہے بغیر اٹھ کر چلے گئے دوسرے دن ان کو پھر دربارِ رسالت میں پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ پہلے تو ان میں سے کسی کو بولنے کی جرات ہی نہ ہوئی پھر باذان کے مقرر کردہ دستے کے سربراہ بانو یہ نے مختصر لفظوں میں اپنا موقف بیان کیا کہ وہ آپ ﷺ کو دربارِ کسریٰ میں پیش کرنے پر معمور ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ نے توجہ سے ان کی بات سنی ذرا سا مسکرائے اور اپنا رخِ زیبا بانو یہ کی طرف پھیرا اور فرمایا: کہ تمہارا کسریٰ جس کے سامنے تم مجھے پیش کرنا چاہتے ہو اس کو تو گذشتہ شب میرے اللہ نے اس کے بیٹے شیرو یہ کے ہاتھوں قتل کرا دیا ہے۔ کسریٰ کے وفد کو اس عجیب وغریب جواب کی قطعاً توقع نہ تھی۔ اس پہ بانو یہ نے کہا کہ اگر یہ بات سچ ہوئی تو دوسروں کی بابت تو

میں نہیں جانتا لیکن میں خود اسی لمحے آپ پہ ایمان لے آؤں گا۔ چنانچہ کسریٰ کا یہ دستہ فوراً ہی وہاں سے اٹھا اور تیزی سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ یمن پہنچے تو فوراً ہی خسرو پرویز کے قتل کی تصدیق ہو گئی۔ بانو یہ فوراً اپنے حکمران باذان کے پاس پہنچا اور اس کے سامنے دربارِ رسالت کا اتنا دلکش نقشہ پیش کیا کہ نا صرف باذان بلکہ یمن کی تقریباً پوری ریاست نے اسلام قبول کر لیا۔

پھر جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زمانہ خلافت آیا تو ایرانیوں نے مسلمانوں کی سرحدوں پہ دباؤ بڑھا دیا اور ان سے جنگ کا عندیہ دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ ریاست کے اندرونی خلفشاروں سے نمٹنے میں مصروف تھے جن میں ارتداد اور جھوٹے نبیوں کے فتنے ان کی ترجیح تھے۔ تاہم وہ ایران کی طرف سے غفلت میں نہ تھے۔ اہل ایران کو اپنی عددی برتری پر بہت ناز تھا جس کی وجہ سے وہ عرب میں قائم اس اسلامی ریاست کو قابل برداشت تصور نہ کرتے تھے۔ چونکہ یہاں ان معرکوں کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں ہے جن سے گذر کے دین اسلام کے شیدائیوں نے زردشت کی ریاست کو ایک اسلامی ریاست میں بدل دیا اس لیے ہم اختصار کی راہ اپنائیں گے۔

اسلام اور آگ کے پجاریوں کے درمیان پہلا بڑا معرکہ ابلہ کے مقام پر پیش آیا مسلمان افواج کے سربراہ حضرت خالد بن ولیدؓ سیف اللہ تھے جنہوں نے مشہور ایرانی جرنیل ہرمز کو شکست دی۔ ہرمز کو حضرت خالد بن ولیدؓ نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا اس جنگ کو ذات السلاسل بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے امت کی خلافت کا بوجھ اٹھایا تو وہ جانتے تھے کہ ایرانی اب پوری تیاری کے ساتھ مسلمانوں پہ حملہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے انھوں نے بھی خوب تیاری کی اور ہر طرف سے مسلمان افواج کو کمک ارسال کی۔ چنانچہ تاریخ کی مشہور جنگ قادسیہ کے میدان میں لڑی گئی جس میں شاہ ایران یزدگرد نے ایران کے سب سے بہادر سپہ سالار رستم کو ایرانی فوجوں کی سربراہی عطا کی۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ اعزاز حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے حصے میں آیا تھا۔ بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی جو کئی دن جاری رہی آخر ایرانی لشکر رستم سمیت بیس ہزار لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد بھی اگرچہ ایرانیوں اور مسلم افواج کے درمیان معرکہ بپا رہا مگر اصل فیصلہ قادسیہ والے دن ہی ہو چکا تھا۔ اور اب رفتہ رفتہ ایران کے سب بڑے صوبے اسلامی افواج کا سامنا کر رہے تھے اور ایک ایک کر کے گر رہے تھے۔ جنگِ قادسیہ کے بعد مسلم افواج نے مدائن پہ قبضہ کر لیا جو اِن کا پایہ تخت تھا۔ مدائن کی شکست کے بعد آگ پرست آگے آگے بھاگ

رہے تھے اور مسلمان افواج ان کے تعاقب میں تھیں ۔ چنانچہ پھر جلولا ، حلوان، جذیرہ، عراق، تکریت ، خوزستان، نہاوند، اصفہان، ہمدان، رے آذربائیجان، آرمینیہ، فارس، کرمان، سیستان اور مکران یکے بعد دیگرے سرنگوں ہوتے رہے اور آتش پرستوں پہ عرصہ حیات تنگ ہوتا رہا۔ یزدگرد اب اپنے لشکروں سے مایوس خراسان میں مقیم تھا جہاں اس کی مقدس آگ ابھی تک جل رہی تھی۔ مگر بالآخر نبی پاک ﷺ کے ایک اور شیدائی حضرت احنف بن قیسؓ نے اس کو بھی بجھا دیا اور وہ ایرانی سلطنت جو صدیوں نصف دنیا پہ حکومت کرتی رہی تھی صفحہ ہستی سے نابود ہوئی کہ اب جب کہ نور کی یلغار تھی تو کسی آتش کدے کی روشنی کی دنیا کو کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ ایرانی تمدن جو صدیوں تک کھوکھلے اوہام کی بنیادوں پہ کھڑا تھا اب اس کو مقصد زندگی بھی مل گیا تھا اور دستورِ حیات بھی۔ لوگوں نے دین اسلام کو قبول کرنے میں سبقت کی اور دیکھتے ہی دیکھتے آتش کدوں کے پجاری اپنے ہاتھ سے اس آگ پر پانی ڈال رہے تھے کہ بقول قرآن اب حق آ گیا تھا اور باطل مٹ گیا تھا کہ بے شک باطل مٹنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔

چنانچہ ایران ہو یا روم اسلام کی روشنی پھیلنے کے بعد اپنی اساس سے اکھڑ گیا اور دنیا جان گئی کہ اب ان کے مقدر کے اندھیرے چنے جا چکے ہیں اور مکروہ رسم ورواج کے اس جال سے انسان کو نجات مل جائے گی جس میں انسانیت سسکتی تھی، جو شرف انسانی پہ کسی بدنما داغ سے کم نہ تھا، صدیوں کی سسکتی آرزوؤں کے پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا کہ اب انسانیت اس روشنی سے منور ہو رہی تھی جو ان کے خالق نے ان کے لیے اتاری تھی کہ اس روشنی میں منزل صرف چند گام ہی رہ جاتی ہے [26*]۔

سلطنت رومہ

روم کی سلطنت محل وقوع کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل تھی۔ بلند و بالا پہاڑی سلسلوں کے درمیان گھری سلطنت رومہ کا شمار چھٹی صدی عیسوی کی بڑی طاقتوں میں ہوتا تھا۔ وہ ایران کے بعد خطہ ارض پہ طاقت ورترین ریاست تھی جس پہ قیصر حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ ایران کی زرتشت اور روم کی مسیحی ریاست کے درمیان میدانِ کارزار گرم رہتا۔ عیسائیت چوتھی صدی عیسوی سے سلطنت رومہ کا آئینی مذہب چلا آرہا تھا۔ روم کی سرزمین ایسی تھی جہاں حملہ آوروں کو شدید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اس لیے کہ رومیوں کو بہت سی قدرتی قلعہ بندیاں دستیاب تھیں جن کی وجہ سے وہ بڑی سے بڑی حملہ آور طاقت سے بھی خود کا دفاع کرنے میں کامیاب رہتے تھے۔ ان کے سامنے سمندر تھا جس نے جزیرہ نما اٹلی کو ایک قوس کی صورت گھیرا ہوا تھا تو پشت پہ بلند و بالا پہاڑی سلسلے تھے جو فطری طور پہ ان کی پشت کو دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ روم اٹلی کے تقریباً وسط میں واقع تھا اور اس کا جھکاؤ مغربی ساحل کی طرف تھا روم میں قدیم زمانوں کے لوگ کھیتی باڑی سے واقف تھے اور دستیاب میدانوں میں فصلیں اُگا کر اپنی خوراک کی ضرورتیں پوری کیا

کرتے۔سمندری مخلوقات بھی ان کی خوراک کا کام دیتی تھیں۔وسیع پہاڑی سلسلوں اور طویل رتیلے ساحلوں کی وجہ سے اہل روم کو کاشت کاری کے لیے زمین کے بہت وسیع خطے تو دستیاب نہ تھے مگر پھر بھی یونان کے مقابلے میں ان کا رقبہ بہت زیادہ تھا اور زمین بھی بہت زرخیز تھی۔جزیرہ نما اٹلی نے ۵۰۹ ق م میں آزادی کی نعمت حاصل کی اور اہل رومہ نے آخری بیرونی حملہ آور (Tarqeon) جس نے ان کے ملک پہ ناجائز تصرف کیا ہوا تھا کو نکال باہر کیا۔

ابتدا میں لاطینی کمزور تھے اس لیے ان کی ریاست پہ عام طور پہ کوئی طاقت ور ہمسایہ ہی قابض رہتا۔تاہم لاطینی قبائل ان بیرونی حملہ آوروں سے سخت نفرت کرتے اور دور کہیں ان کے دل میں یہ خیال مچلتا رہتا کہ ایک دن وہ ان بیرونی حکمرانوں کے تسلط سے نجات حاصل کرلیں گے۔چنانچہ وہ اس موقع کی تلاش میں رہے اور اندر ہی اندر لاطینی قبائل کی طاقت کو مجتمع کرنے کا عمل بھی سست رفتاری سے جاری رہا۔پھر مغرور بادشاہ "شاہ ٹارکیون" کے دور میں بالآخر نفرت کا یہ لاوا پھٹ پڑا اور لاطینی قبائل نے ایک بھرپور بغاوت کا آغاز کیا اور بیرونی حکمرانوں کے جبر سے خود کو نجات دلادی اور آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوئے۔

سیاسی حالات

ابتداء میں رومی حکومت کا ڈھانچہ نیم جمہوری تھا اور امراء کا قلیل طبقہ ہی ایوانِ حکومت میں براجمان تھا یہی طبقہ تمام سرکاری اور قلیدی عہدوں پہ مسلط تھا اور اختیارات کو انہوں نے اپنی ذات میں مجتمع کر رکھا تھا۔ وہ ریاست کے تمام وسائل کو بے دردی سے اپنی ذاتی منفعت کے لیے استعمال کرتے جس کی وجہ سے عوام میں ایک ردعمل اور انتشار سا تھا جو ان کی بے چینی کو بڑھاوا دے رہا تھا تاہم روم کے حکمرانوں نے اس عوامی بے چینی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ساری توجہ ملک کی فوجی طاقت کو بڑھانے اور اس کے نظم و نسق کی بہتری کی طرف مبذول رکھی اور اس کے لیے سخت قوائد وضوابط وضع کیے جن کی پابندی روم کے ہر شہری کے لیے لازم تھی۔ روم کے ہر شہری پہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ لازمی فوجی تربیت حاصل کرے اور خود کو ملکی دفاع کے لیے ہر لحہ تیار رکھے۔ چنانچہ روم کے جمہوری حکمرانوں نے فوج کو وہ فولادی نظم و نسق عطا کیا جس نے ملکی دفاع کو ناقابل تسخیر بنا کے رکھ دیا اس لیے جو بھی رومی شہری ملکی دفاع یا اس سے متعلق کسی اور کوتاہی کا مرتکب پایا جاتا اس کو نہایت سخت اور غیر انسانی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مورخین نے ان غیر انسانی سزاؤں کا ذکر کیا ہے مثال کے طور پہ اگر رات کو پہرے پہ موجود کسی اہلکار کی نیند کے غلبے کی وجہ سے ذرا آنکھ لگ جائے تو جرم ثابت ہونے پر اس کو فوجی عدالت کی طرف سے سزائے موت دی جاتی۔ سزائے موت کا طریقہ بجائے خود اپنے اندر عبرت کا سامان لیے ہوتا اس لیے کہ مجرم کو شہر کے کسی بارونق چوک میں باندھ دیا جاتا اور اس پہ بھوکے کتے یا بھوکے شیروں کو چھوڑ دیا جاتا جو اسے زندہ ہی نگلتے رہتے۔ شہر بھر کے تماشائی اس منظر عبرت کو پورے ذوق وشوق کے ساتھ دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے۔ بعض اوقات کسی مجرم کو سنگسار کرنے کی سزا بھی

دی جاتی تاہم اس سلسلے کی سب سے نرم سزا یہ تھی کہ مجرم کو بیچ صحرا میں چھوڑ دیا جاتا جہاں درندے اس کو پھاڑ کھاتے یا وہ خود ہی صحرا کی سختی سے جاں بحق ہو جاتا۔ تاہم اگر کوئی سخت جان ان ابتلاؤں سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتا تو بھی اب معاشرہ اسے قبول نہ کرتا اور اس کے بیوی بچے اور دوسرے رشتے دار اس کو گھر میں نہ گھسنے دیتے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کے معاشرے میں فوجی مجرم کو پناہ دینا کتنا بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔

رومی فوج اپنے اہلکاروں پہ صرف سختی ہی نہ کیا کرتے بلکہ ان کے ہاں کسی کی انفرادی یا فوج کی اجتماعی کارکردگی پہ فراغ دلانہ انعام و کرام کا تصور بھی موجود تھا۔ جو نہ صرف فوج کے نظم کی اہمیت کو بڑھا دیتا بلکہ فوج کے نفسیاتی مورال کو بھی بلند رکھتا اور یہ اسی شاندار نظم کا ثمر تھا کہ یہ چھوٹی سی جمہوری ریاست ترقی کرتے کرتے ایک دن اس مقام پہ پہنچی کہ برطانیہ سے مصر تک اور ماریطانیہ سے آرمینیا تک رومیوں کی سلطانی کا پرچم لہرانے لگا اور اس وسیع و عریض مملکت کے باشندے اس بات پہ فخر کرتے کہ وہ رومی شہری ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں جب نبی اکرم ﷺ نے مکہ میں اپنی نبوت کا اعلان کیا تو مملکت روم کا شمار دنیا کی شاندار اور طاقتور ریاست کے طور کیا جاتا تھا۔

روم پہ اس وقت ہرقل نامی قیصر حکومت کرتا تھا جب آپ ﷺ کا نامہ مبارک اس تک پہنچا تو وہ اپنی علمی استعداد کی بنا پر آپ کی حقانیت کو جان گیا تھا اور اس نے کوشش بھی کی کہ اس کی ریاست کے ائمائدین اگر ساتھ دیں تو وہ دین اسلام کو اختیار کرلیں۔ تاریخ میں اس مشہور واقعے کا ذکر موجود ہے جب ہرقل نے اپنے تمام پادریوں اور دوسرے بااثر افراد کو بلایا اور محل کے دروازے بند کرا دیئے پھر ان کے سامنے نبی اکرم ﷺ کا پیام رکھا۔ جب عیسائی پادریوں نے ہرقل کا جھکاؤ اس نئے دین کی طرف دیکھا تو وہ پہلے تو باہر کی طرف بھاگے مگر دروازوں کو بند پا کر واپس آئے اور ہرقل پر برس پڑے۔ انھوں نے دین اسلام کی شدید مخالفت کا عندیہ دیا اور بھرے دربار میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے ہرقل کی تائید کی ہو۔ چنانچہ ہرقل نے اس شدید مخالفت کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور بات بنائی کہ اس نے تو یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا تا کہ اپنے دین کے ساتھ ان لوگوں کی پختگی کا امتحان لے سکے اور اب وہ مطمئن ہے اس پہ ہرقل کے درباری ٹھنڈے ہو گئے۔ اور ہرقل نے ابدی فلاح کی جگہ تاج و تخت کو چن لیا۔ ہم بات کر رہے تھے قدیم رومیوں کے اس نظام مملکت کی جس نے انھیں بام عروج تک پہنچایا۔ قبل مسیح کے اس نیم جمہوری ڈھانچے نے اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا اور لوگوں کے اندر یہ شعور زندہ ہو گیا کہ ان کو اپنے بنیادی حقوق کی بات بھی کرنی چاہیے چنانچہ روم کے

حکمران طبقے پر جب ایک حد سے زیادہ دباؤ پڑا تو انہوں نے عوامی مطالبات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور نظام حکومت میں ترامیم کی منظوری دے دی۔ عوام کا مطالبہ تھا کہ ان کے استحصال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملک میں کوئی تحریری آئین موجود نہیں اس لیے ان کے حقوق غیر محفوظ ہیں اس لیے سب سے پہلے تو اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ ملک کا تحریری آئین وضع ہوتا کہ ہر شہری جان لے کہ اس پہ ریاست کی کونسی ذمہ داریاں ہیں۔ اور اس کے ریاست کی طرف کون سے حقوق ہیں اس طرح بات واضح ہو جائے گی اور لوگ زیادہ اطمینان محسوس کریں گے۔ چنانچہ بڑھتے ہوئے اس عوامی مطالبے کے پیش نظر (۴۴۹ ق م) میں رومی حکمرانوں کو ایک کمیشن مقرر کرنا پڑا جو عوامی مطالبات کی روشنی میں ملک کا نیا اور تحریری آئین وضع کرے۔ رومی آئین کو تحریری طور پہ مرتب کر لیا گیا جس پہ جلی حروف میں عام شہریوں کے حقوق کو کندا کیا گیا۔ تاریخ میں اس آئین کو "رومیوں کی بارہ تختیاں" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لکڑی کی یہ تختیاں دارالسلطنت کے مرکزی چوک میں نسب کی گئیں جہاں جا کر ہر شہری اپنے حقوق و فرائض سے آگاہی حاصل کر سکتا تھا۔ طویل عرصہ تک رومی مملکت نے اپنے اس عروج کو برقرار رکھا مگر پھر اپنی وسعت کی وجہ سے اس کا معیار گرنا شروع ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ریاست کے بنیادی ڈھانچے میں کمزوری آتی گئی اور ہر طرف طرح طرح کی انتظامی اور عمرانی خرابیاں سر اٹھانے لگیں۔ امن و امان کی صورت بگڑتی چلی گئی اور مختلف علاقوں کے طاقتور فوجی حکمرانوں نے مرکز سے اختیارات اپنی جانب منتقل کرنے شروع کر دیئے جو سالار کسی علاقے کو فتح کرتا وہ بیشمار اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لیتا اور ہر قسم کی من مانی شروع کر دیتا۔ ظاہری طور پہ اگرچہ مملکت رومہ قائم تھی اور اس کے تمام ادارے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے مگر رفتہ رفتہ یہ سارا نظام بے اثر ہوتا چلا گیا اور ان میں یہ قوت نہ رہی کہ وہ اجتماعی طور پہ بیرونی حملہ آوروں کے سامنے بند باندھ سکیں چنانچہ بالآخر سلطنت رومہ کے حالات اس مقام پہ پہنچ گئے جہاں جمہوری اداروں کی کمزوری کے خلا کو پر کرنے لیے انھیں آمرانہ نظام حکومت قائم کرنا پڑ گیا۔

چنانچہ ایک رومی سپہ سالار ماریس نے صدیوں کی رومی جمہوریت کو متعلق العنانی کی راہ پہ ڈال دیا۔ ماریس ایک اچھا فوجی جرنیل تھا جس نے شمالی افریقہ کے بہت سے علاقوں کو رومی قلمرو میں شامل کیا تھا۔ بظاہر وہ ایک منتخب نمائندہ تھا جس کو ۱۰۸ق م میں کونسل کا رکن چنا گیا مگر اس کے آمرانہ ذہن نے ملک کے نظام مملکت کو متاثر کیا اور رومی جمہوریت کی راہ کھونے لگے۔ ماریس کی وفات کے بعد ایک اور آمر سُلا نے اقتدار

پر قبضہ کرلیا اور ملک کا ڈکٹیٹر بن بیٹھا۔اس زمانے میں اگر چہ رومی سینٹ کا ادارہ موجود تھا جس نے سُلا کو چھ ماہ تک حکومت کرنے کی اجازت دے دی مگر سُلا ایک فوجی آمر تھا اس لیے فوج کی پشت پناہی کے بل بوتے پر وہ برسوں اہل روم پہ حکومت کرتا رہا۔تاہم تاریخ کے صفات میں شہرت کے حامل ایک اور فوجی ڈکٹیٹر جولیس سیزر نے اس سے حکومت چھین لی۔انتشار کے اس دور میں جولیس سیزر کو رومی سالاروں میں اہم مقام حاصل تھا۔اس نے ۵۰ ق م قبل مسیح میں خوب فتوحات حاصل کیں اور بہت زیادہ فوجی شہرت حاصل کر لی۔اس نے اپنی فتوحات اور کارناموں کو خوب پھیلایا اور پوری سلطنت رومہ پر حکمرانی کا خواب دیکھنے لگا۔جولیس سیزر اگر چہ قابل سپہ سالار تھا مگر وہ پرلے درجے کا حریص اور خوشامند پرست بھی مشہور تھا۔اس نے مرکزی سینٹ کے تمام احکامات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی تربیت یافتہ افواج کو لے کر نئی فتوحات کے راستے کو چل نکلا۔اس نے یونان اور مقدونیہ کی ریاستوں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنا رخ مصر کی طرف کیا جہاں کا بادشاہ پومپی قتل ہو چکا تھا اور اس کی نوجوان اور خوبصورت ملکہ جولیس سیزر کی مخالفت کرنے کے قابل نہ تھی۔

چنانچہ اس نے اپنی سلطنت کو برقرار رکھنے کے لیے جولیس سیزر سے مدد کی درخواست کردی جسے جولیس سیزر نے اس لیے منظور کرلیا کہ وہ اس کے حسن سے متاثر ہو گیا تھا۔ملکہ مصر کلوپیٹرہ اور جولیس سیزر اکھٹے ہی حکومت کرنے لگے۔جولیس سیزر کئی سال تک ملکہ کلوپیٹرہ کی زلف کا اسیر رہا وہ عملی طور پہ ایک جمود کا شکار تھا اور اس کی فواج میں بے دلی پھیل رہی تھی۔اس دوران کلوپیٹرہ اور جولیس سیزر کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔پھر بادل نخواستہ اس نے مصر سے اپنی فوجوں کو نکالا اور روم کے مرکزی اہمیت کے حامل علاقوں کا کنٹرول سنبھالنے کی طرف پیش قدمی کی جس میں بالآخر وہ کامیاب رہا اور اہل رومہ کے لیے متعلق العنانی کے ایک اور دور کا آغاز ہوا۔سیزر کی حکمرانی میں یونانی استبداد اور مشرقی متعلق العنانی کے خصائص جمع ہو گئے تھے۔ اس نے عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے بہت سے دوررس اقدامات کیے جس سے اسے عوامی ہمدردیاں بھی حاصل ہو گئیں۔لوگ جو ملک کی بدانتظامی اور ابتری سے تنگ آئے ہوئے تھے انھوں نے جولیس سیزر کی منظّم اور مرتب تبدیلیوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔اس نے فوری طور پر اٹلی کے بہت سے شہروں کو حق خود اختیاری عطا کردی اس طرح اس نے رومی شہریت کی توسیع کو مزید بامعنی بنا دیا۔اس نے صوبوں کو بھی وسیع اختیارات سے نوازا۔اس کے بعض اقدامات کو دانشمندانہ اور تعمیری قرار دیا جاسکتا ہے۔مثلاً اس نے غلط اور

قدیم تقویم کی جگہ ۳۶۵ دنوں کے نئے سال کا اجراء کیا جس میں ہر چوتھے سال ایک دن کا اضافہ کر دیا جاتا۔اس نے اس طرح کے مزید کئی اقدامات بھی کیۓ جن کی اس نے اشد ضرورت محسوس کی۔تاہم ان سب اصلاحات کے پردہ میں جولیس سیزر نے اپنی آمریت کو مستحکم کیا اس نے تمام جمہوری اداروں کو معطل کر دیا اور قونصل کے اختیارات بھی اپنی ذات میں مجتمع کر لیے۔اس نے مذہبی پیشواؤں کے اختیارات کو بھی سلب کر لیا جس نے معاشرے میں بے سکونی اور انتشار کو جنم دیا جسے اس نے طاقت کی زبان سے کچل دیا۔اس نے سینٹ کو مجبور کر دیا کہ اس کی تمام سفارشات کو بغیر کسی بحث و تمحیص کے منظور کر لیا جائے ساتھ ہی اس نے یہ اہتمام بھی کیا کہ لوگ سکندرِ اعظم اور بطلیموس کی طرح خود اس کی بھی پرستش کریں تاہم مذہبی اور سیاسی حلقوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور جولیس سیزر بدستور کمزور ہوتا رہا۔وہ مصر چلا آیا اور ملکہ مصر کلوپیٹرہ سے مدد طلب کی تاہم وہ پھر سے کلوپیٹرہ کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔کلوپیٹرہ کے عشق نے اسے کسی قابل نہ چھوڑا اور وہ سپہ سالاری کی صفات سے بھی محروم ہو گیا۔

چنانچہ اہل وطن کی نگاہوں میں اس کی جو قدر و منزلت تھی وہ بھی جاتی رہی۔اب وہ اہلِ رومہ کا جرنیل نہ تھا بلکہ محض ایک عاشق تھا جس کو سوائے عشق کے اور کوئی کام نہ تھا۔بعد میں جولیس سیزر کے دشمنوں نے اسے سینٹ کے ایک اجلاس میں قتل کرا دیا۔تاہم اقتدار جولیس سیزر کے ایک رشتہ دار اکیٹوین کو منتقل ہو گیا جس نے جولیس سیزر ہی کی آمرانہ روش پہ چلنا چاہا۔آکیٹوین نے مصر پہ حملہ کر کے اسے بھی رومی قلمرو میں شامل کر لیا۔کلوپیٹرہ کو اپنی ریاست کے چھن جانے کا اتنا صدمہ تھا کہ اس نے خودکشی کر لی۔آکیٹون بھی اپنی طرز کا منفرد آمر تھا۔اس کے پاس سلطنت رومہ کے کلی اختیارات تھے۔آکیٹون نے اپنے اختیارات کو اس حد تک بڑھا لیا کہ مملکت رومہ میں جمہوریت کا دم گھٹ کر رہ گیا۔اگرچہ ہر آمر کی طرح وہ خود کو جمہوریت کا بحال کنندہ خیال کرتا۔آکیٹون نمود و نمائش کا عادی تھا اس نے نہایت عیاری سے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ آمر متعلق نہیں بلکہ عوام کا خادم ہے۔وہ اپنے آپ کو شہنشاہ معظم یا سیزر کی طرح خود کو دیوتاؤں کا بیٹا کہلانے کی بجائے جمہوریت کا پہلا شہری کہلانا پسند کرتا۔تاہم کچھ عرصہ بعد ہی اس نے مذہبی حلقوں کی ملی بھگت سے خود کو آگسٹس (محترم و معظم) کہلانا شروع کر دیا۔وہ تاریخ میں اپنے نام کی بجائے اسی لقب سے زیادہ پہچانا جاتا ہے۔رفتہ رفتہ اس کی بھی دیوتاؤں کی طرز پہ پرستش شروع کر دی گئی اور رعایا کے مختلف گروہ اس کی پرستش کرنے لگے۔مشرق کے اور بہت سے ممالک میں بھی بادشاہوں کی پرستش کی جاتی تھی اور اسے

حب الوطنی کی علامت تصور کیا جاتا۔ اس کے بعد اہل رومہ میں شہنشائیت کے اس دور کا آغاز ہوا جسے اہل عرب نے ختم کیا۔ اسی عرصہ کے دوران ہی حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ آپ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں ہی یہودیوں نے آپ پر اور آپ کی والدہ ماجدہ پر نہایت گھٹیا قسم کے الزام لگائے اور مسیح علیہ السلام کی نبوت اور مخالفت میں اپنے تمام وسائل اور اثر ورسوخ استعمال کرتے رہے جس کی وجہ سے آپ علیہ السلام کی زندگی میں آپ پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت ہی کم رہی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے دین میں آپؑ کی زندگی میں صرف بارہ افراد داخل ہوئے جن کو حواری کہا جاتا ہے۔ مگر آپ کا لایا ہوا دین اپنی صداقت کے باعث آپؑ کے آسمان پر اٹھا لیے جانے کے بعد رفتہ رفتہ پوری رومی سلطنت کے اندر پھیل گیا اور پہلی صدی گزرنے کے بعد مسیحیت کا بیج سلطنت کے تمام حصوں میں بویا جا چکا تھا۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت روم کے کونے کونے میں پھیل چکی تھی۔ مجبوراً اس وقت کے شہنشاہ گیلیر یس نے ۳۱۱ء میں مذہبی رواداری کا فرمان جاری کیا۔ ۳۲۵ء میں مسیحیت کے مذہبی راہنماؤں کی ایک مجلس شہنشاہ نے اپنی سرپرستی میں نیقیہ کے مقام پر منعقد کی۔ قسطنطین کی موت کے وقت کلیسا اس درجے پر پہنچ چکا تھا کہ رومی سلطنت کا سرکاری مذہب بن سکے۔ چنانچہ قسطنطین نے بھی بپتسمہ لے لیا اور عیسائیت ساری رومی مملکت میں پھیل گئی۔

مذہب اور عقائد

نبی اکرم ﷺ کی دعوت سے قبل خطہ ارض پہ اہل روم ہی وہ قوم تھے جو کسی الہامی مذہب کے پیرو تھے تاریخ کے صفحات میں ان کے قدیم عقائد کی تفصیلات بھی مرکوز ہیں جو ان کی معاصر اقوام ہی کی طرح اوہام اور تخیلات پر مبنی تھیں۔ چنانچہ (Krean Britnen) نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب (History of Sivilization) میں لکھا ہے کہ ابتدائی دور کے رومی اسی قدیم مذہب پہ کاربند تھے جو یونان کی شہری ریاستوں میں مروّج تھا۔ روم کی چھوٹی سی شہری ریاست جس میں صرف کسان بستے تھے اور ان کا قدیم مذہب بالکل طبعی تھا۔ وہ ان روحوں کی پرستش کرتے تھے جو گھروں چشموں اور کھیتوں میں ڈیرہ جمائے رہتی تھیں۔ اس دور کے سادہ لوح کسانوں کا ذہنی معیار ان طلسمات کو بڑی رغبت کے ساتھ قبول کرتا تھا۔

یونانیوں کی طرح قدیم رومیوں کے دیوتاؤں کا تعلق بھی کوہ المپس کے ساتھ تھا۔ تاہم رومیوں کے ہاں یونانی دیوتاؤں کے نام قدرے مختلف تھے۔ اگرچہ ان کی پوجا کے طریقے اور دیوتاؤں کے تصرفات میں ایک قدرِ مشترک موجود تھی۔ یونانیوں کے ہاں جس دیوتا کو زیوس کہا جاتا تھا اس کو رومیوں نے جوپیٹر کا نام دیا اور اس کی بیوی ہیرا کا نام رومیوں نے نور رکھ دیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پوسیڈون کو نیپچون سے، ریرس کو مارس سے، ہٹا اسٹس کو ولکن سے، ایفروڈائٹ کو وینس سے، ہتھینا کو منروا کے ناموں سے بدل دیا۔ یونان میں مذہبی رسوم کو اولمپیائی کھیلوں اور ایتھنز کے ڈرامائی جشنوں کی صورت میں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا مگر

رومیوں کو اس طرح کی رسومات میں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ ان کے عقائد میں عبادات کا بھی کوئی نظام مروّج نہ تھا۔ اور نہ ہی عام رومی اس بات کا مقلد تھا کہ وہ کسی طرح کی رسم عبادت کا پابند ہو۔ بلکہ رومہ کے ہاں دیوتاؤں کے حقوق ایک مخصوص طبقہ کے ذمہ تھے اور وہی اس کو ادا کرنے کے پابند تھے۔ مذہبی رسوم اور عبادات کی ادائیگی پروہتوں کی ایک جماعت کے ذمہ تھی جن کی سربراہی خود بادشاہ کیا کرتا۔ تاہم جولیس سیزر کے عہدِ اقتدار کے بعد ان کے ہاں بادشاہوں کی پوجا بھی رواج پا گئی اور ان کے معبودوں کی فہرست میں ایک نئے اور فانی معبود کا اضافہ ہو گیا۔

رومی حیات بعد ممات پہ بھی یقین نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ رومی شاعری میں ان کے عقائد کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک رومی شاعر کہتا ہے کہ انسان کو موت کے بعد کے ہر اس امکان کو نظر انداز کر دینا چاہیے جس میں تکلیف و اذیت کا کوئی تصور پایا جاتا ہو۔ موت خوابوں سے خالی ایک ایسی نیند ہے جس کا کوئی اختتام نہیں۔ رومی فلسفہ کے مطابق انسانی جسم اور روح کائنات کے دوسرے عناصر کے اجتماع کا عارضی نتیجہ ہیں اس لیے موت کے بعد یہ تمام عناصر بکھر کے رہ جاتے ہیں۔ اہل رومہ اس طرح کے اوہام اور مذہبی تصورات کے چنگل میں صدیوں تک مقید رہے جن میں انسانیت کی فلاح کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ بلکہ ایک نظام جبر تھا جس میں عام آدمی اس بری طرح جکڑا گیا تھا کہ اس سے بنیادی انسانی حقوق تک چھین کر ان تخیلاتی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے تھے۔ معبودانِ باطل کی پرستش کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک رومیوں کو اللہ کی طرف سے ہدایت کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور آپ کی زبان سے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی واحدنیت کا ذکر سنا۔ شام اور فلسطین کے یہودیوں نے دین عیسوی ؑ کو اپنے لیے بڑا خطرہ قرار دیا اور پوری شدت سے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ انھوں نے سیاسی طور پہ اہل رومہ کو مجبور کر دیا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو دعوت و تبلیغ سے روکیں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ ؑ اور ان کی ماں حضرت مریم ؑ پر رکیک الزامات کے انبار لگا دیئے اور بیت المقدس میں معمور رومی گورنر پیلاطوس پہ اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ انھوں نے گورنر سے کہا کہ اگر تم نے اس شخص کو یہاں سے نہ نکالا تو ہم تم کو یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ چنانچہ یہودیوں نے ایک طوفان بدتمیزی بپا کر دیا جس کی بدولت بہت کم خوش نصیبوں کو حضرت مسیح ؑ کا پیام سننے اور اس پہ ایمان لانے کی توفیق عطا کی گئی اور صرف بارہ خوش نصیب افراد ہی دین عیسوی پر ایمان لا سکے جنہیں بعد میں آپ کے حواری کہا گیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ ؑ

کے رفع الی السماء کے بعد ان حواریوں نے اپنی دینی پختگی کا ثبوت فراہم کیا اور تبلیغ کا فریضہ بڑی تندہی سے ادا کیا جس کے نتیجے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات عام ہونے لگیں اور لوگ جوق در جوق مذہب عیسائیت میں داخل ہونے لگے۔تاہم یہودیوں کا غلبہ بدستور موجود تھا اور ان کا عناد بھی جس کی وجہ سے دین عیسوی اختیار کرنے والے لوگوں پہ عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا اور ان پہ انفرادی اور اجتماعی مظالم کی انتہا کر دی گئی۔شہر کے چوکوں میں ان بے کس اور نہتے عیسائیوں کو باندھ دیا جاتا اور ان پہ بھوکے درندے چھوڑ دیئے جاتے۔رومی اپنا کام کاج چھوڑ کر وحشت کے اس کھیل کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔لوگ نیا دین قبول کرنے والوں سے نفرت کرتے اور ان پہ اپنے پالتو کتے چھوڑ دیتے جو ان کو زخمی کر دیتے۔

شہر میں جا بجا عشق و جنوں کے ثبات نقش ہونے لگے۔انسانی حوصلوں کی انتہا جاننے کے لیے وہ کونسا ہتھیار تھا جو ان لوگوں پہ نہ آزمایا گیا مگر جو دل حق کی راہ پا جائیں ان کو پھر سے بے راہ کرنا کسی بھی دور میں ممکن نہ ہو سکا۔تاہم داستان عزیمت کے صفحات میں بدستور اضافہ ہوتا رہا اور عشق و مستی کے مظاہر جلوہ افروز رہے۔ جنوں اور خرد کے مابین ازلی معرکہ بپا رہا جس میں جنوں کو فتح اور نصرت سے نوزا گیا اور عقل انگشت بدنداں جنوں کی رفعتوں پہ ششدر تھی۔ان لوگوں کو سر عام صلیبوں سے باندھ کر بلند کیا جاتا اور پھر انھیں بھول جایا جاتا۔وہ لوگ ان صلیبوں پہ بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو جاتے تو ان کے زندہ جسموں کو مردہ خور نوچنے آجاتے۔آج مورخین نیرو کو ایک مجرم کی حیثیت سے ہی یاد کرتے ہیں جس نے خود روم میں آگ لگوائی اور اس کا الزام دین مسیح کے پیروؤں پر لگا کر ان کا قتل عام کروایا۔کچھ علاقوں میں سڑک کے دونوں اطراف ان مظلوموں کی صلیبیں دن بھر لٹکی رہتیں پھر رات کو انھیں آگ لگا دی جاتی تاکہ راستے میں عیسائیوں کے جلتے ہوئے بدن روشنی کا کام دیں سکیں۔روم کے شہنشاہ نیرو نے جب ایک بڑے مسیحی راہنما کو قتل کرا دیا تو عیسائیت کی مقبولیت میں چند دنوں تک زوال رہا مگر پھر فوراً ہی مسیحیت کسی وبا کی طرح پھوٹی جو یہودیوں کے گھر تک ہی محدود نہ رہی بلکہ روم کے دارلحکومت تک جا پہنچی۔اب لوگ جا بجا اپنے مذہب کا اعتراف کرتے اور اسی وقت قتل کر دیئے جاتے مگر عجب بات تھی کہ دین عیسوی کے پیروکاروں میں ہر لحہ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔رومی بادشاہوں اور یہودیوں کی سازشوں کے تحت ظلم و جبر کا یہ سلسلہ کوئی دو چار روز کی بات نہ تھی بلکہ صدیوں بہمت کا یہ تماشا جاری رہا حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا جب تمام رومی سلطنت میں عیسائیت کا پرچم لہرانے لگا۔مشہور مغربی مورخ (Gubben) نے ان وجوہات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جس کے

باعث یہودیوں پہ عیسائیوں کو یہ لازوال فتح حاصل ہوئی وہ لکھتا ہے:

''یہودی انتہا درجہ کے تنگ دل تھے وہ لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے سے بھی کتراتے تھے اگرچہ ان کے ہاں مذہبی جوش وخروش بھرپور تھا۔مگر ان کے اخلاق عیسائیوں کی نسبت بہت پست تھے جس کی وجہ سے لوگ ان سے متنفر ہو رہے تھے اور عیسائیت کو اپنا رہے تھے جن کے ہاں یہودیوں ہی کی طرح کا جوش وجذبہ اور عزم وثبات تو موجود تھا مگر وہ تنگ نظر نہ تھے اور لوگوں کو خوش دلی سے عقائد عیسوی سے آگاہ کرتے اور ان کو محبت بھری دعوت دیتے۔ان کا یہ انداز لوگوں کو مسحور کر رہا تھا کہ ان کے دروازے ہر عامی کے لیے کھلے ہیں۔چنانچہ معاشرے کے ہر طبقہ سے لوگ ان کھلے دروازوں سے داخل ہوتے اور عیسائیت کی الہامی چھتری تلے سکون محسوس کرتے۔یہودیوں کی نسبت عیسائیوں کے ہاں مابعد الطبعیات کا تصور بھی بہت واضح تھا جسے عیسائی راہب کچھ اس مسحور کن انداز میں پیش کرتے کہ انکار کی گنجائش ہی ختم ہو جاتی۔پھر حضرت عیسیٰ کے معجزوں کی وہ روائیتیں تھیں جن پہ لوگوں کا پختہ اعتقاد تھا۔وہ مزید لکھتا ہے کہ مسیحیت کو اتنی شاندار کامیابیاں محض اس لیے حاصل نہ ہوئیں تھیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیروؤں نے بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی تھی بلکہ اس لیے ہوئیں تھیں کہ اس نئے دین میں قدیم تر مذاہب کے اصول وضوابط کو مستعار لینے اور خود میں جذب کر لینے کی بھی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔مثلاً مسیحیوں نے حیاتِ جاودانی اور قیامت کے بارے میں جو تصورات پیش کئے ہیں ان کا مصریوں یہودیوں اور یونانیوں کے تصورات سے گہرا تعلق ہے۔اس لیے یونانیوں کے ہاں مسیحیت میں کوئی نرالا پن نہ تھا۔وہ سمجھتے تھے کہ مسیحیت دراصل ان کے عقائد کے تسلسل کا ہی دوسرا نام تھا اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے پرانے معبود اور ہیرو جوان کے شہروں کی حفاظت کیا کرتے تھے اب بھی وہی ان کے نگران اور پاسبان تھے اگرچہ ان کے نام اور شکل وصورت قدرے بدل چکی تھی اور ان کے روائتی دیوی دیوتاؤں کی بجائے خدا رسیدہ بزرگوں اور فرشتوں نے لے لی تھی۔اب وہاں قدیم بتوں کی بجائے عیسائیت کے مجسموں کی پوجا کی جاتی جسے عیسائیت کے دوسرے فرقے کفر وشرک کے نام سے یاد کرتے اور ان کے اس

عمل سے اپنی کراہت کا اظہار کرتے۔مگر یونان اور روم کے پادری ان مجسّموں اور تصویروں کی پوجا پہ ہمیشہ بضد رہے اس لیے کہ ان کے مالی مفادات اس سے وابستہ تھے۔ چنانچہ رومی شہنشاہ شاہ لیوم سوم نے جب ان تصویروں اور مجسّموں کی پوجا کے خلاف شاہی فرمان جاری کیا تو روم اور یونان کے بہت سے حصوں میں بغاوت اور فتنہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔تاہم شاہ لیوم نے اپنا فرمان واپس نہ لیا حتیٰ کہ وہ وفات پا گیا اس کے بعد اس کے بیٹے (Kenstaien) نے اپنے باپ کی پالیسی کو جاری رکھا اور راہبوں کی شدید مخالفت کا دلیری سے مقابلہ کیا اس لیے بہت سے لوگوں کے دلوں میں مجسّمہ پرستی سے نفرت پیدا ہو گئی تھی مگر پھر جب (Kenstaien) کی والدہ نے مجسّموں اور تصاویر کی پرستش کی حمایت میں شاہی فرمان جاری کر دیا تو کنسٹائن اور اس کے باپ شاہ لیوم کی ساری کوششیں بیکار ہو گئیں اور عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کی حقیقی تعلیمات سے دور ہوتے چلے گئے اب اگرچہ عیسائیت کو سارے رومی مذاہب پہ غلبہ حاصل ہو چکا تھا مگر وہ فرقہ پرستی کی اس راہ پہ چل نکلے جس میں کوئی خیر نہ تھی''۔

□□□□□□□

مسیحیت اپنے عظیم الشان غلبے کے بعد خود اپنے اندر سے زوال کی راہ پہ چل نکلی اور فرقہ پرستی کی اس خوفناک کشمکش کا آغاز ہوا جس نے عیسائیوں کے خون کی داستانِ عبرت رقم کی۔شاہ قسطنطین کے عہد حکومت میں بیزنطین کو رومہ کا دارالحکومت بنا دیا گیا جسے بعد میں قسطنطنیہ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔یہ شہر رومی حکومت کا مرکز بنا اور اس کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ روزِ اول سے ایک مسیحی شہر تھا (اگرچہ آج وہ ایک اسلامی شہر ہے) قسطنطنیہ یونانی اور رومی تہذیب وتمدن کا مرکز بن کے رہ گیا اس لیے اسے کبھی بھی بت پرستانہ رسومات میں نہ الجھایا گیا اور جب کبھی کسی بادشاہ نے یہاں کافرانہ اور بت پرستانہ عقائد کو فروغ دینا چاہا تو عیسائیت کے پیرو کار فوراً اس کی مزاحمت کے لیے میدان میں نکل آئے۔

حضرت عیسیٰؑ کے پیروکار جب فرقہ بندی کی راہ پہ نکلے تو بہت دور تک چلے گئے یہاں تک کہ ان کے ہاتھ سے مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیمات گم ہو کر رہ گئیں۔اس راہ پہ انھوں نے اپنے مسیحی بھائیوں کا محض فرقہ پرستی کی بنا

پر اتنا خون بہایا کہ کسی اور قوم نے ان کا اتنا خون نہ بہایا ہوگا۔فرقہ پرستی کے اس پس منظر سے ظلم و جبر کی اتنی داستانوں نے جنم لیا کہ حیرت سے آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں کہ کوئی اپنے عقائد سے اختلافات کی بنا پہ انسانی پستی کی اس انتہا تک بھی جا سکتا ہے جہاں تک عیسائی گئے تھے۔عیسائیوں کے ان متحارب گروہوں نے تاریخ انسان پہ کتنے سیاہ نشانات چھوڑے ہیں یہ نہ تو ہمارا موضوع ہے اور نہ ہی یہاں اس طویل داستان کو بیان کرنے کی گنجائش ہے۔چنانچہ ہم عیسائیت کے چند اہم فرقوں اور ان کے مابین باہمی اختلاف کے ذکر تک ہی خود کو محدود رکھتے ہوئے ان حالات پہ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے جو نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت رومی مملکت میں موجود تھے۔جسٹس پیر محمد کرم شاہؒ نے اپنی معرکۃ الآرا سیرت ضیا النبی ﷺ میں عیسائیوں کے باہمی عقائدی اختلاف پر روشنی ڈالی ہے وہیں سے چند اقتباسات پیش نظر ہیں:

''اس بات پہ تو تقریباً سبھی عیسائی متفق الرائے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بحیثیت جوہر ہونے کے واحد ہے اور بحیثیت اقانیم تین ہے۔وجود، علم اور حیات کو اقانیم کہتے ہیں، وجود کو باپ، علم کو بیٹا اور حیات کو روح القدس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ان کا اختلاف اس میں ہے کہ ان تین اقانیم کا تعلق جوہر سے کیا ہے۔ایک فرقہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ تین اقانیم اور جوہر قدیم ہیں اور الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک خدا ہے اقنوم ثانی (علم) حضرت مسیح کے جسم سے متحد ہو گیا جیسے شراب اور پانی آپس میں ملنے کے بعد یک جان ہو جاتے ہیں اور مسیح بھی ازلی قدیم ہے اور مریم نے ازلی قدیم کو جنا ہے۔دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ بیٹا یعنی مسیح کی دو حیثیتیں ہیں ایک لاہوتی اور ایک ناسوتی اس حیثیت سے کہ وہ خدا کا بیٹا ہے وہ خدائے کامل ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کا ظہور اس جسد عنصری میں ہوا انسان کامل ہے اس لیے یہ بیک وقت قدیم بھی ہے اور حادث بھی اور قدیم و حادث کا یہ اتحاد نہ قدیم کی قدامت کو متاثر کرتا ہے اور نہ حادث کے حدوث کو، تیسرے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اقنوم ثانی گوشت اور خون میں بدل گیا اور خدا مسیح کی شکل میں ظاہر ہوا۔بعض کی رائے یہ ہے کہ اللہ قدیم کے جوہر اور انسان حادث کے جوہر میں یوں امتزاج ہوا جیسے نفس ناطقہ کا جسم کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دونوں ایک چیز بن جاتے ہیں اس طرح قدیم جوہر اور جوہر حادث

کے مجموعہ کا نام مسیح ہے اور وہی خدا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگرچہ خدا انسان نہ بن سکا لیکن انسان خدا بن گیا جیسے اگر آگ کوئلہ نہیں بن سکتی تو کوئلہ تو آگ بن جاتا ہے اگرچہ مسیح نے خود کبھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ ان کی اصل کوئی مافوق الفطرت چیز ہے بلکہ وہ اسی پر مطمئن تھے کہ انھیں مریم کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانا جائے۔ عیسائیوں میں فرقہ پرستی کا جنوں کبھی بھی کم نہ ہو سکا اور وہ آج تک اس ابتلا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ تاہم تاریخی طور پہ تیسری صدی کے ختم ہونے سے پہلے یسوع کو کلام الٰہی کا مجسمہ تسلیم کر لیا گیا لیکن اس کی الوہیت کا عام طور پہ انکار کیا جاتا تھا۔ اس اثناء میں (Arian) کے تنازعہ نے چوتھی صدی عیسوی کے کلیسا کو ایک اضطراب اور حیرت میں مبتلا کر دیا تھا اس نے لوگوں کی توجہ کو اس مسئلہ کی طرف مبذول کیا۔ پھر جب (Nicaea) کی کونسل جو ۳۲۵ء میں منعقد ہوئی اس میں یسوع کی الوہیت کو تسلیم کر لیا گیا اور مشرق و مغرب کے عیسائیوں نے اسی عقیدے کو صحیح مسیحی عقیدہ مان لیا۔ بیٹے کی الوہیت کا مظہر یسوع کو قرار دینے سے ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو گئی جو چوتھی صدی اور اس کے بعد کے عرصہ مابہ النزاع بنی رہی اور وہ یہ کہ یسوع میں الوہیت اور انسانیت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ کالسیڈان کی کونسل جو ۴۵۱ء میں منعقد ہوئی اس میں یہ قرار پایا کہ مسیح کی ذات میں الوہیت اور انسانیت دونوں یکساں طور پہ مجتمع ہیں اور باہمی امتزاج کے باوجود دونوں کی خصوصیات جوں کی توں قائم ہیں قسطنطنیہ کی تیسری کونسل جو ۸۶۰ء میں منعقد ہوئی اس میں اس پر مزید اضافہ کیا گیا کہ ان دو ہستیوں کی الگ الگ مرضی اور مشیت ہے مسیح دونوں مشیتوں کا مالک ہے مسیح کے اندر دو مشیتوں خدائی اور انسانی وجود کے نظریات کو مشرق و مغرب کے کلیساؤں نے بحیثیت پختہ اور صحیح عقیدہ کے طور پہ مان لیا"۔

□□□□□□□

چنانچہ عیسائی کلیسا نے حضرت عیسیٰؑ کی آسان اور سادہ تعلیمات کو اتنا الجھا دیا کہ قدیم دیومالائی مذاہب بھی اتنے گنجلک نہ رہے ہونگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف بہت سا انسانی خون ضائع ہوا بلکہ بہت سے انسان مذہب سے ہی بے پرواہ ہو کے رہ گئے۔ عیسائی علماء کے باہمی عقائدی اختلافات اور تنازعات کی تفصیل اتنی

طویل اور گھمبیر ہے کہ انسانی ذہن انتشار میں مبتلا ہو کے رہ جائے۔ چنانچہ یہی وہ حالات تھے جن کے پیش نظر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت اہل رومہ حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیمات کو اپنے باہمی نزاع میں گم کر چکے تھے اور ان کا یہ دعویٰ کہ وہ ایک الہامی مذہب کے پیرو ہیں محض ایک دعویٰ ہی تھا اس لیے اسلام کی صبح طلوع ہونے سے قبل دنیا کی سب سے بڑی ریاست روم کے مذہبی اور عقائدی حالات انتہائی ابتری کا شکار تھے اور اپنے اندر بہتری کی گنجائش رکھتے تھے۔ چنانچہ وقت نے اس خلا کو پر کیا اور رومی عیسائی بھی اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔

اخلاق ومعاشرت

قدیم رومی معاشرے کو بہت سی خرابیوں کے باوجود بھی ماعصر معاشروں سے زیادہ متوازن معاشرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ سلطنت رومہ بھی دوسرے بہت سے معاشروں کی طرح طبقات میں منقسم تھی مگر اس کا خوشحال طبقہ بھی ملک وملت کی تعمیر وترقی میں کوشاں رہتا۔ امراء کا طبقہ خوشحال خاندانوں اور وسیع قطعات اراضی کے مالک زمینداروں پر مشتمل تھا۔ ان کو پورے شہری حقوق حاصل تھے۔ تاہم آبادی کی اکثریت کا تعلق طبقہ عوام سے تھا جو سلطنت رومہ کے جزوی شہری تصور کیے جاتے۔ جمہوریت کے ابتدائی دنوں میں انھیں یہ اجازت نہ تھی کہ وہ فوج میں بھرتی ہوسکیں اور دفاعی خدمات بجالاسکیں اور نہ ہی ان کی اپروچ حکومتی ایوانوں تک تھی۔ تاہم وہ سپارٹا کے غلاموں کی طرح حد درجہ مظلوم بھی نہ تھے اور انھیں بنیادی سیاسی حقوق حاصل تھے۔ چنانچہ جب شاہی تختہ الٹا تو پہلے پہل امراء کا طبقہ جمہوریت کے تمام سیاسی اداروں پر قابض ہوگیا۔ سینٹ اور اسمبلی کے ارکان امراء کے طبقہ سے لیے جاتے تھے۔ کونسل کا عہدہ بھی امراء کے طبقہ کے لیے مخصوص تھا۔ کونسل دو ہوتے تھے جنہیں ایک سال کے لیے انتظامی معاملات میں کلی اختیارات دے دیئے جاتے تھے۔ البتہ ایک کونسل دوسرے کونسل کے خلاف حق تنسیخ استعمال کرسکتا تھا۔ اس پابندی کی وجہ سے کوئی پالیسی اس وقت تک نافذ نہ ہوسکتی تھی جب تک دونوں کونسل اس کی حمایت پر متفق نہ ہوں اور عام حالات میں سینٹ کے مشورہ کے مطابق ہی امورِ سلطنت انجام دیئے جاتے۔ سینٹ کے ممبروں کی تعداد تین سو تھی اور ان کا تعلق عموماً طبقہ امراء سے ہی ہوتا روم کے شہری حکومتی ایوانوں پہ امراء کے تسلط کو پسند نہ کرتے تھے اگرچہ اس معاشرے میں ہر شہری کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ حکومتی ایوانوں تک رسائی حاصل کرے

مگر اسمبلی کی محدود نشستوں اور امراء کے روائتی ہتھکنڈوں کی وجہ سے شاذ و نادر ہی کوئی عام آدمی ایوانِ بالا تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔تاہم ان کی اس روش کے خلاف عوامی ردعمل میں اضافہ ہوتا رہا اور رومی مملکت نے جلد ہی مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے عوامی مطالبات کو تسلیم کر لیا اور حکومت میں ان کی براہ راست شمولیت کو ممکن بنایا۔انھوں نے نظام مملکت میں بنیادی حقوق کی اصلاحات نافذ کیں اور آئین میں ترامیم لائے جس میں عوامی حلقوں کو طبقہ امراء میں شادی کرنے کا حق دیا گیا۔ان کو جائیداد کی خریداری کا حق بھی دیا گیا اور سینٹ کا رکن بننے اور کونسل کے عہدے پر فائز ہونے کا حق بھی دیا گیا۔انھوں نے زرعی شعبے میں بھی اصلاحات کا نفاذ کیا اس لیے کہ اس سے قبل بہت سے کسان حکومتی قرضہ ادا نہ کرنے کے باعث اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔چنانچہ اب کسانوں کی حالات میں بہتری کے لیے بہت سے قوانین بنائے گئے جس کا ان کو براہ راست فائدہ پہنچا۔روم کی جمہوری حکومتوں نے جاگیرداروں کے لیے زمین کی حد مقرر کر دی جس سے زیادہ زمین کی ملکیت کا حق خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔انھوں نے کسانوں کو قرضے کے حوالے سے آسانی پیدا کی اور سابقہ قرضوں کو منسوخ کر دیا گیا اور قرض ادا نہ کر سکنے والے کسانوں پر سے سخت سزاؤں کا خاتمہ کر دیا گیا،جن کسانوں کے پاس زمین کم تھی یا بالکل ہی نہ تھی ریاست نے ان کسانوں کو قابل کاشت اراضی فراہم کی جس سے ملک خوراک کی بنیادی ضروریات میں خود کفیل ہو گیا۔

ان سب اصلاحات کے باوجود بھی صوبائی حکومتوں کے اختیارات بہت زیادہ تھے اور وہ مقامی کسانوں کا کسی حد تک استحصال کرنے میں کامیاب رہتے۔قدیم رومی سلطنت کا حکومتی ڈھانچہ اس کی ہم عصر دیگر ریاستوں کے لیے کسی نمونے سے کم نہ تھا۔روم کے صوبائی نظام حکومت میں اگر مرکز کے بنیادی مطالبات پورے ہوتے رہیں تو وہ صوبوں کی دیگر پالیسیوں میں دخیل نہ ہوتا۔ان کے بنیادی مطالبات یہ تھے صوبائی حکومت محاصل کی باقاعدگی کے ساتھ وصولی اور مرکز کو بروقت ادائیگی کی ذمہ دار ہوتی اس کے علاوہ حالتِ جنگ میں اس پہ لازم تھا کہ وہ ملکی دفاع میں اپنا حصہ ڈالیں اور مرکزی فوج کو افرادی قوت اور اسلحہ مہیا کریں تیسرا اور بنیادی مطالبہ شاہ وقت کی اطاعت اور پرستش کا تھا جو ان کو عقائدی اور سیاسی طور پہ منضبط رکھتا۔مملکتِ رومہ کا نظام تعلیم قابل ذکر حد تک پست تھا۔تعلیمی اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ عام لوگ تعلیم حاصل کرنے کا صرف سپنا ہی دیکھ سکتے تھے۔عملاً ان کے لیے محال تھا کہ وہ اپنے بچوں کو اتنی مہنگی تعلیم دلوا سکیں۔رومہ کی جمہوری حکومتوں اور شاہی حکومتوں نے کبھی درسگاہوں کی سرپرستی نہ کی اور سرکاری خزانے سے ان پہ ایک پیسہ تک

خرچ نہ کرتے جس کی وجہ سے تعلیم نجی شعبے میں چلی گئی اور بہت مہنگی ہو گئی اب صرف ان افراد کے بچے ہی زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو سکتے تھے جن کے پاس بڑی بڑی جائیدادیں تھیں یا ان کا تعلق امراء کے طبقے کے ساتھ تھا۔

سلطنت روم میں شاہی استبداد نے وہ وقت بھی دکھایا جب شاہی حکم سے ان تعلیمی اداروں کو بھی بند کر دیا جو کسی حد تک ملک کے بچوں کو علم کی روشنی سے آشنا کر رہے تھے۔شاہ جسٹین نے وہ تمام سکول بند کرا دیئے جہاں فن خطابت اور علوم فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس نے ان اداروں کے ساتھ وقف جائیدادوں کو بھی ضبط کر لیا اور فرمان عام جاری کیا کہ ایتھنز میں جتنی درسگاہیں ہیں ان کو بند کر دیا جائے اور کسی کافر (عیسائی) کو علم حاصل نہ کرنے دیا جائے۔اس طرح یونانی فلسفہ کی وہ شمع جو ہزار سال سے روشن تھی بادشاہوں کی جہالت کی وجہ سے بجھ گئی۔ان علم دشمن حکمرانوں نے ہر اس آواز کو روک دینا چاہا جو علمی تھی۔ ہر اس عمل پہ پابندی تھی جس میں کوئی علمی پیش رفت پائی جاتی ہو۔مملکت رومہ اس وقت مختلف عیسائی فرقوں کے مابین عقائدی اختلاف کے باعث جنم لینے والی انتہائی منافرت کا سامنا کر رہی تھی جس میں خون تھا، جبر تھا، منافرت تھی، انارکی اور انتشار تھا جس کا ایک عکس (Well Deurant) کے حوالے سے پیش خدمت ہے۔

''وہ اپنی تاریخ میں اسکندریہ کی ایک خاتون کا ذکر کرتا ہے جس نے اس اتھاہ تاریکی میں بھی خود کو علم کی سربلندی کے لیے وقف کر رکھا تھا اس کا نام (Hypatia) تھا۔اس خاتون کو کئی علوم میں کمال حاصل تھا اول اس نے علم میں ریاضی میں کمال حاصل کیا، پھر اس نے علم فلکیات کی طرف رجوع کیا اور علم فلکیات پر لکھی جانے والی مشہور زمانہ کتاب (Ptolemy) کی شرح لکھی، علم ریاضی میں بھی اس کی گراں قدر تصنیفات شائع ہوئیں۔ریاضی کے بعد اس نے فلسفے کے میدان میں قدم رکھا اور افلاطون اور پلوٹینس کے خطوط پر اپنا ایک مستقل نظام فکر تعمیر کیا۔اسی زمانے کا ایک عیسائی مورخ سقراط اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام فلسفیوں سے سبقت لے گئی تھی اور اسے اسکندریہ کے عجائب خانے میں فلسفے کی چیئر تفویض کی گئی تھی۔اس کے لیکچرز اتنے دلکش اور مدلل ہوا

کرتے کہ لوگوں کا ایک ہجوم ہر وقت اسے گھیرے رہتا۔ دوسری طرف وہ ایک اعلیٰ اخلاق و کردار کی خاتون تھی جس کی وجہ سے دور دور تک اس کی عزت و تکریم کی جاتی۔ تاہم اسکندریہ کے عیسائی اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس لیے کہ ان کے خیال میں وہ لوگوں کو کفر کی راہ پہ لگا رہی تھی اور خود بھی بڑی کافرہ تھی اور ایک کافر ارسٹس کی دوست بھی تھی۔ اسکندریہ کا آرچ بشپ (Cyril) تھا جسے خاص طور پہ ارسٹس اور ہپاٹیا سے نفرت تھی۔ چنانچہ اس کے اکسانے پر پہلے اس کے پادریوں نے ارسٹس کو ہلاک کیا اور پھر وہ ہپاٹیا کے درپے ہو گئے اور ایک دن انھیں اپنے دل کی آگ بجھانے کا موقع مل ہی گیا۔ اس دن ہپاٹیا بگھی میں جا رہی تھی کہ سیرئیل کے چند کٹر پیروکاروں نے ہپاٹیا کو اس سنسان اور بھیگی شام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بگھی سے اتار لیا انہوں نے اس کے کپڑے اتار دیئے اور اسے گھسیٹ کر ایک کلیسا کے اندر لے گئے جہاں انھوں نے وقت کی اس بہت بڑی عالمہ پر بے پناہ تشدد کیا جس کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ ہلاک ہو گئی۔ ہپاٹیا کے ہلاک ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنی جہالت اور بہیمت کا مظاہر جاری رکھا اور اس کی لاش کی بے حرمتی کی۔ انھوں نے ہپاٹیا کی لاش کے ٹکرے کر دیئے اور انھیں آگ لگا دی۔ دوسری طرف اتنے سنگین جرم کے بعد بھی بادشاہ کے کان پہ جوں تک نہ رینگی اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ فرقہ ورایت کی اس جنگ میں اس نے جس گروہ کا بھی ساتھ دیا دوسرا گروہ اس کا دشمن ہو جائے گا چنانچہ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ خاموش ہو رہے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

رومی سلطنت میں اس پھیلتی ہوئی مذہبی منافرت نے اس کے عام سماجی ڈھانچے کو بھی بری طرح متاثر کیا تھا۔ معاشرے کے وہ لوگ جن کے پاس دولت تھی یا ان کا تعلق خوشحال گھرانوں سے تھا وہ تو عیش و عشرت کی زندگی میں مشغول تھے اور انھیں عام آدمی پر گذرنے والی آفات کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ اپنے اونچے محلوں سے ہر جا پھیلی ہوئی بدنظمی اور انتشار کا مشاہدہ تو کرتے مگر اپنے بالا خانوں سے اتر کر اس طوفانِ بدتمیزی کا حصہ بننے پر تیار نہ ہوتے۔ اس لیے کہ ان کو نہ تو اس کی ضرورت تھی اور نہ خواہش۔ وہ ان لوگوں کے طرزِ عمل پر

افسوس کا اظہار کرتے اوران کی جہالت پہ چار حرف بھیجتے۔رومی سلطنت میں اب امیر اور غریب کے درمیان حائل خلیج وسیع ہونی شروع ہوگئی تھی اور متوسط طبقہ تیزی سے ختم ہورہا تھا۔کسانوں کے لیے آرام اور تعیش کا سامان نہ ہونے کے برابر تھا اور وہ نہایت عسرت کی زندگی بسر کررہے تھے۔دوسری طرف شہروں کی حالت بھی دِگر دوں تھی اور لوگ لکڑی کے بدنما جھونپڑوں میں رہتے تھے یا پھر چھ سات منزلہ بلند اور گندی عمارتیں ان کی رہائش گاہ کا کام دیتی تھیں۔معاشرے میں بے روزگاری عام تھی اور حکمران اس سنگین مسئلہ پر توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے جس کی وجہ سے ملک کی بیشتر آبادی کا گذارا سرکاری خیرات پر تھا۔اس دور میں سلطنت رومہ کے صنعتی اور زرعی ادارے زوال کا شکار تھے۔حکومت کی صنعتی پالیسی نہایت ناقص تھی جس کی وجہ سے عام صنعت کار ٹیکسوں کے بوجھ تلے کراہ رہا تھا اور اس کی معاشی حالت گر رہی تھی۔

دوسری طرف کسان کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا اس لیے کہ وہ بھی بادشاہ اور اس کے حواریوں کی طرف سے لگائے گئے بے پناہ ٹیکسوں کی وجہ سے بے حال تھا۔شاہ جسٹنین کے زمانے میں زمینداروں کی جاگیریں وسیع ہورہی تھیں اور عام کاشتکار بڑے زمینداروں کی غلامی میں جکڑے جارہے تھے کیونکہ طغیانی یا قحط سالی یا کسی اور وجہ سے جب ان کی فصلیں تباہ ہوجاتیں تب بھی حکومت وقت ان کو لگان اور دوسرے مروّج ٹیکسوں میں چھوٹ دینے کو تیار نہ تھی۔اس لیے رومی کسان کی حالت ہر دن بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی اور شاہی استبداد کے شکنجے اس کو مزید بدحال کررہے۔چنانچہ جب کوئی کسان پیداوار دینے کی اہلیت کھو بیٹھتا تو اس کو بیگار پہ لگا دیا جاتا۔ان کو نہروں کی صفائی اور انہیں گہرا کرنے کے کام پہ لگا دیا جاتا تاکہ ملک کا نظام آبپاشی قائم رہے۔

رومن ایمپائر کے بادشاہوں میں سب سے جلیل القدر اور عظیم بادشاہ شاہ جسٹنین کو گنا جاتا ہے۔جو چھٹی صدی عیسوی کا تاجدار تھا جس کے بیاسی سالہ دورِ اقتدار کو عہد فتوحات کہا جاتا ہے اس کے عہدِ حکومت میں سلطنت میں وسعت ہوئی اور بڑے بڑے محلات اور قلعے تعمیر کئے گئے۔تاریخ میں اس بادشاہ کو جسٹنین دی گریٹ کے خطاب سے نوازا گیا۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم بادشاہ کے عہدِ حکومت میں بھی عوام کی حالت قابل رحم ہی تھی۔چنانچہ جب شاہ کی طرف سے جبر ایک حد سے گذر جاتا تو عام لوگوں میں بغاوت کے جذبات مچلنے لگتے۔شاہ جسٹنین ہی کے دور میں ایک دفعہ جب بادشاہ کو عظیم تعمیری منصوبوں اور پے در پے جنگوں کی وجہ سے عوام پہ ٹیکسوں کا بوجھ بڑھانے کی ضرورت پیش آئی تو بادشاہ یا اس کے حواریوں نے اس بات کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی کہ وہ یہ بات تو جان لیں کہ آیا ان کے عوام یہ اضافی ٹیکس ادا کرنے کے قابل بھی ہیں یا

نہیں۔حقیقت یہ تھی کہ انھی دنوں ملک بھر کے کسانوں کی فصلیں ناگوار موسم کا بوجھ برداشت نہ کر کے تباہ ہو چکیں تھیں۔وہ روایتی ٹیکس ادا کرنے کے قابل بھی نہ تھے چہ جائے کہ وہ اضافی بوجھ برداشت کریں۔چنانچہ بادشاہ کے اس مطالبے پر ان کے پاس ادا کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا شاہ کے کارندوں نے لوگوں کی جائیدادوں اور نجی املاک پہ ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے اس انارکی نے جنم لیا جو سلطنتِ رومہ کی ایک بڑی بغاوت میں بدل گئی جس میں چالیس ہزار سے زائد لوگ ہلاک ہوئے۔ان تمام حالات میں ملکی نظم ونسق کی کمزوری اور اس سے جنم لینے والی افراتفری کا منظر ہی دور دور تک دکھائی دیتا تھا شام بھی مملکت رومہ کا ایک صوبہ تھا جو اپنی خوشحالی کی وجہ سے مشہور تھا تاہم اس پہ اسی مناسبت سے ٹیکس عائد کئے گئے اسے اپنی آمدنی کا دسواں حصہ صرف ایک ٹیکس کی مد میں ادا کرنا ہوتا جب کہ ہر شامی پر اس کی ذاتی حیثیت میں بھی کئی ٹیکس واجب الادا تھے اس لیے شامی لوگ بھی بادشاہ کے جبر واستبداد کا بری طرح شکار تھے اور قدرے مشکل زندگی ہی بسر کر رہے تھے عوام کے ابتر حالات کی تفصیلات آپ نے پڑھیں۔

اب شاہی خاندان بادشاہوں اور امراء کی عیش کوشی پہ بھی ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے عالیشان محلوں میں دیوان خانوں میں اور ناؤنوش کی محفلوں میں سامانِ عیش وعشرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔حضرت حسان بن ثابتؓ جبلہ بن الایہم غسانی کی ایک مجلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں نے دس باندیاں دیکھیں جن میں پانچ رومی تھیں جو بربط پہ گا رہی تھیں پانچ اور باندیاں اہل حیرہ کی دھن گا رہی تھیں جنہیں عرب سردار ایاز بن قبیصہ نے بطور تحفہ بھیجا تھا۔وہ کہتے ہیں جب رومی سردار شراب نوشی کے لیے بیٹھتے تو ان کی نشست گاہ کئی قسم کے پھولوں سے سجا دی جاتی۔شراب سونے اور چاندی کے برتنوں میں پیش کی جاتی اگر جاڑے کا موسم ہوتا تو عود جلایا جاتا اور اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو فرش پہ برف بچھائی جاتی۔ان کے ہم نشینوں کے لیے گرمیوں کا لباس آتا جسے وہ اپنے اوپر اوڑھ لیتے بادشاہ اپنے حرم میں انگنت حسین عورتوں کو شامل کر لیتا۔اہل رومہ کی اخلاقی حالت بھی قابل قدر نہ تھی معاشرے میں زنا عام تھا ایک طرف تو عیسائی مملکت ہونے کی وجہ سے رقص وسرور کی محفلوں پہ پابندی عائد کی جاتی تو دوسری طرف قسطنطنیہ میں ہر طرف رقص گاہیں اور ناچ گھر آباد تھے۔کلیسا نے اگرچہ اعلان کر رکھا تھا کہ وہ ایکٹروں کو بپتسمہ نہیں دیں گے یعنی ان کو دین عیسوی میں داخل نہیں ہونے دیں گے دوسری طرف بازنطینی اسٹیج پر ایکٹروں اور ان کے کھیلوں کی بہت پذیرائی کی جاتی۔قانونی طور پہ ہر رومی شہری ایک ہی شادی کر سکتا تھا مگر زنا پہ کوئی پابندی نہ تھی۔چنانچہ ایک مورخ لکھتا

ہے کہ سلطنت رومہ اس وقت انتہائی اخلاقی زوال کا شکار تھی اور اس زمانہ کی تقریباً تمام عورتیں بدکردار تھیں۔ ہر گلی ہر چوک میں قحبہ خانہ موجود تھا جہاں عصمت فروشی کا دھندا کھلے عام کیا جاتا اگرچہ شاہ جنسٹین کے زمانے میں شاہ اور اس کی ملکہ نے عصمت فروشی کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش ضرور کی۔ انھوں نے تمام عصمت فروش عورتوں کو قسطنطنیہ سے نکل جانے کا حکم دیا تو وہ ششدر رہ گئے کہ شہر جیسے عورت کے وجود سے خالی ہو رہا ہو چنانچہ ان کو اپنے اس حکم کو واپس لینا پڑا۔ میرا خیال ہے اگر وہ زانی مردوں کو شہر چھوڑ جانے کا کہتے تب شہر میں صرف عورتیں ہی رہ جاتیں۔ چنانچہ یہ تھے اس معاشرے کے اخلاقی اور معاشرتی حالات جس کو ایک الہامی مذہب کے پیشرو ہونے کا دعویٰ تھا۔

ہر سو اِک گھور اندھیرا تھا جس میں اہل روم منزل کا ہر نشان، بھلائی کی ہر صفت، انسانیت کا ہر احساس، جذبوں کا ہر گداز، رفعتوں کی ہر تمنا، طمانیت کی ہر ساعت، ندامت کا ہر طریق، زیاں کے سب خیال، رستوں کے سب چراغ، حسنِ جمال کے اثاثہ جات، جبر و استبداد سے نجات، آرائش خیال کے مندرجات، سسکتی آنکھوں کے سب خراج، حکمت و دانش کے سب خزائن، ہاتھوں سے نکلی امیدِ بہار، اخلاق کا ہر چلن، انسانیت کا سب وقار، راحتوں کے سنگِ میل، گُل و بلبل کی سرسراہٹ، وصل کی راحتیں، منزلوں کا خمار، جنوں کے آثار، زیست کا ہر احساس، بہکے قدموں کا یقیں، رواجوں کے شکنجے، رسموں کے آزار، اندھیروں کی کسک، رنگوں کا احساس، یقیں کے خرابے ایماں کے کھنڈر، احساس کا آہنگ، توفیق کی مستی، سبھی کچھ تو وہ کھو چکے تھے۔

سلطنت رومہ کا خاتمہ

اُن دنوں مسلمان مکہ میں بہت عسرت اور تنگی کے دن گذار رہے تھے اور کفارِ قریش کے مظالم حد سے بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی اور صحابہؓ کا ایک گروہ امن وسکون کی تلاش میں حبشہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ اسی سال ۶۱۵ء میں عرب سے ملحق عیسائی ریاست رومہ کو ایران کی زرتشت ریاست کے ہاتھوں ایک بڑی شکست کا سامنا تھا جس کا ایک طبعی اثر مکہ کی نوآموز تحریکِ اسلامی پر بھی پڑا اور کفارِ قریش نے اس شکست پہ مسلمانوں کو یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ وحی کے پیرو اور اللہ کے ماننے والے تمہارے رومی بھائیوں کو ہمارے آگ پرست اور مشرک بھائیوں نے شکست دے دی ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہم ہی حق پر ہیں اور حقیقت میں یہ ہمارے عقائد ہی کی فتح ہے۔ مکہ کے مسلمانوں کے لیے پہلے ہی مسائل اور دشواریوں کی کچھ کمی نہ تھی کہ اب ان کو کفار کے ان زہریلے جملوں کا بھی سامنا تھا جو رومی افواج کی شکست کے بعد ان کی زبانوں پہ تھے۔ چنانچہ اللہ پاک نے اپنے ان مومن بندوں کے صبر کو مزید آزمانا پسند نہ کیا اور اپنے محبوب کی طرف سورۃ روم کی وہ آیات اتاریں جن میں اس بات کی پیش گوئی کی کہ

اگرچہ قریب کی زمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں تاہم جلد ہی وہ دوبارہ غالب ہوں جائیں گے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ٥ فِيْ بِضْعِ
سِنِيْنَ ٥ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ ٥ وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ O
القرآن الحکیم (سورۃ روم۳۰ ؛ آیات ۴۔۲)

ترجمہ:

''رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے، اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور وہ دن آئے گا جب اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ و تابعین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ روم اور ایران کی اس لڑائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ اور کفار مکہ کی ہمدردیاں ایران کے زرتشت لشکروں کے ساتھ تھیں۔اس کی وجوہات پہ مورخین نے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ ایرانیوں نے اس لڑائی کو مجوسیت اور مسیحیت کی لڑائی کا رنگ دے دیا تھا اور وہ ملک گیری کے مقصد سے تجاوز کر کے اسے مجوسیت پھیلانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔پھر بیت المقدس کی فتح کے بعد خسرو پرویز نے قیصرِ روم کو جو خط لکھا اس میں صاف طور پہ وہ اپنی فتح کو مجوسیت کے برحق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔اب چونکہ مجوسیوں کا مذہب اپنے اصول اور فرع کے لحاظ سے مشرکین مکہ کے مذہب سے ملتا جلتا تھا اس لیے کہ مجوسی بھی مشرک تھے اور دو خداؤں کو مانتے تھے اور آگ کی پرستش کرتے تھے اور اہل مکہ بھی مشرک تھے اور بت پرستی کرتے تھے اس لیے فطری طور پہ وہ ایران کے آتش پرستوں کی اس فتح کو اپنے عقائد کی صداقت پہ دلیل تصور کرنے لگے تھے۔دوسری طرف روم کے عیسائی اگرچہ اپنی رسوم اور تحریفات کے حوالے سے چاہے جتنا بھی شرک کر لیں ان کا الہامی دین اپنے اصول کے لحاظ سے بہرحال دین توحید تھا اور مسلمان بھی چونکہ اہل مکہ کو دین توحید کی طرف دعوت دے رہے تھے اس لیے انہوں نے خود سے ہی یہ تصور کر لیا کہ اہل رومہ کی شکست بہرحال اہل مکہ کی بھی

نظریاتی شکست ہے اور مسلمانوں نے بھی اس پہ کوئی اعتراض نہ کیا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ جو قوم آخرت پہ ایمان رکھتی ہو ایک خدا کو پوجنے والی ہو وحی اور رسالت کو سرچشمہ ہدایت تصور کرتی ہو اس کی شکست پہ ان کا افسردہ ہونا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ جب سورہ روم کی مندرجہ بالا آیات اتریں تو اہل مکہ نے پھر سے مسلمانوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اس لیے کہ ان آیات میں جن حالات کی پیش گوئی کی گئی تھی بظاہر دور دور تک اس کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور اُبی بن حلف کے مابین بھی اس مسئلے پہ تقرار ہوئی تو ان کے مابین یہ شرط طے ہو گئی کہ اگر دس سالوں کے اندر رومی غالب آ گئے تو ابی بن حلف حضرت ابوبکرؓ کو سو اونٹ ادا کرے گا دوسری صورت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اس شرط کو پورا کریں گے۔

ایران اور روم کی اس باہمی چپقلش کا آغاز نبی مکرم ﷺ کے اعلان نبوت سے آٹھ سال قبل اس وقت ہوا جب خسرو پرویز ایران کے تخت پہ جلوہ افروز ہوا۔ اس سلسلے میں روم کے قیصر ماریس نے اس کی سیاسی مدد کی تھی۔ چنانچہ خسرو اس قیصر کو اپنا محسن اور مددگار تصور کرتا تھا مگر روم کی ریاست میں بغاوت ہوئی اور قیصر ماریس کو اس کے تمام بیٹوں سمیت قتل کر کے فوکاس تختِ روم پہ قابض ہو گیا۔ خسرو پرویز کو اس بات کا رنج تھا اور اب اس کے پاس روم پہ حملہ کرنے کا ایک اخلاقی جواز بھی موجود تھا جس کو اس نے ضائع کرنا پسند نہ کیا اور اپنے روائتی حریف پر حملہ کر دیا۔ ایک سال کے اندر ہی خسرو پرویز کی فوجوں نے فوکاس کی رومی افواج کو پے در پے شکستیں دیں اور ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسیا تک اور دوسری طرف شام میں حلب تک ایرانی افواج قابض ہو گئیں۔ روم کے اربابِ اختیار دیکھ رہے تھے کہ فوکاس شاید ملک کو اس ایرانی حملے سے محفوظ نہ رکھ سکے چنانچہ انھوں نے افریقہ کے گورنر سے مدد طلب کی جس نے اپنا نوجوان بیٹا ہرقل ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے ساتھ رومیوں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ فوکاس کو نہ صرف معزول کیا گیا بلکہ اس کو اس کے بیٹوں سمیت قتل کر کے ہرقل کو رومی تخت پہ بٹھا دیا گیا۔

اب شاہ ایران کے پاس وہ اخلاقی جواز باقی نہ رہا تھا جس کے تحت اس نے سلطنت روم پہ حملہ کیا تھا مگر اس کے باوجود ایرانی افواج نے جنگ بند کرنے کا کوئی عندیہ نہ دیا اور وہ بدستور آگے بڑھتے رہے۔ اب شاہ ایران نے مجوسیت اور مسیحیت کے درمیان جنگ کا نعرہ لگایا تو کئی عیسائی فرقے جن کو روم کی ریاست نے ملحد قرار دے رکھا تھا وہ اہل ایران کے ساتھ ہو گئے۔ دوسری طرف عیسائیوں کے بڑے دشمن یہودی بھی ہزاروں کی تعداد میں ایرانیوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ ہرقل اس سیلاب بے پناہ کا سامنا نہ کر

سکا اور پہلے انطاکیہ پھر دمشق اور آخر میں بیت المقدس پہ بھی ایرانیوں نے قبضہ کرلیا۔انھوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھادی اور ایک دن میں نوے ہزار عیسائی صرف بیت المقدس کے شہر میں قتل کیے گئے وہ عیسائیوں سے ان کی مقدس صلیب بھی چھین کر لے گئے جس کے متعلق عیسائیوں کا دعویٰ تھا کہ مسیح کو اس صلیب پہ مصلوب کیا گیا تھا۔تاریخ کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ تقریباً انھیں دنوں میں مکہ معظّمہ میں ایک اور اس سے بدر جہا زیادہ تاریخی اہمیت کی حامل جنگ برپا تھی۔ جہاں توحید کے علمبردار سیّدنا محمد ﷺ کی قیادت میں اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی راہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبشہ کی عیسائی سلطنت میں پناہ لینا پڑی جو روم کی حلیف ریاست تھی اس وقت روم پر ایرانی قبضے کا بڑا چرچا تھا۔مکے کے مشرکین اس پہ بغلیں بجا رہے تھے اور ایران کی اس فتح پہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔مومنین کو اگرچہ سورۃ روم کی ان آیات پہ پختہ یقین تھا کہ وہ پیشگوئی ضرور پوری ہوگی اور رومی عنقریب غالب آئیں گے مگر ظاہراً ہر آنے والا دن اپنے ہمراہ بری خبریں لا رہا تھا اور ایرانی رومی سلطنت میں دور تک جا اترے تھے۔ان کی فتوحات کا سلسلہ تھمنے میں نہ آتا تھا ایک طرف اس آیت میں مسلمانوں کے لیے فتح کی بشارت تھی تو دوسری طرف رومیوں کے ایرانیوں پہ غلبے کی اطلاع مگر مکہ میں مٹھی بھر مسلمان کفارِ قریش کی ظلم کی چکی میں پس رہے تھے تو دوسری طرف پورا مصر بھی ایران کے قبضے میں چلا گیا تھا ۶۱۹ء تک مجوسی افواج طرابلس تک پہنچ چکیں تھیں اور رومیوں کے دارالحکومت کے دروازوں پر دستک دے رہیں تھیں۔

ہرقل نے دل سے شکست قبول کرلی تھی اور خسرو کے پاس صلح کی التجا کے لیے وفد بھی روانہ کیا جسے خسرو نے پوری رعونت کے ساتھ رد کردیا۔مشہور مغربی مورخ (Gubben) لکھتا ہے قرآن کی اس پیش گوئی کو بھی آٹھ سال گذر چکے تھے مگر رومیوں کے غلبے کا کوئی امکان دور دور تک نظر نہ آتا تھا۔ہرقل بری طرح دلبرداشتہ تھا اور اپنے دارالحکومت کو چھوڑ جانا چاہتا تھا کہ چند ہی مہینوں میں حالات نے پلٹا کھایا اور نبی مکرم ﷺ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تو ہرقل بھی خاموشی سے قسطنطنیہ سے نکلا اور بحر اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے ایرانی افواج کی پشت پہ ڈیرے ڈال دیئے اور ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔قیصر نے رومی کلیسا سے سود پہ بہت بڑی رقم حاصل کی اور مسیحی کلیسا کے اسقف اعظم سرجیس نے بھی مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے ہرقل کا بھرپور ساتھ دیا جس کے نتیجے میں ہرقل نے

پوری تیاری کے ساتھ آرمینیا سے اپنا حملہ شروع کیا اور ایک طوفان کی طرح بڑھتا ہوا آذربائیجان میں گھس گیا جہاں اس نے زرتشت کے جائے پیدائش اورمیا کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ایرانیوں کے آتش کدے بجھا کے رکھ دیئے اسے قدرت کا کرشمہ کہیے یا اعجازِ قرآنی کہ انھیں دنوں میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین مکہ کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی اس طرح وہ دونوں پیش گوئیاں پوری ہوئیں جو سورہ روم میں کی گئی تھیں۔ پھر رومیوں کی فوجیں ایرانیوں کو دباتی چلیں گئیں انھوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ کے رکھ دی اور اپنی مقدس صلیب اور بیت المقدس کا قبضہ بھی دوبارہ حاصل کرلیا۔ ہرقل اِن دنوں ایران کے خلاف اس عظیم فتح کے شکرانے کے لیے حمص سے بیت المقدس آیا ہوا تھا جب نبی مکرم ﷺ کے سفیر دحیہ کلبیؓ نے اسے آپ ﷺ کا دعوتی پیغام پہنچایا۔ قیصر نے نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ کے سفیر کا خوب اکرام کیا اور حکم دیا کہ بڑا دربار آراستہ کیا جائے بعدازاں اس نے خط پڑھنے کا حکم دیا جس کا متن یہ تھا۔

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان ہے اور نہایت رحم والا ہے محمد کریم ﷺ کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اسلام لے آ تو سلامت رہے گا خدا تجھ کو دوگنا اجر دے گا اور اگر تو نہ مانا تو سب اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی پوجا نہ کریں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کا شریک نہ بنائے اور اگر تم نہیں مانتے تو گواہ رہنا کہ ہم تو مانتے ہیں''۔

□□□□□□□

قیصر نے اس پہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے سفیر نبی ﷺ سے کہا کہ میں جانتا تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن میں یہ خیال نہ کرتا تھا کہ وہ اہل عرب میں سے ہوگا اگر میں وہاں جا سکتا جہاں تمہارے پیغمبر مقیم ہیں تو میں خود ان کے پاؤں دھوتا۔ قیصر کے ان خیالات اور نامہ مبارک میں دی گئی دعوت سے بطارقہ اور اس کے اہل دربار سخت برہم ہو چکے تھے۔ قیصر نے یہ حالات دیکھتے ہوئے اہل عرب کو دربار سے اٹھا دیا سب حالات اسی

بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قیصر کا دل اسلام کی روشنی اور حقانیت تک پہنچ چکا تھا۔مگر تاج وتخت کی چمک دمک میں ایمان کی یہ چنگاری بجھ کے رہ گئی اور آنے والے دنوں میں روم کے قیصر بھی اسلام کے اتنے ہی دشمن ثابت ہوئے جتنے کہ ایران کے آتش پرست تھے۔بعثتِ نبوی کے وقت دنیا میں دو ہی قابل ذکر ریاستیں موجود تھیں جن میں ایک روم اور دوسری ایران کی مجوسی ریاست تھی۔راس وقت دنیا میں صرف دو ہی تمدن موجود تھے آدھی دنیا پر رومی تمدن چھایا ہوا تھا تو باقی آدھی دنیا میں ایرانی تمدن موجود تھا۔ملک عرب تو بالکل ہی کسمپرسی اور تاریکی کے عالم میں پڑا تھا۔پھر اللہ نے ان پہ رحم فرمایا اور محمد ﷺ کو ان میں معبوث فرمایا اور اسلام کے ذریعے ایک دین ابراہیم علیہ السلام کی گئی جس نے الگ سے ایک نئے تمدن کی بنیادوں کو استوار کرنا شروع کیا تو اہل روم اور ایران کے ساسانیوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں اسلام کا یہ نیا سیلاب ان کے تمدن کو ہی نہ بہا کرلے جائے۔چنانچہ یہ دونوں بڑی ریاستیں اسلام کی راہ میں دیوار بن کر کھڑی ہوگئیں اور اس کی بیخ کنی کے لیے اپنے تمام وسائل جھونک دیئے۔

یہ الگ بات ہے کہ اس پتھر سے سر ٹکرا کے وہ خود زمین پہ آرہے۔پہلے ان لوگوں نے اسلام کی نظریاتی اساس کو سیاسی،سماجی،معاشی اور اخلاقی سطح پر جدوجہد سے ختم کرنے کوشش کی پھر ناکامی کی صورت میں وہ خود بدستِ شمشیر میدان میں نکل آئے اور یوں اس جنگ کا آغاز ہوا جس کے آخیر میں نہ ایران کی ساسانی ریاست کا کچھ پتہ چلا نہ روم کی عیسائی ریاست کا۔ایران کی ساسانی ریاست سے مسلمانوں کا باقاعدہ ٹکراو نبی مکرم ﷺ کے وصال کے بعد شروع ہوا تاہم روم کی عیسائی ریاست سے مسلمان خود آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں دوبدو ہو چکے تھے اور اس سلسلے میں مسلمانوں کا رومی افواج سے پہلا باقائدہ ٹکراؤ رومی سلطنت کے صوبہ شام کے ایک مقام موتہ میں ہوا جس کی تفصیلات کچھ یوں ہیں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے نبی مکرم ﷺ نے مکہ کے اطراف اپنے دعوتی وفود روانہ کئے تھے ان میں سے ایک صحابی حارث بن عمیرؓ آپ ﷺ کا نامہ مبارک لے کے بلقاء کے رئیس شرجیل بن عمرو کے پاس پہنچے جو ایک عرب عیسائی قبیلے کا سربراہ تھا اور علاقے میں اس کی حیثیت رومی سلطنت کے نائب جیسی تھی مگر اس بدبخت نے حضرت حارث بن عمیرؓ کو قتل کر دیا ہر چند کہ عہد جاہلیت میں بھی سفیر کا احترام کیا جاتا تھا اور کو قتل کرنے کا دور دور تک کوئی رواج نہ تھا۔چنانچہ حضرت حارث بن عمیرؓ کا قصاص لینے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے تین ہزار صحابہؓ پہ مبنی ایک فوج شام کی طرف روانہ کی۔شرجیل کو مسلمانوں کی روانگی کی اطلاح مل چکی تھی اور وہ ان کا

مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔اس نے ایک لاکھ کے قریب فوج جمع کر رکھی تھی۔موتہ کے مقام پہ مقابلہ ہوا مسلمان بہت پامردی سے لڑے مگر ایک لاکھ اور تین ہزار میں کوئی نسبت نہ تھی اس لیے حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ جیسے اکابرین کی شہادت کے بعد جب فوج کی کمان حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ آئی تو انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ فوج کو اکٹھا کیا جائے اور پسپائی اختیار کی جائے تاکہ نقصان بھی کم ہو اور اگلے حملے کی تیاری بھی کی جا سکے چنانچہ وہ اپنی فوج کو ایک لاکھ کی جمعیت سے بہ حفاظت نکالنے میں کامیاب رہے اور اس کو نبی اکرم ﷺ نے ان کی فتح قرار دیا۔

موتہ میں مسلمانوں کے بہ حفاظت نکل جانے کا دکھ رومی افواج کو چین نہ لینے دیتا تھا چنانچہ تھوڑے ہی عرصے بعد مدینے میں شام کے غسانی قبائل کی تیاری اور رومی افواج کی پشت پناہی کی اطلاعات آنے لگیں تھیں۔اللہ کے رسول محمد ﷺ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا ان دنوں قحط اور سخت گرمی کا زمانہ تھا اور جنگ کے لیے حالات کسی طور بھی مناسب نہ تھے اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ یہ نہ چاہتے تھے کہ رومی ان پہ حملہ آور ہوں بلکہ وہ خود پہل کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ نہایت مشکل حالات میں اس غزوہ کی تیاری کی گئی بہت سے لوگ اپنی غربت اور سواری نہ ہونے کی وجہ سے لشکر کے ساتھ نہ جا سکے اس لیے اس غزوہ کو غزوہ عسرت بھی کہا جاتا ہے۔منافقین نے پہلی دفعہ کھل کے اپنی پالیسی کا اظہار کیا وہ خود جنگ پہ جانے کو آمادہ نہ تھے اور دوسرے لوگوں کو جنگ پہ جانے سے روکتے تھے۔اہل شام یعنی روم کی سلطنت کے ایک گورنر سے براہ راست لڑنے کے لیے اہل اسلام کا لشکر مدینہ سے پوری شان کے ساتھ روانہ ہوا۔تیس ہزار کے قریب جانثار پروانے اپنی شمع پہ قربان ہونے کو بے چین تھے اور آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔

آپ ﷺ نے تبوک پہنچ کے ڈیرے ڈالے مگر ہیبت نبوی ﷺ سے بیس دن تک کسی رومی لشکر کو مسلمانوں پہ حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔بہت سے نزدیکی قبائل مطیع ہوئے اور جزیہ دینا قبول کیا۔آخر بیس روز قیام کے بعد نبی مکرم ﷺ نے اپنی افواج کو وہاں سے واپسی کے لیے کوچ کا حکم دیا اور اس بغیر کسی جنگ کے مسلمان افواج واپس مدینہ پہنچ گئیں۔رسول اللہ ﷺ اپنے غلام زید بن حارثہؓ سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں بھولے نہ تھے۔چنانچہ اگلے سال آپ نے ایک لشکر زید بن حارثہؓ کے بیٹے اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں ملک شام کی طرف روانہ کرنے کا ارادہ کیا لشکر اس وقت روانگی کے لیے تیار تھا جب آپ ﷺ کو اس مرض نے گھیرا جس کی بنا پہ آپ پردہ فرما ہوئے۔اسامہؓ کا لشکر مدینہ سے باہر پڑاؤ ڈالے کسی اچھی خبر کا منتظر تھا مگر

انھیں ایک بری خبر کا سامنا کرنا پڑا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے وصال فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بارِ خلافت اٹھایا اور حضرت اسامہؓ کے لشکر کو روانہ فرمایا جس نے رومیوں سے خوب جنگ کی اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ شاندار فتح اور بہت سے مال غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس پہنچے اور سچ تو یہ ہے کہ اہل اسلام کو اِن دِنوں ان دونوں چیزوں کی بہت ضرورت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ رومی خطرے سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے انھوں نے خالد بن ولیدؓ کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ شام کے سرحدی علاقوں میں رومی افواج کو الجھائے رکھیں اور میدان جنگ کو پھیلا دیں تاکہ انھیں وقت مل جائے اور وہ حضرت خالدؓ کی مدد کے لیے کوئی بڑی فوج روانہ کر سکیں۔ آخر خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیقؓ حالات پہ قابو پانے میں کامیاب رہے اور انھوں نے رومیوں سے مقابلے کے لیے مدینہ سے لشکر روانہ کرنے شروع کئے۔ انھوں نے عکرمہ بن ابی جہلؓ کو فوراً حضرت خالد بن ولیدؓ کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ عمرو بن العاصؓ کو ایک اور لشکر دے کر ملک شام کو روانہ کیا تاکہ رومیوں سے بھرپور جنگ کا آغاز کیا جا سکے۔ عمرو بن العاصؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے فلسطین کی طرف سے رومی ریاست پہ حملہ آور ہونے کو کہا یزید بن ابی سفیانؓ کو ایک اور لشکر دے کر کہا کہ تم دمشق کی طرف سے حملہ کرو اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو لشکر دے کر حمص پہ حملہ کرنے کو روانہ فرمایا۔ شرجیل بن حسنہؓ بھی روم پہ حملہ کرنے کے لیے اپنے لشکر کے ہمراہ نکلے ان کو اردن کی طرف سے حملہ کرنے کا حکم تھا۔ ہرقل کو مسلمانوں کی ان تیاریوں کی خبریں مل رہی تھیں اور وہ مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ چنانچہ یرموک کے میدانوں میں اس عظیم جنگ کی بنا پڑنے والی تھی جس میں فیصلہ ہونا تھا کہ اس تمام علاقے میں اب رومی تمدن و تہذیب زندہ رہے گا یا اسلام کا نوزائیدہ نظام حیات ان کا طرزِ زیست ہوگا۔ چنانچہ اگلے کئی دن کی جنگ نے فیصلہ کر دیا کہ آنے والا وقت اب صرف اسلام کا ہے اور اس خطہ میں اسلام کے نظریہ کے سوا کسی نظریہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ یرموک کے میدان میں مسلمان افواج نے فتح حاصل کی اور ایک لاکھ چالیس ہزار رومی اس جنگ میں مقتول ہوئے۔

اس کے بعد ان جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کے اختتام پر رومی سلطنت تاریخ کے صفحات سے حرف غلط کی طرح مٹ کے رہ گئی۔ اب ہر طرف اسلام ہی کا بول بالا تھا اور آئے دن رومی کسی نہ کسی میدان میں مسلمانوں سے مغلوب ہو رہے تھے۔ یرموک کے بعد دمشق فتح ہوا، دمشق کے بعد فحل اس کے بعد بیسان اس کے بعد صیداء اس کے بعد عرقہ اس کے بعد جبل اور اس کے بعد بیروت کو بھی اسلامی فوجوں نے اپنے قدموں تلے

روند ڈالا۔ پھر حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ نے حمص کو فتح کیا حضرت خالد بن ولیدؓ نے قنسرین کو بھی فتح کر لیا۔ رومی سربراہ قیصر ہرقل دربدر مسلمانوں کی افواج سے بھاگتا پھر رہا تھا۔ قیصر اب حلب میں تھا چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ نے حلب کا محاصرہ کرلیا حلب فتح ہوا تو قیصر بھاگ کر اپنے ایشیائی دارالحکومت انطاکیہ میں جا کے پناہ گزین ہوگیا پھر انطاکیہ بھی فتح ہوگیا ایک اور محاذ پر معاویہ بن ابی سفیانؓ نے قیصاریہ اور اجنادین میں رومی عیسائی فوجوں کو نہایت واضح شکست سے دوچار کیا اور اب اسلامی فوجیں بیت المقدس کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ عمرو بن العاصؓ نے بیت المقدس کے نزدیکی علاقے غزہ، سبط، نابلس، لد، عمواس، جبرین اور یافا پر قبضہ کرلیا تھا اور بیت المقدس اب حضرت ابوعبیدہؓ کے محاصرے میں تھا۔ بیت المقدس کے عیسائی راہبوں نے مشروط طور پہ شہر کا کنٹرول مسلمانوں کے حوالے کرنے کا عندیہ دیا ان کی بہت سی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ شہر کی چابیاں حضرت ابوعبیدہؓ کی بجائے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کے حوالے کریں گے اور معاہدے کی شرائط بھی انہی کے ساتھ طے کریں گے۔ چنانچہ اس امر کی اطلاع خلیفہ حضرت عمرؓ کو کردی گئی تو وہ ستوؤں کا ایک تھیلا ایک اونٹ ایک غلام اور ایک لکڑی کا پیالہ ہمراہ لے کر بیت المقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ میں حضرت عثمان غنیؓ کو اپنا نائب مقرر کیا۔

آپ کے اس سفر کی سادگی اور جفاکشی خلافت راشدہ کے دور کی اصل تصویر پیش کرتی ہے کبھی غلام اونٹ کی مہار پکڑ کر چلتا ہے تو خلیفہ سوار ہوتا ہے۔ کبھی عرب و عجم کے سربراہ خلیفۃ المومنین حضرت عمرؓ نے اونٹ کی مہار تھام رکھی ہے اور اونٹ پہ ان کا غلام سوار ہے۔ یہ وہ سفر تھا کہ جس نے مساوات کا وہ معیار قائم کیا جس کی مثال معلوم انسانی تاریخ سے دینا ممکن نہیں۔ عرب و عجم کے لوگ اگر چند افراد پر دسترس حاصل کرلیں تو ان کی رعونت دیکھی نہیں جاتی مگر یہاں وہ شخص اپنے غلام کے اونٹ کی مہار تھامے ہوئے تھا جس کی فوجوں نے قیصر و کسریٰ کے محلات اور تخت و تاج کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ سنہ سولہ ہجری ماہ رجب میں آپ بیت المقدس کے علاقے میں داخل ہوئے۔ اتفاق سے اس وقت اونٹ پہ سوار ہونے کی باری غلام کی تھی۔ چنانچہ اسلامی فوج کے وہ لوگ جنہوں نے اپنی آنکھوں سے خلیفۃ المسلمین کی زیارت نہ کی ہوئی تھی وہ دھوکہ کھا کر سوار کی طرف لپکے۔ مگر حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت یزید بن ابی سفیانؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ اس شخص کی طرف بڑھے جس نے اونٹ کی مہار تھام رکھی تھی کہ یہی ان کے محبوب سربراہ اور مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمرؓ تھے۔ اگرچہ چہرے پہ سفر کی گرد جسم پہ صحرا کی تھکن تھی مگر اپنے ان سرداروں کو قیمتی عجمی لباس پہنے

دیکھا تو اپنے جلال میں واپس آ گئے اور ان کی سرزنش کی تم نے دو ہی سال میں عجمی خو بو اپنا لی ہے تو انھوں نے اپنے لباس کے نیچے پہنے ہتھیار خلیفہ کو دکھائے تب ان کی گلو خلاصی ہوئی۔ آپ مقام جابیہ میں مقیم ہوئے اور یہیں روساء بیت المقدس سے ملاقات کی اور ان سے معاہدہ کیا جس کو مورخین نے محفوظ رکھا۔ پیش خدمت ہے۔

''یہ وہ امان نامہ ہے جو امیر المومنین حضرت عمرؓ نے ایلیا والوں کو دیا ہے۔ ایلیا والوں کو جان ، مال، گرجے، صلیب، بیمار، تندرست سب کو ایمان دی جاتی ہے اور ہر مذہب والے کو امان دی جاتی ہے ان کے گرجاؤں میں سکونت اختیار نہ کی جائے گی، اور نہ ان کو مسمار کیا جائے گا یہاں تک کے ان کے احاطوں کو بھی نہ چھیڑا جائے گا نہ ان کی صلیبوں اور مالوں میں کسی طرح کی کمی کی جائے گی، نہ مذہب کے معاملے میں کسی قسم کا تشدد کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کوئی کسی کو ضرر پہنچائے گا، اور ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے اور ایلیا والوں پہ فرض ہے کہ وہ جزیہ دیں اور یونانیوں کو ملک سے نکال دیں۔ پس یونانیوں یعنی رومیوں میں سے جو شہر سے نکل جائے گا اس کے جان و مال کو امان دی جائے گی جب تک کہ وہ محفوظ مقام تک نہ پہنچ جائے اور اگر کوئی رومی ایلیا میں ہی رہنا چاہے تو اسے باقی اہل شہر کی طرح جزیہ ادا کرنا ہو گا یہاں سے اگر کوئی شخص یعنی اہل ایلیا میں سے رومیوں کے ساتھ جانا چاہے تو اس کو بھی امن و امان ہے یہاں تک کہ وہ محفوظ مقام پر پہنچ جائیں جو کچھ اس عہد نامے میں درج کیا گیا ہے اس پہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور خلیفہ حضرت عمرؓ اور تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے بشرطیہ کہ اہل ایلیا مقررہ جزیہ کی ادائیگی سے انکار نہ کریں۔[*27]

اس عہد نامے پر حضرت خالد بن ولیدؓ، عمرو بن العاصؓ، عبدالرحمان بن عوفؓ اور معاویہ بن ابی سفیانؓ نے بطور گواہ دستخط کئے۔ بیت المقدس کے عیسائیوں نے جزیہ ادا کیا اور شہر کی چابیاں حضرت عمرؓ کے حوالے کر

دیں گئیں۔شہر کے دروازے کھل گئے اور فاروق اعظمؓ پا پیادہ بیت المقدس میں داخل ہو گئے۔مسجد اقصیٰ میں گئے اور محرابِ داؤد کے پاس پہنچ کے سجدہ داؤد کی آیت پڑھ کے سجدہ کیا۔پھر عیسائیوں کے گرجے میں گئے اور سیر کر کے واپس آ گئے۔اس طرح عیسائیوں کی وہ عظیم سلطنت بھی سرنگوں ہوئی جو آدھی دنیا پہ قابض تھی۔اسلام کا جھنڈا سر بلند ہوا اور اس کی حقانیت مزید نکھر کے دنیا کے سامنے آئی۔لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور جوق در جوق اس کی رحمت اور عافیت میں پناہ تلاش کرنے لگے۔روم کی عظیم سلطنت تاریخ کے صفحات سے ایسی غائب ہوئی کہ اس کا تذکرہ اب صرف داستانوں میں باقی رہ گیا۔حضرت عمرؓ نے بیت المقدس والوں سے جو معاہدہ کیا اس کی نرمی میں مسلمانوں کے عفو درگذر کی حقیقی تصویر سامنے آتی ہے جو ان کے اعلیٰ اخلاق اور کردار کا بین ثبوت پیش کرتی ہے۔کسی مفتوح قوم کے تین بنیادی حقوق ہوتے ہیں یعنی ان کی جان کو امان ان کے مال کو امان اور ان کے عقائد کو امان،مسلمانوں نے اس معاہدے میں دشمن کی یہ تینوں چیزیں محفوظ کیں یہودیوں کا بیت المقدس سے اخراج عیسائیوں کی رعایت سے تھا اس لیے کہ وہ ان کے قومی اور مذہبی دشمن تھے۔یونانی گو مسلمانوں کے حریف اور مقابل تھے مگر ان کو بھی اہل ایلیا ہی کی طرح امان دی گئی اور یہاں سے نکل جانے صورت میں بھی ان کی جان مال اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ لیا گیا۔ایک غیر قوم اور غیر مذہب کے ساتھ اس سے زیادہ منصفانہ سلوک کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔آج اگر مغربی اقوام اپنے ارادے اور عمل کو مسلمانوں کی اس رواداری اور مروّت کے معیار پہ پرکھیں تو ان کو اپنا حقیقی چہرہ نظر آئے گا جو یقیناً بہت بھیانک ہوگا[28*]۔

خالق کی تلاش (مقدمہ حصہ دوم)

سائنس اور فلسفے کے کائنات اور انسان کے مابین تعلق کی بابت الجھے ہوئے نظریات اور قرآن کا فلسفہ کائنات ۔ایک ایسا مطالعہ جو بہت سے سوالات کے جواب سمیٹے ہوئے ہے۔

طالب نگاہ

نگاہ کی مستی، دل میں سرور، آنکھ سے اَشک، علم سے عرفان، یقین کی دولت، وصل کی لذت، فراق کے معنی ،مجاز سے حقیقت، عشق سے جنوں اور گریز سے وارفتگی تک کے سب مراحل ارتکازِ نگاہ کے مرہونِ منت ہیں کہ اگر نگاہ سے درِ خالق اوجھل ہو جائے تو انسان اُن بے رحم راہوں پہ جا نکلتا ہے جہاں وہ اپنی ذات کے دروں اتنے زخم کر لیتا ہے کہ اسے پھر سے ایک مسیحا کی تلاش میں نکلنا پڑتا ہے تلاش کی اس راہ میں جب اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے شکر کا یہ جذبہ اس کے اندر اس احساس و ادراک کو جنم دیتا ہے جو اسے خالق کے رحم اور اس کے قہر سے آشنا کرتا ہے یہ ادراک اب اس کی ذات پہ اس طرح سے چھا جاتا ہے کہ کبھی تو وہ خدا کے قہر اور اس کی قوت کے خوف سے مغلوب ہو کے روتا ہے تو کبھی اس کے رحم اور محبت کے بے انت بہاؤ میں کسی ادنیٰ تنکے کی طرح بہتا ہے اور پھر روتا ہے اس کے یہ دونوں طریقِ اَشک خالق کی خصوصی توجہ کی وجہ بنتے ہیں اور خالق اسے سیدھی راہ پہ استقامت عطا فرما دیتا ہے۔ تاریخ انسانی کی دبیز تہوں میں خالق کی تلاش کے تمام ارتقائی مراحل رقم ہیں کسی خالق کی تلاش، کسی مسیحا کی کھوج

،کسی ماورائی طاقت کی جستجو اس زمانے سے جاری ہے جب انسان اپنے دو پاؤں پہ کھڑا ہوا اور اس کے ذہن نے سوچ کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ابتدائی طور پہ اس کے خالق کا تصور بھی اس کی سوچ ہی کی طرح پست تھا اس دور کا انسان بے سروسامان تھا، نہتا تھا، کمزور تھا اس لیے خوف کی ایک چادر نے اسے گھیرے ہوا تھا ،اس خوف سے نجات کے لیے اس نے کئی طاقتوں کی بیک وقت پوجا اور عبادت کا اہتمام کیا جس نے اسے اس خوف سے قدرے نجات دلائی اور انسان نے مذہب کے ابتدائی خدوخال وضع کیے۔

اس نے ہر اس درخت کو پوجا جس کی اونچائی کچھ زیادہ تھی اور وہ پھیلاؤ میں دوسرے درختوں سے ذرا بڑا تھا، اس نے سانپ کو پوجا، ہاتھی کو پوجا، گائے کی پوجا کی، آگ کی پوجا کی، سورج کو سجدہ کیا چاند کو پوجا، آسمان کو پوجا، عضو تناسل کو پوجا، دریاؤں، پہاڑوں، ستاروں، سیاروں، سمتوں اور ہواؤں کی پوجا کی، پہلے بڑے بڑے پتھروں کو پوجا پھر ان کی کانٹ چھانٹ کرکے بدہیئت معبود تراشے اور ان کو سجدہ کیا۔اس نے اپنے آباء کی پوجا کی، اپنے مشاہیر اور بہادروں کی پوجا کی، حتیٰ کہ طویل عرصہ تک ان کے حکمران بھی ان کے معبود بنے رہے۔ہمیشہ سے اور ہر دور میں اس کی ذات کے اندر کسی کی پوجا کے مچلتے جذبات اور خواہش نے اسے چین نہ لینے دیا اور وہ پوجا کیے گیا یہ جانے بغیر یہ سوچے بغیر کہ اس کا معبود ایک بدہیئت اور سخت پتھر ہے یا وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے جسے اس نے خود ہی بھڑکایا ہے۔

آغاز کائنات اور قرآن

تاریخ کا ایک اور در کھلتا ہے اور ہمیں اپنی عمیق گہرائیوں میں لے جاتا ہے جہاں اندھیرا تھا، سردی تھی ،کائنات تازہ تھی اور ٹھنکتی تھی، تخلیق کائنات کے متعلق آج اگرچہ ہم کچھ نہ کچھ جانتے ہیں مگر ہزار سال پہلے مطلق اندھیرا تھا اور صرف قرآن ہی تھا جس نے ہمیں بتایا کہ:

ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا
قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۔

القرآن الحکیم (سورۃ حم سجدہ ۴۱ ؛ آیات ۱۱)

ترجمہ؛

’’پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور یہ دھواں تھا تو اللہ نے اسے اور زمین کو کہا کہ تم دونوں برضا یا بغیر رضا اطاعت کرو تو انہوں نے کہا ہم بخوشی اطاعت کرتے ہیں‘‘۔

آج کے انسان نے سائنس کے میدان میں ترقی کی بے پناہ منازل طے کی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہماری یہ کائنات شروع میں چند گیسوں کا مجموعہ تھی (ہیلیم اور ہائیڈروجن وغیرہ) اور یہ بادلوں کی شکل میں تھیں۔ پھر

ان بڑے بڑے بادلوں نے سکڑنا شروع کیا، خشک ہونا شروع کیا اور اس طرح اس پختگی کے نتیجے میں کائنات کی تخلیق کے ابتدائی مراحل کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال) پہلے کی بات ہے جب اس کائنات کا کوئی وجود نہ تھا، اس وقت ستارے تھے نہ سیارے مگر فضا میں ایک مادہ موجود تھا اس وقت یہ مادہ جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹون کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پہ پھیلا ہوا تھا گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے یہ کائنات بھری ہوئی تھی یہ بادل سے قدرے مشابہ تھا اور ہر طرف دھواں دھواں سا تھا قرآن نے اس کو لفظ ''دخان'' سے تعبیر کیا ہے۔

چنانچہ ذرات کا یہ غبار یہ دھواں یہ بادل اس وقت اپنے توازن میں تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی حرکت نہ تھی۔ علم سائنس یہ کہتا ہے کائنات کی تخلیق اس توازن میں اس خلل کی وجہ سے معرض وجود میں آئی جو اچانک ہی کہیں سے نمودار ہو گیا اور ذرات کے اس بادل میں اضطراب پیدا ہوا جس نے اس خلل کو جنم دیا جو بڑھتا ہی چلا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا اور ستارے سیارے اور سحابیئے وجود میں آ گئے۔ اس جمع شدہ مادے کے بہت سے حصے بکھرے ہو گئے ایک بہت بڑا حصہ سمندر میں گرا جو لاکھوں سال ٹھنڈا ہونے کے بعد زمین کی صورت وضع ہوا کئی حصے بدستور گرم ہی رہے جیسے کہ سورج اور کئی وقت کے ارتقاء کے ساتھ ٹھنڈے ہوتے رہے جیسے کہ چاند اور مریخ وغیرہ۔ ان ستاروں، سیاروں اور سحابیوں کی باہمی مقناطیسی کشش اور زمین کی کشش ثقل نے ان کو متحرک اور گھومتے ہوئے اجسام میں بدل دیا اور یوں وہ نظام شمسی وجود میں آیا جس کا مشاہدہ ہم شب و روز کرتے ہیں۔ دخان سے مراد ایسا دھواں ہے جس میں پانی ملا ہو یعنی بخارات والا دھواں۔ یہ وہ لفظ ہے جو مرطوب گیسوں کے معنی میں بھی بخوبی استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہی گیسیں وہ بنیادی مواد تھیں جن سے یہ کائنات وجود میں آئی مگر چونکہ آج سے ایک ہزار سال پہلے کائنات کے متعلق کسی بھی قوم کے پاس اس قسم کا کوئی تصور موجود نہ تھا اس لیے ان آیات کے درست مفہوم تک رسائی ممکن نہ تھی جو تخلیق کائنات کے متعلق تھیں اس وقت کی متمدن تہذیبوں یعنی رومنوں اور یونانیوں کے طریقیاتی علوم (Methodological Sciences) میں بھی اس طرح کا کوئی کائناتی تصور موجود نہ تھا۔ نہ بابلیوں میں اور نہ ہی میسوپوٹیمس کے ہاں اس طرح کا کوئی تصور پایا جاتا تھا اس لیے مترجمین قرآن اس امر پہ مجبور تھے کہ لفظ دخان کو سادہ ترین معنی میں بدلیں اور شاہ رفیع الدین

جیسے بلند پایہ عالم کو بھی لفظ ''دخان'' کے مقابل اردو زبان کے دامن سے کوئی ایسا لفظ نہ مل سکا جو اس کی اصل ماہیت سے قریب تر ہو۔ پھر اسی ترجمہ کو نواب وحید الزمان نے دہرایا کہ ''وہ بلند ہوا آسمان کو اور وہ دھواں سا تھا'' اور یہ ترجمہ پہلے سے بھی زیادہ اصل حقیقت سے دور ہو گیا اس پر تو اشتباہ عمومی پڑ گیا کہ وہ دھواں سا تھا حالانکہ قرآن نے کہا کہ ''ھی دخان'' اور کسی قسم کا ابہام نہیں چھوڑا۔ یعنی مرطوب اور بخارات والا دھواں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی سائنس گو بہت متمدن ہے مگر ابھی اس کو بہت سفر کرنا ہے اور تخلیق کائنات کے حقیقی منظر کے قریب پہنچنے کے لیے سائنس کی تھیوریاں قدرے ناپختہ اور نابالغ ہیں۔

اگر چہ سائنس اپنے درست رخ کی طرف سفر کر رہی ہے اور اس کی منزل ہے قرآن کے ایک ایک لفظ پہ مہر تصدیق ثبت کرنا۔ کیونکہ جب تک پورے قرآن کی حقانیت ثابت نہیں ہو جاتی، جب تک ایک آیت قرآنی میں بھی اشتباہ موجود ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس دنیا میں تحقیق و جستجو کے دامن کو تنگ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ قرآن ہر حال میں اپنی حقانیت کو پورا کرے گا اور اللہ ہر حال میں سچا ہے۔ اب چاہے اس جستجو کا سفر مسلمان طے کریں یا کافر۔

مسلمان ابھی غفلت میں ہے مگر کافر جستجو کے میدان میں قدم اٹھا رہا ہے۔ میں جب یہ الفاظ سپرد قلم کر رہا ٹھیک اسی وقت میرے کان بگ بینگ کے اس تجربے کی طرف بھی لگے ہوئے ہیں جس کا آنکھوں دیکھا احوال فرانس سے براہ راست میری پشت پہ میرا ٹیلی ویژن نشر کر رہا ہے۔ سولہ سال کی محنت، ہزاروں سائنس دانوں کی جستجو اور ستائیس ارب پونڈ لگا کے فرانس اور سویڈزر لینڈ کی سرحد پر پہاڑی علاقے میں ایک طویل سرنگ کھودی گئی۔ سرنگ کو تقریباً اسی درجہ حرارت تک ٹھنڈا کیا گیا جو بنگ بینگ کے وقت تھا پھر اس میں ایک بڑا دھماکہ کیا گیا اور یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ بگ بینگ کے چند لمحوں بعد کائنات میں کون کون سی کیمیائی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ابھی اس تجربے کی تفصیلی رپورٹ آنا باقی ہے مگر فوری طور پہ اس تجربے سے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ کائنات کا اختتام بھی ایک دھماکے پہ ہوگا اور یہ کہ کائنات بالآخر تباہ ہونے والی ہے اور فانی ہے۔ میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو مجھے اس امر تک پہنچنے کے لیے کہ یہ کائنات فانی ہے اور اس کا اختتام قریب ہے ستائیس ارب پونڈ تو کیا ایک پینی تک خرچنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی اور میں یقین کی ان سرحدوں کو پہنچ جاتا ہوں جہاں آج کا مغربی سائنس دان پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس بگ بینگ کے متعلق قرآ ن میں ارشاد ہے کہ:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الانبیاء ۲۱۔آیات ۳۰)

ترجمہ؛

"کیا یہ کافر لوگ دیکھتے نہیں کہ یہ زمین اور آسمان اکھٹے تھے پھر ہم نے انھیں پھاڑ کے الگ کر دیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا تو کیا وہ ایمان نہیں لاتے"۔

❑❑❑❑❑❑❑

اللہ پاک فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان پہلے اکھٹے تھے پھر ہم نے انھیں ایک دھماکے سے الگ کر دیا۔اس طرح کسی چیز کو پھاڑ کے الگ کرنا آسان نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف پروردگار ہی کی قدرتِ کاملہ کے تحت ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔بگ بینگ کے تصور تک سائنس تو بہت بعد میں پہنچی اول اول نوع انسانی کو اس کی اطلاع قرآن ہی نے فراہم کی اور آج اس کی جزیات کو بھی سائنس ثابت کر رہی ہے جو آگے بڑھتے ہوئے مزید دھماکوں کی نشاندہی کر رہی ہے۔اگر ہم مندرجہ بالا آیات کریمہ پہ تفکر کی ذرا گہری نظر ڈالیں تو ہم جانیں گے کہ ایک "Huge mass" ہے جو دامن سے باطن کو پھٹ کر جدا ہو رہا ہے اور اس سے ہمارے زمین و آسمان تخلیق ہو رہے ہیں۔تخلیق کائنات کے حوالے سے یہ نقطہ بھی قابل غور ہے کہ جب پروردگار عالم زمین و آسمان بنانے کی بات کرتا ہے تو ایک زمین یا ایک آسمان کی بات نہیں کرتا بلکہ سات آسمانوں اور سات زمینوں کی بات کرتا ہے چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا O

القرآن الحکیم (سورۃ الانبیاء ۲۱۔آیات ۲۹)

ترجمہ؛

"اللہ تو وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور سات زمینیں اور اس طرح کہ ان کے درمیان اس کا امر اترتا ہے تا کہ تم جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور بے شک اللہ نے اپنے علم کے ساتھ ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے"۔

❑❑❑❑❑❑❑

اگر چہ سائنس بہت عرصہ تک اس بات پہ مصر رہی کہ یہ سات زمینوں اور سات آسمانوں والی بات محض ایک افسانہ ہے۔ تاہم جب ان کے مشاہدے کو قدرے وسعت عطا ہوئی تو انھوں نے اس بات پہ غور کرنا شروع کیا اور اب ان کی سوچ قرآنی تصور کے قدرے قریب ہے اور وہ نظروں کے سامنے سجے اس نظام شمسی کے علاوہ دیگر گلیکسیز کے وجود کا یقین بھی حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ پاک مندرجہ بالا آیات میں فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان یعنی پوری کائنات کے مابین کوئی زمین ایسی نہیں کہ جہاں حیات کا بیج نہیں اگتا اور جہاں قانونِ خداوندی نہ اترتا ہو آج کی سائنس اپنی جستجو سے حاصل ہونے والی کامیابیوں کا موازنہ جب الہامی علوم سے کرتی ہے تو اسے اپنی تنگ دامانی پہ شرمندگی سی ہوتی ہے اس لیے کہ خالق کے وجود سے انکار اور اس سے بے اعتنائی کے رویہ نے جب اس کا عکس خود ان کے میدانِ جستجو میں اتارا تو ان کو اپنی فکری پستی پہ غور کرنا ہی پڑا اور کتنے ہی ایسے خوش نصیب سائنس دان ہیں جنھوں نے جب خالق کی جولانیوں کا مشاہدہ اس عقلی میدان میں کیا جہاں ان کے خیال میں روحانیت کا تصور تک ممکن نہ تھا تو وہ بے اختیار پکار اٹھے کہ ہاں ہم مان گئے کہ وہ خالق ہے اور ہم اس کی ادنیٰ اور بے مایہ سی مخلوق ہیں۔ آج کی تحقیق اور متعدد سائنسی انکشافات انگنت شمسی وجودوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ۔ ان کا نظام شمسی اور مجموعہ ہائے نجوم (Constellation) ہماری زمین اور ہمارے سورج سے ہی مشابہ ہے۔ اب سائنس برملا اس بات کے اعتراف پہ مجبور نظر آتی ہے کہ ہماری کہکشاؤں جیسے بے شمار سورجوں کا وجود ہے۔ اگر چہ اس وقت تک سائنس اس کائنات میں کسی دوسری حیات کا سراغ نہیں ڈھونڈ سکی اور نہ کسی اور دنیا میں زندگی کا ظہور دریافت ہو سکا ہے۔ دراصل ہم لوگوں کی محدود عقل و معرفت اللہ کی کائنات کو صرف ہمارے سامنے کی کائنات تک محدود کرتی ہے جب کہ "سبع سموات" سے مراد ایسی کئی کائناتیں ہیں اور دیگر زمینیں اور آسمان اس لیے بھی

ابھی انسانی آنکھ سے اوجھل ہیں کہ ہماری نظروں کے سامنے جو کائنات موجود ہے ابھی اس کی گہرائیوں پہنائیوں اور اتھاہ قوتوں کو سمجھنے میں بھی صدیاں گذر سکتی ہیں۔ آسمانوں کی بات کرتے ہوئے پروردگارِ عالم نے سماوات یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے اور پھر آسمان دنیا کا الگ سے تذکرہ فرمایا ہے کہ ہم نے اسے چراغوں سے سجایا ہے۔

اَوْحٰی فِی کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ O

القرآن الحکیم (حٰمٓ السّجدہ ۴۱۔آیات۱۲)

ترجمہ؛

''اور ہم نے ہر آسمان میں اپنا حکم نازل کیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے سجایا''۔

❑❑❑❑❑❑❑

اگر ہم اپنی ایک کھرب یا دو کھرب کے قریب کہکشانی وسعتوں کو دیکھیں تو ان میں ہمیں جو بے پناہ ارب ہا روشن سورج نظر آتے ہیں تو یہ آسمان دنیا کے چراغ ہیں۔ قرآن حکیم ان ستاروں کو جلتے ہوئے چراغ یا روشن شدہ چراغ کہتا ہے اور چاند کو منور شدہ۔ پورے قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں چاند کو از خود روشن کہا گیا ہو۔ چنانچہ اگر اللہ کے وجود کا کوئی اور ثبوت نہ ہوتا تو بھی یہی ایک حقیقت کہ پندرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے سورج اور چاند کے مابین اس فرق کو بیان کر دیا تھا انسان کو اللہ کی موجودگی اور اس کے وجود کا یقین دلانے کے لیے کافی تھی۔ جس طرح جوش ملیح آبادی نے کبھی کہا تھا کہ ہم جیسے اہل یقین کو ثبوتِ حق کے لیے اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی چنانچہ یہ کائنات جو اپنے خالق کے وجود کی دلیل ناطق ہے ابھی اپنے اندر آسمانوں اور زمینوں کے بے انت اسرار چھپائے بیٹھی ہے۔ درحقیقت پروردگارِ عالم کے نظام میں کوئی جھول کوئی کجی نہیں ہے اس لیے کہ وہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہے جسے عقل کی آنکھ سے جب چاہے پڑھا جا سکتا ہے اس کے لیے یہ بھی شرط نہیں کہ پڑھنے والا اعتقاد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال ہو جو اس کی وجہ شرف ہے اگرچہ بہتر یہی ہے۔ چنانچہ نظام کائنات کا کوئی بھی جز، کوئی بھی کُل، ذرا سی بھی غیر سائنسی یعنی غیر اصولی نہیں اس لیے اصول کی زبان ان گتھیوں کو سلجھا سکتی ہے جنہیں اسرارِ کائنات کہا جاتا ہے۔ ذرا غور سے

آفاق والنفس پہ نظر ڈالیں تو پروردگار کی ذہن کو مسحور کر دینے والی انگنت نشانیاں نظر کے سامنے دوڑ جائیں گی۔ چنانچہ انسان نے اللہ کی دی ہوئی عقل کو جب بھی اسرارِ کائنات پڑھنے کے لیے استعمال کیا ہے تو حجابِ کائنات سر کے ہیں۔ مثلاً ان نظری شہادتوں میں سے ایک شہادت ہبل ٹیلی سکوپ کے ذریعے ملی ہے کہ 11.5 بلین سال قبل کائنات میں پہلا دھماکہ ہوا جس سے کائنات کی عمر کا تعین کرنے میں مدد ملی اور ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ 15 بلین سال ہے۔

اگرچہ یہ کائنات ہمارے احاطہ علمی تک ہی محدود ہے مگر کل کو یہ صورت بھی سامنے آ سکتی ہے کہ ہم ایک کائنات کے کنارے پہ پہنچیں تو وہاں بے شمار کائناتیں ہماری منتظر ہوں کیونکہ اب یہ خیال تقویت پکڑ رہا ہے کہ بگ بینگ کے ذریعے صرف یہی ایک کائنات معرض وجود میں نہیں آئی تھی جس کا ہم نے تصور کیا ہوا ہے بلکہ کئی اور کائناتوں کا تصور بھی اب افسانہ نہیں رہا۔ اور قرآن تو پہلے ہی اس کے بارے میں اشارے کر چکا ہے۔ چنانچہ جلد ہی وہ وقت بھی آئے گا جب اس کائنات سے وراء مزید دنیاؤں میں ہنستی کھیلتی زندگی دریافت ہوگی اور اب یہ یقینی بات ہے صرف وہ وقت وہ فاصلہ وہ حجاب ابھی بیچ میں ہے جس کو سائنس اور علم کا نشتر چاک کرے گا۔

آج سائنس کو کتنی ہی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں کہ حیرت سے اہل مشاہدہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے مثال کے طور پہ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ آج سے 11.5 بلین سال پہلے جو دھماکہ (Big Bang) ہوا جس سے بے شمار (Galaxial Bodies) کا آپس میں تصادم ہوا۔ اس کی روشنی زمین تک اب پہنچی ہے اور اب آج کے سائنس دان اس بات کا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اگر ان کے پاس ہبل سے زیادہ طاقتور ٹیلی سکوپ موجود ہو تو وہ اس وقت کو بھی پا سکتے ہیں جب ہماری یہ کائنات شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ اتنے بڑے (Galaxial Order) پہ جہاں اس کی وسعتوں پہ فاصلے ختم ہو جاتے ہیں جہاں Space ختم ہو جاتی ہے جہاں زمانہ صرف ایک اکائی رہ جاتا ہے کہ جس سے ہم فاصلے ماپ سکتے ہیں اور اس اصول کے تحت معمولی سے معمولی فاصلے کو بھی ماپا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ان فاصلوں کی لامحدود وسعتوں کے پیش نظر (Light Year) نوری سال کی اصطلاح وضع کی گئی۔ مگر جب انسان نے روشنی کی شعاع سے چلتے ہوئے ایک سیکنڈ کو لے کر اس کی بنیاد پہ فاصلے گنے تو معلوم ہوا کہ یہ کائنات اتنی بڑی ہے کہ اس کی وسعت کے سامنے نوری سال کا پیمانہ بھی ناقص پڑ جاتا ہے اور اب سائنسدان روشنی کی رفتار کے بلین ایر پیکٹ کی تیاری

میں مصروف ہیں تاکہ کوئی ایسی اکائی وضع کی جاسکے جس کے بلین پیکٹ جمع کر کے ہم شاید کائنات کے ان وسیع ترین پیمانوں کو یا اس پھیلی ہوئی کائنات کی وسعتوں کو کسی قدر علم انسانی کے احاطہ میں لاسکیں۔جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ زمانہ اور سائنس یا تمام جدید علوم کا رخ یا قبلہ قرآن ہی کی طرف ہے۔اس لیے کافر ہو یا مسلمان جو بھی اسرارِ کائنات کی تحقیق میں لگا ہے وہ دراصل ان قرآنی گتھیوں ہی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے جن کی سمجھ کے لیے انسانی شعور ابھی ناپختہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ الہامی علوم تک درست رسائی کے لیے جس دقیق پس منظر اور جس گہرے تحقیقی شعور کی ضرورت ہے انسان کو اس رخ پہ سفر کرتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔اسی نقطہ نظر کے مطابق مندرجہ ذیل آیات پہ نظر ڈالیں۔

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ الذاریات ۵۱۔آیات ۴۷)

ترجمہ؛

”اور ہم نے آسمان کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور ہم ہی صاحبِ قدرت ہیں کہ کائنات کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں“۔

❑❑❑❑❑❑❑

تحقیق اس بات کی طرف روشنی ڈالتی ہے کہ سورۃ ”الذاریات“ کی یہ آیت سولہویں صدی تک ناقابلِ فہم تھی اور ہمارے علماء نے علم سائنس سے ناواقفیت کی بناپر اس کو متشابہات قرآن کہہ کے جان چھڑالی تھی اور تقریباً تمام مفسرین نے اس کا مفہوم زورِ بازو یا رزق لیا ہے جو کہ درست ترجمہ نہ تھا اور اسے محض لغوی مفہوم قرار دیا جاسکتا ہے۔چنانچہ حاملین قرآن اپنے علمی تنزل کی وجہ سے اس آیت کی حقیقی معنویت کو واضح کرنے کے قابل نہ ہوئے اور علم وحکمت کی یہ میراث اغیار کو منتقل ہوگئی تب یہ سعادت دورِ جدید کے مایہ ناز سائنس دان آئن سٹائن کے حصے میں آئی جب اس نے اپنی گہری تحقیق کے بعد مشہورِ زمانہ نظریہ اضافت پیش کیا جس میں اس نے کائنات کے پھیلاؤ کے اس تسلسل کی طرف اشارہ کیا جس نے اس آیت کے حقیقی معنوں کو واضح کیا۔ٹیکنالوجی کی اس تیز رفتار ترقی کے باوجود انسان کی تحقیقات بالآخر عرصہ زماں تک آکر رک جاتی ہیں اور

بغیر اذنِ پروردگار کوئی نیا نقطہ کوئی نئی تحقیق انسان کو نہیں بخشی جاتی۔ میں نے بارہا اس ضمن میں سوچا ہے اِک کسک اس بابت میرے دل میں ضرور رہی ہے کہ آخر ہر نئی تحقیق اہلِ مغرب ہی کو کیوں سونپ دی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میری اس الجھن کا جواب بھی مجھے قرآن ہی سے ملا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکمت کے جن معانی کو قرآن نے استعمال کیا ہے اس کے لیے مسلم و غیر مسلم کی کوئی قدغن ہی نہیں چنانچہ کتاب المرتبت قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

يُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ ۲-۲۶۹)

ترجمہ؛

''اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کی گئی اور نصیحت تو اہل عقل لوگ ہی حاصل کرتے ہیں''۔

❑❑❑❑❑❑❑

بدقسمتی کی بات ہے کہ ہمارے آباء نے اسلام کی اس مرکزی اساس کو نظر انداز کیا جو ایک مخصوص ذہنی رویے (Mental Apporach) کی تشکیل کرنا چاہتا تھا جس کی بنیاد تحصیل علم پہ ہو۔ ایمان ہی کی تعریف کو لے لیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے اس بابت سوال کیا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ ایمان ''بیم و رجا'' کے درمیان ہے۔ یعنی جسے تقدیر الٰہی کا خوف نہ رہا وہ بھی اللہ کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور جس پہ اس خوف کا غلبہ بڑھ گیا وہ بھی عمل اور امید سے دور ہٹ گیا الغرض اسلام کا ذہنی رویہ تحصیل علم سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں سے علم کی محبت اٹھ گئی اور تاج و تخت کی حب بڑھ گئی تو ان کا زوال شروع ہوا۔ حالانکہ ابھی کل کی بات لگتی ہے جب تقریباً تمام معلوم انسانی آبادیوں پہ مسلمان ہی حکومت کرتے تھے اور علم و عمل کا پیکر تھے۔ ایک وقت تھا جب دنیا میں تین ہی بڑی اور طاقتور حکومتیں اور حکمران تھے اور وہ تینوں ہی مسلمان تھے۔ جب یورپ پہ حماقتوں اور جہالتوں کا دور دورہ تھا تو اسلام کی عظمتوں کا یہ عالم

تھا کہ ایک طرف سلیمان ذیشان المعظم یورپ کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا تو مغل شہنشاہ اکبراعظم ماوراءالنہر سے ایشیائے کوچک تک حکومت کرر ہا تھا۔تیسری بڑی عالمی طاقت اس وقت سلطان عباس صفوی کی تھی جو مشرق وسطیٰ سے مشرق بعید تک حکمران تھا۔اکبر اعظم کے دربار میں ایک دفعہ جب برطانوی سفارت آئی اور ملکہ انگلستان کا ذکر بھی ہوا تو اس پہ اکبراعظم نے اپنے وزراء سے استفار کیا کہ ''ایں جزیرہ نما چرا است''

اب یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآنی علوم ہی وہ محوری اثاثہ ہیں جس کے گرد پوری کائنات کے علوم گھوم رہے ہیں یا اس بات کو اس طرح کہہ لیں کہ علمی طور پہ قرآن ہمیشہ زمانے سے آگے رہا ہے اور علم وتحقیق اس کے تعاقب میں۔اگر چہ منزل ابھی دور ہے مگر انسانی عزم وجستجو بھی متحرک ہے۔چنانچہ بطلیموس کا زمانہ ہو یا گلیلیو کی دریافتیں یا دور جدید کے سائنسدان ہوپکنز یا آئن سٹائن کے تصورات ہر زمانے میں قرآن جدید تر رہا ہے۔مگر اسے سمجھنا شرط ہے کہ فہم انسانی نے ابھی اپنے ارتقاء کا بہت کم سفر طے کیا ہے اور کائنات کی ان بعید سمتوں کی طرف ابھی انسان کے قدم نہیں پہنچے۔ابھی انسان اِن آسمانوں کی عظیم ترین وسعتوں میں سے پہلے آسمان کی وسعتوں میں سے بھی نہیں گذرا مگر سات زمینوں کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ کائنات کی ان سات زمینوں کا دور پہچاننے میں انسان نے وہ اشارے وصول کرنے شروع کر دیئے ہیں جن پر گمان ہے کہ یہ کسی اور حیات اور سرزمین سے آئے ہیں۔انسان نے پندرہ کھرب نوری سال کے فاصلوں پر ایک چمکتے ہوئے شہر کو دیکھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔

قرآن اس حقیقت کو کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَO

القرآن الحکیم (سورۃ المومنون ۲۳۔۱۷)

ترجمہ:

''اور بے شک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے پیدا کئے اور ہم اپنی تخلیق سے غافل نہیں ہیں''۔

□□□□□□□□

کائنات کی ان وسعتوں کے علم اور تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ جب علم کا حصول تمام تر بدن کے لیے ہوگا یا ضروریات اور سامان تعیش کے لیے ہوگا تو ایسا علم انسان کی راہنمائی کبھی بھی منزل کی طرف نہیں کرتا اور مادی مقاصد کے تحت مزین کیے جانے والے علوم کبھی بھی انسان کے ذہن کو قرآنی علوم کو سمجھنے کی سطح فراہم نہیں کر سکتے۔

اس کے لیے انسان کو علم کی اس شاخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا جس سے اسے قلبی تسکین حاصل ہو جسے وہ شناختِ حیات اور مقصودِ حیات کے لیے استعمال کر سکے جو اللہ کو اس کائنات کو اور اس کائنات کے اغراض و مقاصد تک پہنچنے میں اس کا مددگار ہو۔ مگر یاد رہے کہ کائنات کی شناخت کے موضوع کو کبھی بھی زمان و مکاں کے تصور سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں حقیقتیں ایسی ہیں جو باہم پیوست ہیں اور انسان ان کو الگ کرنے پہ قادر نہیں۔ اگرچہ آج کے اس متمدن عہد میں بہت سے سوچنے والے لوگ نظریہ اضافیت یا کوانٹم تھیوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس جستجو میں محو ہیں کہ وہ ماورائے کائنات کچھ ایسے اصول دریافت کر لیں جن سے فہم کائنات آسان ہو جائے مگر اس سے پہلے ہم اس سوال پہ غور کرتے ہیں کہ کیا انسان کے لیے کائنات کی تسخیر مقدر ہے۔ کیا انسان نے اس کائنات کو ہر صورت مسخر کرنا ہے یا اس کائنات کو اور اس کی تحقیق و جستجو کو محض خالق کی تلاش کے لیے ایک راستہ بنایا گیا ہے۔

گویا مسخر کائنات کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ ہم تحقیق و جستجو سے کام لے کر تھوڑے عرصے میں بڑا کام کریں اور رب کائنات کی حقیقت سے آگاہی حاصل کریں۔ تاہم اس کے لیے ہمیں ذرا پیچھے جانا ہوگا اور اس نقطہ آغاز کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جب رب ذوالجلال نے حضرت آدم علیہ السلام کی شکل میں پہلے انسان کو اس کرۂ ارض پہ آباد کیا اور ساتھ ہی یہ ارشادِ مبارک بھی اتارا کہ:

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ ۲۔۳۶)

ترجمہ:

”تمہارے لیے زمین میں تھوڑا سا ٹھہرنا ہے اور ایک وقت مقرر تک فائدہ اٹھانا ہے“۔

□□□□□□□

یہاں اللہ پاک نے لفظ ''مستقر'' استعمال فرمایا ہے جو عارضی ٹھکانے کی اطلاع دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کرۂ ارض انسان کے لیے کوئی مستقل جائے قیام نہیں ہے بلکہ یہاں اس نے تھوڑا سا ہی ٹھہرنا ہے۔ چنانچہ انسان کی اس مختصر زندگی کو اگر کائنات کے وسیع تر تسلسل کے تناظر میں رکھ کے دیکھا جائے تو کوئی نسبت ہی نہیں بنتی کیونکہ اس کائنات کا چوتھا دور ساٹھ کروڑ سالوں سے اوپر شروع ہوتا ہے جہاں گنتی کے تمام مروجہ آلاتِ پیائش معطل ہو کے رہ جاتے ہیں اور وہ کائنات جو اربہا نوری سالوں کے فاصلوں تک پھیلی ہوئی ہے جس کے ایک نوری سال کا ایک سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حساب سے تو اتنی بڑی کائنات کی ذرا سی پرکھ کے لیے بھی انسانی زندگی نہایت مختصر ہے جس کے ابتدائی بیس سال تو انسان کو اپنی حیات سے آگہی میں گذر جاتے ہیں اور آخری بیس سال ناتوانی میں باقی بچے بیس سالوں میں سے تقریباً آٹھ سال وہ سوتا رہتا ہے تو بارہ سالوں میں وہ ان گہرے اسرارِ کائنات کی کھوج میں کہاں تک جائے گا۔ یہاں اللہ پاک اپنے اس احسان کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے صرف انسان پہ کیا ہے اور اس سلسلے میں باقی تمام مخلوقات سے بے اعتنائی برتی ہے اور انسان کو عقل و معرفت کی عطا جس کی مدد سے وہ مختصر وقت میں بھی خالق کی تلاش میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ اسے بتایا گیا کہ خالق کی تلاش معبود حقیقی کی جستجو میں اسرارِ کائنات پہ غور و فکر کرنا ضرور اس کے کام آئے گا۔ قرآن میں انسان کو باقاعدہ طور پہ اس امر کی طرف مدعو کیا جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران ۳-۱۹۱)

ترجمہ:

''(اہل ایمان وہ لوگ ہیں) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق پہ غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے میرے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔''

□□□□□□□

قرآن نے اپنے اس مقصد کو کبھی قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ وہ انسان کو خدا تک لے جانے کے لیے آیا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی اس امر کو بہ تخصیص بیان فرمایا ہے کہ اپنے رب کو پہچاننے کے لیے اپنی ذات پہ غور کرو۔ چنانچہ سورۃ آل عمران کی مندرجہ بالا آیات کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق پہ غور کرنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ کائنات کی ان وسعتوں کا خالق کون ہے مالک کون ہے سنت ابراہیمی علیہ السلام ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہی اعزاز بخشا گیا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوئے جہاں ستارے خدا تھے جہاں علم نجوم کو آخری علم کا درجہ حاصل تھا۔ تب سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے محض غور و فکر کے ذریعے لا الہ سے الا اللہ کی منازل طے کیں۔ انھوں نے نجوم و سموات اور شمس و قمر کو خدا ماننے کے بجائے ان کے خالق کی کھوج میں اپنی جستجو اپنے تدبر اور عمیق تفکر سے جانا کہ خالق کون ہے اور بالآخر وہ اپنے اس ترجیحی طریقہ کار کے ذریعے اپنے اللہ تک جا پہنچے۔ اگر ہم جستجوئے خداوند اور معرفتِ کائنات کے حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیں تو انھوں نے کوئی نیا کائناتی اندازِ فکر نہیں دیا اور تحصیل علوم یا علم کائنات میں وہ کوئی بڑا نام نہیں سمجھے گئے۔ مگر اللہ کو جاننے اور خالق کی تلاش میں وہ اتنے بڑے انسان قرار دیئے گئے، مقصدِ کائنات اور معرفتِ کائنات میں وہ اتنی بلند مرتبہ شخصیت قرار پائے کہ پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا کہ:

قَالَ اِنِّی جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ ۲-۱۲۴)

ترجمہ:

"اے ابراہیم (خالق کی تلاش میں تیری اس جستجو، تیری اس تحقیق اور تیرے اس خلوص کے عوض) ہم نے تمھیں جملہ انسانوں کا امام بنا دیا۔

□□□□□□□

چونکہ علم کی بنیاد تدبر اور تفکر پہ ہی رکھی ہے اس لیے اللہ پاک اہل علم کے درجات کو بلند کرنے کی بات کرتا ہے

ارشاد ہوتا ہے۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ وَفَوقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ O

القرآن الحکیم (سورۃ یوسف ۱۲-۷۶)

ترجمہ؛

''ہم جس کے چاہیں درجات بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے''۔

زمان ومکاں کا فلسفہ

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ علم والے کا ایک سجدہ بعض اوقات جاہل کی سو سالہ عبادت پہ بھی بھاری پڑتا ہے اور خداوند کی منشا بھی کچھ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ میرے نزدیک ظاہری عبادت کے درجے وہ نہیں ہیں وہ درجے وہ تقوی جو انسان ظاہری عبادات کے ذریعے حاصل کرتا ہے ان کا معاوضہ جنت ہے تو وہ ان کو ضرور ملے گی مگر میری شناخت میری رضا میری آگہی میرا دیدار اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان علم کے وہ مندارج طے نہیں کرتا جو اسے معرفت آگہی اور شعور کی اس منزل تک لے جائیں جہاں وہ خالق کی شناخت کے قدرے قریب پہنچ سکیں۔ علم نفس ہی سے کمال عرفان کی منزلوں کا پتہ چلتا ہے اگرچہ ہمیں علم نفس اور کمالِ عرفانِ نفس کے متعلم ہونے کا دعویٰ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ کچھ صدیوں سے علم اہل مغرب کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور انھوں نے سائیکالوجی، پیرا سائیکالوجی، کلینکل سائیکالوجی اور اخلاقی نفسیات کی صورت میں علوم نفسیہ کو کچھ اس مہارت سے فروغ دیا ہے کہ آخر کو ہم ادھر ہی دیکھنے پہ مجبور ہیں۔ زمان و مکاں ہی کے تصور کو لیجیے کہ اس طرح کے کچھ تصورات کے بغیر شاید کائنات کے اسرار ہماری سمجھ میں نہ آسکیں اس لیے کہ اس طرح کے تصورات کتابوں میں سجے لگے بندھے فلسفیانہ یا ریاضیاتی اصول نہیں ہیں کہ ان کو سامنے رکھا اور کائنات کے اسرار بے حجاب ہونے لگے۔ بلکہ بنیادی طور پہ یہ وہ تصورات ہیں جو انسان کو فکر و تدبر کے اس مقام پہ فائز کرتے ہیں جہاں اسے خالق کے اختیارات کی کچھ جھلک حاصل ہو جاتی ہے اور وہ تھرا کے رہ جاتا ہے۔ اسی طرح زمان و مکاں کا تصور بھی انسانی غور و فکر کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ زمان و مکاں پہ غور و فکر انسان کا بنیادی وصف ہے اور ہر ذہین آدمی کہیں نہ کہیں ان تصورات پہ غور ضرور کرتا ہے۔

اگر چہ یہ موضوع بہت طویل ہے اور اسے زمانہ ہی محدود کر سکتا ہے۔زمان ومکاں کے بارے میں تاریخ کے اوراق میں بکھری اس جدو جہد کو بھی اگر ہم مدنظر رکھیں جو قدیم زمانے سے اہل دانش اس بارے میں کرتے آئے ہیں تو زمان ومکاں کے بارے میں اہل فلسفہ کے بنیادی افکار کوئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

فلاسفہ کا وہ گروہ جو زمانے کو غیر متغیر اور ابدی سمجھتے ہیں مثلاً(Z e n o)اور (Parmenides) وغیرہ جنھوں نے زمانے کو غیر متحرک سمجھا ہے ان کا خیال یہ ہے کہ زمانے میں کوئی حرکت نہیں بلکہ حرکت جو بھی ہے سرابِ تخیل ہے۔زمانہ دراصل ایک سکوتِ مستقل ہے۔ایک لامتناعی امر استقلال ہے اس میں کوئی حرکت نہیں ہے جیسے ایک تیر بظاہر فضاؤں میں سے گذرتا ہوا لگتا ہے اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تیزی سے فاصلے طے کر رہا ہو مگر Zeno کہتا ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ جب زمانوں کو تقسیم کیا جائے تو یہ تیر کسی نہ کسی زمانے کے کسی نہ کسی حصے میں ساکت ہوگا۔دراصل یہ سکوت ہے تغیر نہیں۔مگر پھر اہل فلسفہ کے بہت سے اکابرین نے (Zeno) اور (Parmenides) کے زمان ومکاں کے اس غیر متحرک نظریہ کو چیلنج کیا اور اس کی شدید نفی کی۔چنانچہ (Leibniz) کہتا ہے کہ زمانہ ایک سراب ہے،ایک خیال ہے یا ایک تصور ہے ایک وہم ہے ایک سہولت ہے جسے انسان نے اپنے معاملات کو سرانجام دینے کے لیے متعین کیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ زمانہ ایک اضافت مسلسل ہے ایک اضافیت ہے اور ایک کام کو دوسرے کام سے جدا کرنے کے لیے ہم زمانے کا نام لیتے ہیں۔اگر کام اور مقام جدا جدا نہ ہوں تو زمانہ بھی نہ ہو جو کاموں میں فراغت اور فرق ڈالتا ہے اس کو ہم از خود ہی زمانہ کہتے ہیں۔مختلف حالات و واقعات کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کا نام بھی زمانہ ہے۔مگر زمان و مکاں کے ان تصورات کو سائنسی جبریت (Scientific Determinism) ایک مختلف انداز سے پیش کرتی ہے اور زمان کو اور مکاں کو اندازِ دگر دیکھتی ہے جس پہ اگر غور کیا جائے تو وہ ہمارے نظریہ جبر وقدر سے زیادہ قریب ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اس مغربی فکر نے ہمارے نظام مقدر کو کچھ بہتر انداز سے سمجھا ہے۔وہ کہتا ہے کہ جبر یہ ہے کہ اللہ نے زمانے کے ایک لمحے کو ایک مقام دنیا سے جوڑ رکھا ہے اور جوڑنے والا جبار ہے قہار ہے اور اس کا اندازہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔تو زمانے کے خالق کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ زماں کو مکاں سے جوڑے رکھے کیونکہ اگر وہ زماں کو مکاں سے نہیں جوڑتا تو دنیا میں کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہ ہوتا اور ہر جگہ ''کبھی تو نہیں تو کبھی ہم نہیں'' والا معاملہ ہوتا۔کہیں زماں خوف ہو جاتا تو کہیں مکاں اور اس طرح زمان اور مکاں میں کوئی باہمی ربط

باقی نہ رہتا۔ نہ پتہ لگتا کہ بچے کب پیدا ہوتے ہیں اور نہ پتہ چلتا کہ موت کب آنی ہے۔ چنانچہ پروردگار نے انسانی زندگی میں ضبط کے لیے اس کی آسانی اور سہولت کے لیے اور حفاظتی تدابیر کے لیے زماں کو مکاں سے اس طرح جوڑ رکھا ہے کہ ہم سب اپنی اپنی ساعتوں سے گذر کر اپنے اپنے مکاں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ گویا (Leibniz) حقیقت کو تجربہ کہتا ہے۔ وہ زمانے کو ایک تجربہ سمجھتا ہے ایک وہم اور گمان وخیال تسلیم کرتا ہے اور اسی طرح وہ ماضی حال اور مستقبل کو زمانے کی اضافتیں تصور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمانے کو مختلف ادوار میں تقسیم کئے بغیر زمانے کا حقیقی ادراک حاصل نہیں ہوسکتا۔ حال مستقبل کی صورت میں ہماری تخلیقات اور ہماری تقسیمات ہیں اگر یہ نہ ہوں تو زمانہ جو ایک تسلسل کا نام ہے جو رواں اور پیہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں زمانے کو حال ماضی اور مستقبل کے وجود سے سمجھتا ہوں اور زمانہ بذات خود کوئی چیز نہیں یعنی اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ زمانہ الٹتا پلٹتا ہے اور زمانہ بدلتا ہے تو اس کا کوئی وجود میں تسلیم نہیں کرتا۔

چنانچہ ہم مختلف واقعات اور حادثات کو حال ماضی اور مستقبل کے مختلف ادوار سے منسوب کر دیتے ہیں اور زمانے کو ایک منفرد اکائی تصور کرنے لگتے ہیں۔ ارسطو اور ابن رشد نے کہا کہ ہم واپس جا رہے ہیں اس لیے کہ یہ زمانہ ہے اور اس میں نئے تصورات شروع ہونے والے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زمانہ حرکت سے ہے مگر زمانے کو حرکت پر تقدم حاصل نہیں ہے۔ حرکت خود زمانے کے اندر موجود ہے جو سکوت تک پہنچ جاتی ہے اور زمانہ حرکت پہ غالب ہے اور خود ایک بڑا وجود رکھتا ہے۔ دورِ حاضر کا عظیم فلسفی (Loard Russall) بھی زمانے کو حقیقت قرار دیتا ہے اور اس کو وہمہ اور فریب قرار دینے والوں کو احمق کہتا ہے۔ اس طرح وہ زمان ومکاں اور تغیر وحرکت جیسے سارے تصورات کو حقیقت خیال کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ جو ریاضیاتی عناصر ریاضیاتی حدود کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے ان کو وہمہ خیال کرنے کا کوئی جواز اس کے پاس موجود نہیں ہے اور ان کو فریب نظر قرار دینا بہت قبل از وقت ہے اس لیے وہ زمانے اور اس کے تغیر کو ایک بڑی انسانی حقیقت قرار دیتا ہے۔ اسی طرح آئین سٹائن کا تمام تر تصور اضافی تاثرات کے گرد گھومتا ہے اور وہ زمان ومکاں کو باہم ایک اضافی حقیقت تسلیم کرتا ہے اس کے ہاں سہ جہتی مکاں اور یک جہتی زمان کا تصور بھی موجود ہے جو ہمارے لیے بھی اضافی ہوتے ہیں اور خود ایک دوسرے کے لیے بھی اضافی تاثرات پیدا کرتے ہیں۔ تاہم اس کی وضاحتیں تاحال نہیں آسکیں مگر اس حوالے سے جو آخری تحقیق طبع ہوئی ہے اس کے مطابق اول اول جب ستاروں کی حرکت کو پرکھا گیا تو ان کی حرکت کے مدار چار سمتوں کی بجائے زیادہ سمتوں پہ مبنی تھے۔

چنانچہ اب چہار سمتی تصور کی یکجائی ٹوٹ رہی ہے اور مستقبل میں اس امر کے امکان موجود ہیں کہ کائنات کی کثیرالجہتی کا تصور رواج پا جائے۔ مغرب میں اس حوالے سے جو جدید تحقیق سامنے آ رہی ہے وہ باعث حیرت اور استعجاب ہے اور شائد آنے والے وقت میں مطالعہ کائنات کی بے شمار جہتیں انسان کے لیے ذوقِ تحقیق کے نئے در وا کریں گی۔

قبل مسیح زمانے کے ایک دانشور ''ہیر کلیطیس'' نے کبھی کہا تھا کہ ہم ایک دریا سے دوبارہ نہیں گذر سکتے اس لیے کہ ایک لہر جو دریا سے گذر جائے وہ دوبارہ کبھی نہیں پلٹتی اس کا مقصد یہی تھا کہ زمانہ متحرک ہے اور انسان ایک زمانے سے دوبار گذرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اس لیے کہ دریا کی لہروں کی طرح گذرا ہوا وقت بھی واپس نہیں پلٹتا۔ جرمنی کے مشہور فلسفی اور دانشور ''برگساں'' نے زمان و مکاں کے بارے میں کہا کہ گذرتے زمانے کے لمحے یعنی دوراں ہی اصل حقیقت ہے اور اسی کو دوام ہے باقی سب واہمہ ہے اپنے قیام فرانس کے دوران جب شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی ملاقات برگساں سے ہوئی تو انھوں نے زمان و مکاں کے متعلق برگساں کو بتایا کہ ہم مسلمانوں کا زمانے کے بارے میں وہی عقیدہ ہے جو ہمیں ہمارے نبی محمد کریم ﷺ نے بتایا اور وہ یہ ہے کہ:

لاتسبو الدھر ان الدھر ھو واللہ (حدیث پاک بخاری و مسلم)

ترجمہ: زمانے کو برا مت کہو بے شک اللہ ہی زمانہ ہے

❑❑❑❑❑❑❑

برگساں ایک اپاہج انسان تھا اور مدت سے وہیل چیئر پہ تھا۔ علامہ اقبال کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ اپنی کرسی سے اچھل کر گرا اور نیچے آ رہا، اس لیے کہ اس کو زمان و مکاں کی اس حقیقت تک رسائی حاصل ہوگئی تھی جس پہ وہ پچیس سال تک غور فکر کے باوجود بھی نہ پہنچا تھا۔ اسی طرح (Kant) نے زمان و مکاں کے بارے میں اپنا جدید تصور پیش کیا جس کے مطابق تصور زمانہ ایک خیال کا انعکاس ہے اور وہ تصوراتی حد تک ہی زمانے کے وجود کو مانتا ہے۔ (Hegal) نے زمان و مکاں کے بارے میں کہا کہ وہ زمان و مکاں کے تصور کو خارجی نوع کی حقیقت ماننے سے انکاری ہے۔ وہ کہتا ہے زمانہ کا ادراک ہمارے حواس پہ منحصر ہے (Friedrich Nietzsche) نے زمان و مکاں کا انوکھا اور سب سے الگ تصور پیش کیا

اس نے کہا کہ توانائی وقت میں اپنی صورتوں کو اختتام پذیر کرتی ہے اور یہ کہ زمانہ ایک وقت میں موجود جب تمام تصورات کو ختم کرلے گا تو ان کو پھر سے دوہرانا شروع کردے گا۔آج کے مغربی دانشور جو اس سلسلے میں متحرک ہیں ان کے خیالات (hakeing Stefan) کی زبانی پیش ہیں۔

''وہ کہتے ہیں کہ اب زمان ومکاں کی آزادی کا تصور بوسیدہ ہو گیا ہے بلکہ آج یہ تصور کیا جاتا ہے کہ زمان ومکاں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا جب کائنات کی تفہیم ایک واضح اور باہم فریم ورک میں ممکن ہوگی تو زمان ومکاں کا تصور زیادہ آسان ہو جائے گا حقیقت میں زمان ومکاں باہم اس حد تک مربوط ہیں اور زمان مکان اور حرکت ایک ہی قسم کے اثرات رکھتے ہیں ان کو الگ الگ کر کے سمجھنا ابھی انسان کے احاطہ علوم سے ذرا پرے ہے''۔

□□□□□□□

اب زمان ومکاں کے قرآنی تصور سے بحث کی جاتی ہے اللہ پاک نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا کہ:

وَ سَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ کُلٌّ یَّجۡرِیۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ

القرآن الحکیم (سورۃ الرعد ۱۳۔۲)

ترجمہ؛

''اور اللہ نے سورج اور چاند کو مسخر کیا اور یہ سب ایک مقررہ مدت تک چل رہے ہیں''۔

□□□□□□□

یعنی تمام کائنات ایک مقررہ وقت تک چل رہی ہے اور اس کی تمام تخلیقات ایک مقررہ وقت تک موجود ہیں اور تمام کائنات وقت کے ایک مخصوص فریم میں ہے اس لیے اللہ نے ہمیں یہ حقیقت بتادی کہ تمھارے ادراک میں آئے یا نہ آئے مگر کائنات کا وقت لامحدود نہیں بلکہ محدود ہے۔ایک وقت مقرر تک ہے خدا تو

زمانے کی ہر حرکت کو اپنے ساتھ متعین کرتا ہے اپنے کلام کے ساتھ متعین کرتا ہے اور اس کی مثال حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعے میں بڑے واضح انداز سے نظر آتی ہے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمان و مکاں کے پھیلاؤ کے بارے میں آج کی جدید سائنس اتنی واضح نہیں ہے جتنا کہ خدا کا کلام واضح ہے ارشاد ربانی ہے کہ:

وَ السَّمَآءَ بَنَیۡنٰهَا بِاَیۡدٍ وَّ اِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الذاریات ۵۱۔آیات ۴۷)

ترجمہ؛

''ہم نے آسمانوں کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور ہم ہی انھیں وسعت عطا کر رہے ہیں''۔

❑❑❑❑❑❑❑

آج نظریہ اضافت کے تحت سائنس میں یہ تصور رواج پا رہا ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے اسی طرح سائنس آگے بڑھتے ہوئے ان سنگ میل تک پہنچے گی جن کو قرآن میں انسانی جدوجہد کے لیے روشن کیا گیا ہے۔ کائنات بالا کے گیسی اجسام کی حرکت کے دوران عظیم تر بادلوں کی حرکت سے جو اشارات آج کے انسان کو مل رہے ہیں وہ کائنات کے پھیلاؤ کو ایک مثبت خیال دے رہے ہیں اس لیے اب کسی کو بھی کائنات کے اس پھیلاؤ میں شبہ نہیں رہا۔مگر کائنات اور زمانے کا استعمال اور اس کی رفتار کا استعمال اللہ تعالیٰ نے جس حیثیت سے کیا ہے وہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے۔قرآن میں سورۃ بقرہ کی کچھ آیات اس طرف اشارہ کرتی ہیں جب حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے اللہ سے پوچھا کہ وہ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے تو اللہ پاک نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا کہ؛

أَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِـي هَـَذِهِ اللّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللّهُ مِئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ

يَوْماً أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِئَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ
يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى العِظَامِ كَيْفَ
نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْماً فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللّهَ عَلَى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ۲۔آیات۲۵۹)

ترجمہ:

”یااس شخص کی طرح (عزیرؑ) جوایک ایسی بستی سے گذرا جو ویران ہوچکی تھی تو کہنے لگا اللہ اسے کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا اس کی موت کے بعد پس اللہ نے اسے ایک سو برس تک موت سے ہمکنار رکھا پھر اسے اٹھایا اور پوچھا کہ تو کتنے عرصے تک اس حالت میں رہا تو اس نے کہا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ فرمایا نہیں بلکہ ایک صدی تک اب تو اپنے کھانے اور پینے کے سامان کو دیکھ کہ باسی تک نہیں ہوا اور اپنے گدھے کو دیکھ تا کہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشانی بنائیں کہ کس طرح ہم نے اس کی ہڈیوں کو باہم جوڑا اور ان پر گوشت چڑھایا جب یہ حقیقت اس پہ کھل گئی تو کہنے لگا میں جان گیا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے“۔

❑❑❑❑❑❑❑

قرآن کا یہ واقعہ اپنے اندر حکمت معرفت اور عبرت کے بے پناہ سامان رکھتا ہے اس واقعے پر انسان جتنا بھی غور کرے زمان ومکاں کی حیرت انگیز نوعیت سامنے آتی ہے کہ وہ خدا ہے جو زمانے کو روکتا ہے زمانے کو سکیڑ دیتا ہے یا وہ زمانے کو عمومی رفتار سے چلنے دیتا ہے جیسے ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔اس طرح زمانہ اللہ سے باہر اس کے حکم کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا۔زمانہ وہ احساس تفریق ہے جو اشیاء کے مابین ہے اور جو پروردگار نے انسان کے دل ودماغ میں ڈال دیا ہے۔زمانہ اللہ کی دریافتِ اندروں کی وہ سکیم ہے جس کے تحت اس نے اشیاء اور واقعات کو باہم (Friction) یعنی ٹکراؤ سے بچا لیا ہے۔اس نے مقام Friction کو معطل کرنے کے لیے زمانے کو وسعتیں بخش دیں مگر یہ سب محدود ہے اور اس کے مقدر کی ایک حد ہے۔زمانہ مسلسل رواں دواں ہے۔زمانہ انسانی ذہن کی وہ سہولت ہے جس کے تحت اشیاء اور حوادث اپنے عمومی

دوراں سے گذرتے ہیں اور باہم ٹکراتے بھی نہیں اور نہ ہی ان میں ہلچل پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ ایک ہموار روانی ہے جسے زمانے کے تصور سے وابستہ کر دیا گیا ہے اس سلسلے میں مجھے امام شافعیؒ کے کچھ فقرے یاد آ رہے ہیں۔انھوں نے فرمایا زمانہ یعنی وقت کاٹتی ہوئی تلوار ہے جو اشیاء کو الگ الگ کر دیتی ہے اور موت بھی جو انسان کے جوہر اعظم کو رکھ لیتی ہے اور مٹی کو فنا ہونے دیتی ہے۔چنانچہ اگر زمانہ نہ ہوتا تو موت بھی نہ ہوتی جو جسم اور روح میں فرق کرتی اگر زمانہ نہ ہوتا تو اشیاء کی باہم تفریق ختم ہو جاتی مگر حقیقت یہ ہے زمانہ کلیتاً اپنے پروردگار کی مرضی کا پابند ہے جہاں چاہتا ہے اسے گذار دیتا ہے جہاں چاہتا ہے اسے روک لیتا ہے۔

یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ زمانے کو ہم پہ گذار دیتا ہے مگر اصحابِ کہف پہ روک لیتا ہے،حضرت عزیر علیہ السلام پہ روک دیتا ہے ان کے گدھے پہ گذار دیتا ہے کھانے پہ نہیں گذارتا ایک دن کی وسعت کو چوبیس گھنٹے میں محدود کر کے اسے عزیرؑ پہ ایک صدی بنا دیتا ہے پھر معراج والی رات پوری کائنات کو ساکن رہنے کا حکم جاری ہو جاتا ہے پورے زمانے کی کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہلنے کی نہ اجازت تھی نہ جرأت ایک مکمل سکوتِ زمانہ ہے جس کو حرکت کی اجازت اس وقت ملتی ہے جب محمد رسول اللہ ﷺ ام ہانیؓ کے گھر دوبارہ داخل ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مجھے نہیں پتہ کہ کتنا وقت گذرا ہے مگر جب میں اندر داخل ہوا تو دروازے کنڈی ابھی ہل رہی تھی۔

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا رویہ جو قرآن کو اس کے علوم کو اور اس کے اشارات کو اہمیت نہیں دیتے انتہائی پست ہے اور اس ذہنی پستی نے اس تصور کو جنم دیا جس کے مطابق وہ علوم الہامی کو زوال پذیر سمجھتے ہیں اور اس کے مقابل آج کے انسان کو زیادہ آگاہ اور باخبر تصور کرتے ہیں بلکہ یہاں تک کہ وہ فرمان الٰہی کی تضحیک پہ اتر آتے ہیں میں کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو اللہ کی جنت کا مذاق اڑاتے ہیں اگرچہ وہ خود کو مسلمان بتاتے ہیں مگر اپنے ضمیر کی آواز پہ کان نہ دھرتے ہوئے خود کو اس معاشرے سے الگ بھی نہیں کرتے اس لیے کہ اس معاشرے نے ہی ان کو زندگی کی وہ ساری تعیّشات بخشی ہیں جن کی بنا پہ وہ تکبر کے اس رویے تک پہنچے جہاں سے ان کی واپسی ناممکن سی لگتی ہے اگرچہ درِ توبہ کھلا ہے مگر ہر کسی کو اس سے گذرنے کی نہ اجازت ہے اور نہ توفیق۔میں ذکر کر رہا تھا اس جنت کا جسے ربِ ذوالجلال نے اپنے اہل ایمان بندوں کے لیے بنایا ہے اور اسے باغ کہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ مقام جس کو باغ کہا گیا ہے اس کو ان تصورات سے کوئی نسبت نہیں ہے جو ہمارے ذہن میں لفظ باغ سے ابھرتے ہیں۔اس کی وسعتوں کا تو یہ عالم ہے کہ ہمارے محبوب ہمارے

راہنما ﷺ نے بتایا کہ جنت کا ایک گھر دوسرے گھر سے پانچ سو نوری سال کے فاصلے پر ہوگا اور ان کے درمیان مسافت براق کے ذریعے طے کی جائے گی خیر جنت کی وسعتیں اور مناظر تو آج کا مادی انسان کیا سمجھے گا اس کے لیے تو اس کائناتِ ارضی کی وسعتیں ہی اتنی زیادہ ہیں کہ تا حال انسان اس قابل نہیں ہو سکا کہ ان کی پیمائش کر سکے اور عصر حاضر کے جدید ترین سائنسی وسائل نے زمین سے قریب کا جو ایک ستارہ دریافت کیا ہے اس کا زمین سے فاصلہ پندرہ ٹریلین نوری سال ہے تو پھر اس کا علم ''اقطار السموات'' تک کب پہنچے گا یہ اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے اور کوئی یہ دعویٰ کرے کہ وہ خدا سے باغی ہو کے اس کے نظام کائنات میں دخیل ہو سکتا ہے اس کے اسراروں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے تو یہ محض اس کا جہل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نو کروڑ سال کی پوری انسانی تاریخ میں جو پہلا انسان تھا وہ بھی مذہبی تھا اس کو بھی خالق کے وجود اور اس کی قہرمانیوں کا احساس تھا۔ اس لیے آج کے فلسفہ عمرانیات اور بشریات نے اس امر کو طے کر دیا ہے کہ کسی معبود کی ضرورت ایک بدیہی ضرورت ہے جس سے فرار دراصل فطرت سے فرار ہے اور یہ کہ پہلا انسانی معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ تھا یعنی سب سے پہلے انسان کو جو شعور عطا کیا گیا وہ مذہبی شعور تھا۔ اس لیے بعض یونانی فلسفیوں کا یہ کہنا کہ مذہب خوف کی پیداوار ہے درست نہیں کیونکہ اس کے پیچھے پیش کردہ دلیل اتنی بودی ہے کہ عقل اسے پہلے مرحلے پر ہی رد کر دیتی ہے ان کے مطابق انسان نے جب اپنے شعور کی آنکھ کھولی تو اس نے خود کو حوادث میں گھرا ہوا پایا وہ برفانی طوفانوں، زلزلوں، سیلابوں اور وباؤں کی زد میں تھا اس لیے وہ ایک مستقل خوف کی کیفیت میں تھا۔ چنانچہ خوف کے اس جذبہ نے انسان کو چندان دیکھی قوتوں کی پرستش پہ مجبور کر دیا جو سائنس کے خیال میں ان حوادث کی وجوہ تھیں۔ مگر عقل اور سائنس کی ترقی سے ان سب حوادث کی توجیح ہوتی چلی گئی اور انسان نے بھی اپنے اس خوف اور خوف کی بنا پہ تراشے معبودوں سے چھٹکارا پا لیا۔

چنانچہ یہ تصور کہ مذہب کا آغاز ان دیکھی قوتوں کے خوف کی وجہ سے ہوا اور یہی جذبہ انسان کے جذبات میں اولین اور قدیم ترین ہے بالکل لغو اور بے سروپا ہے۔ اس لیے کہ انسانوں میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت زوالِ نعمت کا اندیشہ ہے، خوف کا تجزیہ کریں تو صاف نظر آئے گا کہ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے چھن جانے کا یا اس سے محروم ہو جانے کا جو انسان کو محبوب اور دستیاب ہو۔ اسی بات کو اگر ایک اور طریق سے بیان کیا جائے تو خوف سے قبل کسی نعمت کا شعور لازمی امر ہے جس کے چھن جانے کا اندیشہ جذبہ

خوف کو جنم دیتا ہے۔ چنانچہ جب نعمت کا شعور حاصل ہو گیا تو ایک منعم کا شعور بھی اس کا لازمہ ٹھہرا۔ اس سے اگلا مرحلہ جذبہ شکر کا ہے جو نعمت کے حصول کے بعد پیدا ہوتا ہے اور ہمارے اس نظریہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ان قدیم فلاسفہ کے خیال میں جو چیزیں انسان کے اندر حالت خوف کو جنم دیتی ہیں وہ دنیا کے عام واقعات میں سے نہیں۔ زلزلے روز نہیں آتے، آتش فشاں روز نہیں پھٹتے، بجلیاں روز نہیں کڑکتیں، وبائیں روز نہیں پھوٹتیں اور طوفان بھی کوئی روزمرہ کا معمول نہیں رکھتے، اس کے برعکس تارے روز نکلتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، چاند اپنی روپہلی کرنیں ہر شب دشت و جبل پہ بچھاتا ہے، آسمان کی نیلگونی ہر لمحہ باصرہ نوازی کرتی ہے، ابر کرم کی تردستیاں اور درختوں کی ثمرباریاں ہر موسم میں موجود ہیں، چمن کی ہر کلی اپنے حسن کی انتہا بیان کرتی ہے، قوس قزح کے رنگ انسان کے اندر وہ احساس لطیف پیدا کرتے ہیں جو اس کو حس جمال کی لطافت سے آشنا کریں۔

چنانچہ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہر قدرت کی گاہ گاہ گھرکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ انسان ان کی پوجا کرنے لگے مگر منعم غیب کی یہ ساری فیاضیاں بالکل بے اثر ہو جائیں اور انسان میں شکر و سپاس کا کوئی ولولہ پیدا نہ کریں۔ اس لیے انسان کے مشاہدہ کائنات اور مشاہدہ انفس کی فطری راہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی بے انت نعمتوں اور رحمتوں کے مشاہدہ سے اس پر ایک منعم حقیقی کی شکر گذاری کا جذبہ اور احساس طاری ہو۔ پھر اس جذبہ کی تحریک سے وہ اس کی بندگی کی طرف مائل ہو۔ گویا انسان کے شعوری ارتقاء کا آغاز کسی منعم کی شکر گذاری سے ہوا یا دوسرے لفظوں میں اس کی تہذیبی زندگی کا آغاز مذہب سے ہوا، دینِ توحید سے ہوا، تاہم اس میں وقت گذرنے کے ساتھ جو تغیر رونما ہوا اس نے انسان کے اندر شرک کو رواج دیا جس کی بیخ کنی کے لیے اللہ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر انسانوں کی راہنمائی اور ہدایت کے لیے زمین پہ اتارے تا کہ وہ اپنے شرف کو پہچانے مقصدِ زیست کا ادراک حاصل کرے اور اس راہ پہ زندگی گذارے جو اسے کامیابی اور فلاح کی طرف لے جاتی ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی جلد باز ناشکرا اور سخت جھگڑالو ہے۔

مذہب تاریخ کے آئینے میں

اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی دور کا انسان مذہب یعنی خدا کے تصور سے خالی نہیں رہا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنی شعوری ناپختگی اور نام نہاد فلاسفہ کے آڑے ترچھے نظریات کے سائے میں زندگی اور مذہب کے درمیان وہ توافق قائم نہ کر سکا جو وقت کی ضرورت تھی۔ اگر چہ وہ ایک ایسے خالق کی تلاش میں انتہائی جذباتی تھا جو اس کے لیے زندگی کی راہیں روشن کر دے۔ مگر ایک کثیر وقت تک انسان خالق کے حقیقی ادراک سے قاصر رہا۔ وہ توہم اور اپنے آباء کی روایت کے سامنے کسی اور چیز کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس مضمون میں ہم مذہب کی حقیقی ماہیت سے بحث کرنے کی بجائے مختلف ادوار کے اہل دانش کی رائے اور ان کے علاقائی رسم و رواج پہ مشتمل ان نظریات اور روایات سے بحث کریں گے جن کو قدیم زمانہ کے لوگ مذہب قرار دیئے ہوئے تھے۔ یاد رہے کہ بیان کیے جانے والے تمام خیالات حقیقت سے دور مادیت سے آلودہ ایسے نظریات ہیں جن میں ملحدانہ خیالات سمیت فلاسفہ کے وہ سب تصورات شامل ہیں جو انھوں نے کسی بھی دور میں مذہب کی تعبیر کرتے ہوئے اختیار کیے۔ ان میں غالب اکثریت یونانی افکار سے متاثر نظر آتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مذہب کی جو سوغات اقوامِ عالم کو بخشی ہے اس کا حقیقی ادراک تبھی حاصل ہو سکتا ہے جب انسان جانے کہ لوگ مذہب کے نام پر کن کن اندھیری راہوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرے ہیں۔ روشنی کا احساس اندھیرے میں اور جہل کا ادراک علم سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں لوگوں کی ان آبادیوں کا تذکرہ ہے جو اپنے آباء کی روایات سے اس طرح چمٹے ہوئے تھے کہ کوئی دلیل ان کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔ یہ ان وقتوں کا ذکر ہے جب انسان ابھی صنعتی اور سائنسی ادراک و فہم سے دور بہ مشکل اپنے بقاء

کی جنگ سے باہر آیا تھا اور اپنے سماج کی دیواریں چننے میں مصروف تھا اس لیے لامحالہ اس کے مذہبی تصورات بھی اتنے ہی ناپختہ تھے جتنے کہ ان کے سماجی رویے، مذہب کی تشکیل وتدوین کیسے عمل میں آئی اس بارے میں اہل علم کے ہاں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ایک مغربی مفکر(EB Tayler) کہتا ہے کہ دیو مالا اور جادو کی طرح مذہب بھی روحوں کے مت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ذہن وشعور کی نشو ونما سے قدیم پتھر کے دور کے انسان کی غور وفکر کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں تو اس نے قدرتی مظاہر کو سمجھنے کے لیے قیاس آرائیاں شروع کیں۔اس دور کے انسان کے خیالات اور احساسات کا تجزیہ معاصر وحشی اقوام کے مطالعے و مشاہدے اور نفسیاتِ طفلی کی روشنی میں کیا گیا ہے۔چنانچہ(Tayler) کہتا ہے کہ پہلے پہل نیند خواب موت اور دوسرے حوادث پہ غور کرتے ہوئے انسانی ذہن میں روح کا تصور جا گزیں ہوا۔جب وہ دیکھتا کہ وہ دور دراز کے جنگلوں میں شکار کھیلتا پھر رہا ہے اور اپنے مرے ہوئے ساتھیوں سے ملاقاتیں کر رہا ہے تو وہ سوچنے لگا کہ اس کے اندر کوئی ایسی شے ضرور موجود ہے جو اس کے بدن سے الگ بھی ہو جاتی ہے اور دوبارہ جسم میں واپس بھی آجاتی ہے۔دن بھر کی مشقت سے تھک ہار کے جب وہ سوتا تو خواب اسے نگر نگر لیے پھرتے اور وہ اپنے ان دوستوں سے بھی مل لیتا جنہیں کب سے موت کا عفریت نگل چکا تھا۔اس امر سے قدرتاً اس کے ذہن میں یہ تصور راسخ ہوا کہ انسان مر کے مٹ نہیں جاتا بلکہ ان کے اردگرد ہی کہیں بھٹکتا رہتا ہے۔

(Tyaler) کے خیال میں روح کے تصور اور اس کی بقاء اور حیات بعد موت کا یہی خیال بعد میں مذہب کا سنگِ بنیاد بن گیا۔قدیم زمانے کا انسان اپنے مرے ہوئے آباؤ اجداد کو زندہ تصور کر کے ان کی دعوت بھی کیا کرتا۔چنانچہ مردوں کی روحوں کی دعوت کا یہ سلسلہ آج تک دنیا کی کئی اقوام میں باقی ہے۔ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ انسانی ذہن کی ایک معروف خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات کو اپنے لاشعور میں ہمیشہ مرتب ومدون کرتا رہتا ہے۔چنانچہ مرورِ زمانہ سے قدیم دور کے انسان نے بے شمار ذی روح ہستیوں اور اشیاء میں سے چند بڑی بڑی ہستیاں منتخب کرلیں اور انھیں دیوتا بنا کر پوجنے لگا۔شکار کا دور گذرا اور انسان کاشت کاری کی طرف راغب ہوا تو جہاں اس کے اندر بے پناہ سماجی تبدیلیاں در آئیں وہیں اس کے عقائد بھی ارتقاء کا سفر طے کرتے رہے۔زرعی انقلاب کے ساتھ جب اس کے پیداواری ذرائع بدل گئے تو اس کے معبود بھی بدل گئے۔اب وہ بارش برسانے اور ہریالی لانے والی قوتوں کا پجاری تھا

شکار کے دور کا انسان فطری طور پہ بہت آزاد تھا۔وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا اور جہاں اس کا جی چاہتا پڑا رہتا۔مگر جب انسان نے کاشت کاری کی بنا رکھی تو اب اس کو اپنی فصلوں کی حفاظت کے لیے ان کے پاس رہنا پڑا۔چنانچہ لوگ مل کے رہنے لگے اور اولین سماجی ڈھانچے کے خدوخال وضع ہونے لگے،لوگ دھرتی سے وابستہ ہو گئے جس سے مختلف قبائل کی تدوین عمل میں آئی جو سیاست کی نمود کے ساتھ شہنشاہیت کی صورت اختیار کر گئی۔

اگر چہ قبیلہ کا سربراہ اب بھی سردار ہی تھا مگر وہ شاہ کا وفادار تھا۔اس لیے سارے سردار بادشاہوں کے تحت آ گئے۔پھر بادشاہ کو آقا یعنی (خداوند خدا یا اس کا اوتار) بھی کہا جانے لگا اور بنی نوع انسان نے کثرت پرستی سے دوئی اختیار کی۔تثلیث اور توحید کی جانب اپنے قدم بڑھائے۔ایک اور مغربی مورخ(W Rijway) نے کہا کہ مذہب روحوں کا نہیں بلکہ مردوں کا مت ہے اور یہ نظریہ پیش کیا کہ ابتدا میں لوگ دیوتاؤں کی نہیں بلکہ اپنے مرے ہوئے پرکھوں (آباؤ اجداد) کی پوجا کیا کرتے تھے۔دیوتاؤں کا ظہور بعد میں ہوا۔

دیوتا شروع شروع میں پرکھوں کی روحیں ہی تھے جن پہ فوق الطبع کا رنگ چڑھا دیا گیا تھا۔تاہم (Frezer) نے ٹوٹم مت کے حوالے سے مذہب کی توجیہ کی ہے۔ٹوٹم مت آج بھی آسٹریلیا،افریقہ اور بحرالکاہل کے بعض وحشی قبائل میں موجود ہے۔جب کسی قبیلے کے افراد اپنے آپ کو کسی جانور یا درخت سے منسوب کر لیتے تو اسے اپنا بھائی یا آسمانی باپ قرار دے لیتے۔وہ اسے جان سے مارنا یا کاٹنا بڑا گناہ تصور کرتے۔چنانچہ ان کا منتخب کردہ وہ درخت یا جانور ان کا دیوتا یا ٹوٹم بن جاتا۔فریزر کے مطابق ٹوٹم کی اصطلاح سب سے پہلے ایک انگریز جے لانگ نے سولہویں صدی میں لال ہندیوں سے سیکھی۔ایک اور مغربی مفکر(Mac lanon) نے بھی (J-G Frezer) کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہب ٹوٹم مت ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

جب کہ ٹائلر نے ٹوٹم کا رشتہ پرکھوں کی روحوں کی پوجا سے جوڑا اور کہا کہ وحشیوں کے عقیدے کے مطابق ان کے پرکھوں کی ارواح نے حیوانوں پرندوں اور پودوں وغیرہ کو اپنا مسکن بنایا تھا اس لیے انھیں مارنا یا کاٹنا ممنوع ہے۔ہندوستان کے کچھ علاقوں میں بھی ٹوٹم مت کے ثبوت ملے ہیں۔درختوں کو نہ کاٹنا اور جانوروں کو نہ مارنے کے اصول کو اس مذہبی تصور کے لوگ اپنا سماجی قانون قرار دیتے تھے جس کا نام انھوں نے "ٹیبو" رکھا تھا۔ہندوستان کے ناگا اسی ٹیبو کو گِنا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ٹیبو کا لفظی معنیٰ یہ ہے کہ ایسا امتناع جسے

مذہب نے تقدس فراہم کیا ہو[29*]۔چنانچہ ٹیبو وہ قدیم ترین غیر تحریر شدہ مذہبی قانون ہے جس کی پابندی اس معاشرے کے لیے لازمی قرار دی گئی تھی۔(Roberat Semieth) نے بھی تقدس کے حوالے سے ٹیبو کے قوانین کی تشریح کی ہے۔ان کے خیال میں مقدس کے دو پہلو ہیں مثبت اور منفی، پاک اور آلودہ ،عارفانہ اور شیطانی۔اسی طرح (Fraied) نے بھی اپنی کتاب(Totam and Taboos) میں ان قوانین کو قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے۔اس نے کہا کہ جب قدیم زمانے میں بیٹوں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور اسے مل کے کھا گئے تو ان میں ایک احساسِ جرم پیدا ہوا جس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے محرمات سے اختلاط اور ماں باپ کو مارنا ممنوع کر لیا۔یہیں سے اولین اخلاقی قدروں کا آغاز ہوا۔تاہم دوسرے بہت سے مذہبی مفکرین نے (Fraied) کی اس تشریح کو دور از کار قرار دیا ہے اور اس کے رد میں سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔

ان کا تصور یہ ہے کہ ٹوٹم مت کے زمانے میں مادری معاشرہ تھا جس میں باپ کو کوئی خاص اہمیت ہی حاصل نہ تھی اس لیے ایسے کسی معاشرے میں اس طرح کی کسی نفسیاتی الجھن کا خیال محض ایک مفروضہ ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔آج بھی جہاں کہیں ٹوٹم کے پیرو وحشی قبائل پائے جاتے ہیں وہاں کے اخلاق اور معاشرے کو ٹوٹم اور ٹیبو ہی کی بنا پر منظّم کیا گیا ہے۔ان کے ہاں کسی جانور یا درخت کو ٹوٹم بنا لیا جاتا اور اسے وہ اپنا باپ تصور کرتے۔اس لیے کہ ان کے ہاں یہ خیال پختہ ہے کہ ان کے ٹوٹم میں ان کے پدرِ اعلیٰ کی روح نے حلول کیا ہے۔ان کے ٹوٹم کے نشانات ان کی کھجوروں پہ کھدے ہیں جن کی وہ بتوں کی طرح پوجا کرتے، وہ ان کو سجدہ کرتے اور ان پہ قربانیاں چڑھاتے۔(Agestas kont) نے مذہب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ مذہب کی ابتدا اشیاء پرستی سے ہوئی اور ان چیزوں میں عموماً پراسرار قسم کی طلسماتی قوت ضرور ہوتی۔

(Herberat Spensar) نے کہا کہ مذہب کا آغاز پرکھوں کے بھوتوں کی پوجا سے ہوا کہ لوگ اس سے خائف تھے۔ان کے خیال میں اگر ان ارواح کی پرواہ نہ کی جائے تو وہ انسان کے لیے خطرہ ہو سکتی ہیں۔تاہم اگر ان کو راضی رکھنے کی کوشش کی جائے تو وہ انسان کی مدد بھی کرتی ہیں۔ایک جرمن مفکر(E - Sakey نے ستارہ پرستی کو مذہب کا ماٰخذ قرار دیا ہے۔اس کے مطابق دیو مالا اور مذہب شروع سے ستاروں کی پوجا سے وابستہ رہے ہیں جن کا مرکز شہرِ بابل تھا۔اس کی اشاعت مشرق وسطیٰ کے ممالک سے

عرب یونان اور اسرائیل میں ہوئی تھی شاید اسی لیے اسے (E- Askey) نے ہمہ گیر بابلیت کا نام دیا۔ (Robert Samith) نے قربانی کو مذہب کا نقشِ اولیں کہا۔ اس کے خیال میں جب قدیم زمانے کا انسان اپنے آباء کی روحوں کی تسکین یا اپنے تصوراتی دیوتاؤں کو خوش کرنا چاہتا تو قربانی کرتا۔ اسی سے مذاہبِ عالم کا آغاز ہوا۔ مانا کے تصور سے بھی مذہب کی تشریح کی گئی ہے۔ میلانیشیوں کے ہاں عالم ارواح کے لیے مانا کا لفظ ہے۔ وہ مانا کو ایک قسم کی توانائی خیال کرتے تھے جو کائنات میں ہر کہیں مخفی ہے۔ جو ہماری صحت اعمال اور خوشحالی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس غیر مرئی اور غیر شخصی توانائی کو جو بعض اوقات مختلف اشخاص یا اشیاء میں حلول کر کے انھیں مقدس یا بابرکت بنا دیتی۔ شمالی امریکہ میں روانڈا کے مکین اسی مخفی توانائی کو مانیٹو کہتے۔ مراکو (مراکش) میں اسے برکہ کہا جاتا۔ اہل مراکش کا خیال تھا کہ یہ توانائی ان کے سلاطین اولیاء سادات اور مجذوبوں سے خاص ہے۔ جنوبی ہند میں اسے یعنی مانا کو شکتی کہا جاتا۔ وہ مانا کی تقسیم کے قائل تھے اور ان کے خیال میں شکتی بری بھی ہوتی ہے جو آزار پہنچاتی ہے اور اچھی بھی ہوتی ہے جو خوشحالی لاتی ہے۔ اڑیسہ کے وحشی قبائل مانا کو "بوانگا" کہا کرتے (Robert Samith) کے خیال میں مانا کا تصور اول اول مقدس ضیافت (قربانی) ہی سے پیدا ہوا۔ اس لیے کہ بعض قبیلوں کے لوگ اپنے ٹوٹم کو مار کر کھا جاتے تھے تا کہ اس کی طلسماتی پر اسرار توانائی ان میں حلول کر جائے۔ (Goderngten) نے میلانیشی معاشرے کے حوالے سے مانا کے تصور پہ تفصیلی بحث کی ہے اور اشارتاً کہا ہے کہ یہی ہمہ گیر توانائی ہے جس کو بعد میں مذہب اور روحانیت قرار دے دیا گیا جو آج تک مذہب کے حوالے سے ایک مضبوط جواز تصور کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف علم الانسان کے طلبہ نے خدا کے تصور کو تشبیہی "Anthropomorph" قرار دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اپنے نمونے پر خلق نہیں کیا جیسا کہ اہل مذہب کہتے ہیں۔ بلکہ انسان نے خدا کو اپنے نمونے پر خلق کیا ہے گویا خدا انسان سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتا اور خالق خود انسانی ذہن ہی کی ایک الجھن ہے۔

(Fried) اور اس کے ہم مسلک اِدعاً کا کہنا ہے کہ مذہب بچپن کے نفسیاتی عدم توازن کے مماثل ہے اور جذبہ مذہبیت دورِ طفلی کے بے بسی کے احساس سے یادگار ہے۔ اس میں بنی نوع انسان کے عہدِ طفلی یا ابتدائی دورِ تہذیب کی بے چارگی کا احساس بھی شامل ہے۔ وہ خدا کو باپ کا عکس مانتے تھے جو دہشت اور شفقت دونوں کا مجموعہ ہے۔ بچہ باپ سے ڈرتا بھی ہے اور اس کا سہارا بھی تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ خدا کا تصور ابوی

الجھن کی پیداوار ہے ۔اسی بنا پر خدا کو آسمانی باپ بھی کہتے ہیں (Fried) کا ایک شاگرد(Dr Forsmith)جو اپنے استادہی کی طرح ''بے دانش'' ہے مذہب کی تشریح کچھ اس طرح کرتا ہے؛

''مذہب انسان کو سہارا دیتا ہے لیکن یہ ایسا ہی سہارا ہے جیسا کہ ایک بچہ تلاش کرتا ہے۔ بالغ آدمی کسی کا سہارا لے گا تو یہ اس کی ذہنی ناپختگی اور طفلانہ پن کا ثبوت ہوگا۔انسان کے لیے خدا کی ذات یا کسی ماورائی طاقت کا سہارا بالکل بے جواز ہے بلکہ انسان کو خود اپنی ذات کا سہارا لینا چاہیے اسے جنت کی تلاش کے بجائے خود اسی دنیا کو جنت بنالینا چاہیے، اسے موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے بلکہ یہ دنیا ہی جائے تعیش ہے اور مذہب نے یہ جو شقی اور سعید، نیک و بد، صادق و کاذب کی تفریق کی ہے یہ قطعاً غیر ضروری ہے۔کوئی شخص فطرتاً اچھا یا برا نہیں ہوتا ماحول اور معاشرہ اسے اچھا یا برا بنا دیتے ہیں اس لیے ماحول کو سازگار بنا کے ہر شخص کو اچھا بنایا جا سکتا ہے''۔

مگر حیرت ہے کہ(Dr Forsmith)اپنی کتاب(Psychology of Rerligion) کے آخری صفحے تک یہ راز کھولنے سے گریزاں رہے کہ آخر مذہب کے سوا وہ کون سی اخلاقی اور تہذیبی بنیادیں ہیں جن کو اپنا کر انسان اپنے ماحول کو اتنا سازگار بنا سکے جس میں برائی کا وجود مٹ کے رہ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب کا یہ پورا گروہ جس نے اپنے فلسفے کی ساری عمارت کی بنیاد مادیت پہ رکھی ہے انھوں نے دنیا میں علم کے نام پہ جو اندھیرا پھیلایا ہے اس نے کئی انسانی نسلوں کو روحانی تشنگی کے اس غار میں دھکیل دیا جہاں صرف ناکامی مایوسی ندامت اور پچھتاوے کے سائے ہیں۔

Fried اپنی کتاب(Pleasure Thinking) میں مذہب کے حوالے اپنی دانش کی دہائی کچھ یوں دیتا ہے!

"تحلیل نفسی کی رو سے نفس انسانی کے دو پہلو ہیں ایک حظ فکری اور دوسرا حقیقت فکری۔ مذہب اور تصوف حظ فکری کی پیداوار ہیں جب کہ سائنس حقیقت فکری کی پیداوار ہے۔ حقیقت پسند آدمی خواب وخیال کی دنیا کی بجائے حقائق کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے مسائل اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے چاہے حالات اس کے کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں۔ اس کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہاتھ خلا میں اٹھائے کسی ان دیکھی طاقت سے مدد کا طالب ہو۔ اس کے برعکس مذہبی آدمی وہ ہے جو حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتا اور وہ حقائق سے فرار اختیار کر کے تخیلات سے رجوع لاتا ہے اور تخیل ہی میں اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا مداوا تلاش کرتا ہے۔ مذہب اسی اجتماعی تخیل آرائی کا کرشمہ ہے بنی نوع انسان نے اپنے ابتدائی دور میں بچوں کی طرح نامساعد قدرتی ماحول سے گریز اختیار کرنے کے لیے تخیل آرائی کے دامن میں پناہ لی تھی جو بعد میں عقائد کی شکل اختیار کرنے کے باعث مذہب کی بنیاد بن گیا رفتہ رفتہ انسان زمانے کے تقاضوں اور فکری ارتقاء کے ساتھ بلوغتِ نظر و احساس سے بھی بہرہ یاب ہو گیا اور اپنے عقدے حقیقت پسندانہ انداز میں سلجھانے لگا۔ اب اگرچہ اس کو کسی خارجی طاقت کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی نجانے کیوں وہ مذہبی تخیلات سے ہی چمٹا رہا حتیٰ کہ صنعت اور سائنس کا دور آ پہنچا اور سائنس کی ترقی نے انسان کی دلچسپیوں کا رخ تخیل آرائی سے ہٹا کر معروضی صداقتوں کی طرف موڑ دیا اور وہ نفسیاتی بلوغت کے مرحلے میں داخل ہو گیا[30*]"۔

قدیم مذہبی عقائد

صبح تاریخ سے مذہب کی تشکیل میں دو عوامل کارفرما رہے ہیں ایک انسان کی معاشیات اور دوسرے اس کی نفسیات کہ بھوک کے خوف اور تشویش کے باعث قدیم زمانے کے انسان کو اپنی بے بسی اور بے چارگی کا نہایت تلخ احساس تھا جس کی تلافی کے لیے اس نے تخیل آرائی میں پناہ ڈھونڈی اور مافوق الطبع عناصر کا سہارا لیا۔فوق الطبع کا سہارا وہی شخص لیتا ہے جو موت سے ڈرتا ہو یا غریب اور مفلس ہو۔مذہب کی مقبولیت کا راز اس میں ہے کہ وہ موت کے بعد ایک اچھی زندگی کی بشارت دیتا ہے جس کا سنگ بنیاد روح کے تصور میں تلاشا جا سکتا ہے۔اس لیے کہ اس تصور کے ساتھ ہی حیات بعد موت، بقاء و معاد، حشر اجساد، جزا و سزا، جنت اور دوزخ اور خوفِ خدا کے عقائد وابستہ ہیں۔کوئی بھی شخص جو روح کے وجود کا منکر ہو با مذہب نہیں ہو سکتا کیونکہ روح کے منکر پر لازم آئے گا کہ وہ موت کے بعد روح کے باقی رہنے سے بھی انکار کرے۔چنانچہ روح پر عقیدہ رکھنا ہی عالم عقبیٰ پر عقیدہ رکھنا ہے۔خدا کے وجود پر عقیدہ رکھنا یہ ہے کہ روح کا منکر لازماً خدا کا بھی انکاری تصور کیا جائے گا۔قدیم زمانے کا انسان سانس یا ہوا کے جھونکے کو روح کہا کرتا تھا۔آج بھی متعدد بڑی زبانوں میں روح کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں وہ سانس یا ہوا کے جھونکے ہی کے ہم معنیٰ ہیں۔ جیسا کہ عربی میں روح کے لیے نفس عبرانی میں رواح یا نفش، یونانی میں سائیکی، لاطینی میں اینی ما سنسکرت میں آتما اور انگریزی میں سپرٹ کے لفظ روح کے مقابل زیر استعمال ہیں۔[31*] قدیم زمانے کا انسان ارتقاء کے مراحل طے کرتا رہا اور شعور بیداری کے ساتھ اس کے ہاں روح کا تصور بھی بدلتا رہا۔پہلے روح ہوا کا جھونکا یا کسی پر اسرار توانائی پر مشتمل تھی۔پھر انسان کے آباء نے روح کو اپنی ہی شکل و صورت اور قد و قامت

جیسی چلتی پھرتی کایا سمجھ لیا۔ پھر وہ اس کو بھوت پریت سمجھتا رہا جو انسان کی موت کے بعد کسی دوسرے عالم کو چلی جاتی ہے۔ اسی کایا سے عفریت، ہمزاد، جن اور بھوت پریت وغیرہ کے تصورات وابستہ ہیں۔ یہ روح موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے وہ اپنے عزیزوں کی مدد کرتی ہے۔ ان کی ضیافت میں شریک ہوتی ہے پرانے زمانے کے شمن اور کاہن اور آج کے روحانیت پسند (Spiritualists) روح کی حاضری کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور اہل مذہب وتصوف کی روحانیت بھی اسی عقیدت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

متکلمین نے روح کے بارے میں عجیب وغریب موشگافیاں کی ہیں۔ صوفیوں اور سریت پسندوں کا مشہور عقیدہ ہے کہ ابتدائے آفرینش میں انفرادی روح، روح کل کا جز تھی جو اس عالم مادی میں آ کر اپنی اصل سے جدا ہو گئی یہاں وہ اپنے ماخذ میں واپسی کے لیے بے قرار رہتی ہے اور اس کے فراق میں تڑپتی ہے۔ چنانچہ ان کے خیال میں انسانی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی روح کو ریاضت تجرد مراقبے اور تپ سے کام لے کر مادے کی بندشوں سے رہائی دلوائے تا کہ وہ دوبارہ روح کل میں جذب ہونے کے قابل ہو جائے۔ یہی جذب وفنا روح کی بقاء ہوگی اور اسی مقصد کے لیے صوفیہ، جوگی، ویدانت اور سریت پسند دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے جپ تپ کرتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''مشکواۃ الانوار'' میں روح کی چار قسمیں گنوائی ہیں۔ جدید نفسیات کی رو سے روح کو انسانی ذہن سے خارج میں کوئی مستقل بذات ہستی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ امام غزالیؒ کے بقول روح جسم میں آنے کے بعد حادث ہوتی ہے جیسے صورت آئینے میں نظر آتی ہے اور موت آنے پر عالم ارواح کو لوٹ جاتی ہے۔ امام غزالیؒ کے اس فلسفے پر سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب قانون اسلام میں شدید تنقید کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ :

> ''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جب امام غزالیؒ نے روح کو مادی تسلیم نہیں کیا بلکہ بغیر جسم کے مانا ہے اور کہا کہ نہ وہ جسم میں داخل ہے نہ جسم سے خارج نہ اس سے ملی ہوئی ہے نہ جدا ہے بلکہ اس کا تعلق بدن سے ایسا ہے جیسے صورت کا آئینے سے تو وہ انسان کے افعال سے اخلاق حسنہ یا اخلاق قبیح کیونکر حاصل کرتی ہے''۔[32*]

□□□□□□□

روح کو مادی سمجھنا آسان ہے مگر یہ سمجھنا سخت مشکل ہے کہ وہ غیر مادی ہو کر مادے کو کس طرح متحرک کرتی ہے اس امر میں مادیت پسندوں کا استدلال یہ ہے کہ جس شے کو روح کہا جاتا ہے وہ انسانی ذہن سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی اور ذہن مغز سر کا فعل ہے۔ مغز سر ایک مادی چیز ہے لہٰذا روح بھی مادہ ہوئی۔ جب موت پہ مغز سر کا فعل ختم ہو جاتا ہے تو روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پہ مادیت پسند روح کے انفرادی وجود کے منکر ہیں۔

مسلمانوں میں فرقہ کرامیہ اور حنابلہ روح کو جسم مانتے ہیں اور حشر اجساد کے قائل ہیں یعنی ان کے خیال میں قیامت کے دن انسان اسی جسم اور روح کے ساتھ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھے گا جس کے ساتھ وہ اس دنیا میں زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ شیخ ابن العربی نے روح اور نفس میں فرق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روح انسان میں عقلی اصول ہے جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ جب کہ نفس حیاتِ حیوانی ہے۔ لغتِ تاج العروس میں نفس سے مراد ذہن اور روح سے مراد زندگی لیا گیا ہے۔ روح کے وجود سے نسخِ ارواح یا آواگون کا قدیم عقیدہ بھی وابستہ ہے۔ یہ عقیدہ قدیم مصر میں بھی تھا لیکن ہندوؤں نے اس پہ بڑی شرح وبسط سے بحثیں کی ہیں۔

ہندوؤں کے خیال میں آتما (انفرادی روح) ایشور (خدا) اور پراکرتی (مادہ) تینوں ازلی وابدی ہیں اور غیر مخلوق ہیں۔ ایک اور مغربی مفکر (Monier Willams) نے ہندوؤں کے قدیم عقائد پہ بحث کرتے ہو لکھا ہے کہ نسخ ارواح کا تصور غیر آریائی ہے اور دراوڑوں سے یادگار ہے۔ رگِ وید میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا اس میں روح کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وہ موت کے بعد پانیوں میں چلی جاتی ہے۔ ہندوؤں نے دراوڑوں کے تصور پر کرم کا پیوند لگایا اور کہا کہ انسان کی روح اپنے نیک اعمال کی جزا میں اور بداعمال کی پاداش میں موت کے بعد نیا چولا بدلتی ہے اصطلاح میں اسے سنسار چکر یا آواگون (آنا جانا) کہا جاتا ہے۔ جب تک روح کو نجات یا مکتی حاصل نہ ہو وہ جنم روپ اختیار کرتی رہتی ہے اور اسے چوراسی لاکھ جنموں سے گزرنا پڑتا ہے۔ گوتم بدھ اور جین روح کے منکر رہے ہیں اسی لیے انھیں ناستک یا ملحد کہا جاتا ہے۔ بدھ مت کا بڑا اعتقادی تضاد یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ روح نامی کسی وجود کا سرے سے منکر ہے دوسری طرف وہ تناسخ اراواح کا بھی قائل ہے۔ اگر چہ بدھ مت جین مت اور سکھ مت میں ہندوؤں کے مہمات عقائد کی پیروی کو مسترد کر دیا گیا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ حیات بعد موت اور آواگون کے بھی قائل ہیں۔

آواگون ظاہراً نہایت رجعت پسند عقیدہ ہے جس کی آڑ لے کر مکار برہمنوں نے نیچ ذات والوں کو یقین دلا

رکھا ہے کہ ان کے سابقہ جنموں کے گناہوں کی پاداش میں انھیں نیچ پیدا کیا گیا ہے چنانچہ وہ بغیر کسی حیل و حجت کے ایشور کی مرضی کے سامنے سر جھکائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں جب تک آواگون کا یہ عقیدہ زندہ ہے وہاں کے کروڑوں نیچ ذات والوں کو ان کا اصل انسانی مقام میسر نہیں آسکتا۔ مسلمانوں میں اسماعیلی خوجے بھی آواگون کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں منکر نکیر مردے سے پہلا سوال یہی کرے گا کہ کیا تم اپنے امام کو پہچانتے ہو اگر جواب نفی ہو تو مردے کو روح کا قالب بدلنا پڑتا ہے اور جب تک وہ اپنے امام کی شناخت نہیں کر لیتا اسے سنسار چکر سے نجات نہیں مل سکتی۔ اخوان الصفا بھی تناسخ ارواح کے قائل تھے وہ کہتے تھے کہ روح نباتات، جمادات اور حیوانات میں سے گذرتی ہوئی انسان تک آتی ہے اور پھر عالم علوی کو پرواز کر جاتی ہے۔ دنیا کا ہر مذہبی عقیدہ کامل سپردگی کا تقاضا کرتا ہے اور اس میں چوں چراں کی گنجائش نہیں ہوتی اسی بنا پر (Carel Zang) مذہبی عقیدے کو عشق سے مماثل قرار دیتا ہے اس کے خیال میں؛

"عشق اور مذہبی عقیدے میں ایک سے زیادہ عناصر مشترک ہیں اور دونوں میں کامل سپردگی ضروری ہے۔ صرف وہی اہل مذہب جو اپنے خدا کے سامنے پوری طرح سر تسلیم خم کرتے ہیں اس کی بارگاہ میں مقبول ٹھہرتے ہیں اور اس کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں اسی طرح عشق کے حیرت انگیز اسرار بھی اسی شخص پہ کھلتے ہیں جو اپنی محبوبہ کے سامنے کامل سپردگی سے کام لیتا ہے"۔

❑❑❑❑❑❑❑

مذہبی عقیدے اور تقدس کے احساس کا بھی آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مشہور مغربی دانشور (Jon Hukslay) نے تقدس کے احساس کو مذہب کا جوہر قرار دیا ہے اس نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب (Religion without Revelation) میں اس امر سے تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ؛

"جو شخص کسی وجود یا شے پہ عقیدہ رکھتا ہے وہ اس کے لیے مقدس بن جاتا ہے چنانچہ اہل

مذہب خداوند سے لے کر پتھروں، چٹانوں، دریاؤں پہاڑوں کی چوٹیوں، چشموں، جھیلوں ، پتھر اور لکڑی سے تراشی ہوئی مورتیوں، درختوں، پھولوں، پرندوں، حیوانوں اور قبروں کو مذہبی عقیدے کی بنا پر ہی مقدس جان کر ان کی پوجا کرتے چلے آئے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے چلے آئے ہیں۔تقدس کا احساس محبت اور خوف کے ملے جلے جذبات پر مشتمل ہے یعنی انسان جس وجود یا شے کو مقدس سمجھ لیتا ہے اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس کی جانب کشش بھی محسوس کرتا ہے۔یہی کیفیت مقدس اشیاء یعنی ٹیبو اور ٹوٹم کے تصور میں بھی پائی جاتی ہے۔اسی حوالے سے مانا کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔مانا یا غیر معمولی طلسماتی قوت اشیاء اور اشخاص سے وابستہ ہوتے ہیں تو مقدس بن جاتے ہیں اسی بنا پر انسان بجلی کی کڑک اور چمک، آتش فشاں پہاڑ، گھنے جنگل گہرے غاروں اور عجیب وضع کے پتھروں کو بھی مقدس سمجھتا رہا ہے اور انھیں عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے‘‘۔

❑❑❑❑❑❑❑

عقیدے کے بعد جذبہ مذہبیت پہ بحث ہوگی۔(Fried) نے کہا کہ جذبہ مذہبیت سراسر منفی جذبہ ہے اور اس کی بنا محبت پر نہیں بلکہ خوف پر رکھی ہوئی ہے۔اس سے کسی محبوب ہستی کے ساتھ قلبی تعلق و ربط پیدا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی مافوق الطبع ہستی کی تالیفِ قلب مطلوب ہوتی ہے۔اگرچہ فرائڈ سے بہت پہلے لکریشس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ مذہب دہشت کی پیداوار ہے اور غاروں کا انسان اپنے آپ کو چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتا تھا۔وہ صدیوں تک گوناگوں اندیشوں میں مبتلا رہا اور مظاہرِ فطرت سے خوف کھاتا رہا اندھیرے کا خوف، مرے ہوئے دشمنوں کے بھوتوں کا خوف، قحط اور بھوک کا خوف، موت کا خوف، امراض کا خوف، درندوں کا خوف، سانپوں کا خوف، چوروں اور لٹیروں کا خوف، سیلاب کا خوف، بجلی کی کڑک کا خوف اس کے اعصاب پر مسلط رہا جو اس کے دن کے آرام اور رات کی نیند کو حرام کرتا رہا۔علم کی ترقی کے باوجود انسان آج بھی نامعلوم خوف کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا، لکریشس کی طرح ’’ ہابس، ہولباخ، کندور اور فرائیڈ ‘‘ نے بھی جذبہ خوف کے حوالے سے ہی مذہب کی توجیہ کی ہے۔جب کہ کارل مارکس نے مذہب کو انسان کے لیے افیون قرار دیا ہے۔کیونکہ مذہب عوام کو

اگلے جہان کی نعمتوں کی بشارت دے کر انھیں دنیا میں اپنے جائز حقوق کے لیے جدو جہد کرنے سے روکتا ہے۔بعض اہلِ تحقیق نے احساسِ جرم کو جذبہ مذہبیت کا لازمہ قرار دیا ہے اس میں شک نہیں کہ جہاں تک اسرائیلی مذہب کا تعلق ہے اس میں احساسِ جرم اور جذبہ مذہبیت لازم وملزوم رہے ہیں۔مذہبی احساسِ جرم یہودیت سے شروع ہوا اور عیسائیوں میں سرائیت کر گیا۔یہودیوں کا خدا یہواہ ایک قبائلی معبود تھا جس کے ہر حکم کو بجالانا وہ اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔یہواہ کے احکام ان کی روزمرہ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ محیط تھے اس لیے قدرتاً انھیں ان کی تعمیل میں دقت محسوس ہوتی تھی اور وہ لغزشوں سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے تھے جس کے باعث ان کے دلوں میں احساس جرم گھر کر لیتا تھا اور وہ ان خطاؤں کی قربانیاں دے کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیتے تھے شروع شروع میں ان کے ہاں شیطان کا تصور موجود نہیں تھا۔

شیطان کو بابل کے ایام اسیری میں یہودیوں نے اپنے مذہبی عقائد میں شامل کیا اس لیے وہ ہر برے کام کا ذمہ دار شیطان کو نہیں بلکہ اپنی فطرتِ بد کو ٹھہراتے تھے۔آبائے کلیسا پال ولی آگسٹائن اور کلیمنٹ نے کہا کہ جب آدم نے حکم خداوندی سے سرتابی کی تو اس نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا اور یہ گناہ اولادِ آدم کو ورثے میں ملتا ہے لہٰذا سب انسان بالطبع گنہگار ہیں اور نیکی سے گریزاں ہیں۔ان کے مطابق جناب مسیحؑ ہی ان کی شفاعت کر سکتے ہیں اور انھیں عذاب سے نجات دلا سکتے ہیں۔ازلی اور موروثی گناہ سے بحث کرتے ہوئے ولی امبروسی نے کہا کہ آدم وحوا کی جنسی مواصلت ہی ان کا اصل گناہ تھا جس سے بچنے کے لیے تجرد کی زندگی گزارنا ہے۔اس عقیدے کے باعث جنسی مواصلت سے گناہ کا احساس وابستہ ہوگیا جو جنسی آزادی کے باوجود آج بھی عیسائی دنیا کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنا ہوا ہے۔تاہم عیسائی سریت پسندوں کے ہاں گناہ اور ثواب کا فلسفہ قدرے مختلف ہے ان کے مطابق انسان کے لیے گناہ کرنا اس لیے ضروری ہے کہ بخشش تبھی ہوگی جب گناہ کیے ہوئے ہوں گے اور خدا کی رحمت بھی صرف گنہگاروں ہی کے لیے زور مارتی ہے اور گنہگار خدا کے محبوب ہوتے ہیں۔ایک اور مغربی مفکر(Helan Waker) نے مذہب کی توجیہ اس طرح کی کہ حیاتیاتی پہلو سے مذہب بے چارگی اور بے بسی کے طویل طفلی دور کی پیداوار ہے جس کی مثال یہ ہے کہ ایک ننھا بچہ قدم قدم پر اپنے ماں باپ کا سہارا لیتا ہے مگر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو بے مہر دنیا کے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے اس پہ بچپن کی ناتوانی کا احساس اور تنہائی کا خوف از سرنو اس کے قلب وذہن پر حاوی ہو جاتا ہے جس کا مداوا وہ مذہب میں تلاش کرتا ہے اس لیے جب تک بچے کو ایک مساعد سماج فراہم کر کے اس

کے ذہن سے ناتوانی کے احساسات دور کر کے اسے اس نامعلوم خوف سے نجات نہیں دلائی جاتی اس وقت تک انسان مذہب کا محتاج ہی رہے گا۔

مذہب کے موضوعی اور معروضی پہلو

یاد رہے کہ مذہب کے بارے میں یہ تمام نظریات اسلام کی روشنی سے قبل کے ہیں اور ان لوگوں کے قلم سے نکلے ہیں جو خود کو شامل تو اہل دانش میں کرتے ہیں مگر ان کی تعلیمات اور عملی روش سے کسی دانش کا اظہار نہیں ہوتا۔ ورنہ زمانہ ماقبل میں بھی لوگ محض عقل کے سہارے خالق تک پہنچنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے مذہب کے دو پہلوؤں کو نمایاں طور پہ اجاگر کیا ہے ایک اس کا موضوعی پہلو ہے جس میں انسان اپنے معبودوں سے جذباتی تعلق استوار کرتا ہے اور مذہب کے دوسرے پہلو کو انھوں نے معروضی کہا جس میں رسوم وعبادات شامل ہیں۔ جس کے تحت تجرد، ریاضت، قربانی دستورِ عمل اور علم کلام شامل ہیں۔ جیسا کہ ارواح کے باب میں ذکر آ چکا ہے کہ روح کا تصور بھوت، ہمزاد یا ایک چلتی پھرتی لطیف کایا میں بدل گیا تو انسانوں نے اپنے آباء کی ارواح کی پوجا شروع کی۔ یہی پوجا بعد میں منظم ہو کر دیو مالا اور مذہب کی صورت اختیار کر گئی۔ مذہب نے ارواح کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی سعید ارواح اور بد ارواح اسی نسبت سے ان کے دیوتا بھی سعید اور شقی دیوتاؤں میں تقسیم ہو گئے۔ تاہم اس دور میں انسان مجبور تھا کہ سعید اور شقی ہر دو قسم کے دیوتاؤں کی پوجا کرے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قربانی کرے۔ اس لیے کہ سعید دیوتا کی پوجا تو اظہارِ تشکر کے لیے کی جاتی مگر شقی دیوتا کی پوجا اس لیے کی جاتی ہے تاکہ لوگ اس کے آزار سے محفوظ رہ سکیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی ہندوؤں کے ہاں جو دیوی یا دیوتا جتنا زیادہ بدصورت ہوگا اس کی پرستش اتنے ہی ذوق وشوق سے کی جائے گی۔ کالی دیوی گنیش اور جگن ناتھ اس کی معروف مثالیں ہیں۔ انسان نے دیوتا کو انسانی طبع پہ قیاس کیا ہے اس لیے جن باتوں سے انسان خوش ہو سکتا ہے اسی کی تمثیل وہ دیوتاؤں کے

لیے لائے ہیں۔ چنانچہ انسانوں نے اپنے اسی تخیل کے پیش نظر اپنے دیوتاؤں کے بڑے بڑے معبد تعمیر کیے تا کہ ان کے دیوتا وہاں آرام وسکون کے ساتھ رہ سکیں۔ ہندو اپنے مندروں کی دیواروں کو اس لیے جاذبِ نظر بناتے ہیں تا کہ ان کے دیوتا کے حسِ جمال کی تسکین ہو سکے وہ دیواروں کو خوبصورت کاشی گری اور دلآویز مجسّموں سے سجاتے ہیں۔ وہ اپنے دیوتاؤں کے بت سونے اور چاندی سے ڈھالتے ہیں انھیں اطلس و کمخواب کے قیمتی لباس پہناتے ہیں پھر انھیں قیمتی پتھروں ہیرے جواہرات یاقوت ولعل زمرد نیلم اور پکھراج وغیرہ سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے معبودوں کے لیے شمعیں جلانے کا اہتمام بھی کرتے وہ پتھر کے بتوں کے سامنے لذیذ کھانے چن کے بیٹھ رہتے اور ہندوؤں کے ہاں تو آج تک دودھ اور اس سے بنی ہوئی اشیا مکھن بالائی وغیرہ خود کھانے کی بجائے اپنے ٹھاکروں کو بھینٹ کی جاتی ہے۔

ان کے مندروں میں پوجا کے وقت فضاؤں کو معطر رکھنے کے لیے طرح طرح کی خوشبویات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کے ذوقِ حسن کی تسکین کے لیے سینکڑوں پری چہرہ دیوداسیاں ان کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہتی ہیں اور دن میں تین مرتبہ ناچ گا کر اپنے دیوتاؤں کا جی بہلاتی ہیں۔ ان کے ہاں مقدس بکرے اور بیل کی زوجیت میں خوبصورت لڑکیاں دی جاتی ہیں۔ دیوتاؤں کی ستائش کے لیے کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے طائفے پرے باندھ کر اور سریلی آوازیں ملا کر سازوں کی گت کے ساتھ دلکش انداز میں بھجن اور گیت گاتے ہیں جس میں ٹھاکروں سے پرجوش عقیدت اور محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ان کے سوانح پر مبنی ناٹک بھی کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھ کر چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ جملہ فنون لطیفہ فن تعمیر فن سنگ تراشی مصوری شاعری موسیقی اور ناٹک مذہب ہی کے دامن میں پروان چڑھے تھے۔ مالیاتی پہلو سے یہ بات اہم ہے کہ ملک کی آمدنی اور محصولات کا کثیر حصہ مندروں اور پروہتوں پر ہی خرچ کیا جاتا۔ چین کے قبضے سے پہلے تبت کی آمدنی کا ایک تہائی حصہ اس مکھن پہ خرچ کیا جاتا جس سے معبدوں کے چراغ روشن کیے جاتے تھے۔

پوجا کی رسوم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آدمی اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے اس کی بڑائی کرے اور اس کے سامنے اپنی عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرتا رہے۔ اس کی سب سے معروف صورت رکوع ہے جو صابئین کے ہاں بھی مروّج تھی۔ رکوع وسجود سے بندے کی مسکنت اور معبود کی عظمت وجلالت کا اظہار ہوتا ہے اس کی انتہائی صورت ہندوؤں کے ہاں پائی جاتی ہے جہاں لوگ پیٹ کے بل لیٹ کر اپنے تیرتھ کی طرف جاتے

ہیں۔اکثر اقوام میں طواف بھی پوجا کا لازمہ رہا ہے۔اس کا آغاز بھی صائبین سے ہوا جن کا تصور یہ تھا کہ جس طرح سات ستارے خداوند خدا کا طواف کرتے ہیں اسی طرح بندوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ مقدس معبودوں اور دیوتاؤں کے مجسّموں کا طواف کریں۔ہندوؤں کے ہاں طواف کو پرکرما کہا جاتا ہے۔اسلام سے قبل عرب کے مرد اور عورتیں مادرزاد برہنہ ہوکر کعبے کا طواف کیا کرتے تھے اسی طرح قربانی بھی ایک ہمہ گیر مذہبی رسم ہے جو ابتدائی زمانے سے انسان کے اندر موجود تھی (Robert Smith) نے قربانی پر ایک سیر حاصل بحث کی جو اس کی کتاب (Religion of the semites) سے پیش کی جاتی ہے جہاں وہ لکھتا ہے کہ؛

قربانی کی ہمہ گیری کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کوئی بھی مذہب خواہ وہ الہامی ہو یا سامی قربانی کے تصور کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس لیے کہ قربانی انسان کا بہت قدیم عمل ہے جو ہزراوں سال سے جاری ہے۔قربانی کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہے کہ یہ وہ مذہبی عمل ہے جس کی بنا پہ ذبیحہ یا بھینٹ کرنے والے کی مراد پوری ہوتی ہے یا اس مذکورہ شخص کے گناہوں کا کفارہ ادا ہوجاتا ہے۔قربانی وہ تحفہ یا نذرانہ تھا جو اول انسان ان فوق الطبع ہستیوں کو پیش کیا کرتا جن کی خوشنودی یا رضا کا وہ طالب تھا تاہم گذرتے وقت کے ساتھ دیوتاؤں کا تصور پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا اور انسان کے معبود اس سے دور ہوتے چلے گئے تو ان تک اپنی قربانی یا نذرانہ پہنچانے کے لیے رسوم وشعائر وضع کیے گئے۔انسان کا اگلا قدم یہ تھا کہ اس نے عمومی نذرانوں کی بجائے اب ترکِ دنیا اور ترکِ لذات کرکے اپنی ذات کا نذرانہ دینا شروع کیا۔ذات کی قربانی کا تصور صائبین سے شروع ہوا اور دنیا کے بہت سے معاشروں اور مذاہب میں جگہ بنانے میں کامیاب رہا۔بدھ مت میں اسے عروج حاصل ہوا کہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی ترکِ دنیا پر رکھی تھی۔تاہم ہندوازم، جین مت ،سکھ ازم عیسایت اور اسلام بھی ذات کی قربانی سے اپنے دامن کو محفوظ نہ رکھ سکے۔اپنی ذات کی قربانی کا تصور تصوف کے راستے اسلام میں داخل ہوا۔ہر چند کے اسلام کے حقیقی شعائر میں راہبانیت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔قربانی کا رواج سامیوں میں عام تھا۔مولک اور بعل دیوتا کے مذبحہ سال بھر خون سے تر رہتے۔انسان کی قربانی افضل تصور کی جاتی اور اسے آفات وبلیات کے دفعیے کے لیے موثر تصور کیا جاتا۔ایک اور تصور بھی قربانی کے پس منظر میں بیان کیا جاتا ہے جو یہ ہے کہ صبح تاریخ سے خون اور اس کے حوالے سے سرخ رنگ

حیات اور شباب کی علامت رہی ہے۔قدماء اپنے دیوتاؤں کے حضور قربانی اس لیے کیا کرتے تھے کہ سرخ خون کے باعث ان کی زندگی طویل ہو اور ان کی توانائی بحال رہے۔دنیا کے بہت سے معاشروں میں اس طرح کے قدیمی تصورات موجود تھے۔مثلاً میکسیکو کے باشندے سورج دیوتا پر انسان قربان کیا کرتے تھے اس لیے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر یہ قربانی نہ کی گئی تو سورج کی شعاعیں ماند پڑ جائیں گی اور وہ بجھ کے رہ جائے گا۔یہودیوں کے ہاں بڑے بیٹے کی قربانی کی قدیم رسم بابلیوں کے واسطے سے داخل ہوئی جو اہل عرب تک پھیل گئی تھی جس کی معروف مثال جناب عبدالمطلب کے بیٹے حضرت عبداللہ کی ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ اگر ان کے دس بیٹے ہوئے تو وہ ایک بیٹے کی قربانی دیں گے۔چنانچہ اللہ نے انھیں دس بیٹوں سے نوازا اور جناب عبدالمطلب نے حضرت عبداللہ کی قربانی کا ارادہ کیا مگر اہل مکہ کی مداخلت سے اس امر کا فیصلہ ایک کاہنہ پر چھوڑ دیا گیا جس کے کہنے پر حضرت عبداللہ کے بدلے سو اونٹ قربان کیے گئے۔یہودی اپنے کھیتوں کے پہلے خوشے اور اپنے پیڑوں کا پہلا پھل بھی یہواہ پر قربان کیا کرتے۔وہ خطا کی قربانی بھی کیا کرتے تا کہ یہواہ ان کی غلطیاں اور لغزشیں معاف کر دے۔ان کے ہاں سوختنی قربانی کا رواج بھی موجود تھا جس کا طریقہ یہ تھا کہ کسی مقدس چٹان یا پتھر پر آگ جلا کر اس میں ذبیحہ کی انتڑیاں وغیرہ رکھ دیتے تاہم ذبیحہ کے گوشت کے عمدہ حصے پروہتوں یا ربائیوں کو دیئے جاتے۔عہد نامہ قدیم میں آیا ہے کہ یہواہ کو یہ قربانی بہت مرغوب تھی اور وہ اس کی خوشبو سونگھ کر خوش ہوتا تھا۔عام طور سے آج تک قربانی کے جانور کو مقدس خیال کیا جاتا ہے۔ہندوؤں کے ہاں سر کے بال منڈوا کر بھی دیوتا کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اور ہندو عورتیں آج بھی گیا کے مندر میں اپنے سر کے بال کٹوا کر ٹھا کر کو بھینٹ دیتی ہیں یا بعض اوقات کسی دیوتا کے لیے سر کے بالوں کی ایک لٹ بھی بڑھا دی جاتی ہے تا کہ وہ اس کے ہاں قربان کی جاسکے۔میں نے خود اس امر کا مشاہدہ پنجاب اور سندھ کی دیہاتی زندگی میں کیا ہے کہ وہ لوگ جو خود کو مسلمان کہتے ہیں کسی دربار یا کسی پیر کے مزار پر چڑھانے کے لیے اپنے بچوں کی لٹ بڑھا دیتے ہیں اور پھر وقت آنے پر قربان کر دیتے ہیں۔سب سے خوفناک قربانی ایران میں کی جاتی تھی جس کا تصور کر کے ہی دل دہل جاتا ہے۔یہ ہولناک قربانی مولک دیوتا کے حضور کی جاتی جس کا طریقہ یوں تھا کہ مولک دیوتا کے عظیم اور قوی الجثّہ بت کے شکم میں آگ کا آلاؤ روشن کیا جاتا پھر مولک دیوتا کے بڑھے ہوئے ہاتھوں پہ جن پر تیل لگا ہوتا کسی نومولد بچے کو رکھ دیا جاتا بچہ حرکت کرتا اور پھیلے ہوئے ہاتھوں سے تیل کی پھسلن کی وجہ سے آگ کے

آلاؤ میں جا گرتا اور زندہ ہی جل جاتا۔ بچے مولک دیوتا کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے پھسل پھسل کر مولک کے شکم میں بڑھکتے شعلوں کی خوراک بنتے رہتے۔ان کا خیال تھا کہ اس قسم کی قربانی سے بلائیں ٹل جاتی ہیں سب سے افسوس ناک امر یہ تھا کہ کبھی کبھی مولک دیوتا کے لیے اجتماعی قربانی بھی کی جاتی مورخین بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ جب رومیوں نے کارتھیج شہر کا محاصرہ کیا تو محاصرہ طول پکڑ گیا اور شہر میں خوراک کی قلت پیدا ہونے لگی جس پہ مذہبی حلقوں نے اجتماعی قربانی کا واویلہ بلند کیا۔ چنانچہ ایک ہی دن میں صبح سے لے کر شام تک دوسو معصوم اور ننھے بچے مولک دیوتا کے ہاتھ سے پھسل کر اس کے آگ بھرے شکم کی خوراک بن گئے۔مگر رومیوں نے محاصرہ پھر بھی نہ اٹھایا۔ ہندوستان میں قربانی آریاؤں کے واسطے سے داخل ہوئی ہندو آریاؤں میں قربانی کی تین بڑی رسمیں تھیں نرمیدہ یگ (انسانی قربانی) اشومیدھ یگ (گھوڑے کی قربانی) اور گئیو میدھ یگ (گائے کی قربانی) وہ گھوڑے کو دیوتا پہ قربان کرنے سے پہلے ایک بکری ذبحہ کرتے تا کہ وہ جا کے دیوتا کو بتائے کہ اس کے لیے سفید گھوڑے کی قربانی تیار ہے۔ وہ سفید گھوڑے کا سینہ چاک کر کے اس کا دھڑ کتا ہوا دل کھینچ کر باہر نکال لیتے اور گھوڑے کو تبرکاً کھا جاتے۔ان کی کتابوں میں گائے کی قربانی کا ذکر بھی موجود ہے۔ اگر چہ آج ہندو گائے کو بھی دیوی قرار دے بیٹھے ہیں وہی ہندو پہلے گائے کو قربان کر کے شوق کے ساتھ اس کا گوشت کھایا کرتے تھے۔انسان کی تاریخ میں یہ قربانیاں فی الحقیقت قدیم انسانوں کی اجتماعی ضیافت سے یادگار تھیں جن میں مقدس ٹوٹم یا کسی دوسرے جانور کا گوشت سارا قبیلہ مل بیٹھ کر کھاتا تھا تا کہ اس کی پراسرار طلسماتی توانائی ان میں حلول کر جائے۔ ہندوستان میں صدیوں تک کالی دیوی کے مندر میں انسان کی قربانی کا رواج تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد تک جاری تھا۔ پھر انگریزوں نے اسے وحشت قرار دے کر اس پہ پابندی عائد کر دی۔آج بھی کالی گھاٹ کلکتہ میں کالی ماں کے مندر پہ بکریوں کی قربانی دی جاتی ہے اور اولاد کی خواہش مند عورتیں ان کا بہتا ہوا لہو چاٹتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں کانگڑی کے قریب ایک مندر ہے جہاں لوگ اپنی زبانیں کاٹ کر دیوی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ دیوی کی برکت سے کٹی ہوئی زبانیں اسی وقت اپنی اصل حالت میں واپس آجاتی ہیں‘‘۔

مذہبی اخلاق یا دستورِ عمل

اگرچہ اپنے ابتدائی دور سے ہی انسان نے اپنے لیے اخلاق کی بنیادوں کو استوار کرنا شروع کر دیا تھا تاہم اخلاق کی اصل بنیاد انسان کو مذہب ہی نے فراہم کی۔ جب انسان نے کھیتی باڑی سیکھی تب ان میں شخصی املاک کا تصور پیدا ہوا۔ اراضی، گائے، بیل، بھیڑ، بکری کی طرح عورتوں، غلاموں اور باندیوں کو بھی شخصی املاک میں شامل کر لیا گیا۔ قدیم ترین ضابطہ اخلاق جسے تاریخ محفوظ رکھ سکی اسے شاہ حمورابی والئی بابل نے مرتب کیا تھا یہ ضابطہ گلی الواح میں محفوظ تھا۔ شاہ حمورابی کا دستورِ اخلاق دو سو پچاس شقوں پر مشتمل تھا جنہیں شخصی املاک کے تحفظ اور قصاص کے اصول پر مرتب کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ ،دانت کے بدلے دانت، قانونِ حمورابی میں نہایت سخت سزائیں مرتب کی گئیں تھیں ان کے ہاں قتل، زنا، اغوا، راہزنی سرقہ اور مفرور غلام یا باندی کو پناہ دینے کی سزا موت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہی املاک یا محل میں تصرف کرنے اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کی سزا بھی موت تھی اس طرح حمورابی سلاطین نے اُمرا، جاگیرداروں اور پروہتوں کی شخصی املاک کو تو تحفظ فراہم کیا مگر عوام کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مذہبی اخلاق کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے مرتب کرتے وقت معاشرے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا اور اسے لوگوں کے سروں کے اوپر سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ شاہ حمورابی نے بھی شروع میں یہی دعویٰ کیا تھا کہ یہ دستورِ عمل اسے شمس دیوتا نے دیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی تعمیل ایک مذہبی فریضہ ہے جو شخص اس سے روگردانی کرے گا وہ عاصی اور مرتد ٹھہرے گا۔ مذہبی اخلاق کے اوامر و نواحی ازلی و ابدی ہوتے ہیں حالانکہ عملاً معاشی اور عمرانی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ شکار کے زمانے میں

چوری ڈاکے اور قتل کو مستحسن خیال کیا جاتا تھا اور ان امور کو شجاعت کی علامت قرار دیا جاتا تاہم زرعی انقلاب کے بعد انھیں سنگین جرائم قرار دے دیا گیا اور ان کی سزا موت مقرر کی گئی۔ اخلاقی قدروں کے اضافی ہونے کی مثال جنسی اخلاق سے ملتی ہے۔ مادری نظام معاشرہ میں عورت کی عصمت اور بکارت کو معائب میں شمار کیا جاتا تھا اور لوگ باکرہ لڑکی سے شادی کرنا پسند نہیں کرتے تھے جیسا کہ آجکل کے قبائلیوں کے مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ زرعی انقلاب کے بعد جب عورت مرد کی ذاتی ملکیت بن گئی تو اس پر عصمت اور بکارت کی کڑی پابندیاں لگادی گئیں مرد اپنی شخصی املاک اپنے ہی صلبی فرزندوں کے لیے چھوڑنا چاہتا تھا اس لیے عورت کی عصمت اور بکارت ضروری قرار دے دی گئی۔ چنانچہ حمورابی معاشرے میں جب کوئی مرد اپنی عورت کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ غیر حالت میں دیکھتا تو اس کو حق پہنچتا تھا کہ وہ دونوں کو قتل کر دے۔ مذہبی اخلاق کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی عصبیت وابستہ ہوتی ہے جس کے مطابق لوگ مذہبی عقیدے کی بنا پر اپنے ہم مذہبوں سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں اور غیر مذہب والوں کو برا کہتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں نیک وہ ہے جو میرا مذہب رکھتا ہے خواہ وہ روزمرہ زندگی میں کتنا ہی برا ہو اور وہ شخص نیک نہیں ہوسکتا جو میرا ہم مذہب نہیں خواہ عام زندگی میں وہ کتنا ہی اچھا اور نیک ہو۔ چنانچہ اس نظریے کی بنا پر عمل کی بجائے عقیدہ حسنِ اخلاق کا معیار بن گیا اگرچہ نظری لحاظ سے مختلف مذاہب کے پیرو دانش اور انسان دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے حق میں دلائل بھی دیتے ہیں لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ انسان شاید فطری طور پہ ہی مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو قریب نہیں آنے دیتا۔ مذہبی اخلاق کا ایک پہلو فردّیت ہے یعنی اہل مذہب ذاتی نجات کے حصول کی خاطر اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ذاتی نجات کے حصول کے لیے بعض بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے تجرد اور زاویہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس دنیا میں عوامی بہبود کے لیے جدو جہد کرنے کے بجائے اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں غلطاں رہے جس سے معاشرے کی ترقی پرور قوتوں کو ناقابل بیان صدمات پہنچتے رہے ہیں۔ قدماء کے خیال میں فرد معاشرے کے لیے ہوتا ہے نہ کہ معاشرہ فرد کے لیے اخلاقیات کے نقطہ نظر سے بھی انفرادی نجات کے حصول کی بجائے معاشرے کی بہبود و فلاح کی کوشش زیادہ مستحسن ہے۔ اور مسلّم ہے کہ انا پرستی کی بجائے عمومی فلاح کا احساس اخلاقیات کو زیادہ محکم اساس فراہم کرتا ہے [33*]۔ اس کے بعد مذہب کی

اخلاقی مبادیات میں علم کلام کا ذکر آتا ہے جس کا منصب یہ ہے کہ مذہب کو عقلی اساس فراہم کی جائے۔ اس مقصد کے لیے متکلمین سائنس کے جدید ترین انکشافات اور مذہب میں مطابقت پیدا کر کے مذہب کی ازلی و ابدی صداقتوں کا اثبات کرتے رہتے ہیں۔ علم کلام بھی ایک قدیمی علم ہے جس سے ہر دور کے علما نے مذہب اور سائنس کا تضاد دور کرنے کی سعی کی ہے۔ حقیقی طور پر مذہب اور سائنس میں اس قدر بُعد نہیں ہے مگر بعض معاشروں اور بعض دانشوروں کی مذہب سے بے زاری نے اس احساس کو اجاگر کیا ہے جیسے اہل مذہب اور اہل دانش ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔

دراصل جب اہل نظر نے فطری مظاہر کو قانونِ سبب و مسبّب کی روشنی میں دیکھنا شروع کیا اور طوفان، رعد، زلزلوں، آتش فشاں، شہاب و ثاقب، سلسلہ روز و شب، غروبِ آفتاب و مہتاب اور دیگر سیارگاں کی علمی توجیہ ہوگئی تو قدیم مذہبی عقائد کی کمزوری ظاہر ہوگئی جس سے اہل مذہب خصوصاً پروہت وغیرہ اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ ردِعمل کے طور پہ وہ تحقیقی علوم کی مخالفت پہ کمر بستہ ہوگئے اور انھوں نے ہر علمی تحقیق کے راستے میں روڑے اٹکانا شروع کر دیئے۔ پھر انھوں نے سائنس دانوں اور فلاسفہ کو ہراساں کرنے کی مہم شروع کر دی لیکن یہ تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور علم کا رستہ نہ روکا جاسکا۔ آخر کار ان کو بھی ان ابدی صداقتوں کو تسلیم کرتے ہی بن پڑی بلکہ انھوں نے ایک قدم اور اٹھایا اور سائنس کے انکشافات کو اپنے مذہب ہی کی صداقت قرار دینے لگے۔ انھوں نے موقف اختیار کیا کہ سائنس کے تمام اکتشافات کا راز ان کی مذہبی کتابوں سے لیا گیا ہے۔ اس دعویٰ کے اثبات کے لیے انھوں نے اپنی مذہبی کتابوں کے نصوص کی عجیب و غریب تاویلیں کیں اور ان کو سائنسی علوم سے ہم آہنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سائنس اور مذہب میں مطابقت کی انھی کوشش کو علم کلام کہا جاتا ہے جس کے وسیلے سے یہودی (فیلو بیوبز) عیسائی (طامس اکو ناس، ابیلارڈ) ہندو (رادھا کرشنن، آروند وگھوش) مسلمان (امام غزالی اور امام رازی) جیسے متکلمین نے اپنے اپنے مذاہب کی ابدی صداقتوں سے بحث کی ہے۔

تقابلِ مذاہب ایک مطالعہ

اٹھارویں صدی کے آواخر میں تقابلِ مذاہب کا باقائدہ آغاز یورپ اور امریکہ سے ہوا پورا مغربی معاشرہ اس وقت سائنس اور صنعت کے وبال میں اس قدر الجھ چکا تھا کہ ان کی زندگی میں مذہب کی گنجائش کافی کم ہو چکی تھی۔ ان کے دانشوروں نے مذہب سے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ مذہب کا وجود اگرچہ ضروری ہے تاہم کوئی اپنے مذہب اور عقیدے کے بارے میں کتنا سنجیدہ ہے یہ معاشرے کے ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور وہ سماج کے کسی دباؤ کے بغیر اپنے مذہبی رجحان کو پروان چڑھانے میں آزاد ہے۔ اس نظریے نے ان کے ہاں سے مذہب کے اجتماعی تصور کو ختم کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب مذہب نہ ان کی عام گفتگو کا حصہ تھا اور نہ ہی ان کی زندگی کے نظام الاوقات میں اس کے لیے جگہ باقی بچی تھی۔ رفتہ رفتہ حال یہ ہو گیا کہ سنڈے کو چند منٹ کے لیے چرچ جانا بھی ان کے لیے خالق کے اوپر کسی احسان سے کم نہ رہا۔ چنانچہ اس دور کے مغربی اہل دانش نے اپنی ہر تحریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مذہب دراصل کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتا بلکہ یہ انھی رسموں اور رواجوں کی ترقی یافتہ شکل ہے جو مذہب کے نام پر اول اول انسان نے وضع کیں تھیں۔ تقابلِ مذاہب کے مطالعے میں بھی اسی بات کی کوشش کی گئی ہے کہ بہر حال انسان کو مذہب سے وابستہ رہتے ہوئے سرد مہری کا رویہ اپنانا چاہیے اور اس کے لیے کسی گرم جوشی اور احساسِ وارفتگی کی کوئی ضرورت نہیں مگر یہ علمی موضوع کسی بھی زمانے میں صرف اہل مغرب سے مخصوص نہیں رہا بلکہ مشرق میں بھی اس پہ سیر حاصل کام ہوا ہے بلکہ اس کی تاسیس کا سہرا بھی انھی کے سر بندھتا ہے۔ اس لیے کہ اول اول سہراب ابن حزم، ظاہر البغدادی، شہرستانی اور محسن فانی نے اس علمی جہت کا آغاز کیا انھوں نے قدیم اور معاصر مذاہب کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا اور باہم

موازنے سے دلچسپ حقائق اخذ کیے۔اِن علما کا اندازِ بیان کہیں کہیں تلخ اور جارحانہ ہو جاتا ہے تاہم ان کی فکری اور ذہنی دیانت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا کبھی کبھی جوش بیان میں وہ ان فرقوں اور عقائد پہ شدید تنقید کرتے ہیں جن کو وہ غلط سمجھتے ہیں ان میں سے محسن فانی کا طرز تحریر نسبتاً زیادہ معروضی ہے جو اس کے وسعت مشرب پہ دلالت کرتا ہے۔ان علماء نے صابئیت، کثرت پرستی، مجوسیت، ہندوازم، بدھ مت، یہودیت، عیسایت اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کیا ہے ہمارے زمانے میں دوسرے علوم کے دوش بہ دوش تاریخ وتمدن کو بھی نمایاں فروغ حاصل ہوا جس کی بنا پر ماہرین آثار قدیمہ نے بھی گراں قدر انکشافات کیے ہیں جن میں سمیریا، مصر، بابل، فنیقیہ وغیرہ قدیم تمدنوں اور تہذیبوں کے ایسے گوشے بے نقاب ہوئے جس پہ صدیوں زمانے کی گرد پڑی رہی۔

علاوہ ازیں علم الانسان، جادو اور دیو مالا کے مطالعہ نے بھی فکر ونظر کے نئے در وا کیے ہیں۔ان تحقیقات کی روشنی میں جن مغربی اہل علم نے تقابلِ مذہب کو از سر نو مرتب کیا اور اسے سائنٹیفک اپروچ عطا کی۔ان میں Draheem,Robert Smith,Freezar,Toyaler, Waster) Mark,Malonskey) کو امتیازی مقام حاصل ہے،ان علماء نے مذاہب قدیم کا عمیق نگاہوں سے مطالعہ کیا اور ان کے اصل ماخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔ان کی تحقیق سے جو نتائج فکر سامنے آئے ان کا خلاصہ ہم (J-G Freezar) کی کتاب (Man God and Immortality) سے پیش کرتے ہیں۔

> ''نوع انسانی کے عقائد اور ارادوں کا تقابلی مطالعہ اہل علم ہی کے ذوقِ تجسس کی تسکین کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اس میں اگر احتیاط برتی جائے تو وہ معاشرے کی ترقی کا باعث بھی بنتا ہے کیونکہ وہ بعض ایسی بنیادوں کے کھوکھلے پن کو واضح کر دیتا ہے جن پر موجودہ معاشرہ تعمیر کیا گیا ہے اور جن کی بنیادیں فی الاحقیقت توہمات کی ریت پر اٹھائی گئی ہیں ایسی بنیادوں کو اکھاڑنا جو صدیوں سے انسان کے لیے مصائب اور آلام کے وقت پناہ گاہوں کا کام دیتی رہی ہیں کوئی خوشگوار کام محسوس نہیں ہوتا لیکن جلد یا بدیر تقابلی مطالعہ ان شکستہ دیواروں پر جو ہزاروں مقدس یادوں کی گھنی بیلوں گھاس پھونس اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہیں

رخنے ڈال دے گا۔اس وقت تو اہل علم کا ہراول دستہ توپوں کو کھینچ تان کر آگے ہی لا رہا ہے اگرچہ ان کے داغنے کا وقت ابھی نہیں آیا جو ان قدیم اور بوسیدہ نظریات کی عمارتوں کو گرا کر انسان کا نیا عقائدی مستقبل تعمیر کرے۔لیکن عدم تیقن اور قدامت کا پاس ولحاظ ہماری راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اور ہم بوسیدہ سانچوں کو خواہ وہ کتنے ہی دلکش کیوں نہ ہوں نظرانداز نہیں کر سکتے ہم تو صرف حق وصداقت کی پیروی کر سکتے ہیں خواہ وہ ہمیں کہیں بھی لے جائیں اور خواہ ان کا نتیجہ کتنا ہی خوفناک ہو۔صداقت وہ تابناک ستارہ ہے جو ہماری راہنمائی کرتا رہے گا۔''

□□□□□□□

''Jon Haksly'' نے اپنی کتاب (Religion Without Revelation)۔میں تقابل مذاہب کے حدودِ بحث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ؛

''تقابلی مذاہب بنی نوع انسان کی تاریخ کے ہر دور کے انسان کے اعمال وعقائد کا مطالعہ ہے۔جس طرح علم الابدان حیوانات کی جسمانی ساخت کا تقابلی مطالعہ ہے اسی طرح علم الانسان انسان کی ذہنی ساخت کا تجزیہ ہے جس میں مختلف مذاہب کے اختلاف وتشابہ اوران کے مآخذ کا ارتقائی جائزہ لے کران کی اصل حقیقت کا کھوج لگایا جاتا ہے اورانسان تاریخ کے ان ادوار کے عقائدی جائزہ لینے پہ قادر ہوتا ہے جوآج تک تاریخ کے اندھیرے میں گم تھے۔تقابلی مذاہب کے مباحث کا مسلک ،ارواح جادو، دیو مالا اور علم الانسان کے ساتھ گہرا رشتہ ہے اس لیے ان علوم کی تحقیق میں توارد کا ہوجانا قدرتی امر ہے۔اتنا ضرور ہے کہ تقابلی مذاہب کا دائرہ تحقیق ان علوم سے کہیں زیادہ وسیع ہے اس لیے کہ اس میں وحشی قبائل کے سماجی اورعقائدی نظریات کے علاوہ متمدن اقوام کے رسوم وشعائر اور دستورِ اخلاق وعمل بھی معرضِ بحث آتے ہیں۔چنانچہ ہم یہاں صابئیت اور مجوسیت کے ان اثرات کا مختصر جائزہ لیں گے جو اسرائیلی مذاہب یہودیت،عیسائیت اوراسلام پر مرتسم ہوئے۔اس کے ساتھ دراوڑی مت کی ان روایات کا ذکر بھی ہوگا جو ہندی آریائی مذہب کا آج تک حصہ ہیں۔یہ بات یادرہے کہ دنیا کے اکثر مذاہب سورج کی پوجا اور لنگ پوجا سے نکلے ہیں۔ہم سورج کی

پوجا کا ذکر صابئیت اور مجوسیت کے حوالے سے کریں گے جب کہ لنگ پوجا کی وضاحت دراوڑی مت کے حوالے سے کریں گے۔قدیم ادوار کی مختلف اقوام میں دو متوازی عقائد باہم مرستم رہے ہیں کہ سورج کی پوجا پڑھے لکھے اور دانشور طبقے میں مقبول رہی ہے جب کہ لنگ کی پوجا میں اکثر و بیشتر ان پڑھ اور بے وسیلہ عوام ہی ملوث رہے۔تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ صابیت ستارہ پرستی کا مذہب تھا اور صابئین سورج کو نیرِ اعظم یا خداوندِ خدا کہتے تھے اور اسے بعل مردوخ کے نام سے پوجتے تھے۔جب کہ مجوسیت میں متھرا کو سورج دیوتا مانا جاتا تھا۔صابئین بابل سورج اور اس کے گرد چکر لگانے والے ستاروں کی پرستش بڑے اہتمام سے کرتے تھے ان سب کے لیے الگ الگ معبد تعمیر کیے گئے جن میں ان کے سجے سجائے بت رکھے تھے۔انھی کے نام پر ہفتے کے سات دن متعین کیے گئے اور ہر ایک دن کا نام کسی سیارے کے نام پر رکھا گیا۔پروہتوں نے ان سیاروں کی گردش کا صدیوں تک مشاہدہ کیا اور علم ہیت کی بنیاد رکھی۔انھوں نے سورج اور چاند گرہن کا راز بھی معلوم کر لیا تھا اس طرح سائنس اور مذہب دونوں صابئیت کے دامن میں پرورش پاتے رہے۔صائبین اپنے دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لیے ان پر انسانی قربانی چڑھایا کرتے تھے اور اس قربانی کے واسطے سے ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ان کی قربانیوں کے طریقے بعد میں عرب اسرائیل، کنعان، یونان اور روم میں رواج پا گئے۔سوختنی قربانی اور خطا کی قربانی بھی بابلیوں سے یادگار تھی۔مولک کے سامنے بچوں کی سوختنی قربانی کے ساتھ بیلوں ، بکروں اور مینڈوں کی قربانی بھی کرتے تھے۔ پہلونٹھے کی قربانی بھی انھی سے یادگار ہے[34*]۔صائبین نے اپنے معبودوں کے لیے عظیم الشان معبد تعمیر کیے اور ان میں بلند منارے تعمیر کیے جن پہ چڑھ کے وہ اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا کرتے۔صائبین کے ہاں کہانت کی روایت بھی موجود تھی۔کہانت کا لغوی معنٰی ہے پیش گوئی کرنا یا غیب کی باتیں بتلانا۔عربوں میں اسے عرافت بھی کہتے تھے، کاہن وجد و حال کی کیفیت میں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔اسرائیل یونان، رومہ اور عرب کے ہر معبد میں کوئی نہ کوئی کاہن یا کاہنہ مقیم رہا کرتے۔جب کوئی شخص ان سے غیب کی باتیں پوچھتا تو کاہن بخور جلاتے جس کی خوشبو میں وہ مست ہو جاتے۔اس کے ساتھ سازوں کی دلآویز سریں بھی بلند ہوتیں جنھیں سن کر وہ ازخود رفتہ ہو جاتے اور وارفتگی کے اس عالم میں مقفٰی جملوں میں پیش گوئی کرتے۔عرب میں اسلام سے پہلے کاہن اسی طرح غیب بینی کیا کرتے تھے۔کتابوں میں ان کے نام گنائے گئے ہیں۔یہودیوں کے ہاں کہانت اور عرافت کی روایت نے رواج پایا تو وہ کاہن کو عبرانی میں نبی کہنے لگے نبی نباء سے مشتق ہے جس کا معنٰی ہے

غیب کی خبر دینے۔ والا عہد نامہ قدیم میں اسی قسم کے کئی مجذوبوں اور نبیوں کا ذکر آیا ہے جو غیب کے احوال بتایا کرتے"۔

اسرائیلی مذاہب پہ خارجی اثرات

فکری پہلو سے صابئیت اور مجوسیت کے جو اثرات اسرائیلی مذاہب میں رواج پا گئے ان کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔تاہم اختصار کے ساتھ ان کا کچھ تذکرہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔صائبین کی کہانت کا تصورِ الہام کی صورت مجوسیت میں بار پا گیا اور اسی کی وساطت سے اسرائیلی مذاہب تک پہنچا[35*]۔ علامہ آلوسی اپنی کتاب " **بلوغ الارب** " میں لکھتے ہیں کہ کہانت غیب کا دعویٰ کرنے کو کہتے ہیں، اسے عرافت بھی کہا جاتا ہے اور کاہن کو اعراف کہتے ہیں۔کہانت آنے والے حادثات کے ساتھ مخصوص تھی اور عرافہ گذشتہ امور سے متعلق تھی۔ماورائی یا شخصی معبودوں کا تصور یہودیوں نے مجوسیوں سے اخذ کیا تھا۔ان کا خدا ایک واضح شخصیت ہے جو انسان ہی کی طرح ذی شعور اور ذی ارادہ ہے، وہ قادرِ متعلق ہے، مختارِ کل ہے۔وہ اپنے نیک بندوں کو بہشت میں رکھتا ہے اور برائی کرنے والوں کو دوزخ کا عذاب دیتا ہے۔خدا کی ماورائیت کے ساتھ ہی مجوسیت میں زمان کے حقیقی ہونے کا تصور وابستہ ہے۔زمان کے حقیقی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حرکت مستقیم ہے۔یعنی کائنات کا آغاز بھی ہوا ہے اور اس کا انجام بھی ہوگا۔مجوسیت میں انسان کو ذی قدر و ذی وقار بیان کیا گیا ہے کیونکہ اگر انسان کو ذی اختیار تصور نہ کیا جائے تو پھر روزِ محشر کس بنا پر اس کا محاسبہ ہو گا۔اسی طرح اسرائیلی مذاہب میں بھی انسان کو فاعل مختار سمجھا گیا ہے۔مجوسیوں کا زندگی کے بارے میں نقطہ نظر رجائی ہے اس میں دنیا کی مادی چیزوں سے مسرت اور لذت کا حصول جائز قرار دیا گیا ہے اور انسان کو افزائش نسل کی تلقین کی گئی ہے۔تقریباً یہی رویہ اور تعلیمات اسرائیلی مذاہب کی بھی ہیں۔مجوسیت ،یہودیت ،عیسائیت اور اسلام کے مشترکہ عناصر کا ذکر کرتے ہوئے (Spingler) نے اپنی کتاب (

Fall of west)''زوال مغرب''میں لکھاہے کہ ؛

''اسرائیلی مذاہب مجوسی الاصل ہیں اس کے خیال میں الہامی مذاہب کی روح مجوسی ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ پیغمبرانہ تعلیمات کا مرکزی نقطہ مجوسی الاصل ہے۔خدا ایک ہے،اسے یہواہ کہا جائے اہورامزدا کہا جائے یا بعل مردوخ کا نام دیا جائے وہ ایک ہی قوت ہے، وہی خیر کا اصول ہے۔دوسرے تمام دیوتا یا شر ہیں یا اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔اس تصور پر مسیحا کی آمد کا پیوند لگا یا گیا جس کی شکل یسعیاہ میں صاف دکھائی دیتی ہے جو داخلی جبر کے تحت آنے والی صدیوں میں ہر جگہ ابھرتا رہا۔یہ مجوسیت کا مرکزی خیال ہے کیونکہ اس میں خفی صورت میں خیر اور شر کے مابین عالمی تاریخی کشمکش کا تصور موجود ہے یعنی شر درمیانی دور میں کامیاب ہوگا اور خیر یوم قیامت فتح یاب ہوگا۔تاریخ کی یہ اخلاقی ترجمانی ایرانیوں صابیوں اور یہودیوں میں مشترک ہے اسی سے برگزیدہ امت کا خیال پیدا ہوا۔اسیری بابل کے دوران ختنہ اور سبت جیسے شعائر نے یہودیوں میں بار پایا۔ ابن آدم کے مکاشفات شیطان، ملائکہ کبیر ہفت بہشت اور یوم قیامت کے تصورات ایرانیوں کے آفاقی احساس کی پیداوار ہیں یسعیاہ میں کورش کو مسیحا کہا گیا ہے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

شاعرمشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے سپنگلر کے خیالات کی تلخیص اپنے'' **خطبات**'' میں ان الفاظ میں کی ہے۔

''سپنگلر کے خیال میں پیغمبرانہ تعلیم کا حاصل مجوسی ہے۔خدا ایک ہے اور اسے یہواہ کہا جائے یا اہورامزدا یا مردوخ بعل، جو خیر کا اصول ہے اور باقی تمام دیوتا اس کے سامنے بے بس ہیں یا شر کے حامل ہیں اسی نظریہ کے ساتھ مسیحا کا تصور وابستہ ہے جو یسعیاہ میں دکھائی دیتا ہے۔اس میں مجوسی مذہب کا اساسی تصور موجود ہے یعنی خیر اور شر کے درمیان آفاقی آ

ویژن جس کے درمیانی دور میں شر غالب آئے گا اور آخر میں قیامت کے روز خیر کی فتح ہو گی۔ مجوسی کلچر سے سپنگلر کی مراد وہ کلچر ہے جس کے ساتھ یہودیت قدیم کالدی مذہب، ابتدائی دور کی عیسائیت زردشت کا مذہب اور اسلام وابستہ ہیں"۔

❑❑❑❑❑❑❑

مجوسیت اور اسلام میں مشترکہ عناصر کی بنا پر مجوسیوں کو اہل کتاب میں شمار کیا گیا ہے چنانچہ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں۔ "جو لوگ مجوس کو اہل کتاب کہتے ہیں ان میں صحابہؓ بھی شامل ہیں حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور سعید بن المسیبؒ، تابعین میں سے قتادہؒ، ابوثورؒ اور جملہ اہل ظاہر کی بھی یہی رائے ہے۔ قرآن میں صابئین اور مجوسیوں کا ذکر استحسان سے کیا گیا ہے اور ان میں نیک لوگوں کو بخشش کی بشارت دی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَالَّذِيْنَ هَادُواْ وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ○

القرآن الحکیم (سورة البقرہ ۲-۶۲)

ترجمہ:

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور یہودی ہوئے یا نصرانی یا صائبین جو اللہ اور یوم آخر پہ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے رب کے پاس ان کے لیے اجر ہے اور انھیں کوئی غم ہوگا نہ کوئی خوف"۔

❑❑❑❑❑❑❑

صابئیت کے جو اثرات مجوسیّت پر اور اس کے واسطے سے اسرائیلی مذاہب پر ہوئے ان کے جائزے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ صائبین اور مجوسیت کی سورج پوجا کے مسلک نے عیسائی کلیسا کو کس حد تک متاثر کیا۔ ابتدائی

دور کی عیسائیت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تبلیغ کا دائرہ اثر بہت محدود تھا اس لیے کہ انھیں تو عین عالم شباب میں سولی پر لٹکا دیا گیا تھا (یا ہمارے عقیدے کے مطابق اٹھالیا گیا تھا) ان کی زندگی پر عجیب وغریب روایات کا دھندلکا چھایا ہوا ہے تاہم اتنا یقینی ہے کہ وہ ایک غریب یہودی گھرانے کے فرد تھے اور انھوں نے تبلیغ کا کام بہت ہی چھوٹی عمر سے شروع کر دیا تھا۔ ان کی دعوت بنی اسرائیل کی دعوت تک محدود تھی مگر یہودیوں نے انھیں مسیحا ماننے سے انکار کر دیا اور ان کی موت تک چند مچھیرے ہی ان پر ایمان لائے تھے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ؛

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا دوسرے نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں میں انھیں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں"۔

(متی)

□□□□□□□

یسوعؑ نے کہا! "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔

(متی)

□□□□□□□

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا"۔

(متی)

□□□□□□□

یہ کرشمہ تاریخ عالم کے عجوبات میں سے ہے کہ یہ محدود اصلاحی تحریک بعد میں ایک ہمہ گیر کلیسا (رومن

کیتھولک) میں بدل گئی۔ اہل تحقیق کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ کیتھولک کلیسا کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہیں رکھی بلکہ ترسوس کے ایک یہودی نے رکھی جس کا نام پولس تھا۔ مگر اس نے مقبولیت پال کے نام سے حاصل کی۔ پال یونانی اور رومی دیو مالا کے علاوہ اشراقی فلسفے کا بھی عالم تھا۔ ابتدائے عمر میں پال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سخت مخالف تھا لیکن ایک دن اس نے انکشاف کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے راستے میں چلتے ہوئے ملے جس کے بعد وہ ان کا حلقہ بگوش ہو گیا اور اس نے دینِ عیسوی کی ترویج کا بیڑہ اٹھا لیا۔ جب یہودیوں نے اس کی مخالفت کی تو اس نے غیر اقوام میں جانے کا عندیہ دیا اور یہودیوں سے کہا:

> "تمہارا خون تمہاری ہی گردن پر ہے میں پاک ہوں اور اب میں غیر اقوام کے ہاں جاؤں گا"۔ (اعمال)

❑❑❑❑❑❑❑

بت پرست اقوام میں اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے پولس نے ختنہ موقوف کر دیا اور انھیں خوش کرنے کے لیے یہودیوں کے سبّت (سنیچر) کے بجائے اتوار (سورج کا دن) کو سبت بنا لیا۔ پولس نے بت پرستوں کی دیو مالائی روایات کو بھی اپنے مت میں شامل کر لیا جس سے غیر اقوام کے لوگ پولس کے قافلے میں شامل ہونے لگے۔ عیسائیت کی ترکیب پولس کے زمانے میں رواج پذیر نہیں ہوئی تھی بلکہ تیسری صدی بکرمی میں نیقیہ کی کونسل میں وضع کی گئی۔ ماعصر بت پرست اقوام میں ہر کہیں بعل ہورس اور متھرا وغیرہ کے نام سے سورج کی پوجا کی جاتی تھی۔ اس لیے پولس اور اس کے پیروؤں نے سورج پوجا کی رسومِ عبادات، تہوار اور دوسرے طور طریقے سورج پجاریوں سے لے کے اپنے مذہب میں شامل کر لیے۔ اس طرح جو مذہب صورت پذیر ہوا اسے ہمہ گیر یعنی کیتھولک کا نام دیا گیا۔ گذشتہ اوراق میں ہم نے دیکھا کہ سورج پوجا کا مت صابیت کا مرکزی نقطہ تھا۔ صائبین اپنے سورج دیوتا بعل مردوخ کو خداوندِ خدا مانتے تھے۔ ان کی سورج پوجا کے رسوم و شعائر تمام ماعصر اقوام کے مذاہب میں نفوذ کر گئے۔ ایرانیوں کا متھرا بھی بعل مردوخ ہی کا مثیل تھا۔ جب متھرا مت کی اشاعت رومہ میں ہوئی تو سورج پوجا تمام متمدن اقوام میں پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر

چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ پولس کو اپنا نیا مت مقبول بنانے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سورج دیوتا ہی کے روپ میں پیش کرنا ۔پڑا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جملہ اقوام میں سورج دیوتا کے معبد موجود تھے۔یونان میں اپالو، رومہ میں ہرکولیز، مصر میں ہورس، کارتھیج میں بعل اور ایران میں متھرا کی پوجا بڑے ذوق وشوق سے کی جاتی تھی۔رومن کیتھولک کلیسا کی الٰہیات پر بھی صابئیت کے اثرات مرتب ہوئے۔پھر سورج دیوتاؤں میں کئی مشترک عناصر موجود تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات سے بھی منسوب کر دیئے گئے۔پال کے پیروؤں نے عبادت گائیں بنوائیں اور اولیاء کے مت کی بنیاد رکھی۔وہ اپنے پیروؤں کو بپتسمہ بھی دینے لگے،ان کے ہاں مقدس ضیافت کی روایت بھی موجود تھی جس میں وہ خدا کے بدن کو تمثیلی انداز میں روٹی کی صورت کھاتے تھے اور اس کے لہو کو شراب کی صورت پیتے تھے تاکہ خدا کی برکت ان میں بھی حلول کر جائے۔یہ ساری روایات پولس اور اس کے پیروؤں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب کر کے ان کی سادہ تعلیمات پر قدیم دیومالائی سورج پوجا اور اس سے وابستہ رسوم وشعائر کا پیوند لگا کر اس کا حلیہ بدل کر رکھ دیا۔

چنانچہ یہ بات یقینی طور پہ کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ کلیسا کے بانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں تھے۔پال نے متھرا مت کی بہت سی رسومات من وعن عیسائیت میں داخل کر دیں۔متھرا مت ایران میں چھ سو سال تک مقبول رہا تھا۔بعد میں یہ مت سلطنت رومہ میں بھی پھیل گیا۔متھرا کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی شفیع اور منجی بنا دیا گیا۔متھرا کے بارہ حواری بھی تھے اور وہ خود بھی بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہوئے ہلاک ہوا تھا اور پھر قبر سے جی اٹھا تھا۔اس کی ولادت موت اور پھر احیا کے تہوار بڑے جوش وخروش سے منائے جاتے تھے۔رومن کیتھولک کلیسا نے متھرا مت سے ایسٹر اور کرسمس کے تہوار مستعار لیے اور بپتسمہ لینے کی رسم بھی متھرا مت سے ہی ماخوذ ہے[36*]۔

عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم ولادت شروع شروع میں چھ جنوری ہی کو مناتے تھے لیکن ۳۵۳ب م میں پوپ لائبرس نے اسے پچیس دسمبر میں بدل دیا جو متھرا کا یوم ولادت تھا۔۲۵ دسمبر یا اس سے آگے پیچھے کی تاریخیں تمام سورج دیوتاؤں کی ولادت کی تاریخیں تھیں کیونکہ انھی ایام میں سورج اپنے زوال کو پہنچ کر دوبارہ شمال کی جانب اپنا سفر شروع کرتا ہے جس کی خوشی میں وہ سورج کا یوم ولادت منایا کرتے تھے۔کلیسائے یونان والے آج بھی سات جنوری کو ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم ولادت مناتے ہیں۔کم وبیش تمام قدیم

دیومالاؤں میں سورج کے مرنے (غروب) اور دوبارہ زندہ ہونے کا قصہ بھی صائبین ہی سے مستعار لیا گیا ہے جو طلوع آفتاب کے وقت خوشی اور اس کے غروب کے وقت دکھ کا اظہار کیا کرتے ان کی عبادات کے اوقات بھی یہی تھے۔ عیسائیوں کو متھرامت سے شدید خطرہ تھا اس لیے انھوں نے متھرامت کی بے شمار کتابوں کو آگ لگا کر جلا دیا اور ان کے معبد مسمار کر دیئے۔ اُنھوں نے متھرامت کے پیروؤں کا قتل عام کیا اس طرح متھرامت کے آثار ملیامیٹ کر دیئے۔ لیکن رومن کیتھولک کلیسا میں متھرامت اور بعل پوجا کی رسوم وروایات باقی رہیں اور آج تک باقی ہیں۔ آج بھی اہل مغرب اپنے کلیسا کو اس طرح تعمیر کرتے ہیں کہ سورج کی پہلی شعائیں اس کی قربان گاہ پر ہی پڑیں۔ رومن کیتھولک راہب اور راہبائیں سر کے بال منڈوا دیتی ہیں تا کہ ان کے سروں پر سورج کی تھالی بن جائے۔ لڑکوں کے گروہ آج بھی آوازیں ملا کر مقدس گیت گاتے ہیں۔ عیسائی راہب بھی متھرا کے پجاریوں کی طرح خاص قسم کے لبادے اوڑھتے ہیں۔ عشائے ربانی ، بپتسمہ، کرسمس اور ایسٹر کے آثار آج بھی رومن کیتھولک کلیسا کا حصہ ہیں جو صابی الاصل ہی ہیں۔ اسی طرح صائبین کی سورج پوجا کا مت کلیسائے روم میں بھی نفوذ کر گیا۔

مذہب اور فلسفہ

قدیم زمانے میں انسان کے ذہن پر فلسفے کا غلبہ تھا،علم فلسفہ چیزوں کو مکمل طور پہ سمجھنے پر زور دیتا ہے۔وہ اشیاء کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک پہنچنا چاہتا ہے۔تاہم پانچ ہزار سالہ انسانی کوششوں کے باوجود فلسفہ کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔فلسفہ نے کائنات اور زندگی کی جو تشریحات کیں اگرچہ ایک زمانے تک لوگوں میں مقبول رہیں تاہم خود اہل فلسفہ اور ان کے نظریات زمانے کے ارتقاء کا شکار رہے۔اس لیے کوئی فلسفہ کائنات اور زندگی کی حتمی تشریح تک نہ پہنچ سکا۔مگر جب خالق نے اپنے علم سے انسان کی راہنمائی فرمائی تو انسان نے نہ صرف مقصدِ زیست کو جانا بلکہ زندگی کے پس منظر میں چھپے ان تمام مظاہر کائنات کے حقیقی تصور تک بھی اس کو رسائی حاصل ہوگئی جو صدیوں تک انسان کے لیے ایک لایعنی دردسر کا باعث بنے رہے۔فلسفے کے قبول ورواج کے ساتھ انسان نے توہم کے اس چنگل سے نجات پائی جسے وہ مذہب کہتا چلا آیا تھا۔جب مظاہر کائنات کی فلسفیانہ تشریحات سامنے آنے لگیں تو انسان نے بھی ان کو معبود ماننا چھوڑ دیا

اگر چہ حقیقی معبود تک رسائی ابھی اس کی پہنچ سے ذرا پرے تھی مگر اس نے اپنے سماجی اور تمدنی رویوں میں تبدیلی کا کافی سفر طے کیا جس نے اس کے تصورِ معبود کو بھی متاثر کیا اور قدیم عقائد جیسے روحوں کا مت وغیرہ کے اثرات بتدریج کم ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ مادیت پسندی کی لہر اور سائنسی دور کی ابتدا کے ساتھ بالکل ہی ناپید ہوگئے۔ سائنس اور مادیت پسندی میں شروع ہی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور یہ جدیدیت کے حامی تصورات پر مبنی رہے ہیں اور ان کی رو سے عالم کو حقیقی مانا گیا ہے۔ سائنس میں مشاہدے اور تجربے سے کام لے کر ان کی روشنی میں نظریات مرتب کیے جاتے ہیں اور مادیت پسندی میں حسیات اور مدرقات کے وسیلے سے تجریدات اور معقولات اخذ کیے جاتے ہیں۔ اگر چہ مثالیت پسندوں نے حقیقت کبریٰ کو وجودِ متعلق یا شعورِ متعلق یا عین العیون کو جو اِن کی فکری کاوشوں کا حقیقی مقصود منتہا ہے خدا کا نام دیا ہے مگر مثالیت پسندوں کے وجودِ متعلق یا خدا اور اہل مذہب کے خدا میں یہ فرق ہے کہ مثالیت پسندوں کا وجودِ متعلق یا خدا واجب الوجود ہے اور شخصی ہے جب کہ اہل مذہب کا خدا ایک ذی ارادہ ہستی ہے جو انسان ہی کی طرح جذبات و احساسات رکھتا ہے اور کائنات میں ہر وقت ہر قسم کا تصرف کرنے پر قادر ہے۔ مزید براں مثالیت پسند بھی اہل مذہب کی طرح روح اور اس کی بقاء کے قائل ہیں اور انسان کو فاعل مختار مانتے ہیں۔

فلاسفہ کا مذہبی تصور یہ رہا ہے کہ عہد قدیم کے عقائد جادو دیومالا اور دیگر مذہبی تصورات روحوں کے مت سے ماخوذ ہیں [37*]۔ جادو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انسان کی زندگی پر چند نیک یا بدارواح کا تسلط ہے چنانچہ جادوگر اپنی نیک روحوں سے کام لے کر انسان کو بدروحوں کے آزار سے محفوظ کرتے اور خبیث روحوں پر قبضہ کر کے ان کو اپنے دشمنوں کی ایذا رسانی کے لیے استعمال کرتے۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ مظاہر کائنات یعنی سورج، چاند، ستاروں دھرتی وغیرہ کی پوجا بھی شروع ہوگئی مگر ان کی پوجا اس نظریے کے تحت کی جاتی کہ وہ روشنی، حیات، زرخیزی اور افزائش کے پاسبان تھے علاوہ ازیں ان کے ہاں موت، تاریکی، گرہن، رعد، زلزلے، آتش فشاں اور پہاڑوں وغیرہ کے خوفناک دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھی قربانی دی جاتی تا کہ وہ ان کے درپئے آزار نہ ہوں۔ چنانچہ اہل فلسفہ مانتے ہیں کہ مذہب روحوں کے مت ہی کی منظّم صورت ہے جس میں انسان نے زندگی کے مصائب وحوادث، موت اور امراض کی دہشت اور اس بے کراں کائنات میں اپنی بے چارگی اور بے بسی کے تلخ احساس سے پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے ایک یا ایک سے زائد فوق الطبع ہستیوں کا سہارا لیا۔ اب ہم مذہب اور مثالیت

پسندی کے مابین باہمی تعلق کے بارے میں بحث کریں گے جس پہ مذہبی فلسفے کی بنا رکھی ہے۔مذہب اور مثالیت پسندی کے باہم ربط کے بارے میں مشہور جرمن فلاسفر(Foair Bagh) لکھتے ہیں کہ مذہب اور مثالیت پسندی دونوں ایک ہی فکری رویے کے مختلف پہلو ہیں۔ان کے مطابق مثالیت پسندی نے شروع ہی سے مذہب کے دامن میں پرورش پائی تھی اس لیے مذہب کے ساتھ ہمیشہ اس کا گہرا ربط وضبط قائم رہا ہے۔فوئر باخ کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ مذہب اور مثالیت پسندی کے مہمات مسائل میں گہری فکری یگانگت پائی جاتی ہے۔تاہم اس بارے میں طالیس اور اس کے پیروؤں کا نقطہ نظر علمی و تحقیقی تھا اور وہ ذاتی مشاہدہ کو اہم سمجھتے تھے جس سے فلسفے میں مادیت پسندی کا رجحان پیدا ہوا۔اس کے برعکس مثالیت پسندی میں ''پیر والونیسس مَت'' کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں یہ مت تھریس سے نکل کر یونان میں پھیلا تھا۔وہ شراب کے نشے اور بے خودی کا دیوتا مانا جاتا تھا۔

اس کے پیروؤں کا عقیدہ یہ تھا کہ شراب پینے سے انسان کے دل ودماغ میں ازخودرفتگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دیوتا والونیسس انسان کے بطون میں حلول کر جاتا ہے۔مستی اور بے خودی کے اس مت کی اشاعت میں ایک نیم افسانوی شخصیت عارفیوس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس سے اس کا نام عارفی مت پڑ گیا۔عارفیوس ایک باکمال گوّیہ تھا جو ایک روایت کے مطابق اپنی بیوی کی تلاش میں زمین دوز مملکت کو بھی گیا تھا، جسے نشے میں دھت چند عورتوں نے چیر پھاڑ کر قتل کر دیا تھا، عارفی مت کے خاص تہوار پر ان کی عورتیں اور مرد نشے کی حالت میں دیوانہ وار ناچتے گاتے ہوئے جلوس نکالا کرتے اور اس عالم میں جو بھی حیوان ان کے راستے میں آجاتا اس پر جھپٹ پڑتے اور اس کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔مشہور فلسفی اور ریاضیات کا عالم فیثا غورث بھی عارفی مت کا ایک مصلح تھا[38*] ۔جس کی تعلیمات کی اشاعت سے اس کے خیالات عارفی مت کے رسوم وشعائر مثالیت میں بھی رواج پا گئے مثالیت پسندی کا مشہور شارح افلاطون بھی فیثا غورث کے افکار سے متاثر تھا۔

باطنیت (Esotericism) کی روایات اور تراکیب بھی فیثا غورث سے یادگار ہیں کیونکہ وہ اپنے طلبہ اور طالبات کو ان امور کی خفیہ تعلیم وتلقین کیا کرتا ان باطنی افکار کا حاصل یہ تھا کہ ہم سب اس دنیا میں اجنبی ہیں اور روح بدن کا زندان ہے۔فلسفیانہ تفکر وتعمق سے روح کو مادی علائق سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔روح کو مادی دنیا سے نجات دلانا ہی فلسفے کا حقیقی منصب اور زندگی کا اصل مقصد ہے۔فیثا غورث اور اس کے پیرو تنخ

ارواح پر محکم عقیدہ رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس دنیا میں ہم سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں انھی کی رعایت سے موت کے بعد ہمیں نیا قالب ملتا ہے۔لفظ ''فلسفی'' ایک اصطلاح ہے جس کا لغوی معنٰی ہے دانش دوست ،اور یہ ترکیب فیثا غورث ہی کی وضع کی ہوئی ہے۔اس کے علاوہ فیثا غورث نے اعداد کا تصور پیش کیا اور کہا کہ یہ عالم طاق اور جفت اعداد سے بنا ہے اور یہ اعداد قائم بلذات ہیں اور ہر شئے کی اساس بھی یہی اعداد ہیں۔بعد میں افلاطون نے فیثا غورث کے اعداد اور سقراط کے تجریدات (Concepts) کی طرح اپنے امثال کو بھی ازلی وابدی قرار دے دیا۔افلاطون کے فلسفے میں اشراق، سریّت ، مذہب، باطنیت اور عقلیت پسندی کے عناصر اکٹھے ہو گئے اس کا فلسفہ ایک خوبصورت قالین کی طرح ہے جس کی بنوٹ میں مختلف رنگوں کے دھاگے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود افلاطونی فلسفے کا خاص نقش بھی اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھے ہوئے ہے۔فیثا غورث، پارمی نائدس، ہیریکلیتس اور سقراط کے فلسفیانہ افکار کا مجموعی عکس افلاطون کے ہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

فلسفہ وحدت الوجود

پارمی نائدس واحدت الوجود کا شارح تھا۔اوائل عمری میں وہ فیثا غورث کا پیرو رہ چکا تھا اس کے فلسفے کو الیاطی وجودیت کا نام دیا گیا کیونکہ وہ ایلیا کی ریاست کا شہری تھا۔اس کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں میں زینو اور زینوفینس قابل ذکر ہیں۔مورخین کے خیال میں الیاطی وجودیت پہلا حقیقی فلسفہ ہے اور ایک مستقل نظام فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔اس فلسفے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ صرف وجود ہے اور ناوجود کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم اس کے عدم وجود کی وجہ سے کوئی بھی فکری تصور پیش نہیں کر سکتے۔پارمی نائدس کا وجود احدِ ساکن ہے۔دنیا میں جو کچھ بھی حرکت و تغیر ہے وہ ہماری نظر کا فریب ہے۔پارمی نائدس نے سب سے پہلے عقلی استدلال اور حسیات میں تفریق کی اور کہا کہ کثرت کی دنیا حواس کی دنیا ہے جو غیر حقیقی ہے۔حقیقی دنیا صرف عقل و استدلال کے ذریعے ہی دریافت کی جاسکتی ہے۔عالم ظواہر اور عالم حقیقی یا عالم استدلالی کی یہ تفریق ہی مثالیت پسندی کی سنگ بنیاد بن گئی۔مثالیت پسندوں کا اصل اصول یہی ہے کہ "صداقت عقل استدلالی میں ہے حواس میں نہیں" مادیت پسند کہتے ہیں کہ حواس کا عالم یا عالمِ ظواہر ہی حقیقی ہے جبکہ مثالیت پسندوں کا کہنا ہے کہ حواس کا عالم محض ظواہر پر مشتمل ہے جس کا حقیقت سے بھی دور کا واسطہ نہیں۔افلاطون نے اپنے عالمِ امثال کو پارمی نائدس کے احساسِ وجودی کے ساتھ وابستہ کر دیا اور کہا کہ عالم امثال ہی حقیقی عالم ہے ۔جس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا اس کا یہ خیال بھی پارمی نائدس کے افکار سے ماخوذ ہے کہ عالم کی حقیقت معقولات و تجریدات میں ہے محسوسات اور مدرقات میں نہیں۔افلاطون عالم ظواہر کو فریب نگاہ قرار دیتا ہے

جو امثال کے سایوں پر مشتمل ہے افلاطون کی مثالیت پسندی عقلیاتی ہے کیونکہ اس کے خیال میں عالم حقیقی کا عقلیاتی وقوف ممکن ہے، علم کا ماٰخذ حسیات میں نہیں بلکہ عقل و استدلال میں ہے اور اس کی امثال لاتعداد ہیں اور منتشر نہیں بلکہ مدون ہیں، ان کی ترتیب و ترکیب منطقی ہے ان میں سب سے اعلیٰ خیر ہے۔ سقراط سے اس نے یہ خیال لیا ہے کہ کائنات کا ایک اخلاقی نظام ہے جس میں خیر حسن اور صداقت کی ازلی و ابدی قدریں کارفرما ہیں۔ یہ قدریں معروضی حیثیت میں موجود ہیں خیر کی مثل اعلیٰ ہی خدا ہے۔ لیکن یہ خدا کے مذہب کی طرح یا خدا کی طرح کوئی ذی ارادہ شخصیت نہیں ہے محض ایک منطقی اصطلاح ہے۔ افلاطون نے عالم کے فریب نظر ہونے حیات و موت اور روح کی بقاء، تنسخ ارواح کے تصورات فیثا غورث کے عارفی مت سے لیے ہیں۔ ہیریکلیتس نے سکونِ وجود سے انکار کیا تھا اور کہا کہ دنیا میں ہر کہیں حرکت ہے ہر شئے تغیر پذیر ہے افلاطون نے یہ خیال علم حواس میں منتقل کر دیا اور کہا کہ اس میں ہر کہیں حرکت و تغیر کی کارفرمائی ہے۔ جب کہ عالم امثال ازلی و سکونی ہے۔ افلاطون کا فلسفہ جو حقیقت و ظواہر یا غیر مرئی حقیقی اور مرئی حقیقی کے فرق پر مبنی تھا بعد میں اس کو مذہب کی تصدیق و توثیق میں برتا گیا۔ اہل مذہب بھی عالم ظواہر کو عارضی اور عالم عقبیٰ کو حقیقی مانتے ہیں۔ اس عالم کو ارواح کا زندان سمجھتے رہے ہیں جس سے چھٹکارا پا کر روحیں کسی دوسرے عالم کو منتقل ہوتی ہیں۔

افلاطون نے اپنے اس خیال کو کہ عالم ظواہر عالم امثال کا سایہ ہے غار کی مشہور تمثیل سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے فرض کریں کہ ایک غار ہے جس میں چند قیدی یوں جکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کہ وہ اپنے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتے ان کی پچھلی طرف آگ کا ایک آلاؤ بھی روشن ہے جس کے باعث قیدیوں کے عقب سے گذرنے والوں کے سائے قیدی سامنے کی دیوار پر دیکھتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ان سایوں کی حقیقت کیا ہے یا گذرنے والے کون ہیں۔ چنانچہ افلاطون کہتا ہے کہ اسی طرح ہم بھی اس دنیا میں صرف امثال کے سائے دیکھ سکتے ہیں مثال کے طور پہ ہم حسن ازل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر اس دنیا کے خوبصورت چہروں، قدرتی مناظر میں، پھولوں میں، پودوں میں، قوس قزح میں، بدلتے موسموں میں، بکھرتے بادلوں کے حسن میں حسن ازل کا پرتو دیکھ سکتے ہیں۔ حسن ازل کا یہ تصور بعد میں سریت پسندوں اور صوفیوں نے اپنا لیا اور اس کی بے انتہا کشش کے باعث اس کو عشق حقیقی کا نام دے دیا۔ افلاطون کے مطابق اس کے نظام امثال کو صرف جدلیات کے علم سے ہی جانا جا سکتا ہے اور اس کے بقول یہ علم بہت کم لوگوں کو ارزانی ہوتا

ہے۔افلاطون کی مثالیت پسندی نے وہ اصول وضع کیے جن سے بعد کے مثالیت پسندوں اوراہل مذہب نے فیضان حاصل کیا۔افلاطون کے ان افکار سے بعد میں عیسائی متکلمین اور مسلمان صوفیا نے معذرت خواہی کا کام لیا کیونکہ یہ تصور مذہب وتصوف کے موافق تھے۔اسی بنا پر ولی آگسٹائن نے افلاطون کوفلاسفہ کا مسیحا کہا اورامام غزالی کوالہیٰون میں شمار کیا۔ارسطو بھی اپنے استاد کی طرح مثالیت پسند تھا البتہ اس نے افلاطون کی بعض فکری کوتاہیوں پر گرفت کی ہے۔مثلاً افلاطون نے اس بات کی منطقی توجیہ نہیں کی کہ امثال یا تجریدات جوعالم مادی سے ماوراء ہیں عالم مادی کی تخلیق کیسے کرتے ہیں۔اس اشکال کوافلاطون نے یہ کہہ کرردکردیا کہ وہ ایک افسانوی معمار ہے جو مادے پر امثال کی چھاپ لگاتا رہتا ہے۔ارسطو نے اس تردد کودور کرتے ہوئے کہا کہ ہیت(Potential) یا افلاطون کا مثل عین مادہ سے علیحدہ نہیں بلکہ اس کے بطون میں ہی موجود ہوتا ہے۔کائنات ازلی وابدی ہے امثال اور مادہ ازل سے موجود ہیں ہر مادی شئے بالقوہ سے بلفعل ہوتی ہےاوریہی عمل دنیامیں حرکت وتغیر کا اصل سبب ہے۔

فاعل کسی ہیت کوخلق نہیں کرتا ایسا کرے تو وہ عدم سے خلق کرے گا جو قطعی محال ہے ارسطو نے خدا کوعلتِ العلل کہاہے جوکائنات کی علتِ غائی بھی ہے جس کی طرف کائنات اپنی تکمیل کے لیے حرکت کررہی ہے۔ ارسطو نے خدا کوفکر کی فکراور محرک غیر محرک بھی کہا ہے۔ارسطو کا خدا بھی افلاطون کے خدا کی طرح غیر شخصی ہے۔ارسطو کے فلسفے میں افلاطون کے نظام کی طرح یہ خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ کائنات میں مقصد و غایت موجود ہے۔عیسائیت کی اشاعت کے ساتھ رومۃ الکبریٰ اوراس کے ملحقہ ممالک میں عقلی وفکری عمل دب کررہ گیا۔قسطنطین اور جسٹین نے آزادخیالی یعنی آزادانہ علمی روایت کا قلع قمع کر دیا۔مشہور مورخ (Gubben) لکھتاہے کہ عیسائیت کی فتح کے ساتھ مغرب پرتاریک صدیوں کے گھمبیر اندھیارے چھا گئے یورپ کے اس دورِ جاہلیت میں عربوں نے علم کی شمع روشن کی اورنہ صرف فلاسفہ یونان کی کتابوں کوتہہ خانوں سے نکال کراُن کے ترجمے کرائے بلکہ سائنس میں بھی گراں قدراضافے کیے۔عرب سائنس دانوں نے کیمیاء طبیعات علم المناظر، ہیت، طب، جغرافیہ اورعلم الحلیل میں دادِتحقیق دی۔ان کی بدقسمتی سے متوکل عباسی کے دور میں رجعت پسند ملاّ برسراقتدار آ گئے ۔اور انھوں نے سائنسی علوم کا گلہ گھونٹ دیا اور سائنسدانوں اورفلاسفہ کوجبروتشدد کا نشانہ بنایا۔ان حالات میں قدرتاً عرب سائنس دان اپنے تجربات سے اخذ کیے ہوئے نظریات کا اظہار نہ کرسکے اور سائنس کوسخت دھچکا لگا۔ابن خلدون کی باریک نگاہوں نے

یورپ میں ابھرتی ہوئی نشاطِ ثانیہ کو بھانپ لیا تھا وہ اپنے مقدمے میں لکھتا ہے کہ تاریک دماغ فقہاء کی تعدی کے باعث دنیائے اسلام میں علمی تحقیق کا بازار سرد پڑ گیا ہے جب کہ مغرب میں تحصیل علوم کا جوش بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

سائنس کی تاریخ میں سترہویں صدی کے حالات خاص طور پر قابل لحاظ ہیں کہ اس صدی میں سائنس کو جو فروغ نصیب ہوا وہ گذشتہ دو ہزار سال میں بھی نہ ہوا تھا۔اہل مغرب کے ذہن و دماغ پر سے صدیوں کی جمی ہوئی پھپھوندی ہٹ گئی اور اہل علم نے از سر نو مذہبی عمرانی اور علمی مسائل پر آزادانہ غور و فکر کرنا شروع کیا۔پھر ''دے کارت'' کا عہد آیا جس کو جدید فلسفے کا بانی کہا جاتا ہے وہ فلسفی ہونے کے علاوہ سائنس دان بھی تھا اور عالم ریاضیات بھی تھا۔اس کا فکری رویہ جدید طبعیات اور ہیت سے تشکل پذیر ہوا۔اس نے اپنی فلسفیانہ جستجو کا آغاز شک سے کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف ایک حقیقت ایسی ہے جو شک و شبہ سے بالاتر ہے اور وہ یہ ہے کہ

''میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں''

اسی اصول کو اس کے فلسفے اور نظریہ علم کی کلید سمجھا جاتا ہے۔اس سے ایک تو ذہن کا وجود مادے کے وجود سے زیادہ یقینی ثابت ہوتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ مادے کو ذہن کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے اور خارجی اشیاء کا علم ذہن سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ حواس سے۔''دے کارت'' کی یہ موضوعیت جدید فلسفے میں روح کی گہرائیوں تک سرایت کر گئی اور مثالیت پسندوں نے خاص طور سے اسے اپنے منطقی استدلال کا عنوان بنا لیا۔دے کارت کی موضوعیت نے جدید مغربی فکر میں فردیت اور اَنا پرستی کے رجحان کو پروان چڑھایا جو جرمنوں کی مثالیت پسندی میں سرایت کر گیا''دے کارت'' کے فلسفے کا حاصل یا اصل اصول ''میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں'' کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ ہر شخص کے لیے اس کا اپنا ذہن ہی علم کا معیار ہے اور علم کا کوئی معروضی معیار ہو ہی نہیں سکتا۔جرمن رومانی فلسفہ سے لے کر ''ژاں پال سارتر'' تک کی موضوعیت اور فردیت اسی اصول کی صدائے بازگشت ہے۔دے کارت کے ہاں مادہ وہی ہے جس کا ادراک کیا جا سکے یعنی مادہ مدرقات سے الگ اپنا کوئی معروضی وجود نہیں رکھتا یہی اِدعا جملہ مثالیت پسندوں کا بھی ہے۔

جدید دور کی مثالیت پسندی عضویاتی طور پہ رومانیت سے وابستہ ہے جس کا باوا آدم ''روسو'' کو کہا جاتا ہے۔روسو نے عقلی تفکر اور سائنس کی مخالفت کی تھی وہ فطرت کی جانب لوٹ جانے کی دعوت دیا کرتا تھا۔چنانچہ اس

نے قاموسیوں کی خرد پسندی اور دانش دوستی کے خلاف قلمی جہاد کا آغاز کیا۔ قاموسی دانش اور سائنس کی روشنی میں جملہ علمی معاشرتی اور اقتصادی عقدے حل کرنے پر اسرار کرتے تھے اور بڑے جوش وخروش سے اس امید کا اظہار کرتے تھے کہ انسان سائنس کی مدد سے قدیم زمانے کے توہمات اور مذاہب سے پیچھا چھڑا کر ایک نیا ترقی پرور معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس میں روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہو گا۔ وہ مذہب اور جہالت کو انسانی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور عقل وخرد پر کامل اعتماد رکھتے تھے۔

تحریک خردافروزی

یہی وہ دور تھا جب انسانوں کے ایک گروہ نے شعوری طور پہ مذہب سے بغاوت کا نظریہ اپنایا کہ اُن کا خیال تھا مذہبی نظریات چونکہ عقلی اساس پہ استوار نہیں ہوتیں اس لیے لوگوں کو عقل کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں کا تعین کرنا چاہیے۔اس تحریک کو چونکہ بہت سے صاحب عقل و دانش لوگوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہوگئی اس لیے لوگوں نے اس نظریہ زیست کو اپنالیا۔اسی کو خردافروزی کی تحریک کہا جاتا ہے۔فرانس میں ''Kamoo's'' نے انگلستان میں ''Gubban'' اور ''Hehoom'' نے اعلانیہ روایتی مذہب کے خلاف آواز بلند کی اور خدا روح اور حیات بعد موت کا برملا انکار کیا۔وہ سائنس کی روشنی میں ایک نیا مذہب وضع کرنا چاہتے تھے جو الہام اور وحی سے مبّرا ہو۔روسو ہی سے خرد دشمنی کی روایت کا آغاز ہوا جس کی ترجمانی بعد میں فختے ،نٹشے ،شوپن ہائر اور برگساں جیسے بڑے اہل دانش نے کی۔اہل مذہب اور مثالیت پسند قدم قدم پر سائنس اور مادیت کی مخالفت کرتے رہے۔نشاۃ الثانیہ کی صدیوں میں کلیسا نے سائنس کی اشاعت کو روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔تحریک اصلاح کلیسا بھی نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک فرع تھی جس نے پاپائے روم کے ذہنی استبداد کا جوا اتار پھینکا۔پھر سائنس کی ترویج اور اصلاح کلیسا کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے احتساب کا محکمہ قائم کیا گیا اور یسوعیوں نے بجبر و اکراہ تحقیقی علوم کے استیصال کی کوشش کی۔لیکن اب سائنس کے رواج و قبول کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی کلیسا کا جبر کم ہوا اور سترہویں صدی اہم انکشافات اور ایجادات کی صدی بن گئی۔اٹھارویں صدی کی تحریک خردافروزی سائنس کے فروغ کا منطقی نتیجہ تھی۔قاموسی خردمندوں

کی تحریریں بڑی مقبول ہوئیں۔خردافروزی کے ہمہ گیر اثرات کو زائل کرنے کا بیڑہ جرمن فلسفی Cont نے اٹھایا جو روسو کا بہت بڑا مداح تھا اور جسے جرمن رومانیت کا باپ سمجھا جاتا ہے۔جرمن رومانیت پسندوں کو روسو کے روحانی بچے کہا کرتے۔رومانیت کے دو بڑے اجزائے ترکیبی یہ ہیں ۔اول خرددشمنی ، دوم انا پرستی یا فردیت۔رومانی ادب میں جذبات اور احساسات کے بے محابہ اظہار پر زور دیا گیا ہے اور وہ کلاسیکی ادب کی اسلوبی بندشوں سے باغی تھے۔چنانچہ گوئٹے ،شلر لسنگ ، ہرڈر، بائرن ، وڈز ورتھ اور شیلے کا شمار رومانیت کے مشہور شارحین میں کیا جاتا ہے۔فلسفے میں اس کی ترجمانی موضوعیت اُنا پرستی اور خرددشمنی کی صورت میں کی گئی۔تحریک رومانیت کا فکری پس منظر یہ ہے کہ قدمائے یونان انسان کو مرکز کائنات سمجھتے تھے کیونکہ بطلیموسی نظام ہیئت کی رو سے سورج کرہ ارض کے گرد گھومتا ہے جب کہ کوپرنیکس نے ثابت کردیا کہ کرہ ارض کائنات کا مرکز نہیں بلکہ نظام شمسی کا ایک حقیر سیارہ ہے تو انسان کی اُنا کو سخت ٹھیس لگی اس ذہنی صدمے کے اندمال کے لیے ایک رومانی فلسفہ وجود میں آیا۔کہ کائنات کا وجودِ متعلق یا شعورِ متعلق واحد حقیقت ہے جو انسان کے ذہنی شعور سے معنوی مماثلت رکھتا ہے۔اس طرح گویا شعور کے حوالے سے دوبارہ انسان کو ہی مرکز کائنات قرار دے دیا گیا۔

جرمن مثالیت پسندوں نے اس دلیل کو انتہا تک پہنچا دیا(well deurant)نے لکھا ہے کہ کانٹ سے قبل ہی ایک بشپ بارکلے نے مذہبی نقطہ نظر کو تقویت دینے کے لیے کہا تھا کہ کائنات میں صرف مدرکات موجود ہیں اور مادے کا کوئی وجود نہیں۔پھر بارکلے کی طرح Cont نے بھی مثالیت کے حوالے سے مذہبی اعتقادات کی بحالی کی کوشش کی۔کانٹ نے قدمائے یونان کی طرح ظاہری عالم اور حقیقی عالم کی تفریق کی۔ اس کے خیال میں زمان ومکاں کا عالم جس سے سائنس کا رابطہ ہے عالم ظواہر ہے مگر عالم حقیقی تک رسائی پانا خرد یا سائنس کے بس کی بات نہیں۔چنانچہ عقل وخرد جب عالم حقیقی کے بارے میں سوچنا چاہتی ہے تو تضاد کا شکار ہوجاتی ہے۔راز یہ ہے کہ عالم حقیقی صرف اہل مذہب ہی پر منکشف ہوسکتا ہے اور ہم ذات خداوندی قدر واختیار اور بقائے روح کی توثیق عقلی استدلالی سے کر ہی نہیں سکتے ۔اس مقصد کے لیے اخلاقی وجدان کو بروئے کار لانا لازم ہوگا۔تمام اہل مذہب کی طرح کانٹ نے بھی سائنس کی جبریت کو یہ کہہ کے رد کردیا کہ کسی بھی اخلاقی عامل کے لیے ذی اختیار ہونا ضروری ہے۔کانٹ کا نظریہ بنیادی طور پہ مثالیاتی ہے لیکن وہ مثالیت پسند کہلوانا پسند نہیں کرتا اور اپنے فلسفے کو تنقیدی فلسفہ کہتا ہے Cont کو لا ادری

(Agnostic) بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں عقل کی رسائی حقیقت نفس الامری تک نہیں ہو سکتی وہ کہتا ہے کہ ہمارے ذہن کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ہم حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ کانٹ نے دے کارت کی موضوعیت کو قبول کر لیا اور کہا کہ زمان و مکاں کا کوئی معروضی وجود نہیں ہوسکتا یہ تصور ہمارے ذہن نے خلق کیا ہے اور اس کے وجود کا انحصار ذہن پر ہی ہے۔ کانٹ کی رومانی مثالیت پسندی اور مذہب میں بہت سے اساسی اصول مشترک ہیں۔ مثلاً کانٹ نے ذات باری تعالیٰ اور روح کے وجودِ بقاء اور قدر واختیار کے بارے میں دلائل دیئے ہیں اور دونوں میں اخلاقی وجدان کو ادراکِ حقیقت کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

کانٹ کی لاادریت وہی ہے جو اہل مغرب کی خرد دشمنی سے متبادر ہوتی ہے اس نے یہ کہہ کر مذہب کو تقویت دی کہ حقیقت نفس الامری کا انکشاف عقل وخرد پر نہیں ہوتا۔ اس نے اہل مذہب کی طرح عالم ظواہر اور عالم حقیقی میں فرق کیا اور کہا کہ حقیقی عالم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سائنس کا طریق تحقیق ناکام رہتا ہے جب کہ مذہبی وجدان اسے پا لیتا ہے۔ پھر دونوں کا الٰہیاتی نظریہ تشبیہی ہے۔ مذہب میں خدا کو انسانی شکل و صورت اور احساس وجذبہ پر قیاس کیا گیا ہے مگر کانٹ کی مثالیت پسندی میں کائنات کو انسان پر قیاس کیا گیا ہے وہ کہتا ہے کہ کائنات بھی انسان کی طرح ذہن واحساس سے مزین ہے اور کائناتی ذہن اور انسانی ذہن دونوں واحد النوع ہیں۔ تاہم کانٹ کا جو نظریہ ''تنقید عقل محض'' میں پیش کیا گیا ہے اسے موضوعی مثالیت کہنا زیادہ قرین صحت ہوگا قدمائے یونان کی مثالیت پسندی اور جرمنی کے رومانی فلاسفہ کی مثالیت پسندی میں فرق ہے۔ یونان کے مثالیت پسند فلاسفہ افلاطون اور ارسطو وغیرہ عقل استدلالی پر محکم یقین رکھتے ہیں۔ افلاطون اور پارمی نائڈس کا اِدعا یہ ہے کہ صرف عقل اور استدلال ہی عالم حقیقی تک رسائی حاصل کرسکتی ہے اس کے برعکس کانٹ عقل استدلالی کو چنداں اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اس لیے کہ وہ ادراکِ حقیقت سے قاصر ہے اس طرح کانٹ کے واسطے سے رومانی فلسفے میں خرد دشمنی نے بار پایا۔ کانٹ کی مثالیاتی روایت کی ترجمانی فختے، شیلنگ اور ہیگل نے کی ہے لیکن ایک امر خاص میں انھوں نے کانٹ کے نظریہ سے انحراف کی راہ اپنائی ہے۔ انھوں نے کانٹ کی لاادریت کو رد کردیا اور کہا کہ عقل انسانی حقیقت نفس الامری کو جاننے پر قادر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت کامل واکمل وحدت ہے جس کا ادراک صرف عقل استدلالی ہی کرسکتی ہے۔ انھوں نے بھی روح متعلق، وجود متعلق یا عین متعلق کو خدا کہا ہے۔ فختے کا وجود مطلق اخلاقی ہے شیلنگ

کا جمالیاتی اور ہیگل کا عقلیاتی ہے۔اس اختلاف کے باوصف فلسفیانہ وحدت الوجود ان میں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے۔ فختے نے وجود متعلق کو اَنائے مطلق کہا ہے جو روحانی الاصل ہے۔ غیر شخصی فعلیت ہے اور کائنات میں ہر کہیں جاری وساری ہے اور تمام اَناؤں کا مبدا اور مآخذ بھی وہی ہے۔ فختے کہتا ہے کہ حقیقی وجود اَنا کا ہے۔ عالم مادی جو ہمیں بظاہر دکھائی دیتا ہے اسے اَنائے مطلق نے ہی خلق کیا ہے تاکہ اس سے پیکار آزما ہوکر وہ اپنی تکمیل کرسکے۔ فختے کے اس نظریے میں مثالیت پسندی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ کائنات کی اصل ذہن ہے۔ روحانی ہے، فختے نے کائنات میں ذہن اور مادے کی دوئی سے انکار کیا ہے اور کائنات سے مادے کو یکسر خارج کردیا ہے کہ کائنات فی الاصل ذہن ہے۔ اَنا ہے، خدا ہے، فختے کا فلسفہ مثالیاتی انداز میں مذہب کی توثیق کرتا ہے اور صوفیانہ وحدت الاوجود کی یاد دلاتا ہے۔

فختے بھی اہل مذہب کی طرح انسانی قدر واختیار اور روح کی بقاء کا قائل ہے۔ البتہ اس کے خیال میں وہی روح یا اَنا باقی رہے گی جو فطرت کے خلاف نبرد آزما ہوکر توانا ہوجائے گی اور یہ پیہم کشمکش ہی روح کو غیر فانی بناسکتی ہے۔ ہمارے ہاں اقبال نے فختے کے اس فلسفے کو خودی کے نام سے اسلام کا جامہ پہنایا۔ شیلنگ بھی فلسفیانہ رومانیت کا شارح ہے اس کا وجودِ مطلق جمالیاتی ہے اور اس کا تصور کائنات یہ ہے کہ کائنات ایک نہایت حسین وجمیل فن پارہ ہے جو ایک اعلیٰ فنکار کی صناعی اور اہلیت کا ثبوت ہے۔ یہی نقطہ نظر ”گوئٹے، شلر اور وڈزروتھ“ وغیرہ رومان پسندوں کا بھی تھا۔ البتہ شیلنگ کے فلسفے کو وحدت الوجود بھی کہا گیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں وجود مرئی روح ہے جب کہ نیچر غیر مرئی روح ہے۔ اسی خیال کو وڈزورتھ، لسنگ اور ہرڈر وغیرہ نے آگے بڑھایا جس سے رومانیوں نے کسب فیض کیا۔ انھوں نے نیچر کو ذی حیات اور ذی روح کہا اور پھر اس سے ذہنی وقلبی رابطہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ آخری عمر میں شیلنگ پکا صوفی بن گیا تھا اور کہنے لگا تھا کہ روح بالآخر روح مطلق میں فنا ہوجاتی ہے۔ ہیگل اوائل عمری میں تصوف کی جانب مائل تھا وہ روسو اور کانٹ کے نظریہ کائنات سے خاص طور پہ متاثر تھا۔

اس نے تصوف سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وجودِ متعلق کے علاوہ جو شئے بھی ہے وہ غیر حقیقی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوائے کُل کے کوئی حقیقی شئے نہیں ہوسکتی۔ اس کے فلسفہ میں کائناتِ ذہن کا ارتقاء نیچر کی طرف ہے جو اعمال انسانی ذہن میں وارد ہوتے ہیں وہی نیچر میں بھی واقع ہوتے ہیں۔ نیچر میں یہ عمل لاشعوری طور پہ ہوتا ہے۔ جیسے مثلاً بیج کا پھول بن جانا، انسان میں یہ عمل شعوری ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ارتقاء کے مراحل

سے گذر رہا ہے۔ چنانچہ ہیگل کی کائنات ''وہ کُل'' ہے جو ایک فکری عمل ہے اور کسی فکری عمل ہی کی طرح ارتقاء پذیر ہے اور اسی کو کامل مثالیت کہا جاتا ہے۔ اس کل میں جدلیاتی عمل جاری ہے یعنی مثبت منفی اور اتحاد کا عمل جس میں قدریں محفوظ رہتی ہیں۔ یہ عمل افکار میں جاری ہے لہٰذا کائنات بھی اصلاً فکری ہے اور فکری قوانین کے تحت ہی ارتقاء پذیر ہے۔ کُل نیچر اور انسان دونوں کو محیط ہے۔ بعد کے ادوار میں ہیگل کے اس فلسفہ کائنات کی اس کے شاگردوں نے مزید تشریح کی۔ ہیگل کے پیروؤں میں بریڈلے، رائس، کروچے، جنٹلے اور اوبکن کو شمار کیا جاتا ہے جنھوں نے اس فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ مادہ ذہن کی تخلیق ہے اور اپنے وجود کے لیے ذہن ہی کا محتاج ہے۔

ہیگل اور اس کے پیرو عقلیت پسند ہیں یعنی ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عقل استدلالی مشاہدے اور حسی تجربے کے بغیر بذات خود صداقت کا انکشاف کرسکتی ہے۔ مثالیت پسندی کے اس پہلو سے بھی مذہب کی تائید و توثیق کا کام لیا گیا ہے۔ چونکہ مذہب کی صداقتیں بھی انسانی تجربے سے ماوراء ہوتی ہیں اس لیے ہیگل کے ناقدین ہربارٹ، ولیم جیمز اور فوئرباخ وغیرہ کہتے ہیں کہ عقلیاتی استدلال کے لیے بہرحال کسی بنیاد کی ضرورت ہے جس کے بغیر مجرد عقل استدلالی انسانی تجربے سے ماوراء ہو کر کوئی موضوع فراہم نہیں کرسکتی۔ علم کے دو پہلو ہیں ہیت اور موضوع مگر عقلیت پسند صرف ہیت سے اعتناء کرتے ہیں۔ لیکن ہیت بغیر موضوع کے کھوکھلی ہے جسے موضوع کے بغیر ہیت انتشارِ محض ہے۔ مگر علم نہ کھوکھلا ہے نہ انتشار، اس لیے تجربہ اور مشاہدہ موضوع فراہم کرتے ہیں اور عقل استدلالی اس میں نظم قائم کرتی ہے اور تجربہ اور عقل مل کر ہی کسی موضوع کو منظّم کرتے ہیں اور علم اسی تنظیم کا دوسرا نام ہے۔ یونانِ قدیم میں سوفسطائیوں نے حیات کے حق میں بات کی تھی اور کہا تھا کہ انسان حسی تجربے کے واسطے سے ہی علم حاصل کرسکتا ہے۔ تاہم جدید دور میں بیکن، لاک، ہربارٹ، آگسٹس، کونٹ اور ولیم جیمز وغیرہ نے اس فکری رویے کے حق میں دلائل دیئے ہیں اور تجربیت، نتائجیت، ایجابیت اور حقیقت پسندی کی تحریکوں کی آبیاری کی جس سے بالواسطہ سائنس کے نقطہ نظر کو تقویت پہنچی۔

ہیگل کے فلسفے میں کائنات ارتقائی عمل ہے جس میں خدا عقل محرک کی حیثیت رکھتا ہے اور کائنات کے ارتقائی عمل میں شریک ہے۔ اس پہ یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ہیگل کا خدا اگر شروع ہی سے کامل و اکمل تھا تو ارتقاء کے عمل میں کیسے شریک ہوا۔ اور اگر وہ کائنات کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ صورت پذیر ہو رہا تھا تو اسے کامل

کیسے کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہیگل اور اس کے متبعین کائنات کو ایک عظیم ذات تصور کرتے ہیں جس کی ماہیت ذہنی ہے اور وہ اس کائنات کو بامعنی کہتے ہیں۔ یعنی اس میں ایسے اشارات موجود ہیں جو معروضی صورت میں موجود ہیں۔ اگر ان معروضی معانی کو تسلیم کر لیا جائے تو یقیناً کسی نہ کسی نوع کی ذہنی حیات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اہل مذہب بھی کائنات میں معروضی قدروں کو مانتے ہیں اور ان کے حوالے سے خدا کے وجود کا اثبات کرتے ہیں۔ پھر جرمن فلاسفر ایوکن اور برطانوی سکالر جیمز وارڈ نے جرمن مثالیت کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھایا کہ ہیگل اور اس کے متبعین کے وجودِ متعلق یا روح کل کو مذہب کا خدا تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کوئی ذی ارادہ اور قادرِ مطلق ہستی نہ تھی۔ مزید براں یہ وجودِ مطلق کائنات سے ماوراء نہیں بلکہ اس میں جاری و ساری ہے۔ مگر اس فلسفہ سے مذہب کے شخصی خدا کی نفی ہوتی ہے کیونکہ اگر اسے کائنات میں جاری و ساری تسلیم کیا جائے تو خدا کائنات کا خالق نہیں رہے گا نہ وہ اس میں تغیر و تبدل کرنے پر قدرت رکھے گا۔ مذہب کے خدا کے لیے دو شرائط کا ہونا لازمی ہے، ایک یہ کہ وہ ایک ذی ارادہ ہستی ہو اور دوسرا یہ کہ وہ کائنات سے ماوراء ہو۔ برطانوی فلاسفر ''Latsa'' اور ''James Ward'' نے اس دقت کو یہ کہہ کر رفع کرنے کی کوشش کی کہ خدا کائنات میں جاری و ساری بھی ہے اور اس سے ماوراء بھی ہے۔ خدا کو ماوراء کہہ کر وہ خدا کو خالق منوانا چاہتے ہیں اور اسے طاری و ساری کہہ کر اسے اعمال کائنات اور انسان کے عمل ارتقاء میں شامل بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ خدا کائنات سے ماوراء ہو کر اس میں جاری ساری نہیں رہ سکتا اس لیے کہ یہ امر محالاتِ قطعی میں سے ہے اور منطق کی رو سے اسے اجتماع المغائرین کہا جاتا ہے۔ جرمن رومانی فلاسفہ اور ان کے متبعین کے افکار و انظار سے اہل مذہب نے اپنے عقائد کی توثیق کا کام لیا ہے اور ایک نیا علم کلام مرتب کر دکھایا ہے یہودیوں میں بیوبر ہندوؤں میں آندرو گھوش اور مسلمانوں میں اقبال ہمارے دور کے متکلمین ہیں۔

فلسفہ مادیت کا آغاز

اس کے بعد سائنس اور مادہ پرستی کا دور آیا۔ چونکہ سائنس اور مادیت باہم ملحق فطرت کے حامل ہیں اس لیے ان کا بیان بھی یکساں ہے۔ ہم اس نقطہ نگاہ کے مبادیات تاریخ کے دریچوں سے کھوجیں گے۔ شعور کی نشونما کے ساتھ جب قدیم انسان کی دہشت حیرت میں بدل کے رہ گئی تو اس نے فلسفے اور سائنس کی جانب قدم بڑھایا اور اس کے ذہن و دماغ پر صدیوں سے چھائے توہمات کے گھور اندھیارے چھٹنے لگے۔ انسان کے ذہنی و فکری ارتقاء کے لحاظ سے چھٹی صدی عیسوی قبل از مسیح بڑی انقلاب آفرین ہے۔ اس صدی میں جہاں چین، ایران، ہند اور اسرائیل میں کنفوشس، زردشت گوتم بدھ اور الیسعیاہ ثانی جیسے مصلحین پیدا ہوئے وہیں بحیرہ روم کے ایشیائی کنارے کی ریاست میلٹس میں فلسفے اور سائنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ طالیس کو سائنس اور فلسفہ دونوں کا بانی کہا جاتا ہے۔ میلٹس کے بقول طالیس فنیقی الاصل ایشیائی تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ طالیس سے پہلے لوگ تفکر و تدبر سے عاری تھے یا مشاہدے اور تجربے سے بے بہرہ تھے۔ قدیم چین،

مصر، سمیریا، بابل اور فنیقیہ میں اہل دانش اور خردمندوں کی کمی نہ تھی ان کے جو مقولے ہم تک پہنچے ہیں وہ ان کی گہری دانش و بصیرت پر دلیل ہیں۔ لیکن ایک مدلل علم کی حیثیت سے ان کے ہاں منطق، جدلیات اور مابعد الطبیعات کا کوئی وجود نہ تھا۔ تاہم طب، مساحت اور علم الحیل وغیرہ کے بنیادی اصول وضع کر لیے گئے تھے۔ کلیں بنالی گئی تھیں اور مختلف تجربات کیے جا رہے تھے۔ پروہت عوام کے ذہن و دماغ پر اپنی گرفت کو بحال رکھنے کے لیے اپنے دیوتاؤں کے مجسّموں میں ایسی کلیں نصب کیا کرتے تھے جن کے باعث خاص خاص تہواروں پر مجسّمے اپنے سر ہلاتے تھے یا سورج کی پہلی شعاعوں کے پڑنے سے دیوتا کی مورتی کے منہ سے سریلی آوازیں نکلتی تھیں۔

ہندوستان میں سومنات کے مندر میں ایک لنگ (عضو تناسل) ہوا میں معلق رہا کرتا اس لیے کہ دھات سے بنے اس لنگ کے اوپر اور نیچے مقناطیس کو اس اندازے سے نصب کیا گیا تھا کہ دونوں مقناطیسوں کی طاقت نہ اسے اوپر جانے دیتی تھی اور نہ ہی اسے زمین پر گرنے دیتی تھی۔ چنانچہ لنگ کے سادہ لوح پجاری سائنس کے اس ادنیٰ کرشمے کو اپنے مذہبی عقیدے کی رفعت تصور کیا کرتے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ عملی و تجربی سائنس کا آغاز بھی مذہب کے دامن میں ہی ہوا۔ دراصل پروہت عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ان کی دیویاں اور دیوتا ذی حیات اور ذی شعور ہستیاں ہیں جو اپنے پروہتوں کا کہا مانتے ہیں۔ بابل کے پروہت اپنے آپ کو دیوتاؤں کے معمولات سے آگاہ رکھنے کے لیے راتوں کو اپنے مندروں کے مناروں پر چڑھ کر آسمان کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ ان مشاہدات کی تفصیلات کو باقاعدگی سے محفوظ کیا جاتا۔

چنانچہ چھٹی صدی عیسوی قبل از مسیح سے کئی سو برس پہلے بابل کے پروہت سورج گرہن اور چاند گرہن کی درست پیش گوئیاں کرنے لگے تھے اس لیے نہیں کہ ان کو سائنسی علوم سے دلچسپی تھی بلکہ یہ علم دراصل ان کا کاروبار تھا کیونکہ جب گرہن کا وقت قریب آتا تو معبدوں میں اعلان کیا جاتا کہ ان کے مہربان اور حیات بخش دیوتا کی جان خطرے میں ہے اور تاریکی کا عفریت اس پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے لوگ خوفزدہ ہو کر ان کے پاس ہجوم کر آتے اور قیمتی نذرانے دے کر گڑگڑاتے کہ کسی طرح سورج دیوتا کو بچایا جائے۔ پھر جب گرہن چھٹ جاتا تو ہر طرف خوشی کے شادیانے بجائے جاتے اس طرح سائنس کے اہم انکشافات پر صدیوں توہمات کے دبیز پردے پڑے رہے۔ طالیس ملیطی کی پیدائش سے کم و بیش دو ہزار سال پہلے عراق میں بابل، اشور اور مصر میں ممفس اور تھیبس کے شہر تہذیب و تمدن کے گہوارے بن چکے تھے جہاں جادو، شمن

مت، کہانت، علم نجوم اور فال گیری جیسے توہمات کے پردوں میں ریاضی، ہیت مساحت اور طب کے تحقیقی علوم کی بنیادیں پڑ چکیں تھیں۔ ماعصر اقوام کے طلبہ دور دراز کے شہروں سے سفر کر کے بابل اور مصر آیا کرتے تھے طالیس نے بھی بابل اور مصر ہی سے علم فیض پایا اور علوم تحقیقی میں اس قدر استعداد حاصل کر لی کہ اس کا شمار مشاہیر داناؤں میں ہونے لگا۔ علم ہیت اور ریاضیات کے علاوہ طالیس نے مساحت کی بھی تحصیل کی طالیس کے مرتب کیے ہوئے اصولوں پر جو بابل اور مصر سے اخذ کیے گئے تھے ان سے بعد میں اقلیدس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تصنیف کی مصر اور بابل سے تحصیل علم اور فیض یابی کا یہ سلسلہ بعد میں بھی صدیوں تک جاری رہا۔ فیثا غورث اور افلاطون، زینو اور ایپکوروس کے بارے میں مسلّم ہے کہ انھوں نے مصر اور بابل کے اہل دانش سے کسب فیض کیا۔

مصر اور بابل کے علاوہ کنعان اور فنیقیہ بھی علوم وفنون کے مرکز بن گئے تھے اور قدمائے یونان فنیقیوں کو اپنا استاد کہا کرتے اور یہ اعزاز بھی ایک فنیقی کو ہی حاصل ہوا کہ اس نے مذہب اور دیو مالا کے توہمات سے ہٹ کر ریاضیاتی مساواتوں کی بنیاد پر سورج گرہن کی سچی پیش گوئی کی۔ اس طرح طالیس نے علم ہیت کو علم نجوم کی خرافات سے پاک کر کے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا اور تاریخ میں پہلی بار نظری سائنس کی بنیاد رکھی۔ دوسری طرف طالیس نے تاریخ عالم میں پہلی بار یہ سوال اٹھایا کہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کی تکوین کا اصل اصول کیا ہے۔ طالیس کے زمانے تک پرہتوں کا خیال تھا کہ یہ کائنات ایک بہت بڑے انڈے سے نکلی ہے یا جادو کے ایک کلمے سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ طالیس نے اس سوال کا علمی جواب دینے کا جتن کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کائنات کی بنیاد پانی ہے اور پانی ہی اس کی تکوین کا اصل اصول ہے۔ آج طالیس کے اس اصول کو خندہ آور سمجھا جائے گا لیکن فلسفے اور سائنس کی تاریخ میں یہ بات اہم ہے کہ طالیس نے تکوین کائنات کے طبیعی اسباب معلوم کرنے کی کاوش کی اس پہلو سے طالیس کو نیوٹن، گلیلو، کیپلر اور آئن سٹائن کا پیش رو سمجھا جا سکتا ہے جنہوں نے جدید سائنس کو مذہب اور باطنیت کی غلامی سے نجات دلائی۔ چنانچہ یہ سمجھا جائے گا کہ طالیس کی ذات سے ہی طبیعی سائنس کا آغاز ہوا جس سے مظاہر کائنات میں آزادانہ غور وفکر کر کے ان کے تحقیقی وعلمی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ طالیس کے دو ہم وطن فلاسفر اناکسی مینڈرکس اور اناکسی مینس نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ کائنات کی اصل مادہ ہے۔ اناکسی مینس نے کہا کہ کائنات میں جو کچھ بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ حرکت کے طفیل ہوتی ہیں جو ازلی وابدی ہے۔ اناکسی مینڈرکس

کے خیال میں کائنات پانی سے نہیں بنی بلکہ یہ ایک لامحدود زندہ شئے ہے جو حرکت کے سبب ٹکروں میں بٹ گئی اور مظاہر عالم وجود میں آگئے۔اس نے بقائے اصلح اور ماحول سے موافقت کا ذکر کر کے ڈارون کی پیش قیاسی کی ہے اس کے خیال میں انسان حیوان کی ارتقاء یافتہ صورت ہے۔ ہیریکلیتس کا دعویٰ تھا کہ کائنات پانی ہوا آگ اور مٹی سے نہیں بنی بلکہ آگ سے بنی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے کچھ حصے روشن ہوتے ہیں اور کچھ بجھے رہتے ہیں۔اس کے خیال میں کائنات میں کسی شئے کو سکون نہیں ہر وقت ہر شئے حرکت میں رہتی ہے ایمی ویکلس کا نظریہ تھا کہ کائنات کی بنیاد عناصر اربعہ پہ ہے۔طالیس اوراس کے ہمنواؤں کی مادیت پسندی دیما قریطس کے افکار میں نقطہ عروج کو پہنچ گئی۔ دیما قریطس نے لیوکپس کے ساتھ مل کر ایٹموں کا نظریہ پیش کیا جو قدمائے یونان کے نظریات کی نسبت جدید سائنس کے قریب تر تھا۔اس میں سقراط اور افلاطون کے برعکس عالم طبیعی کی تشریح بغیر کسی علت غائی یا مقصد سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے کہ دیما قریطس کے خیال میں روح اور عقل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں روح بھی دوسری اشیاء کی طرح ایٹموں سے مرکب ہے، فکر وخیال ایک طبیعی عمل ہے روح کے انکار کے ساتھ اس نے حیات بعد موت کو بھی رد کر دیا۔اس کے خیال میں کائنات سراسر مادی ہے اور اس میں کسی ماورائی ذہن یا شعور کا کوئی وجود نہیں۔ تمام فطری مظاہر پر اندھے میکانکی قوانین حاوی ہیں اور انسان بھی پودوں اور پتھروں کی طرح ایٹموں سے مرکب ہے جنھیں وہ سانس کے ساتھ باہر پھینکتا ہے اور پھر اندر کھینچ لیتا ہے اور اس عمل کے خاتمے پر وہ مر جاتا ہے اور اس کے ایٹم فضاء میں منتشر ہو جاتے ہیں۔

دیما قریطس ایک مذہب بیزار شخص تھا وہ دیوتاؤں کا بھی منکر تھا وہ کہتا ہے کہ مذہبی عقائد نے انسان کو خوفزدہ کر رکھا ہے اور کائنات میں کسی قسم کا کوئی مقصد نہیں اس میں صرف ایٹم ہیں جو میکانکی قوانین کے تحت ترتیب پاتے ہیں یا بکھر جاتے ہیں۔ دیما قریطس یونان قدیم کے مادی یا طبیعی فلسفے کا آخری ترجمان تھا جس کا نقطہ نظر سائنٹیفک تھا اور جو ذوق وتجسس سے سرشار تھا۔زندگی کے بارے میں اس کا اندازِ نظر رجائی تھا۔اس کے خیال میں زندگی کا واحد مقصد مسرت کا حصول ہے جو میانہ روی اور تہذیب نفس سے ارزانی ہوتی ہے۔ وہ جذباتی ہیجان اور جوش وخروش کا مخالف تھا اس لیے عورت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کیونکہ عورت مرد کے جذبات کو بھڑکاتی ہے جس سے اس کا نفس اس پہ غلبہ پالیتا ہے۔ بعد میں اس کے خیالات کی ترویج کا فریضہ اپیکورس اور لکریشس نے انجام دیا۔ سیاسیات میں وہ جمہوریت اور انسانی مساوات کا قائل تھا اس کے دور

میں مادی فلسفہ کے بنیادی افکار مرتب ہوئے جو بعد میں مادیت پسندوں کی فکر ونظر کی اساس بن گئے اس دور میں مادیت پسندوں کا نقطہ نظر آفاقی تھا انھوں نے تکوین کائنات اور مظاہر فطرت کے عقدوں کو تحقیقی انداز میں سلجھانے کی کوشش کی۔ سوفسطائیوں اور سقراط کے ساتھ فکری کاوش کائنات سے ہٹ کر انسان اور اس کے مسائل تک محدود ہوگئی اور انسان کا مطالعہ کائنات کے حوالے سے کرنے کے بجائے کائنات کا مطالعہ انسان کے حوالے سے کیا جانے لگا۔

الیاطی فلاسفہ زینوفینیس پارمی نائڈس اور زینو کا رشتہ روحانی فکر اور مادیت پرستی دونوں کے ساتھ استوار رہا وہ کائنات کو خدا سے واحد الاصل مانتے تھے۔ پارمی نائڈس نے زینوفنیس کے افکار کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ کائنات کا اصل وجود ہے جو واحد حقیقت ہے۔ کوئی شئے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی لہٰذا وجود کے سوا کسی شئے کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ حقیقی وجود ایک ہے جسے ہم عقل استدلالی سے جان سکتے ہیں وہ کہتا ہے کہ حواس کا عالم ظواہر کا عالم ہے جو محض دکھاوا ہے، غیر حقیقی ہے، وہم باطل ہے۔ عالم حقیقی اور عالم ظواہر کی یہ تفریق مثالیت پسندی کی بنیاد ثابت ہوئی۔ الیاطیوں کی وحدت الوجود کے اثرات مثالیت پسندی کے علاوہ تصوف اور سریت پر بھی ہوئے اناکسی غورس نے کہا تھا کہ خدا عالم سے ماورا کوئی خارجی قوت ہے۔ اس پر ارسطو نے بجا طور یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ تعلیم توحید کی نہیں ثنویت کی ہے۔ الیاطیوں کی احدیت یا وحدت الوجود اصلاً مادیت پسندی ہے کیونکہ وہ کائنات کو ہی وجود احد کہتے ہیں بعد میں سریت پسندوں، مثالیت پسندوں اور باطنیہ نے وجودِ احد کو خدا کا درجہ دے کر اسے مذہب کا جامہ پہنا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی احدیت پسند بامذہب نہیں ہوسکتا۔ احدّیت میں ایک ذی ارادہ اور بااختیار خدا کا انکار لازم آتا ہے اس لیے احدّیت اور واحدانیت میں بعُد المشرقین ہے۔ پارمی نائدس کو عقل استدلالی پر کامل اعتماد تھا وہ کہتا ہے کہ جس شئے پر غور وفکر نہیں کیا جاسکتا اس کا کوئی وجود نہیں ہوسکتا۔ عقلیت پسندی کی اس روایت نے بھی بعد کے فلاسفہ کے افکار پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ساتھ یونانی فلسفے میں بھی مثالیت پسندوں کا رجحان غالب آگیا اس لیے ان کے افکار کی مقبولیت کے باعث مادیت پسندی کی روایت دب کر رہ گئی۔ ارسطو کے بعد یونانی معاشرہ تنزل پذیر ہوگیا اور اس سیاسی تنزل کا اثر فکر ونظر پر بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ پھر جب یونان کو رومۃ الکبریٰ کا ایک صوبہ بنا دیا گیا تو انھوں نے فلسفہ اور دوسرے علوم کی تدریس کا کام یونانی غلاموں کے سپرد کردیا کہ وہ خود عملی کے قسم کے لوگ تھے اور فلسفیانہ

بحثوں سے دور بھاگتے تھے اس لیے ان کے بہترین دل ودماغ نظم مملکت اور تسخیر ممالک کے لیے وقف ہو کے رہ گئے۔ رومہ کے دورِ تسلط میں دو مکاتبِ فکر صورت پذیر ہوئے۔ اپیکورس نے لذتیت اور زینو نے رواقیت کے فلسفے وضع کیے۔ اپیکورس کا تعلق دیما قریطس کی روایت سے تھا جو پکا مادیت پسند تھا۔ دیما قریطس کی طرح اپیکورس کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ عالم مادی ایٹموں سے مرکب ہے جو فطری قوانین کے تحت ترکیب پاتے اور منتشر ہوجاتے ہیں، روح مادی ہے اور اس کے ایٹم تمام جسم میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر روح مادی نہ ہوتی تو ہم خوشی یا غم کیسے محسوس کرسکتے ہیں۔ روح کے بھی ایسے ہی ایٹم ہوتے ہیں جیسے کہ حرارت یا سانس کے ہوتے ہیں۔

البتہ وہ دیما قریطس کی جبریت کا منکر ہے اور انسانی قدر واختیار کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی گریز پا ہے اس لیے جہاں تک ممکن ہو اسے ہنسی خوشی گزارنا ہی سچا فلسفیانہ رویہ ہے۔ اس کے خیال میں انسان حسیات کے واسطے ہی علم حاصل کرسکتا ہے اور حس یا مشاہدہ ہی صداقت کا معیار فراہم کرتے ہیں۔ اس کا اخلاقیاتی اصول یہ ہے کہ خیر وہ ہے جو مسرت بخش ہو اور شر وہ ہے جو اذیت کا باعث بنے جیسا کہ عام خیال ہے اپیکورس جسمانی لذت پر زور نہیں دیتا اس کے خیال میں ذوقی لذائذ مادی لذائذ پر فوقیت رکھتے ہیں اور ایک دانش ور ہی سچی مسرت سے بہرہ یاب ہوسکتا ہے۔ اخلاق یا خیر مقصود بلذات نہیں بلکہ مسرت کے حصول کا وسیلہ ہے۔ سیاسی سرگرمیاں ذہنی پریشانی کا باعث ہوتی ہیں اس لیے ایک مرد دانا سیاسی امور میں دلچسپی نہیں لیتا اور گوشہ عافیت میں بیٹھ کر سکون اور آسودگی کی زندگی گذارتا ہے۔ کسی ذی عقل فرد کی تگ وتاز کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ مسرت کے حصول کی کوشش کرتا رہے اور درد واذیت سے پہلو بچاتا رہے اپیکورس کے بارے میں رواقیوں کی یہ تعریض درست نہیں کہ وہ کھانے پینے جنسی ملاپ کرنے اور لیٹ کر خراٹے بھرنے کی دعوت دیتا ہے اس کے خیال میں دوستی جو خلوص اور دلسوزی پر مبنی ہو انسان کو لطیف ترین مسرت بخشتی ہے۔

اپیکورس اس لحاظ سے خوش نصیب تھا کہ اسے کئی مخلص اور بے لوث دوستوں کی رفاقت میسر تھی اس لیے جب وہ مرا تو اس نے اپنا تمام اثاثہ اپنے دوستوں کے بچوں کے لیے چھوڑ دیا اپیکورس نے مسرت پر بحث کرتے ہو لکھا ہے کہ انسان کو دو چیزیں سچی خوشی سے محروم رکھتی ہیں۔ ایک مذہب اور دوسرا موت کا خوف۔ اس کے بقول مذہب نے حیات بعد موت کا جو تصور پیش کیا ہے اس نے انسانی مسرت کے سرچشمے میں زہر گھول دیا

ہے اس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ تھا کہ جسم کی موت کے ساتھ ہی روح بھی فنا ہو جاتی ہے اس لیے عالم عقبیٰ کی دہشت بے معنیٰ اور بے بنیاد ہے اسی طرح موت کا خوف بھی قرین دانش نہیں کہ ''جب تم ہو گے تو موت نہ ہو گی اور جب موت ہو گی تو تم نہ ہو گے'' اپیکورس کے شاگردوں میں لکریشس نے شہرت پائی۔ اس کی مشہور نظم اشیاء کی ماہیت کے بارے میں ہے جو مادیت پسندی کا صحیفہ مانی جاتی ہے۔ لکریشس بھی کسی معبود یا دیوتا کا قائل نہ تھا اور کہتا تھا کہ مذہب دہشت کی پیداوار ہے۔ کائنات میں سلسلہ سبب و مسبب کا قانون ذہن نشین کر لینے سے دہشت کا یہ احساس دور ہو جاتا ہے اور آدمی مذہب کی گرفت سے آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے بقول مذہبی مفہوم میں جنت اور دوزخ بھی محض تخیل کی پیداوار ہیں۔ ذہنی سکون اور طمانیت ہی جنت ہے اور دلی خلفشار اور خوف ہی دوزخ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مذہب نے بنی نوع انسان پر بہت ظلم ڈھائے ہیں اور اس کے نام پر بے شمار بے گناہوں کا خون نہایت بے دردی سے بہایا گیا ہے۔ اپیکورس کی طرح اس کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ کائنات ازلی و ابدی ہے جس پر اٹل قانون کارفرما ہیں۔ ان قوانین کو بدلنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

اس کے خیال میں جب تک انسان مذہب سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرے گا وہ ذہنی سکون اور فراغِ خاطر سے بہرہ ور نہیں ہو گا۔ رواقیت کا بانی زینو بھی طالیس کی طرح ایک فنیقی الاصل ایشیائی تھا۔ وہ ایک منقش طاق کے نیچے بیٹھ کر درس دیا کرتا تھا طاق کے لیے عربی میں رواق کا لفظ آیا ہے اس لیے عربوں نے اس کے فلسفے کو رواقیت کہنا شروع کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رواقیت بھی مادیت پسندی ہی کا ایک مکتب ہے۔ رواقی کائنات میں جبریت اور انسان میں قدر و اختیار کے قائل ہیں وہ جذبات کے اظہارِ بے اختیار کی مذمت کرتے تھے اور ضبطِ نفس کو اخلاق کا اصل اصول مانتے ہیں۔ وہ مابعد الطبعیات کے مخالف تھے اور کہتے تھے کہ علم مدرکات کے واسطے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے خیال میں روح پیدائش کے وقت ایک سادہ تختی ہوتی ہے جس پر ماحول کے اثرات ثبت ہوتے رہتے ہیں جیسے کہ موم پر مہر کا نقش لگتا ہے یہی تاثرات عقل استدلالی کے طفیل معقولات اور تجریدات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی بنا پر رواقیوں نے افلاطون کے امثال کو رد کر دیا تھا جنھیں وہ ازلی و ابدی سمجھتا تھا۔ ان کی منطق کا اصل اصول یہ ہے کہ ذہن انسانی محسوسات و مدرکات کے واسطے کے بغیر کسی قسم کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کی طبعیات کی رو سے کوئی غیر مادی شئے وجود نہیں رکھتی اس لیے وہ روح اور خدا کو بھی مادی قرار دیتے تھے۔ اس مادیت پسندی پر انھوں نے وحدت الوجود کا پیوند لگایا

اور کہا کہ خدا روحِ عالم ہے وہ خدا کو عقلِ مطلق بھی کہتے تھے لیکن روح کی طرح عقل کو بھی مادی مانتے تھے۔ ان کا خدا مذہب کے خدا کی طرح کوئی ذی ارادہ ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات ہی خدا ہے وہ ہمہ گیر دوستی کا پرچار کرتے ہیں اور اپیکورس کے برعکس سیاسیات میں گہری دلچسپی لینے کے قائل ہیں کیونکہ ان کے خیال میں سیاسی جدوجہد ہی سے عوام کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکتا ہے اس طرح ان کی اخلاقیات اَنا پسندی پر نہیں بلکہ عوامی فلاح پر مبنی ہیں ان کا انسان دوستی کا اخلاقیاتی نصب العین افلاطون اور ارسطو کے اخلاقی نصب العین سے برتر ہے۔ اس لیے کہ افلاطون اور ارسطو نے ریاست کی فلاح کے لیے غلامی کو ضروری قرار دیا تھا جب کہ رواقی مکمل انسانی مساوات کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ سب بنی نوع انسان خواہ وہ یونانی ہوں یا غیر یونانی، عورتیں ہوں یا مرد، امیر ہوں یا غریب، دانش مند ہوں یا اَن پڑھ آقا ہوں یا غلام تندرست ہوں یا علیل ہر حالت میں مساوی انسانی حقوق کے حامل ہیں۔ رواقیوں کے کئی اصول بعد میں کلیسائے روم کی تعلیمات میں شامل کر لیے گئے۔ رومۃ الکبریٰ کے دورِ تنزل میں عیسائیت کی اشاعت ہوئی جس کی ترویج میں قیصر قسطنطین نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ قیصر جسٹین نے ایتھنز میں فلسفہ کی تمام درس گاہیں بند کرا دیں اور یورپ پر جاہلیت کے اندھیرے چھانے لگے۔ رسل کے الفاظ میں فلسفہ جو مذہب سے نکلا تھا دوبارہ مذہب میں جذب ہو گیا۔ ان تاریک صدیوں میں فلسفے کو کلیسا کی لونڈی بنا کے رکھ دیا گیا اور اس کا علمی رسوخ خیال و خواب ہو کے رہ گیا۔ اب فلسفے کی جگہ علم کلام نے لے لی تھی جس میں فلسفے کا کام بس اتنا تھا کہ وہ پوپ کے نظریات کی توثیق کرتا رہے[39*]۔

مادیت اور روحانی تہذیب

سترہویں اور اٹھارویں صدی کے یورپ میں روایت پسندی(Traditionalism) اور کلیسائی استبداد اپنے زوروں پہ تھا۔اس دور کے تنگ نظر پادریوں نے قدیم یونانی فلسفے اور عیسائی معتقدات کے امتزاج سے بہت سے خودساختہ نظریات قائم کرر کھے تھے اوران نظریات کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی آواز کو وہ مذہب کے لیے خطرہ قرار دیتے تھے۔شاہی نظام جبر کے ساتھ تنگ نظر پادریوں کے گٹھ جوڑ نے ایک ایسا استبدادی نظام قائم کررکھا تھا جس میں کسی بھی آزاد اور علمی تحریک کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔معاشرے کی گھٹن کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ سقراط کو اپنے علمی نظریات کے تحفظ کے لیے آخر زہر کا پیالہ پینا پڑا۔چنانچہ اس نظام جبر کے خلاف جن نظریاتی تہذیبی سیاسی اور سماجی تحریکوں نے جنم لیا انھی کو بعد میں مادیت پسند کہا گیا اور جن کے افکار ونظریات کی بنیاد پر آج کے جدید مغرب کی بنیادیں استوار ہیں۔ابتدائی مراحل میں یہ تحریکیں مذہب سے کلیتاً لاتعلقی کے تخیل سے خالی تھیں بلکہ ان کے پیش نظر محض اس استحصال کا خاتمہ تھا جو مذہب کے ٹھیکیداروں نے عام لوگوں کے ساتھ روا رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ قدامت اور روایت پسندی کے خلاف تھے اس لیے لامحالہ ان کو جدیدیت کے علمبردار کہا گیا جدیدیت کی ان تحریکوں کے جنم لینے میں کئی عوامل کارفرما رہے تھے جس میں سے ایک اسپین کی اسلامی تہذیب کے ساتھ طویل تعامل بھی تھا جس کی وجہ سے عیسائی دنیا میں بھی اب حریت فکر کی آوازیں آنے لگیں تھیں۔ چنانچہ قرطبہ اور غرناطہ میں حاصل شدہ سائنس کے درس اب رنگ لا رہے تھے اور یورپ کے سائنس دان بھی آزادانہ تجربات کرنے لگے تھے

اور مساوات کے اسلامی تصور کے اثرات نے جنوبی اٹلی سے لے کر سسلی تک انسان دوستی (Humanism) کی تحریکیں کھڑی کر دی تھیں۔ان سب عوامل نے مل کر کلیسا کے جبر واستبداد کے خلاف ایک شدید ردِعمل پیدا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں جدیدیت کی حامی تحریکوں کو عوامی تائید حاصل ہوتی چلی گئی۔چونکہ بیداری کی اس لہر سے قبل پورے یورپ میں شدید نوعیت کی دقیانوسیت اور روایت پرستی کا دور دورہ تھا اس لیے جدیدیت کی اس تحریک نے پورے عہدِ وسطیٰ کو تاریک دور قرار دے دیا تھا اور اس تاریکی سے نکلنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔

اصل میں جدیدیت کی اس تحریک کا حقیقی ہدف روایت پسندی اور مذہبی تنگ نظری کا خاتمہ تھا مگر ردِعمل کی یہ لہر اتنی شدید تھی کہ اس نے جدیدیت کی اس تحریک کو اعتدال کی راہ سے ہٹا کر ایک دوسری انتہا پہ جا کھڑا کیا جہاں روایت پسندی اور عصبیت کے خلاف جدوجہد کرتے کرتے یہ تحریک مذہب کے بنیادی تصورات اور معتقدات سے ہی انکاری ہوگئی اور اسے ہر شخص کا ذاتی معاملہ قرار دے کے جان چھڑا لی۔مذہب بیزاری کے اس رجحان کے پیچھے اس دور کے ان مفکرین کے افکار نے بنیادی کردار ادا کیا جو کسی خالق کے وجود سے انکاری تھے۔چنانچہ جب راہزن کسی قوم کے راہبر بن جائیں تو معاشرے کی اخلاقی سماجی اور تہذیبی بنیادوں سے ابھرنے والا عکس تقریباً وہی تصویر پیش کرے گا جس میں آج کے مغرب کا اصل چہرہ دیکھا جا سکتا ہے جس کی مادی ہوس نے کرہ ارض کا چہرہ لہولہان کر رکھا ہے۔کلیسا کے جبر واستبداد کے خلاف جدوجہد کرنے اور معاشرے کو راہ اعتدال پہ ڈالنے کا دعوی کرنے والے وہ لوگ جنہوں نے اس تحریک کا آغاز کیا تھا پس پردہ چلے گئے۔جدیدیت کی اس تحریک کو فرانسس بیکن (م ۱۶۲۶ء)، رینے ڈیکارٹ (م ۱۶۵۰ء) اور تھامس ہوبس (م ۱۶۷۹ء) جیسے بے دانش لوگوں نے اغوا کر لیا اور تمام اہل مغرب کو خالق کے وجود سے بے پرواہ کر دیا۔

انھوں نے اہل مغرب کو انسانی آزادی کے اس تصور سے آشنا کرایا جس میں فلاح کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ تھا ،جس نے اہل مغرب کو روحانی طور پہ اس مہیب خلا میں جھونک دیا کہ آج اہل مغرب اپنے بچوں کو لفظ خوشی کے حقیقی معنی سے آشنا کرانے کے لیے سکولوں میں علیحدہ کلاسز شروع کرنے پہ غور کر رہے ہیں۔اگر آپ کو کبھی یورپ کے کسی اولڈ ہوم میں جانے کا اتفاق ہو تو وہاں بوڑھے اور بوسیدہ گوشت سے جنم لینے والی ایک مخصوص بو کا احساس ہوگا جو انتظامیہ کی تمام تر کوشش کے باوجود بھی ختم نہیں ہوتی تو شاید آپ کو روحانی تشنگی

کے اس احساس تک پہنچنے میں آسانی ہو جو کسی بھی آزاد معاشرے کا خاصہ ہے۔ان کی مادی کامیابیاں اپنی جگہ مگر خاندان کا بنیادی ادارہ ٹوٹنے کی وجہ سے جنم لینے والا خلفشار اتنا خوفناک ہے کہ خود اہل مغرب کا دانشور چیخ چیخ کر اپنے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔مگر زندگی کی جس رفتار کو انھوں نے اختیار کرلیا ہے اس میں کمی اب ان کے اختیار میں نہیں ہے۔اب ان کے پاس پیچھے مڑ کے دیکھنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ مادی معاشرے تیزی سے اس انتہا کی جانب سفر کر رہے ہیں جس کی دوسری طرف خیر کی کوئی بھی منزل ان کی منتظر نہیں ، بلکہ اِک سراب ہے جس کے گہرے سائے میں زندگی کی خواہشات سے مبّرا اور روحانی تشنگی میں بلکتا بوسیدہ گوشت موت کی آرزو میں تڑپتا ہے مگر ریاست کے بے پناہ مادی وسائل اسے مرنے بھی نہیں دیتے۔

بات ہو رہی تھی سترہویں اٹھارویں صدی کے ان دانشوروں کی جن کے افکار نے مادی نظام فلسفہ کو وہ بنیادیں فراہم کیں جن کی وجہ سے اہل مغرب خالق کے وجود سے بے پرواہ ہوگئے۔کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اکثر مغربی معاشرے عیسائی ہیں جو کہ ایک الہامی مذہب ہے اس لیے وہ کسی خالق کے وجود سے کیسے انکاری ہو سکتے ہیں۔اصل بات یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے انفرادی یا اجتماعی رویے ہی ان کے عقائد کا عکس ہوتے ہیں۔اگر ہم دنیا میں بسنے والے ایک ارب ساٹھ کروڑ ملحدین (کیمونسٹ) کی زندگی کا طریق دیکھیں اور اس کا موازنہ مغرب کے تمام عیسائیوں سے کریں تو ان کے مابین مشترکات اتنے وسیع ہیں کہ یوں لگتا ہے دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلہ سے ہے اگر چہ دونوں کے طرزِ زیست میں عقیدے کا ایک بڑا فرق تو موجود ہے مگر عملاً اس فرق کو محسوس نہیں کیا جاتا اور ان کی سماجی اخلاقی اور معاشرتی اقدار باہم اس قدر پیوست ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا ایک دشوار کام محسوس ہوتا ہے۔یورپ اور امریکہ کے چرچ اتنے ویران ہوتے جارہے ہے کہ ان کے پادری احساس تنہائی کا بوجھ اٹھائے دین مسیح کو ماننے والوں کے منتظر رہتے ہیں مگر امریکہ میں صرف دو فیصد لوگ ہفتے میں صرف پانچ منٹ ہی اپنے دین کے لیے نکال پاتے ہیں اور چرچ کی سروس کے دوران بھی ان کی نظریں اپنی گھڑیوں پہ ہوتی ہیں ان کے مقابلے میں تو یہودی اپنے عقائد میں زیادہ پختہ اور اپنے تصور دین کے بارے میں زیادہ جذباتی ہیں۔چنانچہ فرانسس بیکن ، رینے ڈیکارٹ اور تھامس ہوبس جیسے مفکرین نے جدیدیت کی اس تحریک کو جو نظریاتی بنیادیں فراہم کیں ان کی بنیاد ہی اللہ کے انکار پہ رکھی تھی اور وہ اپنے ان نظریات کو بغیر کسی شرم کے بیان کرتے ہیں۔پھر اہل فلاسفہ کا پورا ایک گروہ پیدا ہو گیا جن کی

دانش کی بنیاد ہی اللہ کے انکار پہ رکھی تھی مثلاً:

☜ مذہب اس عقیدے کا نام ہے جس کے مطابق انسان اور کائنات کے مابین توافق پایا جاتا ہے۔(میکٹے گارٹ)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ اپنی تنہائیوں سے مفاہمت پیدا کرنے کا نام مذہب ہے۔ (وائیٹ ہیڈ)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب اس خیال کا نام ہے کہ کائنات بامعنی ہے۔ (ویلس)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب ان بندشوں اور رکاوٹوں کا نام ہے جو انسانی صلاحیتوں کو صلب کر لیتا ہے۔ (سالومن ریناخ)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب کامل احتیاج اور انحصار کا نام ہے جو انسان کو بےعملی طرف مائل کرتا ہے۔ (مثائکر ماخر)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب ان مافوق الطبع ہستیوں کی پوجا کا نام ہے جو انسان کے خیال میں اس کی زندگی پہ متصرف ہیں۔ (جے جی فریزر)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب قدیم زمانے کے انسان کی دہشت کی تخلیق ہے۔(لکریشس)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب انسان کی تمناؤں کی تشنگی کا نام ہے۔ (سپنگر)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب ایک پاگل پن کا نام ہے۔ (فرائیڈ)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب برتر قوتوں کے متعلق اِک احساس کا نام ہے۔ (مارلے)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب بے معنی عمل کو محکم اساس فراہم کرنے کا نام ہے (نامعلوم)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب لوگوں کے لیے افیون کی طرح ہے۔ (کارل مارکس)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب خوابوں اور تخیلات کی سرزمین ہے۔ (ای۔بی ٹائلر)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ جب کائنات کی توجیح عقل اور مشاہدے سے کی جاسکتی ہے تو کسی خالق کی کیا ضرورت ہے۔
(رینے ڈیکارٹ)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ مذہب ایک تخیلاتی اور بے نام سہارے کا نام ہے۔ (ڈیوڈ فارسمتھ)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ کسی خالق کی کیا ضرورت ہے تم مجھے مادہ لا دو میں تمہیں یہ کائنات پھر سے بنا دوں۔

(کانٹ)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ اگر مجھے پانی اور دوسرے کیمیائی اجزا دستیاب ہوں تو میں خود انسان خلق کر سکتا ہوں۔

(ہیگل)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ اب سائنس کا دور ہے اور خدا مر چکا ہے۔ (نٹشے)

❑❑❑❑❑❑❑

☜ کائنات صرف مادہ اور اس کی حرکت کا نام ہے۔ (ٹنڈل)

❑❑❑❑❑❑❑

یہ ہیں ان مغربی اہل دانش کے وہ تصورات جن کو مادیت کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے اہل مغرب کی زندگی میں وہ انقلاب بپا کیا جس نے انھیں محض نام کے عیسائی بنا دیا اور وہ دین مسیح کی اساسی تعلیمات سے اتنے دور جا نکلے کہ آج کہیں کھوجنے سے بھی ان پہ الہامی مذہب کے پیروکار ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔ تھامس ہوبس نے کہا کہ یہ دنیا اور کائنات عقل تجربے اور مشاہدے کے ذریعے قابل دریافت (Knowable)

ہے۔اس کے تمام حقائق تک سائنس کے ذریعے رسائی ممکن ہے تو پھر کائنات کی دریافت کے لیے کسی اور سر چشمہ کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔میرے خیال میں اس مذہبی تصور کی آج کی جدید دنیا میں اب کوئی گنجائش بھی نہیں اور صرف وہی حقائق قابل قدر ہیں جو عقل تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پہ پورے اترتے ہوں۔ان فلسفیوں نے تمام مذہبی تصورات اور مابعد الطبعیاتی مزعومات اور دعوؤں کو اس لیے رد کر دیا کہ وہ نہ تو ان کے مذکورہ معیار پہ پورے اترتے ہیں اور نہ ہی وہ ان کی سمجھ میں آتے ہیں۔

ڈیکارٹ نے اپنے فلسفے کی بنیاد اس پہ رکھی کہ ''میں سوچتا ہوں اس لیے کہ میں ہوں''

یعنی (I Think therefore I am)۔ڈیکارٹ کے اس فلسفے نے نہ جانے کیوں اہل مغرب میں بہت مقبولیت حاصل کی اور انھوں نے اس نظریہ کو جدید مغربی فلسفے کی بنیاد قرار دے دیا۔دوسرے لفظوں میں اس نے کہا کہ خودی کا شعوری عمل (Conscious Act of Ego) سچائی تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے پھر خالق کے وجود کے ہر احساس سے عاری مفکرین کا پورا قافلہ اہل مغرب کو اس آزادی کا سبق پڑھانے لگا جو مادر پدر آزاد ہو اور جس کے دریچوں سے کسی مذہبی تصور کا گذر نہ ہو، پاسکل، مانسٹیکو، ڈیڈارات، وسلی ، ہیوم اور والٹئیر جیسے کتنے ہی بے دانش ''اہل دانش'' نے عقل کی لامحدود بالا دستی اور واحد سر چشمہ علم ہونے کے تصور کو عام کیا۔یہ افکار عقل پرستی (Rationalism) کہلائی اور انھوں نے جدیدیت کی نئی تعریف یوں کی کہ؛

''جدیدیت وہ روشن خیالی اور انسان دوستی ہے جو کسی بھی ہستی کی بالا دستی اور روایت کو مسترد کرتی ہے اور صرف سائنسی اور عقلی علوم کو ہی تسلیم کرتی ہے۔ہمارے نظریات عقل کی اس محکم بنیاد پہ کھڑے ہیں، جو سچائی کا واحد منبع خود مختار فرد کی عقل کو قرار دیتی ہے''۔

□□□□□□□

چنانچہ جدیدیت کی اس نئی تعریف نے اہل مغرب کے ہاں سے خالق کے ہر تصور کو نکال باہر کیا جس کی وجہ سے ان کے ہاں مذہبی محاذ پر الحاد اور تشکیک نے جنم لیا۔والٹئیر جیسے الحاد کے علمبرداروں نے مذہب اور کسی

خالق کے وجود سے قطعی انکار کر دیا۔تو ہیگل جیسے متشکک مذہب کو تسلیم تو کرتے ہیں مگر اسے عقل کے تابع بتاتے ہیں اور مذہبی حقائق کو بھی دیگر عقلی مفروضات کی طرح قابل تغیر قرار دیتے ہیں۔سیاسی محاذ پہ ان افکار نے انسانی آزادی کے اس تصور کو اجاگر کیا جس نے اہل مغرب کو ہر اس اخلاقی معیار سے گرا کر رکھ دیا جو کسی انسانی معاشرے کے لیے معیار قرار دیا جا سکتا ہو۔انھوں نے انسانی حقوق کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ تمام تر اخلاقی تصورات پس پشت ڈال دیئے گئے۔تھامس ہابس نے انسانی حریت،اس کی آزادی فکر اور آزادی رائے کے احترام کے تصورات عام کیے۔جان لاک نے عوام کو اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا،مانسٹیکو،روسو اور والٹیئر نے اس انسانی آزادی کا پرچار کیا جس کی حدود کے متعلق خود ان کے مابین بھی وسیع اختلافات تھے مگر ان سب کے افکار کی مشترکہ اساس ایک ایسے معاشرے کا قیام تھا جو کسی خالق کے وجود سے بے پرواہ ہو۔حیرت کا مقام تو یہ ہے کہ انھوں نے وہ معاشرہ قائم کر دکھایا جس کی وجوہات چاہے جو بھی ہوں سب سے بڑی وجہ جو مجھے نظر آتی ہے وہ ہے اخلاقی حدود و قیود سے آزادی جس نے ان کو جنس کی اس راہ پہ ڈال دیا جہاں انسان محض ایک جنسی حیوان بن کے رہ گیا۔

فلسفہ اور کائنات

انسانی تاریخ کے ہر دور میں یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ کائنات کی اس رنگارنگی اور مخلوقات کے انگنت ہجوم میں سرِ کائنات انسان کا حقیقی مقام کیا ہے اور وہ کونسا درست رویہ ہے جس کو اپنا کر انسان اس دنیا میں ایک کامیاب اور پرامن زندگی بسر کرسکتا ہے۔ان دونوں سوالوں کا آپس میں نہایت گہرا ربط ہے اس لیے دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے صحیح طور پہ سمجھنا ممکن نہیں۔شعوری دور کے آغاز سے ہی انسان ان سوالوں پر غور کرتا آیا ہے۔اس سلسلے میں سائنس فلسفہ اور منطق کے سینکڑوں نقطہ ہائے نظر سامنے آئے ہیں جن کا تفصیلی جائزہ لینا ہی اس بحث کا مطمع نظر ہے۔مثال کے طور پہ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات میں ایک مہمان سی ہے تو اس کا رویہ اس دنیا میں یقیناً اس شخص سے بہت مختلف ہوگا جو یہ سمجھتا ہے کہ کائنات ایک سیج کی طرح ہے اور وہ اس کا دولہا ہے اور یہ سارا جشن طرب اسی کے لیے ترتیب دیا گیا ہے اسی طرح جو شخص کائنات کو اپنے ذہن میں ایک مشین تصور کرتا ہے اس کا نقطہ نظر یقیناً یہی ہوگا کہ کائنات کی اس

مہیب مشین میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں اور وہ محض ایک ناکارہ سا پرزہ ہے جس کے عدم یا وجود سے کائنات کی مجموعی ہیت میں کوئی فرق آنے والا نہیں ہے۔یہی یاسیت پسندوں کا نظریہ تھا ایسا انسان خود کو ایک مجبورِ محض ہی تصور کرے گا کہ جب تک مشین کا چکر چلتا رہے گا وہ بھی کسی مجبورِ محض کی طرح اس کے ساتھ چکر کھاتا چلا جائے گا۔تاہم یہی انسان اگر اس سوچ کا حامل ہو کہ وہ اس مشین کا حصہ نہیں بلکہ اس کو اس مشین پہ عامل مقرر کیا گیا ہے۔اس کی حیثیت مشین سے بالاتر ہے وہ اس کے کام میں دخیل ہوسکتا ہے وہ اس مشین کو اپنی مرضی کا پابند بنا سکتا ہے تو یقیناً ایسے شخص کا رویہ بہت مختلف ہوگا اور وہ یاسیت سے کوسوں دور ہوگا[40*]۔اسی طرح اگر کوئی قدیم نظریات کی طرح یہ تصور کرتا ہو کہ انسان زیادہ سے زیادہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے تو اس کا یہ بوسیدہ خیال بھی انسانی حقیقت سے بہت پست ہے اس لیے کہ کوئی بندر چاہے ترقی کی کتنی ہی منازل طے کیوں نہ کرلے وہ سقراط کبھی نہیں بن سکتا[41*] اور اگر انسان اس کائناتی تصور کو اپنے ذہن کی زینت بنائے جو ادیانِ عالم اسے بتاتے رہے ہیں تو اس کے اندر احساسِ تفاخر کی لہر انگڑائی لے کر بیدار ہوجائے گی اور وہ کائنات کو مسخر کرنے کے منصوبے بنانا شروع کردے گا اس کو احساسِ شرف وہ برتری عطا کردے گا جس کے بعد وہ کائنات کی تمام مخلوقات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا چاہے وہ زمین و آسمان جتنی بڑی اور پر ہیبت مخلوقات ہی کیوں نہ ہوں۔خالق کائنات نے انسان کو اشرالمخلوقات بنایا اپنی عظیم قدرت اور حکمت سے اس کا تسویہ کیا اس کے اندر اپنی خاص روح پھونکی اور اسے وہ نورِ یزدانی (Divine Spark) عطا کیا جس کا ادنیٰ سا شائبہ بھی اس کی کسی اور مخلوق میں نظر نہیں آتا[42*]۔

چنانچہ کائنات کے متعلق یہ نظریہ اپنانے والا انسان ایک مختلف اور احساس ذمہ داری سے معمور مخلوق کی صورت مظاہرِ کائنات میں نمودار ہوگا۔پس ثابت یہ ہوا کہ انسان کا رویہ اور سوچنے کا انداز ہی اس بات کو متعین کرتا ہے کہ اس کا کائنات میں کیا مقام اور حقیقت ہے اس سوال پہ ہر زمانہ میں دانشوروں حکیموں سائنسدانوں اور فلسفیوں نے تفکر جاری رکھا اور اپنی فکر کا ماحاصل مختلف نظریات کی صورت پیش کیا۔مذہب نے بھی انسان کی راہنمائی جاری رکھی۔چنانچہ انسانی زندگی کے متعلق اس اہم سوال کے بارے میں تاریخ کے صفحات جن نمایاں اور تاباں مکاتبِ فکر کو پیش کرتے ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔

فلسفہ کے مختلف ادوار

نظم کائنات میں انسان کے درست مقام کے تعین کے بارے میں سقراط سے قبل تاریخ کے صفحات یا تو مبہم معلومات پیش کرتے ہیں یا پھر ان میں بالکل اندھیرا ہے۔ چنانچہ سقراط سے پہلے کا دور جس میں انسان ابھی اس کائنات میں انسان کے مقام کے تعین سے قدرے پیچھے تھا تب بھی اہلِ دانش کے ہاں کئی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی جدوجہد کا ایک تسلسل ضرور نظر آتا ہے۔ جو کچھ اس قسم کے تھے کہ آسمان کیا ہے، زمین کیا ہے اور کیوں ہے۔ بدلتے موسموں کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں۔ قوس قزح کیا ہے؟ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اہل دانش علم و فلسفہ سے قدرے دور اور علم سائنس سے قدرے قریب تھے۔ اس لیے سقراط سے قبل اہل یونان کے ہاں دو مکتبِ فکر نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انسان کا مقام کائنات میں ایسا ہی ہے جیسا کسی گائے بکری یا بھیڑ کا ہو سکتا ہے۔ وہ بھی کیڑے مکوڑوں کی طرح کائنات کی لامحدود مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے اور اسے کسی اور مخلوق پہ کسی نوع کی بھی کوئی برتری حاصل نہیں۔ آغاز اور انجام کے لحاظ سے بھی وہ انھی دوسری مخلوقات کی طرح ہے۔ یعنی پیدا ہوا جیا اور مر گیا۔ انسان کو نوعی عملی اور جنسی حوالوں سے دوسری مخلوقات پہ نہ تو کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ ہی وہ کسی امتیاز کا حامل ہے۔ ان کے مقابل سوفسطائی تھے جن کا استدلال اولالذکر تصورات کے برعکس تھا۔ سوفسطائی نقطہ نظر کے مطابق انسان کائنات کا دولہا ہے۔ کائنات کا مرکز و محور ہے، کائنات کا گل سرسبد ہے اور اس کے اندر جو صفات، صلاحیتیں اور قوتیں پوشیدہ ہیں وہ اسے دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں اس لیے اسے

جانوروں کے مماثل قرار دینا قطعی غیر دانشمندانہ نظریہ ہے جس کا کوئی جواز اور دلیل اس نظریہ کے حامل افراد پیش نہیں کر سکے۔سوفسطائی مذہب کے وجود کے بارے میں مثبت رویہ رکھتے تھے۔اگرچہ ان کے مذہبی نظریات کسی بھی معیار سے قابل قدر قرار نہیں دیئے جاسکتے تاہم وہ ایک قوت قاہرہ کے ضرور قائل تھے اور کائنات کو سبب اور مسبب قرار دینے کی بجائے اس بات پہ مائل نظر آتے تھے کہ کائنات کے پیچھے ایک قوت قاہرہ موجود ہے جسے وہ اللہ کا نام تو نہ دیتے تھے مگر ان کے نظریات اللہ کی تائید وصفات میں نظر آتے ہیں۔وہ انسان کے اندر قوتِ عقلی کو بڑا محرک قرار دیتے اور انسان کی ترقی اور بقاء کی توجیہ اسی عقل یزدانی (Divine Reason) سے کرتے۔[*43]

چنانچہ اس دور کے علماء حکماء فضلاء اور فلاسفہ نے ایک ایسے علمی تسلسل کو جنم دیا جو بعد کی دنیا کا اثاثہ قرار پایا۔ اس کی اہمیت ہر دور میں علمی بنیاد فراہم کرنے والی رہی۔اس کے بعد کئی صدیوں کا خلا نظر آتا ہے جس کو مورخ قرون وسطیٰ کا نام دیتے ہیں۔جب کلیسا کے جبر نے علم وفلسفہ کا گلہ گھونٹ دیا۔بعض مورخین نے یوں لکھا ہے اور درست لکھا ہے کہ اس دور میں کلیسا نے عقل کے دیو کو سوتے ہوئے پایا اور اس کو زنجیروں سے جکڑ دیا اور اتنی سختی سے جکڑا کہ کسی بھی شخص کے لیے کوئی علمی نظریہ پیش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ خود اس آگ میں کودنا چاہتا ہے جو ایسے لوگوں کے لیے کلیسا اور اس کے علم دشمن پیروں نے جلا رکھی تھی جس کی نظر گلیلیو اور برونوں جسے نابغہ اشخاص بھی بنے[*44]۔صدیاں علمی قحط اور اندھیرے کی نظر ہو گئیں اور آج کے نام نہاد مہذب مغربی معاشرے اپنے آباء کی تاریخ پہ شرمندہ تک نہیں ہوتے۔پھر وقت گذرتا رہا اور اہل مغرب نے جہاں مذہبی جبر سے جان چھڑائی وہیں انھوں نے مذہب کو بھی خیر باد کہہ دیا۔چنانچہ کوپرنیکس ،کپلر،گلیلیو اور نیوٹن وغیرہ کی بے انتہا قربانیوں نے عقل پہ پڑی ان زنجیروں کو توڑ دیا۔تب لوگوں کو قوانین فطرت کی جستجو ہوئی اور اسی جستجو کے غبار میں کوئی سمندروں کی ویران تنہائیوں کو نکل گیا تو کوئی زمین کی گردش ماپنے زمین کی پہنائیوں کے سفر پہ مائل ہوا،کسی نے دوربین کی مدد سے سرِ افلاک کمندیں ڈالیں تو کوئی لوہے کو سونا بنانے کے کیمیائی عمل میں جت گیا۔انسان نے علم نجوم سے علم ہیئت تک سفر کیا اور جانوروں کی کہانیوں سے علم حیاتیات کا ظہور ہوا۔اس طرح طبیعی قوانین کے متعلق انسان کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔تاہم اس سارے عرصے میں فلسفہ پر کوئی قابلِ قدر کام نہ ہو سکا اور اس زمانے کے علوم سے لے دے کے صرف متکلمین کے علم کا وہی حاصل ملتا ہے جسے زیادہ سے زیادہ علم کلام کہا جاسکتا ہے۔تاہم پھر دور

جدید کے فلاسفہ کا دور آیا مگر ان کے افکار میں کائناتی اساسوں کے بارے میں خالق سے بے پرواہی کا رویہ پایا جاتا ہے۔ جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اس دور کے فلاسفہ کے ذہن سے کلیسا کا جبر محو نہ ہوا تھا اس لیے انھوں نے انسان اور کائنات کی ہر ایسی تشریح کو ترجیح دی جس سے خالق کا وجود منفی کر دیا گیا ہو۔ ذیل میں ہم کائنات اور انسان کے باہمی ربط کے بارے میں قدمائے یونان کا فلسفہ بھی بیان کریں گے اور جدید دور کے اہل فلسفہ کے نظریات سے بھی بحث کریں گے۔ ان دونوں ادوار کے اہل فلسفہ کے نظریات کے مطالعے کے دوران جس امر کا احساس شدت سے ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ قدیم ادروار کے فلسفی چاہے وہ سوفسطائی ہوں یا رواقی یا سقراط اور اس کے حواری ان میں مذہب بےزرای قدرے کم پائی جاتی ہے جب کہ جدید دور کا فلسفی چاہے فرانسس بیکن ہو یا تھامس ہابس، ڈیکارٹ ہو یا شوپنہائیر ہو ہر ایک مذہب سے بیزار اور خالق کے وجود سے دور بھاگتا نظر آتا ہے اس لیے کہ ان کی مذہب بیزاری کے پیچھے دیگر عوامل کے ساتھ ان کا اسلام کی تعلیمات کے خلاف تعصب بھی شامل تھا جس نے انسان اور کائنات کی ماہیت پہ قدیم انسانی سوال کا جامع اور مفصل حل پیش کیا ہے۔

سقراط Socrates (۴۷۰۔۔۔۳۹۹ق م)

سقراط کو علم فلسفہ کا سردار مانا جاتا ہے اور مسلمّہ حقیقت یہ ہے کہ یونان میں ہی نہیں اس کا رتبہ تمام عالم کے فلسفیوں میں اونچا ہے۔اس کا مشہور مقولہ ہے کہ ''اے انسان تو اپنے آپ کو پہچان'' اس کا یہ حکیمانہ ارشاد ایتھنز میں ڈلفی کے مندر پہ لکھا ہوا تھا۔سقراط سے قبل فلاسفہ کا جو دور گذرا تھا اس میں بھی اگر چہ نامور فلاسفر موجود تھے جیسے کہ تھیلیز، ہیرا کلیطس، پارمی نائیڈس، زینو اور فیثا غورث وغیرہ مگر یہ لوگ زیادہ تر اشیاء کی ماہیت اور طبیعت دریافت کرنے کے زیادہ خواہاں تھے اور ان کے پیش نظر زیادہ تر مادی دنیا کے اسرار کی جستجو اور اس کے پس منظر قوانین دریافت کرنا تھے۔اس پس منظر اور اس ماحول میں جب یونان کے طول وعرض میں مادی سائنس کا واویلہ تھا پہلی بار سقراط نے انسان کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ بلاشبہ یہ مناظر بھی حسین ہیں اور ان کی توجیہ بھی ضروری ہے مگر اولین انسانی فرض یہ ہے کہ ان مناظر میں رواں دواں انسان کی حقیقت دریافت کی جائے۔اصل چیز جس پہ غور کی ضرورت ہے وہ شجر و حجر اور ثوابت وسیارے نہیں بلکہ خود انسان کی ذات ہے اور کائنات سے متصل اس کا تعلق ہے جس کو جانے بغیر مظاہر قدرت اور نظام کائنات کی تشریح ناممکن ہے۔سقراط نے وقت کے دانشوروں کی ترجیحات میں تغیر پیدا کرنے کے لیے خالص علمی ماحول میں ایک مہم چلائی جس کے بعد سارے یونان کے فلاسفہ کی توجہ انسان اور کائنات کے باہمی ربط کی طرف مرکوز ہو گئی۔

افلاطون Plato (۳۴۸۔۔۔۴۲۸ ق م)

سقراط نے اہل یونان کے فلاسفہ کی توجہ انسانی زندگی کے جس اہم مسئلے کی طرف مرکوز کرنے کی کوشش کی تھی اسے اس کے نامور شاگرد افلاطون نے جاری رکھا۔ افلاطون نے اپنے استاد کے تفکرات کو جلا بخشی اور اس کے نظریے کو استحکام فراہم کرنے کے لیے مزید علمی دلائل فراہم کیے۔ اس نے کہا کہ انسان کے اندر ہی سارا خزانہ دفن ہے اس لیے پہلے اسے دریافت کرو پھر اس کے بعد اس تحقیق میں نکلو کہ آگ کیا ہے اور پانی کیا ہے۔ سقراط کی طرح افلاطون نے بھی نظم کائنات میں انسان کو محور قرار دیا ہے سقراط نے اسی سوال کو لے کر زندگی کے مختلف شعبوں اخلاقیات، سیاسیات، نفسیات اور اجتماعیات وغیرہ میں انسان کی صحیح روش کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ افلاطون کے فلسفہ پر اپنے استاد کی فکر کے گہرے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں اس کے نزدیک یہ کائنات چند ابدی اصولوں اور کلیات پہ چل رہی ہے جن میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ البتہ انسان علم کی سیڑھی پہ چڑھ کے ان اصولوں کی تشریح ضرور کر سکتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک انسان کو حیوان قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے اور اس کو کسی بھی صورت حیوان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ اس کی پیدائش اسی طریقے سے ہوتی ہے جس طرح حیوان پیدا ہوتا ہے۔ وہ انسان کے اندر اس روح اس ملکوتی عقل کی نشاندہی کرتا ہے جو شرف انسانی کا باعث ہے اور جس کی بنا پر انسان نہ صرف کائنات کی توجیہ کر سکتا ہے بلکہ وہ تسخیر کائنات کی طرف بھی مائل ہے۔ افلاطون کے مطابق انسان کا جسم یا دوسرے لفظوں میں مادہ اس کی ملکوتی عقل پہ قابو پانے کی کوشش ضرور کرتی ہے مگر انسان کا فرض ہے کہ وہ اس پہ قابو پائے اور مادی جسم سے بلند ہو کے سوچے۔

ارسطو Aristotle (۳۸۴۔۳۲۲ق م)

افلاطون کے بعد ارسطو کے کارناموں کی حکمائے یونان میں دھوم ہے۔جس طرح سقراط کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے انسان کو فلسفہ بخشا اسی طرح ارسطو کے بارے میں کہا جاتا ہے اس نے انسان کو سائنس بخشی۔وہی پہلا شخص ہے جس نے انسان کی منطقی تعریف کی کہ انسان حیوان نہیں بلکہ حیوانِ ناطق ہے۔ناطق کا معنیٰ ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ انسان صاحب عقل وادراک ہے۔صاحبِ وقوف و عاقل ہے اور یہی حقیقی حد فاصل ہے جو انسان کو باقی تمام مخلوقات سے جدا کرتی ہے۔انسان نے اپنی عقل کے سہارے تہذیب وتمدن کا جو عروج حاصل کیا وہ ارسطو کے فلسفہ پہ دلیل ہے اس لیے باقی تمام حیوان اپنی سماجی زندگی اسی طرح گذار رہے ہیں جس طرح وہ دس یا بیس لاکھ سال پہلے بتایا کرتے تھے مگر انسان نے اپنی عقل کے سہارے وہ منزلیں طے کیں جن کا کوئی جانور تصور بھی نہیں کر سکتا۔ارسطو نے اس سے بھی زیادہ جو بلند تخیل پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک نورِ یزدانی ہے(Divine Spark) اور یہ اسی کی جلوہ گری ہے جس کے رنگ ہر لحہ انسان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔اگر آج کا انسان سائنس اور معاش کی ترقیوں پر ہے تو اس میں کچھ حصہ ان قدمائے یونان کا بھی ہے جنہوں نے اپنے شب وروز علمی جدوجہد کے لیے وقف کر رکھے تھے یہی بڑے لوگ تھے جنہوں نے اپنا آج آنے والے کل پر قربان کر دیا آنے والی نسلوں کے لیے اندھیرے رستوں میں روشنی کر دی ان کو عقل اور معرفت کے وہ جہاں مہیا کیے جس کی بدولت انسان آج زمین وآسمان کے طول وعرض کو ناپتا پھر رہا ہے یاد رہے کہ افلاطون سقراط کا شاگرد تھا اور ارسطو نے افلاطون سے علم وفیض حاصل کیا۔

رواقی فلسفہ ۔

اہل یونان کے ہاں سقراط افلاطون اورارسطو کے افکارِ کائنات کے بعد نمایاں فلسفہ سکول رواقیوں کا فلسفہ ہے جس کو کافی اہمیت حاصل ہے۔اس دبستانہ فلسفہ کے ہاں کچھ اسطرح کے نظریات پائے جاتے ہیں کہ انسان عالم اصغر ہے اور کائنات عالم اکبر انسان کائنات کی انگوٹھی میں ایک نگینہ کی طرح ہے۔رواقی کہتے ہیں کہ جو کچھ عالم اکبر میں ہے وہی سب کچھ انسان کے اندر ہے جس سے قدرت کی منشا اور خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصد کائنات یا مقصد قدرت یہی ہے کہ جس نہج پہ کائنات کا یہ کارخانہ چل رہا ہے اسی طریقہ پر انسان بھی اپنی زندگی کے نقشے کو استوار کرے یعنی تمام کائنات یا خالق کا تمام مادی نظام ایک تسلسل یا ایک نظم کے تابع ہے اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں۔سورج ہو یا چاند زمین ہو یا آسمان سب اپنے اپنے مدار میں اپنی اپنی ڈیوٹی بغیر کسی حیل وحجت کے پوری کر رہے ہیں کائنات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر بھی عقل ہی کی حکمرانی ہے جس کو روقی اہل فلسفہ بھی عقل یزدانی (Divine Reason) کہتے ہیں اس لیے انسان کے لیے بھی فلاح کا رستہ صرف یہی ہے کہ وہ نفس کی بجائے عقل کی غلامی کرے کیونکہ جب وہ عقل کے تابع زندگی بسر کرے گا تو وہ پیٹ اور تن کا غلام بن کے نہ رہ جائے گا کہ بلکہ اپنی ذات کے اندر سرسراتے اور ابلتے جذبوں کی طرف بھی متوجہ ہو گا جو اس کو خالق کی پہچان میں راہنمائی فراہم کریں گے۔رواقی فلاسفہ کا خیال تھا کہ کائنات میں ہر چیز کا مقام اور مرتبہ متعین ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے مرتبے کی تلاش اور جستجو میں نکلے لہٰذا انسان کو عقل یزدانی کی راہنمائی میں قوانین فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے۔

فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء۔۔۔۱۶۲۶ء)

قرونِ وسطیٰ کے اندھیروں کے بعد جب کلیسا کے جبر کا تسلط ٹوٹا تو جدید دور کے بہت سے فلاسفہ میدان میں اترے اور انسان اور کائنات کی عقلی اور علمی توجیحات کا سفر پھر سے شروع ہوا۔ بیکن کو دورِ جدید کے فلاسفہ کا اولین مفکر قرار دیا جاسکتا ہے اس نے عقل کو کلیسا کے چنگل سے چھڑانے کی کوششوں میں ثابت قدمی دکھائی تھی اور تمام اہل فکر کو نظم کائنات پر کھلے دل و دماغ سے سوچنے کی دعوت دی۔ بیکن کا کہنا تھا کہ کائنات کا دقیق نگاہ سے مشاہدہ کیا جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ یہاں بہت سے واقعات میں مشابہت اور بہت سے واقعات میں تضاد ہے جن کی بنیاد پر انسان نتائج اخذ کرسکتا ہے اور انھی نتائج کی بنا پر وہ قوانین مرتب کیے جاسکتے ہیں جو تسخیر کائنات میں انسان کے ہمراہ ہوں گے۔ فرانسس بیکن نے لوگوں کو اللہ کے وجود پر ایمان لانے کی دعوت بھی دی اور اس بات کی تاکید کی کہ مذہب انسان کو بہت سی برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے اس لیے مذہب کی بات مانو اور خدا کو بھی تسلیم کرو چاہے اس کو تمہاری عقل تسلیم کرے یا نہ کرے چاہے، اس کو تمہارا وجدان رد کرتا رہے مگر انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ کسی نظریے سے وابستہ رہے۔

تھامس ہابس (۱۵۸۸۔۔۔۱۶۵۰ء)

تھامس اپنے ماعصر فلاسفہ کی طرح پرلے درجے کا مادیت پسند تھا اس نے نظم کائنات میں کسی خالق کے وجود کا یکسر انکار کیا۔ اس نے کہا کہ سب کچھ مادہ ہے اور ہر مادی چیز مسلسل حرکت میں ہے۔ مذہب کے معاملہ میں اس نے فرانسس بیکن کے برعکس نظریات پیش کیے۔ بیکن کا نقطہ نظر مذہب کے معاملے میں قدرے مصالحانہ تھا اگرچہ وہ خود بھی مادہ پرست تھا مگر تھامس ہابس نے بیکن کے نظریات کو منافقت کا نام دیا اور اپنے افکار کا سارا وزن سائنس کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اس نے انسان کے وجود کو بھی ایک مادی وجود قرار دے دیا اور مابعد الطبیعاتی نظریات کی سختی سے تردید کی۔ اس نے کہا کہ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ حرکت کے قوانین دریافت کرے تاکہ وہ کائنات کو سمجھ سکے۔ ان ابدی قوانین کو سمجھنے کے بعد ہی انسان فطرت کی منشا کو سمجھنے کے قابل ہوسکتا ہے۔

دیکارت (۱۵۹۶۔۔۔۱۶۵۰ء)

اپنے پیشرو فلاسفہ کی طرح دیکارت کا تعلق بھی مادہ پرستوں کے قبیلے سے تھا جن کا تصور خالق کے وجود سے عاری ہے۔ وہ کلیسا کے جبر واستبداد سے اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ انھوں نے مذہب سے ہی اپنا ناطہ توڑ لیا۔ وہ خود بھی اندھیری راہوں کے مسافر تھے اور مخلوق خدا کو بھی اندھیروں ہی کی دعوت دیا کرتے۔ یہ انھی کے افکار تھے جنھیں اہل مغرب نے اپنایا تو اپنی بنیادی اساس سے دور جا گرے۔ دیکارت نے کائنات کو ایک مشین قرار دے کر اپنی دانست میں ایک بڑا کارنامہ کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کسی فلاسفر سے ایسی توقع نہیں کی

جا سکتی۔ البتہ کوئی عقل کا اندھا ایسی بات کرے تو کرے تاہم ڈیکارٹ کا نقطہ نظر یہی تھا کہ جس طرح کوئی گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے اسی طرح نظم کائنات بھی چل رہا ہے۔ اب اس کو کون بتائے کہ گھڑی کو بھی پہلے کوئی بناتا ہے اس کے پرزوں کو ترتیب سے لگاتا ہے اس کی نگہداشت کرتا ہے تب کہیں جا کر کوئی گھڑی چلنے پر آمادہ ہوتی ہے جب ایک گھڑی ذرا سی لاپرواہی سے رک جاتی ہے تو کائنات کیسے خود بخود کسی نگران کے بغیر چل رہی ہے۔ بہر حال ڈیکارٹ کی ہدایت کا وقت تو گذر چکا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کی عقل پہ ماتم کیا جائے جو آج تک انھی غلط فہمیوں کا شکار ہیں جو ڈیکارٹ جیسے عقل کے اندھوں نے علم کے نام پر پھیلائیں تھیں۔ بہر حال ڈیکارٹ کہتا ہے کہ کائنات ایک مشین ہے اور انسان اس عظیم مشین کا ایک حقیر پرزہ ہے چونکہ ہماری دنیا مشینی ہے اس لیے یہاں موجود ہر چیز کی تعبیر مشینی اصولوں پر ہی ہونی چاہیے۔ وہ انسان کے جسم کو مادی قرار دیتا ہے اور عقل کو روحانیت کا اثاثہ قرار دیتا ہے جسم چونکہ مادی قوانین کے تابع ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ عقل کو بھی انھی قوانین کے مطابق ڈھال لے انسان پر ہر حال میں مادہ ہی کی حکمرانی ہونی ضروری ہے۔

سپنوزا (۱۶۳۲۔۔۔۱۶۷۷ء)

مادہ پرست قبیلے کا ایک تسلسل تھا جس نے دو تین سو سال تک انسان کو مذہب سے بیزار رکھنے کی پوری کوشش کی اگر چہ وہ اپنے عزائم میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے اور انسانوں کی اکثریت اپنے خالق کے در سے ہی منسلک رہی۔ چنانچہ سپنوزا نے ڈیکارٹ کے فلسفے کی توثیق کی اور کہا کہ میں بھی کائنات کو ایک مشین مانتا ہوں تاہم اس نے اتنی رعایت ضرور کی کہ خدا کو بھی اسی مشین کا ایک جز قرار دے دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات کے چکر میں اصل اہمیت مشین کی ہے اجزا کی کوئی اہمیت نہیں۔ کائنات کی مشین جبر محض کے اصول پر چل رہی ہے اس لیے اس میں کسی کے ارادے کو کوئی دخل نہیں۔ انسان چونکہ اس مشینی چکر میں پھنسا ہوا ہے اس لیے وہ

نیچر کے قوانین سے بغاوت نہیں کر سکتا۔سپینوزا کے نزدیک خدا کا ارادہ اور فطرت کے قوانین دراصل ایک ہی چیز ہیں۔اس کا خیال تھا کہ ذہن خداوندی دراصل اس تمام ذہنی سرمائے کے مجموعہ کا نام ہے جو زمان و مکاں میں بکھرا پڑا ہے۔سپینوزا عقل اور ارادہ کو ایک ہی چیز قرار دیتا ہے اس کے نزدیک اختیار معدوم ہے اور ذہن میں کسی اختیار قطعی کا کوئی وجود نہیں بلکہ جب ذہن کوئی ارادہ کرتا ہے تو وہ کسی ایسے سبب سے متعین ہوتا ہے جو خود کسی علت کا معلول ہے سپینوزا کے نزدیک انسانی افعال ایسے قوانین کے پابند ہیں جو ہندسی قوانین کی طرح اٹل ہیں۔وہ کہتا ہے کہ ہماری انفرادی ذات ایک معنی میں فریب ہے ہم قانون اور سلسلہ اسباب کے بہت بڑے دھارے کا چھوٹا سا جز ہیں۔ہم خدا کا جز ہیں ہم ایک ایسے وجود کی آنی اور فانی اشکال ہیں جو ہم سب سے عظیم تر ہے ہم فانی ہیں اور متناہی ہیں وہ ابدی ہے اور لامتناہی ہے۔

جارج برکلے (۱۶۸۵۔۔۱۷۵۳ء)

برکلے کے مطابق انسانی ذہن سے خارج میں کوئی چیز نہیں جو کچھ ہے انسان کے ذہن ہی کی پیداوار ہے۔یہ پوری کائنات جس کی توجیہ کے لیے اہل فلسفہ اور تسخیر کے لیے اہل سائنس میدان نکلے کھڑے ہیں وہ ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔کائنات تو صرف انسان کے تخیل کی پیداوار ہے۔مادی پرستی کے اس اندھے فلسفے میں نہ جانے لوگوں کو کیا نظر آیا کہ وہ ان افکار کو بھی سچ ماننے لگے۔دراصل جب انسان خالق سے بے پرواہ ہوتا ہے تو خود خالق بھی اس کے لیے راہیں تنگ کر دیتا ہے اس لیے ایسے نظریات کے حامل معاشرے جب اپنی سماجی اور اخلاقی بنیادوں کو تعمیر کرتے ہیں تو اس میں بھی خالق کی گنجائش نہیں چھوڑتے اسی لیے آج مغرب کا کوئی معاشرہ اپنے آپ کو مہذب کہنے کے باوجود بھی مہذب نہیں ہے ان کے ہاں روحانی تشنگی اب

اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ امریکہ جسے آج کی مادیت کا سربراہ قرار دیا جا سکتا ہے اپنی معاشرتی اور اخلاقی قدروں کے حوالے سے اتنا پست منظر پیش کر رہا ہے کہ کتاب تاریخ سے اس کی مثال کھوجنا مشکل ہے۔

جان لاک (۱۶۳۲۔۔۔۱۷۰۲ء)

جان لاک نے انسان اور کائنات کے اس الجھے سوال کا یہ حل پیش کیا کہ انسانی ذہن اور جسم ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔اسی طرح خدا بھی ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جانا چاہیے۔اس لیے کہ خدا کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے مگر کائنات وہی ہے جسے ہم اپنے احساسات اور تجربات سے معلوم کرتے ہیں۔لاک کے نزدیک اصل کسوٹی عقل ہے اور عقل کی کسوٹی پر ہر چیز پرکھی جا سکتی ہے تاہم وہ حواس سے پرے خارج کی ایک دنیا اور خدا کا بھی قائل نظر آتا ہے۔اگرچہ اس کے احساسات بتاتے ہیں کہ اس نے خدا کے وجود کو اپنے نظریات میں محض تکلفاً ہی شامل کیا ہے۔وہ صرف مادے کو وجود تسلیم کرتا ہے اس کے نزدیک جسے چھوا نہ جا سکے اس کے وجود ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔اگرچہ یہ خود مادی تصورات کی بھی نفی تھی۔اس کا کہنا ہے کہ اگر ذہن نہ ہو تو احساسات بھی نہ ہوں اس لیے جو کچھ بھی ہے ذہن کے اندر ہی ہے اس کے خارج میں کچھ بھی نہیں۔یوں لگتا ہے لاک خود اپنے نظریات کی تشریح کرنے میں الجھن یا تذبذب کا شکار ہے اس لیے کہ اس کے خیالات میں باہم اس قدر تضاد پایا جاتا ہے کہ درست طور پہ نہ تو اس کو مادیت پسندوں کے گروہ میں شمار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے تصورات علم روحانیت کی کسی کسوٹی پر پورا اترتے ہیں کبھی وہ صرف مادے کو وجود کہتا ہے اور احساسات کے دائرے سے پرے کے تمام امکانات کو رد کر دیتا ہے اور کبھی خود ہی عقل اور حواس کی دنیا سے پرے خارج کی ایک دنیا اور خدا کا بھی قائل دکھائی دیتا ہے یہ تو ایسا ہی ہے جیسے رات کو کم دکھائی دینے والا شخص کسی بات کو بیان کر رہا ہو؟؟؟

ڈیوڈ ہیوم (۱۷۰۱۔۔۔۱۷۷۶ء)

ڈیوڈ ہیوم کے نظریات لاک اور برکلے کے الجھے ہوئے خیالات کا تسلسل ہی محسوس ہوتے ہیں اگر چہ وہ انسان کو کائنات کا مرکز اور محور تو ضرور قرار دیتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ کائنات ایک واہمہ ہے اور اس کی تسخیر کا خواب ایک سراب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ جس چیز سے واقف ہیں وہ ہے ہمارا ذہن جس میں خیال جنم لیتے ہیں اس لیے خارج میں کوئی ایسی چیز موجود ہی نہیں جو قابلِ تذکرہ ہو۔ ہیوم کہتا ہے کہ کائنات میں ایسی کوئی روحانی یا مادی چیز نہیں ہوسکتی جو ہمارے تخیل کی حدود سے ماوراء ہو۔ اور کائنات کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمارے ان خیالات کا تسلسل ہے جو ہمارے ذہن میں جنم لیتے رہتے ہیں یہ خیالات ہمارے ذہن میں کہاں سے پیدا ہوتے ہیں کیوں پیدا ہوتے ہیں مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ہیوم مزید لکھتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ ان خیالات کے پیچھے کوئی علت ہے اور اگر ہم اس سبب کو خدا کا نام دیں بھی لیں تب بھی ہم عقلی طور پہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں چنانچہ مغرب کے اس خاص دور کے فلاسفہ کے اسلوب کی ندرت یہ رہی ہے کہ بات چاہے بنے یا نہ بنے خالق کے وجود سے انکار کرنا ضروری ہے۔

جیکوس روسو (۱۷۱۲۔۔۔۱۷۷۸ء)

روسو مادر پدر آزاد معاشرے کا خواہاں ہے وہ کہتا ہے انسان کو تہذیب عقائد سائنس اور فلسفے کے نظریات نے جکڑ رکھا ہے۔ خدا کے لیے اسے آزاد کردو۔ اگر چہ روسو کسی خدا کو نہیں مانتا مگر حیرت ہے کہ دہائی خدا کے نام ہی کی دیتا ہے۔ اس نے اس بات سے بھی اختلاف کیا ہے کہ کائنات کوئی مشین ہے اور انسان اس کا پرزہ

ہے۔اس کا کہنا ہے کہ انسان احساسات اور جذبات رکھتا ہے مگر سائنس اور فلسفہ کے علوم خاص طور پہ مذہبی عقائد نے اس کے احساس مروت کو کچل کے رکھ دیا ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ تمدن کی معروف اقدار سے بغاوت کر دے تا کہ اس کی صلاحیتیں ابھر سکیں (شاید اس کے خیال میں کپڑے اتار دینے سے انسان کی تخلیقی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں)۔لاحول ولاقوۃ

عمانویل کانٹ (۱۷۲۴۔۔۔۱۸۰۴)

پھر جرمنی میں کانٹ نامی عظیم فلسفی پیدا ہوا جسے عہدِ حاضر کا سقراط کہا گیا۔اس جرمن فلاسفر نے انسان اور کائنات کے متعلق مادیت کے تمام فلسفوں کو رد کر دیا۔اس نے اپنے تخیل یا تصور کو یوں پیش کیا کہ اپنے فلسفے کی ابتداء میں اس نے مادیت جبریت اور مشیئیت کا ابطال کیا۔اس نے کہا کہ سائنس اور دوسرے علوم سے بھی ایک برتر حقیقت سرِ کائنات موجود ہے اور وہ ہے انسان کا اخلاقی وجود۔تمام نیکیاں انسان کے اندر موجود ہیں جو اس کے اندر کی آواز ہیں۔جسے اس نے (Inner Voice) کا نام دیا اور اندر کی اس آواز کو سننے کے لیے خارج سے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں اس لیے کہ انسان کا اخلاقی وجود اسے خود سے نیکی پر ابھارتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا موجود ہے اور وہی انسان اور اس کائنات کا خالق ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ اگر مادہ پرستوں کے تصور کے مطابق فی الاحقیقت خدا موجود نہیں ہے تب بھی اس کی ضرورت بہرحال موجود ہے۔کانٹ نے کہا کہ میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ یہ دنیا محض تجربات اور احساسات کی دنیا ہے اور اس کے باہر اور کوئی دنیا موجود نہیں۔اس نے کہا کہ سائنس اور مشاہدے کی حدود سے پرے بھی ایک دنیا موجود ہے جو عقلی اور عملی دنیا ہے۔کانٹ نے مزید کہا کہ عقل ہمیں خدا کی دعوت دیتی ہے اس لیے کہ وہ بھی خالق کی ایک مخلوق ہے جو اپنے خالق کو نہ صرف پہچانتی ہے بلکہ پکارتی ہے ہمارا اخلاقی

وجود ہمیں خدا کو ماننے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ عقل نہ تو موم کی ناک ہے کہ اسے تجربات اور احساسات جس طرف چاہیں موڑ لیں اور نہ ہی عقل تجربات اور احساسات کا گودام ہے بلکہ عقل ہمارے جسم کا نہایت اعلیٰ حصہ ہے جو پیچیدہ تجربات اور احساسات کو ایک لڑی میں پرو کر ان سے نتائج حاصل کرتی ہے۔ کانٹ نے کہا کہ انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ فانی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ حیات دنیوی ایک اور زندگی کا حصہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ سچ بولنے اور نیکی کرنے سے ہمارا نقصان ہے اور جھوٹ بولنے پر ہم پھنس جائیں گے دنیا ہم کو روز یہ سبق دیتی ہے کہ کبوتر کی نرم خوئی کی نسبت سانپ کی چالاکی اپناؤ اس کے باوجود ہم نیکی کا راستہ اختیار کرتے ہیں اس لیے کہ جب سے یہ دنیا قائم ہے اس وقت سے انسانوں کی یہی روش رہی ہے کہ نیکی کیے جاتے ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں کہیں یہ احساس ضرور جاں گزیں ہے کہ یہ زندگی ایک اور زندگی کا حصہ ہے اور دنیا کی زندگی ایک نئی زندگی کو جنم دے گی جہاں ایک نیکی کا سوگنا اجر ملے گا۔ کانٹ کے نزدیک اگر یہ تصور انسان کے اندر موجود نہ ہوتا تو وہ نیکی کا راستہ اختیار کر کے خود کو مشکل میں کیوں ڈالتا۔ اس کو تو فائدے کی راہ اپنانی چاہیے تھی پھر وہ کون سا فسوں ہے کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں انسان کا دامن مذہب کی محبت سے خالی نظر نہیں آتا ہے۔ جب کہ خالق کا انکار کرنے والوں کی تعداد کبھی بھی خدا کے ماننے والوں سے نہ بڑھ سکی۔ کائنات کی مقصدیت سے انکار ہی تو خالق کی ذات کا انکار ہے پھر اگر کوئی سورج کے وجود سے بھری دوپہر میں انکاری ہو تو اس کے لیے کونسی دلیل کارگر ہوگی؟؟؟

شوپہنائر (۱۷۸۸۔۔۔۱۸۶۰)

یہ بھی جرمن ہیں لیکن ان کے فلسفے نے اس وقت بھی مایوسی ہی پھیلائی تھی جب یہ آیا تھا اور اب آج بھی یہ ایک مایوس کن نظریہ ہے۔ اگر چہ اس کی خواہش نئی نہیں ہے اور آج کے اہل مغرب کچھ انھی جیسے لوگوں کے پیروکار ہیں۔ شوپنہائر مادر پدر آزادی کا قائل ہے جس کے نزدیک انسان ہے تو مافوق الطبیعی حیوان مگر وہ اپنی خواہشوں کا غلام ہے اور عقل انسان کو اس لیے دی گئی تا کہ وہ اپنی تمناؤں کی تکمیل کے لیے راستے تلاش کر

سکے۔بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل خواہشوں کے تابع نہیں بلکہ ان کی راہنما ہے لیکن یہ ایسی ہی راہنمائی ہے کہ جیسے گائڈ سیاحوں کو صرف انھی جگہوں کی سیر پہ لے جاتا ہے جہاں وہ جانا چاہتے ہوں۔اس کے نزدیک خواہش ایک ایسے توانا انسان کی مانند ہے جو اندھا ہو اور اس کے کاندھے پر ایک ایسا شخص سوار ہے جو چل تو نہیں سکتا مگر دیکھ سکتا ہے اور وہی عقل ہے جو خواہش کے اندھے مگر طاقتور راجہ کو اس کے مقام خواہش تک لے جاتی ہے۔اس کے نزدیک ارادہ یا خواہش ہی انسان کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے اسے خواب دکھاتی ہے اور اس کو عمل پہ اکساتی ہے پھر خواہش اور تمنا ایک ایسی مستقل نوعیت کی چیز ہے جس میں تبدیلی بہت دیر کے بعد آتی ہے اور کبھی نہیں بھی آتی۔ایک خواہش سے دوسری خواہش جنم لیتی ہے اور دوسری سے تیسری جنم لے لیتی ہے اس طرح یہ تسلسل عمر بھر جاری رہتا ہے اور انسان خواہش کی غلامی سے کبھی آزاد نہیں ہو پاتا یہ آزادی اسے تب نصیب ہوتی ہے جب اس کی خواہش اس کی عقل کے تابع ہو جائے مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے چنانچہ زندگی ایک شر ہے اور ایک مسلسل جنگ اور کشمکش سے عبارت ہے۔

فریڈرک نٹشے (۱۸۴۴۔۔۱۹۰۰)

نٹشے بھی جرمن تھا جس نے میدانِ فلسفہ میں کافی شہرت حاصل کی اس کے تصورات کے مطابق انسان کے اندر اصلی چیز حصول طاقت کا جذبہ ہے اور پوری کائنات کا بنیادی فلسفہ اسی کے گرد گھومتا ہے۔یہ جذبہ نہایت طاقتور ہے جو ہر چیز ہر خواہش پر حاوی ہے۔طاقت کے حصول کی خواہش خود اتنی طاقتور ہے کہ وہ کسی کی کوئی پرواہ نہیں کرتی جو بھی اس کے سامنے آتا ہے پس کے رہ جاتا ہے۔کائنات کا چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے اس کے پاٹوں کے درمیان کون آکر پستا ہے اور کس کا برا حال ہوتا اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔انسان طوفانوں، زلزلوں، سیلابوں، وباؤں اور دوسری قدرتی آفات کے رحم و کرم پہ ہے لہٰذا زندگی ایک مستقل مصیبت ہے۔نٹشے انسان کو سفاک جانور قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے انسان اخلاق کی کسی

بھی پستی میں اتر سکتا ہے اور کوئی سماجی یا اخلاقی قانون اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا اور یہ کہ انسان کی اس طاقتور خواہش کے سامنے نیکی اور عقل کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ اکثر اوقات وہ ان جذبوں کو بھی طاقت کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔اس کا مزید یہ خیال ہے کہ عام طور پہ جو مشہور نیکیاں مروّج ہیں ان کے پیچھے بھی طاقت کے حصول کا جذبہ ہی کارفرما نظر آئے گا اور دوسروں پر بالا دستی کی خواہش ہی اس کی تہہ میں چھپی بیٹھی ہوگی اس لیے انسان کی زندگی کا مقصد نیک بننا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا مقصد حیات یہ ہونا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنے مقابل پر چھا جائے۔

اگسٹ کومٹ (۱۷۹۸۔۔۔۱۸۵۷)

اگسٹ کومٹ کا کہنا ہے کہ علم کا ذریعہ تجربہ اور مشاہدہ ہے جس کی بدولت ہمیں کائنات کی مختلف اشیاء میں باہمی ربط جاننے میں مدد ملتی ہے۔اس سے زیادہ علم انسانی حدود سے ماوراء ہے۔کومٹ فلسفہ کا ایک اور سکول ہے جو اثباتیت کا قائل نظر آتا ہے جس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ کائنات مشاہدے اور تجربے کی دنیا ہے اور انسان کو جو کچھ نظر آتا ہے یا جو کچھ اس پہ بیتتی ہے وہی اصل دنیا ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں اس لیے یہ کوشش عبث ہے کہ کائنات اور انسان کا اصلی جوہر تلاش کیا جاسکے۔چنانچہ جب ہم اس کائنات پہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات ایک خاص انداز سے چل رہی ہے اور انسان گرمی سردی سیلاب خشک سالی بیماریوں اور مصائب میں مبتلا نظر آتا ہے۔تاہم وہ بعض چیزوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرلیتا ہے جو حقیقت میں اس کے نقصان کا باعث بنتی ہیں۔انسان کو اپنے اندر کائنات کے بعض اجزاء نظر آتے ہیں جن کے متعلق اس کا خیال ہے کہ ان کا تعلق انسان سے ہے جس کی بنیاد پر وہ زندگی گزارنے کے بعض قاعدے اور قانون وضع کرلیتا ہے اگرچہ ان کا حتمی علم اس کو حاصل نہیں اسی لیے اس کی اس جہد وسعی کے نتائج اس کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتے۔انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو جاننے کے لیے انسان کے پاس فکر کا

ہتھیار تو موجود ہے مگر جہاں تک فکرِ انسان کی راہنمائی کرتی ہے اسرارِ کائنات ان سے کافی بعید ہیں اسی لیے ہزاروں سال کی جہد وسعی کے باوجود بھی انسان کائنات کی حقیقی توجیح سے دور کھڑا ہے اور ششدر ہے کہ اس معمے کا آخر حل کیا ہے؟؟؟

ہربرٹ سپنسر (۱۸۲۰۔۔۔۱۹۰۳)

سپنسر کا کہنا ہے کہ ہمیں انسان اور کائنات کی حقیقی ماہیت کے بارے میں جو بھی علم حاصل ہوا ہے وہ تجربے اور مشاہدے ہی کی دین ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ ان تجربات کی کوئی علت ضرور ہے جس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ہمارے تجربات اور مشاہدات سے باہر بھی ایک دنیا موجود ہے جو ہمارے تجربات کا سبب بنتی ہے۔ سپسنر اس دنیا کو نامعلوم کہتا ہے جس طرح انسان کے داخلی جذبات اور احساسات کی کیفیت ہے اسی طرح نامعلوم دنیا بھی ایک کیفیت ہے اس لحاظ سے انسان کے لیے بھی وہی اصول ہیں جو دنیا کے بنیادی اصول ٹھہریں۔ سپنسر کے نزدیک یہ نامعلوم دنیا ایک بڑی طاقت ہے جو تخلیق کی صلاحیت بھی رکھتی ہے اور یہی طاقت چند بنیادی مگر مخصوص قوانین کے تحت سرگرم عمل رہتی ہے اور انسان اسی قوت کی تخلیقی صلاحیت کا نتیجہ ہے سپسنر کا خیال ہے کہ انسان اس ارتقائی عمل کا حصہ ہے جو اس کائنات میں پایا جاتا ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ انسان جو بھی ترقی حاصل کرتا ہے وہ اسی ارتقائی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے ارتقاء کا قانون ہی دنیا کا بنیادی کلیہ ہے اور کائنات کی تمام اشیاء کے اندر ارتقاء کا داعیہ پایا جاتا ہے چونکہ انسان بھی کائنات ہی کی طرح ایک خلق ہے اس لیے اس کے ارتقاء کی بھی ایک داستان ہے جسے علماء حیاتیات بیان کرتے ہیں مزید براں یہ کائنات کی ہر چیز خود کو اپنے ماحول کے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے ارتقاء کا باعث بھی ہے انسان میں یہ صلاحیت دوسرے جانداروں کی نسبت نسبتاً زیادہ ہے اس لیے اس نے اپنی بقاء کی جدوجہد میں زیادہ ترقی حاصل کی۔

برٹرنڈ رسل (۱۸۷۲۔۔۔۱۹۷۰)

اگرچہ رسل کا شمار بیسویں صدی کے عظیم فلاسفہ میں کیا جاتا ہے اور میں کوئی شک بھی نہیں کہ بیسویں صدی کے اہل دانش میں رسل چمکتے ہوئے اس سورج کی مانند ہے جس کی موجودگی میں ستاروں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے اہل مغرب کی مذہب بیزاری کی لہر نے رسل کو بھی ہمیشہ اپنی لپیٹ میں رکھا اس لیے رسل کی توجیہ کائنات انتہائی مایوس کن ہے۔ رسل کے نزدیک دنیا ایک عظیم حسابی مشین ہے جو سائنس کے کلیات پر چل رہی ہے جن میں کوئی تغیر ممکن ہی نہیں اور انسان اسی نظام کا ایک حقیر سا حصہ ہے اور اس عظیم مشین کا بھاری چکر صدیوں سے چل رہا ہے اس کی زد میں جو بھی آتا ہے پس کے رہ جاتا ہے۔ انسان بھی اسی کائناتی چکر کا شکار ہے اور اس میں پس رہا ہے البتہ جب کبھی وہ اس چکر کے اوپر والے حصے میں آتا ہے تو انسان ذرا سی دیر کے لیے ابھرتا ہے اور وہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ نظم کائنات میں اس کی بھی کوئی حیثیت ہے۔ حالانکہ مختصر عرصے کے بعد وہ پھر کائنات کے اسی مہیب چکر کی نظر ہو جاتا ہے اور اس کی نسلیں تک مٹ جاتی ہیں۔ اس کائناتی مشین کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کی زد میں آ کر کون کون پس رہا ہے۔ اس کا کام ہے اپنے چکر میں منہمک رہنا ہے اس لحاظ سے انفرادی طور پہ انسان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ رہی اجتماعی حیثیت تو رسل کے نزدیک اس کی مثال ان ملاحوں کی سی ہے جن کا جہاز طوفان میں غرق ہو چکا ہو اور وہ ایک تختے پر بیٹھے گھٹاٹوپ اندھیرے میں سمندر کی موجوں کے رحم و کرم پہ ہوں اور ایک ایک کر کے سمندر میں گرتے چلیں جائیں کسی ایک کے گرنے سے سمندر پر ایک بلبلہ سا پیدا ہو اور پھر ختم ہو جائے۔

فلاسفہ کی آراء پہ جرح ونقد

اہل مغرب کی اس جرح وتعدیل سے ہم نے جانا کہ زمانہ قدیم سے راہ فکر وفلسفہ کے مسافر کن راہوں پہ بھٹکتے پھرے ہیں۔کتنا اندھیرا تھا جس میں راستہ تلاشنے کی جہد وسعی کا صدیوں پہ محیط ایک تسلسل نظر آتا ہے۔لوگ قرنوں تک نظریات وافکار کے پہاڑ تراشتے رہے مگر اس پہاڑ کو جب کھودا گیا تو صرف چوہا نکلا، کیوں؟ اس کیوں کا جواب بھی اتنا سادہ اور سہل نہیں اس لیے کہ اس کیوں کے پیچھے انسانوں کی اس گمراہی کے قصے ہیں جن میں خالق کے وجود سے بے اعتنائی کے نشان ہیں۔ان نظریات اور اعتقادات کا عکس ہے جس کے باعث انسان اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا رہا ہے۔اس نے سورج کو پوجا مگر یہ خیال نہ کیا کہ آخر سورج کو کس نے بنایا ہے۔اس نے پہاڑوں کی پوجا کی مگر پہاڑوں کے خالق کو نظر انداز کیا۔اس نے آگ کی پوجا کی مگر آگ ہی سے بھاگتا پھرا۔الغرض کتنے اندھیرے اور کتنی پستی ہے ان افکار ونظریات میں جن کو مرتب کرنے میں انسان نے صدیاں گنوادیں۔چنانچہ اوپر پیش کی گئیں آراء میں سے ان قنوطیوں اور بنیاد پرستوں کو تو چھوڑ

دیجیے کہ وہ فکر و فلسفہ کا حقیقی گروہ نہیں ہیں اگر چہ ان کو فکر و فلسفہ کی نفی آسانی سے قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم اہل رائے فلاسفہ کی رائے کو درست طور میں سمجھنے کے لیے ہم ان کو تین بڑے نظریاتی گروہوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اول وہ لوگ جن کے نزدیک انسان بھی دوسرے جانداروں ہی کی طرح کا ایک جاندار ہے یعنی وہ کیڑے مکوڑوں اور چوپائیوں ہی کی ایک نوع ہے، جو حشر ان کیڑے مکوڑوں کا ہوگا وہی حضرت انسان کا بھی ہوگا کیونکہ نوعی اعتبار میں ان کے درمیان کوئی بڑا فرق موجود نہیں۔ اگر صفات میں کچھ فرق ہے بھی تو اس کی چنداں اہمیت نہیں اس لیے کہ مختلف النوع جانداروں میں اس نوع کا فرق پایا جانا عین فطری ہے۔

اہل فلسفہ کا دوسرا گروہ اپنی دانش کا اظہار یوں کرتا ہے کہ انسان کائنات کی مجموعی مشین کا ایک پرزہ ہے مگر اصل اہمیت مشین کی ہے کسی پرزے کی نہیں۔ ایک چکر چل رہا ہے اور اس میں جس طرح کائنات کے دوسرے عناصر اپنا اپنا عمل کر رہے ہیں اسی طرح انسان بھی اپنا عمل کر رہا ہے۔ وہ اس چکر کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور اس کا انجام اسی کے ساتھ مقدر ہے۔ یہ بڑے بڑے فلاسفہ کا مذہب ہے حتی کہ سپنوزا اور رسل بھی اسی گروہ میں شامل ہیں۔ تیسرا گروہ انسان کو کائنات کا موضوع اور مقصود بتاتا ہے وہ کائنات کی غایت اور نہایت انسان ہی کو قرار دیتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ انسان ہی اس بارات کا دولہا ہے اور یہ ساری کائنات اسی کو سامنے رکھ کے مرتب کی گئی ہے۔ اس نقطہ نظر کو بھی بڑے بڑے اہل دانش کے افکار کی پشت پناہی حاصل ہے جن میں سوفسطائیوں سے لے کر سقراط، افلاطون، ارسطو اور کانٹ تک جیسے بڑے بڑے نام شامل ہیں۔

آج کا فلسفی یہ سوچ رہا ہے کہ وہ جلد یا بدیر سائنس کے ذریعے اس کائنات کو فتح کرلے گا اور اس کا ماسٹر بن بیٹھے گا۔ وہ خود خدا بننے کے زوم میں مبتلا ہے اس لیے وہ اصل خدا کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ خود خدا بن بیٹھنے کا ایک الگ نشہ ہے جس میں آج کا مغربی دانشور مبتلا نظر آتا ہے۔ مگر فلاسفہ کے نظریاتی گرہوں کے افکار پہ نظر ڈالی جائے تو اس کو بھی اہل دانش کے اسی گروہ میں شامل کرنا پڑے گا جو انسان ہی کو کائنات کا سر سبد قرار دیتا ہے۔

چنانچہ تاریخی اعتبار سے اگر فلاسفہ کی آراء پہ تفکر کیا جائے تو جہاں تک پہلے گروہ کا تعلق ہے ان کی رائے پہ غور کرنے سے انسان اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ انھوں نے نہ تو مکان کی اہمیت کو سمجھا اور نہ ہی مکین کی عظمت کو۔ یعنی وہ نہ تو کائنات کا حقیقی ادراک حاصل کر سکے اور نہ ہی اس سارے نظام کی وسعتوں میں انسان کے حقیقی مقام کا درست تعین کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کوہ نور ہیرا کوڑے کے

ڈھیر سے ملے تو وہ اسے ایک حقیر پتھر ہی جانے گا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان اس کائنات کی عظمتوں اس کی حکمتوں اس کی نیرنگیوں اس کی وسعتوں اس کی رفعتوں اس کی قدرتوں اس کی شانوں اور اس کے عجائب پہ غور کرتا تو دھنگ رہ جاتا کہ مظاہرِ کائنات کے پس پردہ حکمتوں اور عظمتوں کے اتنے نشانات پوشیدہ ہیں کہ بے ساختہ زبان پہ اللہ اکبر آ جاتا ہے۔ فلاسفہ کے اس گروہ کی آراء کو اس تشبیہ سے سمجھیں کہ اگر کوئی شخص آگرہ کے تاج محل کو گھوڑوں کا اصطبل بتائے تو سوائے اس شخص کی عقل پہ ماتم کرنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اتنی بڑی اور حکیمانہ کائنات کے متعلق اگر کوئی یہ کہے کہ یہ ایک بے مصرف کارخانہ ہے تو وہ احمق ہی ہو گا۔ اس لیے اگر انسان جیسی عقل و معرفت کی حامل مخلوق کے بارے میں کوئی یہ کہے وہ کیڑے مکوڑوں ہی کی ایک نوع ہے تو اسے بھی ایک احمق ہی تصور کیا جائے گا۔

انسان جس کی قابلیت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنی عقل کے ذریعے ناپ لیتا ہے کہ سورج زمین سے کتنے فاصلے پر ہے اور اس کی شعاعیں کتنے عرصے میں زمین تک پہنچتی ہیں اس انسان کے متعلق یہ کہنا کہ انجام کے حوالے سے اس میں اور کسی گدھے میں کوئی فرق نہیں خود پرلے درجے کا گدھا پن ہے۔ کیونکہ اس فلسفیانہ طرزِ فکر سے نہ صرف نوع انسانی کی تذلیل ہوتی ہے بلکہ انسان اور کائنات دونوں کی قدر و قیمت مٹی میں مل کے رہ جاتی ہے۔ چنانچہ نظم کائنات کے متعلق یہ نقطہ نظر کہ اس میں انسان کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں بجائے خود ایک ایسی سوچ ہے جو نظام کائنات کی لاتعداد دلیلوں سے رد کی جا سکتی ہے کیونکہ جب انسان بھی دوسرے کیڑوں مکوڑوں ہی کی طرح ختم ہو جائے گا تو سارا کائناتی تصور عبث تصور کیا جائے گا جس کا مطلب یہ ہوا نہ کہ اس کائنات کی کوئی غایت ہے نہ کوئی روز حساب۔ کوئی جزا و سزا اور کوئی مواخذہ اور محاسبہ نہیں، لہٰذا کائنات کے متعلق آسانی سے کہا جا سکے گا کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے اور جب اس کا جی بھر جائے گا تو وہ اس کو توڑ پھوڑ کے ختم کر دے گا۔ مگر اتنی عظیم اور حکمتوں سے بھری اس کائنات کو کسی کھلنڈرے کا کھیل قرار دینا آسان نہیں۔ یہ کہنا کہ کائنات کسی غایت کسی مقصد کے بغیر ہی وجود میں لائی گئی ایک جاہلانہ فلسفیانہ تصور کے بغیر کچھ نہیں۔ کیونکہ غور و فکر کرنے والا کوئی بھی دل جب مظاہرِ کائنات پہ نظر ڈالے گا تو اس کی فطرت پکار اٹھے گی کہ:

''اے رب تو نے یہ کارخانہ (کائنات) عبث پیدا نہیں کیا''

(القرآن)

اہل فلسفہ کا دوسرا گروہ جس کے خیال میں کائنات ایک بڑی مشین ہے اور انسان اس کا ایک حقیر پرزہ ہے اس طرزِ فکر میں بھی منطق کے متعدد خلا اور علمی قحط پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان نظریات نے صدیوں انسانی ذہن کو مسحور رکھا ہے۔ نظام کائنات پہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز سورج، چاند، ستارے، ابر ہوا، گرمی سردی اور دن رات انسان کی کسی نہ کسی نوعیت کی خدمت پر طبعاً اور عقلاً مجبور نظر آتے ہیں۔ اس لیے سرِ کائنات کوئی ایسی چیز نشان زد نہیں کی جاسکتی جس کا براہ راست تعلق انسان کے ساتھ نہ ہو۔ مگر انسان کے متعلق یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے فلاں امر پہ مجبور نظر آتا ہے، یا وہ فلاں کی خدمت میں مصروفِ عمل ہے۔ اگر انسان کو کائنات کا پرزہ کہا جائے تو پرزہ کی اس نوعیت کو متعین کرنا دشوار نظر آتا ہے اس لیے کہ ہر پرزہ دوسرے پرزے کی مدد کرتا ہے مگر انسان پہ اس کا طلاق ہی نہیں ہوتا اس لیے وہی بات درست معلوم ہوتی ہے جو کبھی شیخ سعدی نے کہی تھی کہ:

ابر و باد ومہ و خورشید وفلک در کاراند

تاتو ناتے بکف آری وبغفلت نخوری

یعنی سورج، چاند، ابر، ہوا سب انسان کی خدمت میں سرگرم ہیں اور ان کا مطالبہ جو عقل پہ مبنی معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا شکر ادا کرے۔ پس جو فلسفی یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسان کائناتی مشین کا ایک پرزہ ہے ان کے لیے نرم سے نرم لفظوں میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کو کائنات کی توجیہ میں شدید قسم کا مغالطہ لاحق ہوا ہے۔ اہل فلسفہ کا تیسرا اور آخری گروہ جن کے خیال میں انسان ہی کائنات کا محور و مرکز ہے وہی کائنات کا موضوع اور مقصود ہے ان کی رائے کو حقیقت کے قریب قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں معقولیت کے کئی پہلو پائے جاتے ہیں اس لیے کہ نظم کائنات کو انسان سے الگ کر کے دیکھنا کسی حماقت سے کم نہیں اور فلاسفہ کے سابق گروہ یہی کرتے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی رائے عقل واستدلال سے دور نظر آتی ہے بلکہ آج کے ترقی یافتہ تناظر میں قدرے احمقانہ بھی نظر آتی ہے اس لیے کہ آج کے معاشرے شعوری معاشرے ہیں اور ان میں عقل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پھر انسان نے اپنی سائنسی اپروچ کی وجہ سے مظاہر کائنات کی قابل قدر تشریحات کی ہیں جو عقلی بھی ہیں اور ان کو رد کرنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ جب تک کوئی نیا کائناتی فلسفہ سامنے نہیں آجاتا اس وقت تک موجودہ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں کائنات

کے مشاہدے اور تجربوں کی بنا پر کی گئی تحقیق ہی احسن تصور کی جائے گی۔ کائنات کا محور انسان ہے یہی آج کا جدید سائنسی نظریہ ہے اور موجودہ دور کے ملاحدہ تک اس رائے سے اختلاف کی جرأت نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انسان میں کائنات کا ماسٹر بننے کی صلاحیت اور حوصلہ اسی صورت میں معقول قرار دیا جاسکتا ہے جب کائنات میں اس کا کوئی مقام ہو۔ جب وہ اس کے اندر ایک خاص اہمیت کا حامل ہو اور انسان کے اندر اس بات کا شعور بھی پایا جاتا ہو کہ نظم کائنات کے اسرار اسے تسخیر کی دعوت دے رہے ہیں۔

قرآن اور کائنات

انسان اور کائنات کے باہمی ربط کے بارے میں انسانی تاریخ میں اہل فلسفہ کی جدوجہد اور ان کے افکار و نظریات کے مطالعہ کے بعد اب قرآن کا کائناتی نظریہ پیش کیا جاتا ہے جس میں انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور انسان کا کائنات میں ایک مقام بھی متعین کیا گیا ہے۔ فلاسفہ اور اہل دانش کے نظریات تضادات سے پر ہیں اور فلاسفہ کے مختلف گروہ نظریاتی اور فکری طور پر منقسم نظر آتے ہیں۔ ان کے افکار میں قحطِ شعوری اور منطقی خلا موجود ہیں۔ ان کی آراء اور کائنات کے بارے میں بیشتر توجیحات سطحی ہیں اور فکری عادت سے ماوراء نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ عالم میں انسان کبھی بھی کسی ایک کائناتی نقطہ نظر کو اپنانے سے قاصر رہا ہے اور مختلف علاقوں کے لوگ اپنی توجیحات اور ترجیحات کے مطابق نظم کائنات کی تشریحات کرتے رہے ہیں اور انہیں پہ ان کا اعتماد بھی رہا ہے۔ تاہم قرآن کا علم اپنی آفاقیت اور بے مثال نظم کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ کسی تضاد سے پاک ہے بلکہ اس ضمن میں قرآن کا نقطہ نظر عقلی اور منطقی حوالے سے بھی اتنا مکمل اور جامع نظر آتا ہے کہ کوئی بھی عدل پسند دل اس سے انکاری نہیں ہوسکتا۔ چونکہ قرآن اللہ کی

آخری کتاب ہے اور کائنات کے خالق کا انسان کو یہ آخری خطاب ہے اس لیے پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نظام کائنات اور انسان کے بارے میں قرآن کا نقطہ نظر ہی حتمی ہے جس میں اس دنیا کی منطقی انتہا تک کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس لیے اگر اہل فلسفہ اور سائنس کے وسیع میدانوں کے راہی اس کی راہنمائی میں اپنے نقطہ نظر کو متعین کریں گے تو جلد ہی منزل مقصود حاصل کرلیں گے ورنہ پانچ ہزار سالہ فلسفہ کی تاریخ میں اہل دانش نے جو تیر مارے ہیں ان کا ذکر ابھی اوپر گذرا ہے۔میرا دعویٰ ہے کہ اگر فلسفہ اور سائنس قرآن سے راہنمائی حاصل کئے بغیر مزید پانچ دس ہزار سال بھی تحقیق و جستجو میں گذار دیں تب بھی منزل ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہے گی اس لیے بہتر اور خیر پہ مبنی انسانی رویہ یہی ہے کہ وہ الٰہیات کو فرسودہ رسم ورواج کا پلندہ قرار دینے کی بجائے اس بحرِ بے کراں میں اتر کے دیکھے تب وہ جانے گا کہ قرآن ہی وہ حرفِ آخر پیش کرتا ہے جس میں اس کے تمام مسائل کا حل پوشیدہ ہے۔قرآن نے انسان کو زمین پہ خدا کا خلیفہ بتایا ہے اس نے نہایت وضاحت کے ساتھ تخلیق انسانی کا ماجرا بیان کیا ہے اور وہ تمام مناظر انسان کی آنکھوں کے سامنے روشن کیے ہیں جن کی کھوج میں انسان صدیوں فلسفے اور سائنس کے اندھے غاروں میں دھکے کھاتا پھرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا کہ میں زمین پہ انسان کو اپنا خلیفہ مقرر کرنے لگا ہوں جس پہ فرشتوں نے جانا کہ اللہ اس نئی مخلوق کو اختیار اور آزادی دینے والا ہے۔اس پہ انھوں نے اپنے کچھ تحفظات کا اظہار بھی کیا کہ اے اللہ انسان خلیفہ کی حیثیت سے زمین کو فتنہ وفساد سے بھر دے گا اور جہاں تک تیری تسبیح وتحمید کا تعلق ہے تو ہم نے اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے استدلال کو اہمیت نہ دی اور کہا تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا کہ چونکہ تم میری پوری اسکیم سے آگاہ نہیں ہو اس لیے تمہیں یہ اشتباہ ہوا ہے میں اگر انسان کو اختیار دوں گا تو اس کی ہدایت اور راہنمائی کا اہتمام بھی کروں گا اور اس پہ حجت تمام کروں گا اس کے بعد اگر وہ غلطی کرے گا تو اپنے اختیار سے کرے گا جس کی اسے سزا بھی بھگتنی ہوگی۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جب میں انسان کی نوک پلک سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کی تعظیم کرنا۔اس پہ فرشتوں نے آمین کہا اور یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل اور اختیار کی آزادی کے ساتھ زمین پہ اپنا نائب نامزد کردیا۔میرے نزدیک اسی کو علم الانسان کہتے ہیں جس کی خبر اللہ نے قرآنِ حکیم میں تخلیق آدم کے واقعے میں بیان کی ہے۔اس کے

برعکس مغرب نے انسان کو جوعلم الانسان دیا ہے وہ خرافات کا پلندہ نظر آتا ہے۔مغربی اہل دانش کے علم کی بنیاد قیاس پہ رکھی ہے جس کو وہ کھنڈرات سے برآمد ہونے والی اشیاء زمین کی تہوں سے نکلنے والی کھوپڑیوں اور ٹوٹے پھوٹے برتنوں سے اخذ کرتا ہے۔آج کے ماہرین عمرانیات اپنا سارا فلسفہ انھی قیاس آرائیوں سے مرتب کرتے ہیں۔ان کی تحقیق کا حال یہ ہے کہ قدیم ٹیلوں کی کھدائی سے برآمد ہونے والی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا جوڑ بعض اوقات اس طریقے سے ملاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹڈے کی ٹانگ کے ساتھ ہاتھی کا سونڈ جوڑ دیا گیا ہے اپنی انھی تحقیقات کے نتیجے میں وہ اپنی مختلف النوع رائے قائم کرتے ہیں کہ انسان نے مذہب کا آغاز یوں کیا یا تہذیب وتمدن نے ایسے ترقی کی ،انسان کی معاشرت اور معیشت نے اپنے ارتقائی مراحل یوں اور یوں طے کیے۔قرآن نے انسان کو جوعلم الانسان عطا کیا ہے اس کے بارے میں مستشرقین نے اپنے بغض کا اظہار کیا ہے اور اس پہ شک وارد کیا ہے کہ ہمیں کیا معلوم کہ اللہ نے کب اور کیسے انسان اور فرشتوں کے باہمی معاملات کو طے کیا۔

ہر چند کہ اس نوع کی اکثر معلومات خود ان کی اپنی کتابوں میں بھی موجود ہیں حقیقت یہ ہے کہ بات کو سمجھنے کے لیے مذہب اور فلسفے کے راستوں کے مابین بنیادی فرق کو جاننا بہت ضروری ہے۔اس لیے کہ حقائق تک پہنچنے کے یہ دونوں راستے اپنی نوعی صورت کے لحاظ سے کافی فاصلے پر کھڑے ہیں۔فلسفے کے راستے میں ہر قدم پہ عقل کی راہنمائی میں چلنا پڑتا ہے اور ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کے ثابت کرنی پڑتی ہے،اگر کوئی مقدمہ بھی ثابت ہونے سے رہ گیا تو ساری زنجیر ٹوٹ کے بکھر جاتی ہے۔جب کہ اس کے برعکس مذہب میں ہر بات ایک خاص یقینی معیار کے مطابق بیان کی جاتی ہے جس میں کسی قسم کا جھول نہیں پایا جاتا جس کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہوتا کہ چونکہ بات کہنے والا خود کائنات کا خالق ہے وہ آگے پیچھے اور ماضی حال سے پوری طرح واقف ہے چنانچہ صرف وہی ذات ہے جو انسان کی راہنمائی اصل حقائق تک کرنے کے قابل ہے اس لیے اس کی بات تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔بعض اوقات اللہ ہمیں اپنی ایسی باتیں بھی بتاتا ہے جن کے متعلق انسان عقلی دلائل تو آسانی سے بہم نہیں پہنچا سکتا تاہم اس کا دل اور ضمیر گواہی دیتے ہیں کہ اللہ ٹھیک کہتا ہے اس نوع کے اکثر واقعات میں کوئی چیز بھی خلافِ عقل نہیں ہوتی۔بلکہ ذرا سے تفکر کی ضرورت ہوتی ہے تاہم انسان اکثر و بیشتر اس بات پہ مطمئن ہی رہتا ہے کہ قرآن کی بہت سی باتیں اس دنیا میں نہیں سمجھیں جا سکتیں۔مثال کے طور پہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے تو انسان اس کو ماننے پر تو مجبور ہے مگر اس کی

ذات کیا ہے وہ کس شکل کا ہے وہ کن چیزوں سے بنا ہے اور کس طریقے سے وہ کائنات کے تمام بھیدوں کو بیک وقت جانتا ہے یہ سب باتیں اس دنیا میں سمجھ نہیں آسکتیں۔اسی طرح تخلیق آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض ایسے حقائق بیان کئے ہیں جن کی عقلی توجیہ تو ممکن نہیں مگر اصولاً اس سے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ہم عقلاً اس بات کا انکار نہیں کرسکتے کہ واقعہ یوں ہی پیش آیا ہو کیونکہ یہ تفصیلات جاننے کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ موجود ہی نہیں اور اس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہو جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے۔غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ انسان میں جو قابلیت ہے جو ذہانت ہے، جو حوصلہ ہے، جو کارنامے ہیں اور اس کائنات میں اس کا جو مقام اور مرتبہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی فلسفہ اس بات سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا کہ انسان ہی اس کائنات کا حقیقی وارث ہے اور وہی اللہ کا حقیقی نائب ہے۔آخر انسان کے اندر یہ قوامیت کے حوصلے اور کائنات کی ہر چیز کو مسخر کر لینے کے ولولے ہر چیز کو ایک نظم خاص کے تحت لانے کے منصوبے آخر کس چیز کا نتیجہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس بات کا کہ انسان کو کائنات میں خاص مقام حاصل ہے اور یہ کہ انسان کو اس کا شعور بھی حاصل ہے اس لیے اگر انسان کو قرآن اللہ کا خلیفہ بتاتا ہے تو انسان کو اس پہ کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔انسان کو اللہ نے کائنات میں اپنا خلیفہ بنایا تو یقیناً اس خلافت کی کچھ خصوصیات اور تقاضے بھی ہوں گے جن سے واقفیت ہی انسان کو کائنات میں اس کے حقیقی مقام کا درست ادراک فراہم کرسکتی ہیں۔اس ضمن میں جو سوال سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب خالق کائنات کی ذات ایسی عظیم اور ارفع خصائص سے مزین ہے جس میں وہ ہر جگہ حاضر ہے اس کو نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ جو حیی و قیوم ہے اور اس پوری کائنات کو چلانے میں اسے ذرا بھی دشواری کا سامنا نہیں ہے تو اس کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی کسی مخلوق کو زمین پہ اپنا نائب مقرر کرے۔ظاہر ہے کہ خلافت کے اس منصب کا ایک ہی طریق باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پہ بھیجنے سے قبل آزادی واختیار کی جو خصوصیات عطا کیں اس کو دراصل انسان کا امتحان مقصود تھا کہ وہ دیکھے کہ انسان اس دنیا کا نظام کس طریقے سے چلاتا ہے وہ اپنی زندگی کو خدا کے تابع ہو کر گذارتا ہے اور خدا کی مرضی کو پہچانتا ہے یا خدا کا باغی بن کے سامنے آتا ہے۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کے خلیفہ ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو اختیار اور عمل کی آزادی حاصل ہو کیونکہ اس کو مجبورِ محض بنا کر اس پہ خلافت کی ذمہ داریاں نہیں ڈالی جاسکتیں تھیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان کی یہ خصوصیت نمایاں کی ہے

کہ اسے اختیار اور ارادہ کی پوری آزادی میسر ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن نے انسان کے بارِ امانت سے تعبیر کیا ہے قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ؛

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُO

القرآن الحکیم (سورۃ الاحزاب ۳۳-۷۲)

ترجمہ؛

''اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے مگر انسان نے اس کو اٹھالیا''۔

❑❑❑❑❑❑❑

یعنی اللہ پاک دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمین و آسمان میں یہ صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ اس امانت کا بوجھ اٹھا سکتے اور اللہ کی کرڑوں مخلوقات میں سے اکیلا انسان ہی تھا جو اس بارِ امانت کا اہل تھا۔ چنانچہ یہ بارِ امانت اسی کے سپرد کیا گیا۔ یاد رہے کہ انسان کا اختیار بہر حال مطلق نہیں ہوسکتا بلکہ ایک محدود اختیار ہوگا کہ خلیفہ کے اختیارات آقا کی مرضی کے تابع ہی ہوسکتے ہیں اور انھی چیزوں میں ہوسکتے ہیں جن کے بارے میں وہ آقا کے سامنے جواب دہ ہو۔ جن چیزوں میں انسان کے آقا نے اسے جواب دہ نہ سمجھا ہو اس معاملے میں اس کو اختیار دینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ کسی انسان سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم فلاں خاندان میں کیوں پیدا ہوئے، تمہارا قد چھوٹا کیوں ہے، یا تم غریب کیوں ہو۔ البتہ انسان سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ تم نے نیکی کے بجائے بدی کی راہ کیوں اختیار کی، تم نے جھوٹ کے بجائے سچ کو ترجیح کیوں نہ دی، کیونکہ یہ سب تو تیرے دائرہ اختیار میں تھا اور یہی انسان کا اصل امتحان ہے۔ انسان کے اس اختیار کے متعلق یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے استعمال میں انسان مکمل طور پہ آزاد نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات کسی ایسے کام کا حکم دے جو نیکی کا ہے مگر وہ اسے اپنی حکمت کے تحت اس سے روک دے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسے کام کی ڈھیل دے جو بدی کا ہو۔ اگر خدا نے کسی مصلحت کے تحت کسی کو کسی نیکی سے

روکا ہوتو اس کا اجر بہر حال محفوظ رہے گا گویا ثابت ہوا کہ مطلق اختیار صرف اللہ کو ہے انسان کا اختیار ایک خاص دائرے میں مقید ہے۔منصبِ خلافت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انسان کو کائنات کی تمام مخلوقات پر شرف بخشا گیا۔اسی لیے اس کو قرآن میں اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۝

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔۷۰)

ترجمہ؛

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری میں دونوں میں اس کو سواری عطا کی اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پہ واضح فضیلت عطا کی''۔

❑❑❑❑❑❑❑

چنانچہ خدا کے نائب اور خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے کائنات کے جس حصے میں خالق نے اپنا نائب مقرر کیا ہے اس میں وہ اشرف اور تمام دیگر مخلوقات سے افضل ہو۔اگر چہ انسان اپنی ظاہری حالت میں بھی بہر حال گھوڑوں گدھوں اور دوسرے جانوروں میں شامل نہیں ہے اور نہ ہی وہ ایک ترقی یافتہ بندر ہے۔وہ تمام اشیاء اور حیوانات پر واضح فضیلت رکھتا ہے اور اس کے خالق نے اس کو جو عزت بخشی ہے انسان کو اس کا بھر پور ادراک حاصل ہے۔اگر چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگ جانوروں کی پوجا کرتے ہیں تو یہ محض ان کی عقل کا فتور ہے۔یہ لوگ احمق ہیں اور سفاہت میں مبتلا ہیں اس سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی نفی نہیں ہوتی بلکہ انسان کے اس عمل سے صرف یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا صحیح فائدہ نہیں اٹھایا۔

اس لیے ہمارے نزدیک یہ تصور بھی قابل اعتناء نہیں کہ انسان حیوانات میں سے ایک حیوان ہے۔حیوان تو وہ ہے مگر حیوانِ ناطق ہے اور یہی چیز کائنات میں اس کا درجہ دوسری تمام مخلوقات سے بلند کر دیتی ہے۔منصبِ خلافت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ نے اپنے نائب کی راہنمائی کا قابل ذکر اہتمام کیا ہے۔اس نے

انسان کو عقل فطرت اور وحی الٰہی کی سہ گانہ راہنمائی سے نوازا ہے اس لیے کہ انسان اپنی خلافت کے فرائض درست طور پہ اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب اسے اپنے خدا کی مرضی کا پورا علم حاصل ہو۔ چنانچہ اللہ نے انسان کے لیے علم کا اہتمام کیا، علماء نے اس کے تین درجے بیان کیے ہیں۔

یعنی وجدانی علم، عقلی علم اور شرعی علم، علم کا اصل ابتدائی اور ہمہ گیر ذریعہ وجدان ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ علم انسان کے اندر موجود ہے مگر وہ اسے بھولا ہوا ہے جو تجربہ مشاہدہ غور وفکر واقعات اور حوادث سے اسے یاد آتا رہتا ہے۔ اسلوبِ سقراط میں علم کے اسی طریق کو ذریعہ بنایا گیا ہے کہ سوال و جواب کا تسلسل وجدانِ علم کو ابھارنے کا موجب بنتا ہے۔ چونکہ سارا علمی خزانہ انسان کے بطون میں دفن ہے اس لیے انسان اپنی جہد وسعی سے اس کا سراغ لگا سکتا ہے۔ یہ جو کچھ انسان کے علم وافکار ہیں یا سائنس ہے حقیقت میں یہ تمام تر انسان کی فطرت میں ہی پوشیدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ریاضی کے سارے اصول اگر انسان کے اندر نہیں ہیں تو اس نے کہاں سے لیے ہیں کیونکہ علم کا نشان یا تو خالق کے ہاں ملتا ہے یا پھر اس کی مخلوق کے ہاں۔ اب خالق کا علم تو خارج از بحث ہے اس لیے کہ وہ تمام علوم کا منبع ہے اور اس کی مخلوق میں علم صرف انسان کو عطا کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ باقی مخلوقات کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ ان کو ارادہ اور اختیار کی آزادہ ہی حاصل نہیں۔

وہ فطرت کی طرف متعین کیے گئے مخصوص قوانین کے تحت ہی اپنی زندگیاں بسر کرتے ہیں اس لیے ضروری تھا کہ اللہ پاک اپنا علم اپنی اس مخلوق کو منتقل کرتا جس کا امتحان مقصود تھا۔ وجدان کے بعد عقل ہے جو ہر وقت اور ہر معاملہ میں انسان کی راہنمائی کے لیے تیار رہتی ہے۔ جزئیات سے کلیات بناتی ہے، زمین اور آسمان کے طول وعرض کو ناپتی ہے، سائنس اور فلسفہ کو ایجاد کرتی ہے اور اگر کسی معاملے میں اشتباہ پیدا ہو جائے تو عقل اپنے مختلف اصولوں پہ پرکھ کے بتاتی ہے کہ انسان کے وجدان نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ عقل اگرچہ بہت دور تک مار کرتی ہے مگر اس میں غلطی کے امکانات بہرحال موجود ہیں۔ اس لیے کہ اس کی حدود بھی متعین ہیں اور وہ جب بھی اپنی حدود کو پھلانگے گی تو غلطی کرے گی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نائب کی اعلیٰ پیمانے پہ راہنمائی کا کوئی اور اہتمام بھی کرے۔ چنانچہ اس ضمن میں خالق کا سب سے بڑا احسان انسان پر یہ ہے کہ اس نے اپنے خلیفہ کی راہنمائی اپنے خاص علم سے کی جس کو علم وحی کہا جاتا ہے۔ اللہ نے اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے اپنے اس علم کو حضرت انسان پر اتارا تا کہ اسے فریضہ خلافت کی احسن ذمہ داریوں کو پورا

کرنے میں جو مشکلات حائل ہیں وہ دور ہو جائیں اور انسان اپنے لیے زندگی گذارنے کا وہ طریق اختیار کرے جو خالق کی مرضی سے مطابقت رکھتا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اصل حقائق سے خود آگاہ فرماتا ہے ان کو اپنے احکام و قوانین فراہم کرتا ہے تا کہ وہ زمین کا انتظام اس کی ہدایات کی روشنی میں کرے۔ انبیاء علیہ السلام صدیوں اللہ کے اس خاص علم کو انسان تک منتقل کرنے کا فریضہ ادا کرتے رہے ہیں۔ اس ذریعہ علم میں جو خاص بات اس علم کو دوسرے ذرائع علم سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس ذریعہ علم میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ چنانچہ انسانی علوم کے تمام اجزاء میں کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر کہیں ناموافقت در آئے گی تو ترجیح کے لیے پیمانہ درکار ہوگا یعنی علم وحی کو دوسرے ذرائع علم پر جو فوقیت حاصل ہے اس کا تقاضا ہے کہ اختلافی صورت میں علم وحی ہی کو حرفِ آخر تصور کیا جائے۔ کیونکہ اسی طریق علم کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے اس لیے بھی کہ آخری اور ہر لحاظ سے تسلی بخش اور محفوظ علم کے طور پہ صرف قرآن ہی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید ان تینوں ذرائع علم کے خزائن پیش کرتا ہے اور حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔ صحیح اور غلط کی نشاندہی کرتا ہے معروف اور منکر میں امتیاز کے ضابطے بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لیے جو اہتمام کیا ہے اسی کی بدولت اللہ نے فرشتوں کو کہا تھا کہ تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں کیونکہ جب میں اپنے بندوں کی راہنمائی کروں گا تو وہ میری ہدایات کی پیروی کرے گا اسی لیے جب حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا گیا تو ساتھ یہ پیغام بھی دے دیا کہ:

فَمَن تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ ۲ ۔ ۸۳)

ترجمہ؛

''تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

□□□□□□□

یعنی وہ لوگ جو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت زندگی بسر کریں گے وہ شیطان کے فتنوں سے محفوظ

رہیں گے اور وہ ان کو گمراہ کرنے کے لیے جتنے بھی وسوسے پیدا کرے گا یا جتنے بھی فتنے اٹھائے گا اللہ اس کو محفوظ رکھے گا۔ اسی تناظر میں اللہ نے انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ قرآن نے انسان کو بتایا کہ تمام کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے یعنی کائنات کے سب مظاہر انسان کی خدمت پر معمور ہیں اور یہ سورج، چاند، ستارے، حیوانات، نباتات اور جمادات سب کو انسان کی فلاح اور آسانی فراہم کرنے کا فرض سونپا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہی ہے انسان چونکہ زمین پہ اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے تو اسے کائنات کی اشیاء پر کسی درجے میں تصرف کا اختیار ہونا چاہیے اور کائنات کی یہ ساری سازگاری اس لیے ہے کہ انسان اس کی تسخیر کی طرف مائل ہو اور اپنے خالق کا حقیقی ادراک حاصل کر سکے۔ میرے نزدیک انسانوں کا کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں کو سر کرنا کسی جنون کی وجہ نہیں بلکہ یہ بھی منصبِ خلافت ہی کا اقتضاء ہے کہ انسان جب پوری کائنات میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے تو اس کا گوشہ گوشہ ٹٹولنا اس کی بلندیوں کو سر کرنا، اس کے نشیب و فراز کو جانچنا، سمندروں کی تہوں میں اترنا اور ہر چیز کی ماہیت، کیفیت اور افادیت کو معلوم کرنا بھی تو منصبِ خلافت ہی کی ذمہ داری ہے کیونکہ اگر انسان زمین کی پہنائیوں میں پوشیدہ خزائن تک نہ پہنچتا تو آج جو مادی اور معاشی ترقی نظر آتی ہے اس کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ چنانچہ انسان کا پست حوصلہ اور گوشہ نشین ہونا اور ایک عضو معطل بن کے رہ جانے کو کسی بھی مذہب اور اخلاقی معیار نے پسند نہیں کیا اور اگر انسان راہبانیت اختیار کر لے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ کسی مانع سبب سے شعورِ خلافت سے عاری ہو گیا ورنہ انسان کے حوصلے اور اس کی قوامیت اس کی خلافت کا لازمی تقاضا ہیں۔

تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ بعض فلسفیوں کا یہ خیال درست نہیں کہ یہ کائنات انسان کے ہاتھ میں مسخر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے اسے انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور اسے مسخر کر کے انسان کی خدمت پہ لگایا ہے۔ اس لیے انسان کا کائنات میں تصرف بھی متعین حدود میں رہا ہوگا۔ چنانچہ جب اللہ نے انسان کو منصب خلافت بخش دیا تو اس کے کچھ لازمی تقاضے بھی ہیں جن پہ عمل کر کے انسان اپنے فرائض کو احسن طریقے سے ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ منصبِ خلافت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے لیے ایک دائرہ عمل فراہم کرے اور اسی دائرہ عمل میں انسان کا امتحان مقصود ہے اس لیے نبی اکرم محمد صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب ۵)

یعنی تم میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی ذمہ داری سونپی گئی اور وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں اللہ کے آگے جواب دہ ہے۔

❑❑❑❑❑❑❑

انسان چونکہ اللہ کا خلیفہ ہے اس لیے وہ شتر بے مہار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی باگ ہمیشہ کے لیے آزاد نہیں چھوڑی جائے گی بلکہ ایک دن وہ اپنے خالق کے سامنے جوابدہی کے لیے پیش ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قیامت کا واقع ہونا لازم ہے کہ اگر انسان نے اپنی خلافت کی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کی ہیں تو اس کو انعام سے نوازا جا سکے دوسری صورت میں اس کو سزا دی جا سکے۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان مدنیت اور اجتماعیت کا شعور بھی حاصل کرے کیونکہ اس نے ایک ایسا سماج وضع کرنا ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے اس لیے انسان کو مدنیت اور سیاسیات کے میدان میں بھی جدوجہد کرنی چاہیے کیونکہ مدنیت اور سیاست کوئی مصنوعی چیزیں نہیں ہیں جن سے گریز کیا جائے بلکہ یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں اور فطری حقیقتیں ہیں۔ اس لیے کہ خلافت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کو اس کائنات میں ایک خاص دائرے میں اختیار ملے گا جس کو استعمال کر کے اس نے دنیا کا نظم و نسق چلانا ہوگا اور تمام امر و نہی اسی کے اختیار میں ہوگا تو یہ تمام چیزیں سیاسی اقتدار اور سیاسی اداروں کو مستلزم ہیں، چنانچہ خلافت کے سیاسی نظام کے متعلق بھی چند باتیں بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں کہ اس میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوگی اور اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہیں ہو سکتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا منصبِ خلافت پہ فائز ہونا اس کا ذاتی عمل نہیں ہے بلکہ زمین پہ اس کو جو اختیار حاصل ہے وہ اللہ ہی کا تفویض کردہ ہے یعنی انسان کو خود سے کوئی اختیار حاصل نہیں بلکہ اس کو تفویض (Delegated Powers) کیا گیا ہے اور خود خلافت کے معنی ہی میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں ایک بالاتر ہستی کی نیابت کی جائے گی۔ لہٰذا آپ اللہ کی حاکمیت کے تحت اس کی مقررہ حدود (Four

(Corners) کے اندر اپنے اختیار استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ انسان ان حدود کے باہر نہیں جا سکتا کیونکہ اگر انسان ان حدود کو نظر انداز کرے گا تو اسے باغی کہا جائے گا اور یہی نقطہ نظر زمین پہ فساد کا باعث ہے۔ اس لحاظ سے ان حدود کے اندر جو ضابطے اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے ہیں انھی میں رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کو استعمال کرے گا۔ اسے جو اختیار (Mandate) ملا اسی کے مطابق اسے کام کرنا ہوگا وہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خلافت کا منصب تمام بنی آدم کو حاصل ہے اس لیے اس استحقاق میں تمام بنی آدم مساوی درجہ رکھتے ہیں اور اس درجے کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے میں سب انسان برابر ہوں اور کسی ذات یا خاندان یا خاص علاقے کے لوگوں کو کسی خاص علاقے کے لوگوں پر کوئی ترجیح حاصل نہ ہوگی۔ ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوگا دوسرے لفظوں میں عقائد صفات اعمال کردار کی بنا پر فرق کرنا ہوگا نا کہ ذات پات، حسب نسب، خاندان وطن زبان ثقافت کو فارق جانا جائے گا۔ اس لیے ان بنیادوں پر جو ریاست بنے گی وہ نسلی یا قومی ریاست نہیں ہوگی بلکہ اپنے مزاج کے لحاظ سے وہ ایک جہانی ریاست ہوگی جس کو وطن پہاڑ دریا اور سمندر تقسیم نہیں کر سکیں گے اور اگر اس جہانی ریاست کے قیام میں کچھ رکاوٹیں ہیں تو ان کو غیر فطری رکاوٹیں قرار دیا جائے گا اور ان رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہوگی۔ چنانچہ خلافت ارضی کے حق دار بلقوۃ تو تمام انسان ہیں مگر اس کے اصل حق دار وہ لوگ ہیں جو اس زمین کا نظم ونسق خدا کے احکامات کے مطابق چلائیں گے اس لیے کہ جو لوگ خدا کی منشا کے خلاف چلیں گے تو وہ اس زمین کے باغی اور مفسد کہلائیں گے۔

قرآن میں اللہ نے اس امر کو کھول کے بیان کر دیا ہے۔ انسان اور کائنات میں باہمی ربط بھی بیان کر دیا ہے مگر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں بھی اس تصور کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے دو غلاموں کی تمثیل کے ذریعہ یہی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ باغ ان غلاموں کے سپرد نہیں کیا جاتا جو اس کو اجاڑ دیں بلکہ یہ انھی غلاموں کے سپرد ہونا چاہیے جو اس کو آراستہ و پیراستہ کریں اس لیے اس تمثیل کا مفہوم یہی ہے کہ باغ کی نگرانی کے حق دار بلقوہ تو سب لوگ ہیں لیکن بلا استحقاق صرف وہی لوگ ہوں گے جو باغ میں مالک کی منشا کو پورا کریں گے اور خلافت انھی لوگوں کا حق ہوگی جو زمین میں خدا کی منشا پوری کریں مگر افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج کا مسلمان اپنے منصب سے لاپرواہی کا مرتکب ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ خلافت اس کے ہاتھ سے نکل گئی اور جب تک وہ زمین میں خالق کی منشا پوری کرنے کا علم

نہیں اٹھاتا اس وقت تک امت کی زبوں حالی ختم نہیں ہوسکتی اللہ ہم پہ اپنا رحم فرمائے۔

انسان خدا اور سائنس

سائنسی تحقیق کا کام جب مسلم اسپین سے نکل کر اٹلی فرانس اور برطانیہ پہنچا تو وہاں سائنس کے لیے ماحول سازگار نہ تھا۔اس لیے جلد ہی مسیحی چرچ سائنس کی اس ترقی کی راہ میں حائل ہو گیا کہ مسیحیت جب شام اور فلسطین سے نکل کر یورپ میں داخل ہوئی تو اس کا سامنا ارسطو کے افکار سے تھا جو بام مقبولیت پر تھے۔ چرچ نے اپنی تاریخی روایات کو برقرار رکھا اور ارسطو کے افکار کا مقابلہ کرنے کی بجائے اس سے مفاہمت کی راہ اپنائی۔خود اپنے علم کلام کو افکارِ ارسطو کے مطابق ڈھال لیا حتیٰ کہ سو سال کے اندر ہی افکارِ ارسطو ان کے ہاں مقدس بن گئے۔مگر دو صدیاں مزید گذرنے پر جب سائنسی علوم کو کچھ ترقی حاصل ہوئی تو زمانے نے جانا کہ ارسطو کے افکار تو محض قیاسی اور بے بنیاد تھے اور ان کا حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا تو اب چرچ نے محسوس کیا کہ اگر سائنس کی اس نئی روشنی کا راستہ نہ روکا گیا تو خود ان کا سارا دین مشکوک ہو جائے گا اس لیے اس نے اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا کہ اس زمانہ میں مسیحی چرچ کو یورپ میں زبردست غلبہ اور اقتدار حاصل تھا۔چنانچہ اس نے طاقت سے جدید سائنس کے نظریات کا راستہ روکنے

کی کوشش کی اور بھیانک مظالم کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی زد میں بہت سے نابغہ روزگار شخص بھی آ گئے۔ مسیحی چرچ نے اول اول اہل علم وحرفت کے خلاف بے دینی کے فتوے جاری کیے مگر جب اس سے لوگوں کی زبانیں بند نہ ہوئیں تو پوپ کے خاص حکم سے احتساب کی خصوصی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔مورخین بتاتے ہیں اس دور میں تین لاکھ آدمیوں کو مسیحی احتساب کی اس عدالت میں کھڑا ہونا پڑا۔بہت سے لوگوں کو سخت اور بدترین سزاؤں سے گزارا گیا اور تقریباً تیس ہزار صاحب علم افراد کو مسیحی چرچ کے حکم سے زندہ جلا دیا گیا جن میں گلیلیو اور برونو جیسے قدآور سائنس دان بھی شامل تھے۔جس کے نتیجے میں چرچ اور سائنس کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی جو بالآخر علم اور مذہب کی جنگ بن گئی۔ارسطو کے مفروضہ مقدس عقائد پر بے جا اصرار کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ علم اور مذہب ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک کی ترقی دوسرے کی موت کا حکم رکھتی ہے۔قرآن نے کہا کہ علم اللہ سے قریب کرنے والی چیز ہے مگر مسیحی تحریفات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم لوگوں کو اللہ سے دور کرنے والا بن گیا۔علم اور مذہب کا یہ تصادم دوسو برس سے زائد تک جاری رہا یہاں تک کہ علم کے ایک اور راہی (Sir Charles Darwan) نے چرچ کے جبر کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''Origin of Species'' شائع کی۔

یہ کتاب ۱۸۸۹ء کو منظر عام پر آئی جس نے علمی افق پہ ایک تہلکہ مچا دیا مگر چرچ نے حسب توقع ایک طوفانِ بدتمیزی بپا کر دیا اور اس کتاب کی شدید مخالفت شروع کر دی مگر اب چرچ کا زور قدرے ٹوٹ چکا تھا اور لوگ بہ سہولت نئے علمی نظریات قبول کر رہے تھے۔چنانچہ علم اور مذہب کے مابین اس طویل معرکہ کو ختم کرنے کے لیے نئی راہیں کھوجنے کی کوشش کی گئی جنھیں بالآخر تلاش کر لیا گیا۔اب علم اور مذہب یا یوں کہیے کہ سائنس اور مذہب کو جدا کر دیا گیا اور ان دونوں کے لیے الگ الگ دائرہ عمل متعین کر دیا گیا۔چرچ اور اہل علم کے درمیان ہونے والے اس سمجھوتے کو سیکولرازم (Secularism) کا معروف نام دیا گیا جس کا اطلاق بعد میں ہر اس نظام فکر پہ کیا جانے لگا جو مذہب بیزار ہو۔اس سیکولر تقسیم نے مذہب کو شخصی دائرے تک محدود کر دیا اور مسیحیت سے اجتماعیت کا خاتمہ ہو گیا۔اس سمجھوتے کے تحت مذہب کو تو ایک دائرے میں مقید کر دیا گیا اور بقیہ تمام شعبوں میں انسانی آزادی کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جو چاہے کرے مگر علم چونکہ حدود قیود سے آزاد ہے اس لیے اہل مغرب کے ہاں علم یعنی مادی سائنس دستیاب وسائل میں فراوانی کے باعث منزلوں پہ منزلیں مارتی رہی مگر مذہب اور بھی سمٹ کر رہ گیا کہ اس سیکولر سمجھوتے میں بھی ڈنڈی ماری گئی اور

سائنس کو پھیلنے کے وسیع مواقع عطا کیے گئے۔ جب کہ مذہب کو شخصی طبع کے رحم وکرم پہ چھوڑ دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم اور مذہب کی یہ علیحدگی زندگی اور مذہب کی علیحدگی بن کے رہ گئی جس کا چرچ بھی بڑی حد تک ذمہ دار تھا کہ اس نے جن غیر آسمانی افکار ونظریات کو غلطی سے گلے لگا لیا تھا سائنس کی جدید روشنی میں بھی وہ ان کو اپنے مذہب سے خارج کرنے پر تیار نہ ہوا جس کا منطقی انجام یہ تھا کہ مذہب شخصی دائرے سے بھی نکل گیا۔

آج کا امریکی یا برطانوی شہری اگر چہ خود کو مسیحی کہتا ہے مگر جب اس سے یہ سوال کیا جائے کہ مسیحیت کیا ہے تو اس کا مذہب ختم ہو جاتا ہے اور عملاً وہ ایک سیکولر زندگی گذار رہا ہے۔ مذہب اس کے دائرہ ترجیحات میں دور دور تک کوئی مقام نہیں رکھتا جب چرچ نے اپنے مذہب سے ساری معنویت کھرچ ڈالی تو کوئی بھی سوچنے سمجھنے والی مخلوق اس کو اپنی زندگی کا لازمی جز کیوں کر بنائے گی یہی وجہ ہے مذہب اہل مغرب کے ہاں اب ایک رسمی ضمیمہ بن کے رہ گیا ہے جس نے انھیں اس احساس سے دوچار کیا جس کو آج کا مغربی دانشور بھی روحانی تشنگی قرار دے رہا ہے۔ چنانچہ جسم وروح کی علیحدگی اور اس سے اگلے مرحلے میں خالق سے بے رخی کے نتیجہ میں تاریخ عالم میں پہلی بار انسانیت کے سامنے یہ مسئلہ پیش آیا کہ سامانِ حیات کی افراط کے درمیان بھی انسان احساسِ محرومی سے دوچار ہو سکتا ہے۔ آج انسان کی صورت میں ہمارے سامنے ایک ایسا وجود ہے جس کو اگر چہ سائنس اور مادیت نے سر سے لے کر پاؤں تک سامانِ تعیش سے لاد دیا ہے مگر سائنس اس کے چہرے پر حقیقی خوشی کا کوئی عکس مہیا نہ کر سکی جس کا اعتراف عہدِ حاضر کے سب سے بڑے فلسفی (Burtrand Russall) نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ اس نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب (The Conquest of Happiness) کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے:

> ”جانور اس وقت تک خوش رہتے ہیں جب تک ان کو خوراک ملتی رہے اور وہ صحت مند ہوں انسان کو بھی ایسے ہی ہونا چاہیے مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ آج کا پورا مغربی معاشرہ بظاہر صحت مند بھی ہے اور اسے خوراک کی فراوانی بھی ہے مگر اس کے باوجود وہ خوش نہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جدید تہذیب نے اپنی عظیم کامیابیوں کے باوجود انسان کو اس کی طلب کا صرف ”نصف حصہ“ فراہم کیا ہے اس نے جسم کے تمام تقاضے تو فراہم کر دیئے مگر انسانی

روح کے تقاضے کونظرانداز کرگئی جس نے اس مہیب خلا کو جنم دیا جو آج کی یاسیت کھلایا اور تشنگی کے نجانے کتنے روپ ہیں جن کو ہم پہچانتے تک نہیں مگر وہ اندر ہی اندر ہم کو احساس کے اس کنارے تک لے جاتے ہیں جہاں سکون اطمینان اور طمانیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور انسان ازلی بے چینی کا شکار بن کے رہ جاتا ہے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

حقیقت یہ ہے انسان اپنی زندگی میں معنویت چاہتا ہے اس کے تقاضے جانوروں سے بہت مختلف ہیں کہ جانور کو جبلت عطا کی گئی مگر انسان کو عقل جس کے تقاضے جبلت سے بہت دور اور بہت سخت ہیں۔انسان زندگی چاہتا ہے مگر جدید تہذیب اس کو انسان کی صورت اسٹیچو فراہم کرتی ہے۔انسان قلب ودماغ کی تسکین چاہتا ہے مگر جدید تہذیب اس کو مشین کی بے روح گاڑی میں بٹھا کر چھوڑ دیتی ہے۔انسان خالق کائنات سے ملنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو مخلوق تک پہنچا کر اپنی سواری سے اتار دیتی ہے۔انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے محسن کو سجدہ کرے مگر سائنس نے دنیا کی جو سیج سجائی ہے اس میں انسان کو کوئی اپنا محسن نظر ہی نہیں آتا۔حتیٰ کہ اپنے اندر کی آواز سے مجبور ہو کر وہ مفروضہ خداؤں کے آگے جھکنے لگتا ہے مگر اسے سکون کی کوئی ساعت میسر نہیں آتی کہ قرآن نے پندرہ صدیاں قبل کہہ دیا تھا کہ اللہ کے سوا دوسرے تمام معبود محض اسماء ہیں نہ کہ حقیقتیں:

مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّآ أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ اللّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّآ إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَـكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ O

القرآن الحکیم (سورۃ یوسف ۱۲ ۔ ۴۰)

ترجمہ:

''اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ تو محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے تھے مگر اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری کہ فرمانروائی اور اقتدار صرف اس کے لیے

ہےاس کاحکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور یہی سیدھا طریقہ ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

❑❑❑❑❑❑❑

چنانچہ آج تک کے انسانی علوم نے اب اس امر کو مستحکم کر دیا ہے کہ انسان کے لیے ایک برتر خدا کی ضرورت اتنی مسلّم ہے کہ وہ مفکرین بھی اب اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے ہیں جو اپنے ذوق کے مطابق خدا اور مذہب سے بے زار ہیں مثال کے طور پہ"رسل" کو ہی لے لیں تو اس نے اپنی آخری تحریروں میں لکھا ہے:

"اگر انسانی زندگی کو حقیقی معنوں میں زندگی بنانا ہے تو اس کے لیے کسی ایسے مقصد کا تعین از حد ضروری ہے جو خود انسانی زندگی سے باہر ہو، ایک ایسا مقصد جو غیر شخصی ہو عمومیت سے دور ہو اور انسانیت سے بلند تر ہو جیسے کہ "خدا، یا صداقت یا حسن یا عشق"۔

❑❑❑❑❑❑❑

یاد رہے کہ یہ ایک بہت بڑے منکر "رسل" کی زبان سے نکلے ہوئے وہ الفاظ ہیں جن میں اس نے خدا کی فطری ضرورت کا اقرار کیا ہے۔ دورِ جدید کے انسان کی محرومی یہ ہے کہ اس نے اپنے خدا کو کھو دیا ہے اور اب اس کی نجات صرف اس میں ہے کہ وہ دوبارہ اپنے خدا کو پا لے۔ علم الانسان کے ماہرین نے مختلف انسانی معاشروں کا مطالعہ کیا ہے اور کئی ہزار سال کے تاریخی ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے انسان کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا متفقہ بیان ہے کہ انسان کی فطرت میں خدا کا تصور پیوست (Interwoven) ہے جس طرح بکری سے گھاس اور شیر سے گوشت کھانے کی جبلت کو ختم نہیں کیا جا سکتا اسی طرح خدا کو انسانی فطرت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

مذہب اور سائنس

مذہب انسانی زندگی کا ایک تصور اور اس تصور کی بنا پر بننے والے اس ہمہ گیر طرزِ عمل کا نام ہے اور جو انسان سے اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے کچھ مطالبات اور تقاضے کرتا ہے۔ سائنس اس ''محسوس'' دنیا کے مطالعے کا نام ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ حقیقت میں مذہب اور سائنس کے درمیان کوئی تصادم نہیں اس لیے کہ مذہب فطرت ہے اور سائنس مطالعہ فطرت تو اس میں اختلاف کیسا۔ مگر اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ مذہب اور سائنس کے مابین اس مفروضہ تصادم کی ایک فضاء موجود رہی ہے اور کوئی نہ کوئی بنیاد ایسی ہے جس کی بازگشت گاہے بگاہے سنائی دیتی رہتی ہے۔ سائنس اور مذہب کا روائتی ٹکراؤ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب جدید سائنس کی بنیاد پڑی اور اس بنیاد پر بعض اہل فکر نے دعویٰ کیا کہ سائنس کی دریافتوں نے مذہب کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ اس فکر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب خدا کو ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ خدا کو ماننے کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ تصورِ خدا کے بغیر کائنات کی توجیہ ممکن نہ تھی، اب چونکہ جدید سائنس کی روشنی میں انسان مظاہرِ کائنات کی تشریح کرسکتا ہے اس لیے انسان کے لیے اب ضروری نہیں رہا کہ کسی خدا کے دامن سے ہی وابستہ رہے اس طرح خدا کا خیال ان کی نظر میں ایک بے ضرورت چیز بن گیا اور جو خیال بے ضرورت ہو جائے اس کا بے بنیاد ہونا بھی لازمی ٹھہرتا ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور ہے کہ جب یہ دعویٰ کیا گیا تھا اگرچہ اس وقت بھی اس کی کوئی علمی حیثیت نہ تھی مگر سائنس کی ترقی کے ساتھ اس دعویٰ کی لغویت خود ہی ثابت ہوگئی اور آج کی جدید سائنس نے خود براہ راست یا بالواسطہ اس بات کا اعتراف کررہی ہے کہ اس کے پاس تصورِ خدا کی نفی کے لیے نہ تو کل

تسلی بخش علمی دلائل موجود تھے اور نہ ہی آج کسی بنا پر کوئی حتمی فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سائنس کی وہ کون سی خاص دریافت تھی جس کے بعد انسان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب مزید اسے خدا کی ضرورت نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس کی وہ خاص کامیابی یہ تھی کہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ کائنات کچھ خاص قوانینِ فطرت کی تابع ہے۔ قدیم زمانے میں انسان سادہ طور پر صرف اتنا جانتا تھا کہ اس کی دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کے پیچھے کوئی طاقتور ہستی کارفرما ہے۔ اگرچہ اس طاقتور ہستی کا تصور انسانی ارتقاء کے ساتھ اپنی صورتیں بدلتا رہا ہے مگر یہ ایک برہنہ حقیقت ہے کہ انسان نے ہر دور میں اس طاقتور ہستی کو پوجا ہے اور تمام مظاہر کائنات کو اس کے دستِ قدرت کی چابکدستی قرار دیا ہے۔ مگر شعوری ارتقاء کے بعد جب انسان نے سائنس کے میدان میں قدم رکھا تو اس نے جانا کہ اس کے اردگرد وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعے کے پیچھے کوئی نہ کوئی سبب چھپا بیٹھا ہے جس کو سائنس کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے، تجربے اور مشاہدے کے ذریعے ہر سبب کے مسبب تک رسائی ممکن ہے۔

جیسا کہ نیوٹن کے مشاہدے نے اس پہ آگہی کے جو در وا کیے ان میں جھانک کر اس نے معلوم کر لیا کہ آسمان کے تمام ستارے اور سیارے کچھ ناقابل تغیر قوانین میں بندھے ہوئے ہیں اور انھی کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ ڈارون نے کتابِ فطرت کے اوراق الٹے تو اس نے جانا کہ انسان کسی خاص تخلیقی منصوبے کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ ابتدائی زمانے کے کیڑے مکوڑے عام مادی قوانین کے تحت ترقی کرتے کرتے انسان کی صورت میں ڈھل گئے۔ اسی طرح کئی دوسرے مفکرین نے یہ خیال پیش کیا کہ مطالعہ اور تجربہ بتاتا ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک پیش آنے والے سارے واقعات ایک معلوم نظام کے تحت ظاہر ہوتے نظر آتے ہیں جس کو قانونِ فطرت یا ''**Law of Nature**'' کہا جاتا ہے۔

قانون فطرت کا یہ عمل اس درجہ منظّم تھا کہ آنے والے وقت میں پیش آنے والے واقعات کی درست پیش گوئی ممکن ہو گئی تھی۔ چنانچہ قانونِ فطرت کی باریکیاں جاننے کے بعد انسان نے یہ خیال کیا کہ ماضی میں جن واقعات کو وہ خدا سے منسوب کرتا رہا ہے وہ دراصل کچھ مادی اور طبعیاتی قوانین کی کارفرمائیاں تھیں۔ اب اس نے پختہ طور پہ اس بات کا یقین کر لیا کہ کائنات کی ساری حرکتیں اور اس کے تمام مظاہر خواہ وہ ذی روح اشیا سے متعلق ہوں یا بے روح اشیا کے بارے میں ہوں ایک اندھے مادی عمل کے سوا کچھ نہیں۔ سائنس نے جس دنیا کو دریافت کیا اس میں کہیں خدا کی کارفرمائی نظر نہیں آتی جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔ اس لیے

اس دور کے فلاسفہ نے تکبر کی روش کو اپنایا اور نظم کائنات میں کسی خالق کے وجود کو خارج از امکان قرار دے دیا۔ اگرچہ ان دریافتوں کے حصول کے وقت اس کھیل کے تمام نامور کھلاڑی خدا کے ماننے والے تھے مگر پھر یہ ہوا کہ جب کائنات کے تمام واقعات کی توجیہ خود مادی دنیا کے اندر موجود اسباب وقوانین سے ممکن ہونے لگی تب انھیں کسی خدا کا وجود قطعاً غیر ضروری معلوم ہوا۔ پھر وہ اپنے اس خیال میں پختہ ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ ان کا علم ان کو اندھیری راہوں کی طرف دھکیلتا رہا۔ انھوں نے کہا کہ جب تک دوربین نہیں بنی تھی اور علم ریاضیات میں انسان نے ترقی نہیں کی تھی تو اس وقت کا انسان نہیں جانتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور کیسے ڈوبتا ہے۔

چنانچہ اس نے یہ فرض کرلیا تھا کہ کوئی خدائی طاقت ہے جو اس کے لیے دن اور رات کا سماں پیدا کررہی ہے مگر اب فلکیات کے علم نے وہ حجاب اٹھا دیئے ہیں اور انسان جانتا ہے کہ جذب وکشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج، چاند، ستارے سیارے اور زمین حرکت کررہی ہیں۔ یہ دن اور رات اسی حرکت کا منطقی نتیجہ ہیں اور اسی طرح وہ تمام چیزیں بھی ہیں جن کے بارے میں پہلے زمانوں میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ماورائی طاقت ہے۔ جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آئیں گویا واقعہ کے فطری سبب کو جان لینے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہوگئی جس کے لیے پچھلے لوگوں نے ایک خدا یا کسی مافوق الفطری ہستی یا قوت کا تصور اپنایا ہوا تھا۔ (Haskelly) کہتا ہے کہ اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کا انعطاف (Refraction) ہے تو پھر وہ قدیمی تصور کہ یہ آسمان پہ خدا کا نشان ہے کیسے قابل قبول رہ جاتا ہے۔ یعنی واقعات اگر فطری سبب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو پھر وہ کسی مافوق الفطری قوت کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوسکتے۔ ظاہر ہے کہ جب واقعات کے پیچھے مافوق الفطری اسباب موجود نہ ہوں تو کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے یہ اور کچھ اسی قسم کی اور دلیلیں اس صاحب عقل قافلے کا اثاثہ تھیں جنہوں نے ابتدا میں انسان کے لیے اس کے خالق کے وجود کو غیر ضروری قرار دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قدر بودی توجیحات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن لوگوں نے خالق کے وجود سے انکار کیا وہ بڑے ہی بد دماغ لوگ تھے۔ کیونکہ خالق کو کھوجنے کے لیے کائنات کی وسعتوں میں جانے کی ضرورت ہی نہ تھی وہ تو خود انسان کی ذات کے اندر ڈیرے جمائے بیٹھا ہے۔ اگر انسان اپنی ذات کے ان دریچوں میں ذرا دیر کے لیے جھانکنے کا تردد کرلیتا تو اس کے اندر تکبر کی یہ روش

اپنانے کی کبھی جرأت ہی پیدا نہ ہوتی کہ خالق کے وجود کی دلیلوں کو بیان کرنے کے لیے اگر زمین کے تمام درخت قلم بنا دیئے جائیں اور تمام سمندر سیاہی میں بدل جائیں تب بھی نہ خالق کی باتیں ختم ہوں گی اور نہ اس کی صفات۔ خود انسان کا وجود اس کا دل اور اس میں موجزن جذبات ہر آن اس سے کسی در پہ جھک جانے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ جب وہ رحم مادر میں تھا تب خالق کے احسان نے اس پہ تخلیق کے وہ تمام مراحل آسان کیے ورنہ انسان کی اوقات ہی کیا ہے اچھلتے ہوئے پانی کے چند قطرے جن کو عقل سے نوازا گیا تو وہ خود اپنے خالق کے گریبان کی طرف بڑھا ایک مغربی عیسائی دانشور نے کیا خوب بات کہی تھی کہ؛

Nature does not explain

She is Her self in need of an Explanation

کہ فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی بلکہ وہ تو خود اپنے لیے ایک توجیہ کی طالب ہے

اور

Nature is a fact Not an Explanation

(یعنی فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے اس کو کائنات کی توجیہ قرار نہیں دیا جا سکتا)

❑❑❑❑❑❑❑

دراصل مخالفین مذہب جس انکشاف کو فطرت کی توجیح کا نام دے رہے ہیں اور اس کو خدائی نظام کا بدل قرار دے کر اس کی ذات سے انکار پر مائل ہیں وہ تو خدا کے ان قوانین کے مطیع ہے۔ جس کے ذریعے خالق اپنی کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے جو ان ذہنوں نے پھیلائی ہے جو مذہب کی لگائی ہوئی اخلاقی پابندیوں سے چڑتے تھے اور ان کو اپنی ذات کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ محسوس ہوتی تھیں وہ مادر پدر آزاد زندگی گذارنا چاہتے تھے اور اس میں کسی اخلاقی قدر کو دخیل نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ دراصل وہ اپنے نفس کے ایسے بندے تھے جن کا وجود ہر دور میں موجود رہا ہے مگر ان کی آواز کبھی بھی حق کی آواز پہ غالب نہیں ہوئی مگر بدقسمتی سے ملحد پسندوں کو سائنس کے اس دور میں کچھ کامیابیاں حاصل ہوئیں جب دنیا کے لوگ کلیسا کے جبر سے ابھی نکلے ہی تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اپنے اندر کی خواہش کو سائنس کے نظریات کی صورت بیان کرنا

شروع کیا اور ایک تسلسل کے ساتھ مذہب کی اس عمارت کو منہدم کرنے میں مصروف ہو گئے جس کا وقار اہل کلیسا پہلے ہی گنوا چکے تھے۔ اس لیے عوامی سطح پر ان کو کسی خاص مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑا اگرچہ علمی سطح پر ان کے اس اقدام کی خوب مذمت ہوئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس لیے خدا کی نفی کا تصور ایک خاص ذہنیت کے حامل لوگوں کے دماغ کا گند تھا نہ کہ کوئی سائنسی اصطلاح۔

ان کی دلیل روزِ اول سے کمزور تھی جس کو کچھ ہی عرصے بعد ان کے ماعصر فلاسفہ اور اہل دانش نے رد کر دیا تھا۔ مثال کے طور پہ مذہبی لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سمندروں میں جوار بھاٹا لانے والا خدا ہے۔ اب جدید دور کا ایک ملحد اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے تجربے اور مشاہدے نے مجھے بتایا ہے کہ سمندروں میں اٹھنے والا جوار بھاٹا درحقیقت چاند کی کشش اور دنیا کے سمندروں اور خشکی کے ٹکروں کی جغرافیائی ہیت (Geograrhical Configuration) کے سبب ہوتا ہے تو سائنس دانوں کا یہ انکشاف قبول کر لینے میں مذہب پسندوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا اور نہ ہی یہ انکشاف ان کے عقیدے میں کسی تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے اس لیے کہ طوفان، قوت کشش اور زمین کی جغرافیائی بناوٹ کی وجہ سے ہونے والی کسی تبدیلی کا ان کے عقائد سے کیا تعلق وہ تو پہلے ہی جانتے ہیں کہ یہ طوفان یہ کشش ثقل، یہ زمین کی جغرافیائی بناوٹ خدا کی مخلوقات ہی ہیں اب اگر خدا ان قوتوں کے باہمی اتصال سے کوئی فعل انجام دیتا ہے تو دیتا رہے۔

وہ خالق ہے اُس کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کائنات میں چاہے جس طرح کا بھی تصرف کرے اب اگر کوئی ملحد کہے کہ نہیں یہ بات نہیں تو اس سے کہا جا سکتا ہے کہ پھر وہ اپنے ارادے سے کسی سمندر میں جوار بھاٹا لا کے دکھا دے۔ اس بے وقوف کو یہ نہیں پتہ اپنے علم سے اس نے جوار بھاٹا کی حقیقت کو جان کر خدا کو دریافت کیا ہے اب اگر کسی کا علم ہی کسی کے لیے حجاب بن جائے تو کوئی دوسرا کیا کر سکتا ہے حالانکہ اسی کا بڑا بھائی اسی کا ہم قبیلہ جان ولسن بھی اس کی عقل پہ ماتم کر رہا ہے اور اس کو حقیقت کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے جان ولسن اپنی کتاب (Philosophy and Religion) میں لکھتا ہے کہ:

This does,nt destroy my belif ;It is still Gog working through these things .who is

responsible for the tides.

''وہ خدا ہی ہے جو ان ذرائع سے کام لے کر اپنا فعل انجام دیتا ہے اور خدا آج بھی طوفان کا حقیقی سبب ہے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریہ ارتقاء کے حوالے سے یہ بات بار بار دھرائی جاتی ہے کہ حیاتیاتی عمل اب کسی ماورائے فطرت ذریعہ کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرتا۔ وسرے لفظوں میں زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے کسی باشعور خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جدید سائنس سے ثابت ہو رہا ہے کہ زندگی صرف چند مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے یعنی ان کے خیال میں تولد و تناسل کے ذریعے سے مزید زندگیوں کا پیدا ہونا اور پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فرقوں کا پشت ہا پشت ترقی کرنا اور ختم ہو جانا ہے۔اس طرح مخالفین مذہب کے نقطہ نظر میں ڈارون کے انتخاب طبیعی کے اصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشو ونما پر خدا کی کارفرمائی کے تصور کو ترک کر دیا جائے۔

اگرچہ ابھی تک بذات خود یہ بات بھی غیر ثابت شدہ ہے کہ انواع حیات فی الواقع اسی طرح وجود میں آئی ہیں جیسا کہ ارتقاء پسند علماء بتاتے ہیں۔تاہم اگر اس امر کو چند لمحوں کے لیے درست بھی تصور کر لیا جائے تو تب بھی اس سے مذہبی عقیدے کے تنزل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس لیے کہ انواعِ حیات اگر بالفرض ارتقائی عمل کے تحت ہی وجود میں آئی ہوں تب بھی یکساں درجہ کی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ خدائی تخلیق کا طریقہ کار ہے نہ کہ کسی اندھے مادی عمل کا خود بخود نتیجہ، حقیقت یہ ہے کہ مشینی ارتقاء کو نہایت آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (Creational Evolution) ثابت کیا جا سکتا ہے اور سائنس کی بیساکھیوں کے سہارے مذہب کی مخالفت کرنے والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہ ہو گی۔کیونکہ جو چیز مشاہدے میں آئی ہے وہ ارتقاء ہے نہ کہ مشینیت۔حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے بیسویں صدی میں اپنے اس اعتماد کو کھو دیا جس نے انھیں خالق کے وجود سے بھی بیگانہ کر دیا تھا۔آج جب خود سائنس اپنے بوسیدہ نظریات کو ردی کی ٹوکری میں ڈال رہی ہے اور ان کی جگہ نئے نظریات لے رہے ہیں تو اس سے

ثابت ہوا کہ سائنس کوئی ایسا حتمی علم نہیں ہے جس کو الہام پر فوقیت دی جاسکے۔کل سارے عالم میں نیوٹن کا ڈنکا بج رہا تھا آج آئین سٹائن نے اس کی جگہ لے لی ہے، پلانگ اور ہیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کردیا ہے۔چنانچہ اب مذہب کے مخالفین اس بندگلی میں کھڑے ہیں جہاں سائنس اور اس کے جدید نظریات ان کی مدد کرنے سے انکاری ہیں کیونکہ آئن سٹائن کے نظریہ اضافت (Relativity) اور کوانٹم تھیوری نے خود سائنس دانوں کو اس نتیجہ تک پہنچادیا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کرلیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (Observer) کو مشاہدہ سے الگ کیا جاسکے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرسکتے اور بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب ہوا ہے اس نے خود سائنسی نقطہ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کردی ہے۔سائنس میں جو چیز جدید انقلاب کہی جاسکتی ہے وہ اس واقعہ پر مشتمل ہے کہ نیوٹن کا نظریہ چونکہ دوسو سال تک سائنس کی دنیا پہ حکمران رہا وہ اب جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ سامنے نہیں آسکا مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو سابقہ نظریات کے تھے اور اب اس دعوے پر بھی خود علم سائنس ہی کی راکھ پڑ چکی ہے کہ صرف سائنٹیفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد ذریعہ ہے آج سائنس کے ممتاز علماء حیرت انگیز طور پہ اصرار کررہے ہیں کہ:

Science gives us but a parrial knowledge of reality

''سائنس ہم کو صداقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے''

سائنسی رجحان میں یہ تبدیلی اچانک پیدا ہوئی ہے کہ بمشکل سو سال گذرے جب معروف سائنس دان (Tyndall) نے اپنے خطبہ بلفاسٹ میں اعلان کیا تھا کہ سائنس تنہا انسان کے تمام اہم معاملات سے بحث کرنے کے لیے کافی ہے اس دور میں سائنس دانوں نے اس قسم کے خیالات اس مفروضہ یقین کی بنیاد پر قائم کیے تھے کہ حقیقت تمام کی تمام صرف مادہ اور حرکت (Matter and Motion) پر مشتمل ہے۔تاہم تھوڑے عرصے کے بعد ہی اہل سائنس کے سامنے یہ بات کھل کے آگئی کہ فطرت کی توجیہ محض مادہ اور حرکت کے اصولوں پر کی جانی ممکن نہیں۔ادھر اٹھارویں صدی کے آخر میں جب اہل سائنس کی تصورِ خالق سے بیزاری اپنے عروج پر تھی۔تب ''لاپلاس'' نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ ایک عظیم ریاضی داں جو ابتدائی

سحابیہ میں ذرات کے انتشار کو جانتا ہو وہ دنیا کے مستقبل کی پوری تاریخ پیشگی بیان کر سکتا ہے۔ چونکہ اس وقت نیوٹن اور اس کے نظریات کو تصورِ خالق پر ترجیح دی جارہی تھی اس لیے اس وقت اس بات پہ یقین کر لیا گیا کہ نیوٹن کا نظریہ ہی سارے علوم کی کنجی ہے اس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ تاہم وقت نے اس مادہ پرست ذہن کو اپنے ہر پڑاؤ پر فطرت کے قوانین کے ذریعے شکست دی اور نیوٹن کے نظریات کی قلعی بھی جلد ہی کھل گئی۔ اس کے نظریے کی غلطی پہلی بار اس وقت ظاہر ہوئی جب علماء نے روشنی کی مساوی تشریح کرنے کی کوشش کی اور یہ کوشش انھیں ایتھر (Ether) تک لے گئی جو بالکل مجہول اور ناقابل بیان عنصر ہے۔ کچھ عرصہ تک یہ عجیب وغریب عقیدہ چلتا رہا اور روشنی کی مادی تعبیر کے حق میں ریاضیات کے خوب معجزے دکھائے گئے۔ لیکن میکسویل (Maxwell) کے تجربات کی اشاعت کے بعد یہ مشکل ناقابل عبور نظر آنے لگی کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے تھا کہ روشنی ایک برقی مقناطیسی مظہر **Electromaganetic (Phenomenon)** ہے پھر وقت کے ساتھ یہ خلا بڑھتا ہی رہا یہاں تک کے وہ دن آیا جب علمائے سائنس پر واضح ہوا کہ نیوٹن کے نظریات میں کوئی بھی چیز مقدس نہیں۔ بہت دنوں کے تذبذب اور بجلی کو مادی (**Mechanial**) ثابت کرنے کی آخری کوششوں کے بعد بالآخر اس کو ناقابل تحویل عناصر (***Irreducible Element***) کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات تھی مگر درحقیقت سائنس کے میدان کا یہ بہت اہم فیصلہ تھا۔ نیوٹن کے تصور نے ہم کو بتایا تھا کہ ایک جسم کی کمیت اس کی مقدارِ مادہ تھی اور طاقت کا مسئلہ حرکت سے سمجھ آتا تھا اس طرح یقین کر لیا گیا کہ ہم اس فطرت کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم کلام کر رہے ہیں۔

مگر یہ دراصل ایک واہمہ تھا کیونکہ بجلی کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی فطرت ایسی ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے اس کو معلوم اصطلاحوں میں تعبیر کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئیں۔ وہ سب کچھ جو ہم بجلی کے متعلق جانتے ہیں وہ صرف یہ طریقہ ہے جس سے وہ ہمارے پیمائشی آلات کو متاثر کرتی ہے۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر اہم ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ایک ایسے وجود کو طبیعات میں تسلیم کر لیا جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ بعد میں اس نہج پہ اس قسم کے اور بھی وجود تسلیم کیے جانے لگے اور یہ مان لیا گیا کہ کچھ نامعلوم ہستیاں بھی نظریات بنانے میں وہی اہم کردار ادا کرتی ہیں جو اس سے پہلے صرف مادہ یا اس سے متعلق نظریات ادا کرتے تھے۔ چنانچہ علمائے سائنس کے سامنے یہ حقیقت کھلی کہ

جہاں تک علم طبیعات کا تعلق ہے تو اس کے ذریعے ہم کسی وجود کی اصلی ماہیت کو نہیں جان سکتے بلکہ اس کے صرف ریاضیاتی ڈھانچے (Mathematical Structure) کو جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اب اعلیٰ ترین سطح پر اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ علمائے سائنس کا یہ خیال کہ وہ مادی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اشیاء کی آخری ماہیت کو جان سکتے ہیں محض ایک واہمہ تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے انجام پر جب رسل کو دنیائے سائنس اور فلسفے کا شہنشاہ جانا جاتا تھا وہ بڑی بے بسی سے کہتا ہے:

''ہم صرف اشیاء کے درمیان باہمی تعلق کو جانتے ہیں ہمیں اشیاء کی فطرت سے آگاہی حاصل نہیں ہو سکی۔ لارڈ رسل ایک اور جگہ اپنے علمی سفر کے دوران نارسائی کے تجربات بیان کرتے ہوئے اپنی کیفیت کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ میں ایک ایسے آدمی کی طرح ہوں جو ایک وسیع و عریض سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہوا ہو ہر طرف گھپ اندھیرا ہے اور میرے پاس چپو بھی نہیں بعض دفعہ روشنی آتی ہے تو میں تھوڑا سا رستہ دیکھ لیتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ مکمل تاریکی میں گم ہو جاتا ہوں''

❑❑❑❑❑❑❑

چنانچہ جمالیاتی اخلاق اور روحانی پہلوؤں سے قطع نظر کمیت مادہ جوہر وسعت اور مدت وغیرہ جو خالص طبیعات کے دائرے کی چیزیں ہیں ان کی کیفیات کو جاننا بھی ہمارے لیے ویسا ہی مشکل ہے جیسے غیر مادی چیزوں کی حقیقت کو جاننا۔ اس لیے کہ موجودہ علم طبیعات اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کی حیثیت سے براہ راست واقف ہو سکے۔ ان کی حقیقت ادراک سے باہر ہے دراصل میدانِ سائنس کے لوگ بھی شاعروں کی طرح اپنے تصورات کے ابتدائی خدوخال ذہنی خاکوں کی مدد سے ہی تیار کرتے ہیں مگر ذہن کے اندر کسی ایسی چیز کا عکس موجود ہی نہیں ہوتا جس کا وجود ابھی عالم عدم سے عالم ظاہر کو منتقل نہ ہوا ہو۔ چنانچہ اس طرح سائنس اپنے حقیقی مطالعہ کے اعتبار سے ان خارج از ادراک خصوصیات کا مطالعہ نہیں کر سکتی جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود نہ ہوں اس لیے مارٹن وائٹ نے اپنی کتاب (The Limitations of Science) میں لکھا ہے:

''یہ صحیح ہے کہ یہ مطالعہ عمل کائنات کی بعض خصوصیات کو منعکس بھی کرتا ہے مگر پھر بھی انسان اور سائنس کی یہ معلومات آلاتی مطالعہ سے متعلق ہیں نہ کہ اشیاء کی حقیقی خصوصیات سے متعلق۔ یہ واقعہ کہ سائنس صرف اشیاء کے ڈھانچہ کی حد تک محدود ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت ابھی پورے طور پہ معلوم مشاہدہ نہیں ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے احساسات یا خدا سے اتصال کا عارفانہ تجربہ اپنا کوئی خارجی جواب نہیں (Objective Conuterpart) رکھتا۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ ایسا کوئی جواب خارج میں موجود ہو۔ ہمارے مذہبی اور جمالیاتی احساسات اب محض فریب (IlUsory phenomenon) نہیں کہے جا سکتے جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا۔ نئی سائنسی دنیا میں مذہبی عارف بھی ایک حقیقت کے طور پہ رہ سکتا ہے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

اس سے اگلے دور میں مادہ پرستانہ اور ملحد طرزِ فکر کا مقابلہ خود ان کے اپنوں سے تھا اور خود قبیلہ سائنس میں سے واہٹ ہیڈ، ایڈنگٹن اور جینز نے اس نئی جنگ کا آغاز کیا جس نے مادیت پرستی یعنی خالق سے انکار کی روش اور علم سائنس کو الگ کر دیا تھا۔ ان علماء کی فکر صریح طور پہ کائنات کی مادی تعبیر کی نفی کرتی ہے مگر ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے خود جدید طبیعات اور ریاضیات کے نتائج کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ چنانچہ ان مفکرین خاص طور پہ وائٹ ہیڈ کے بارے میں کہا گیا کہ

He is heroic thinker who tries to bread the lions of Intel letuaslism.Marteialism an positivizm in thier own bristling den

ترجمہ؛ یعنی وہ ایک بلند ہمت مفکر ہے جس نے مادہ پرستی کے شیروں کو عین ان کے بھٹ میں للکارا ہے۔

❑❑❑❑❑❑❑

انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی Elfred erth whitehade نے کہا کہ:

Nature is a alive

یعنی کائنات بے روح مادہ نہیں بلکہ زندہ فطرت ہے

❑❑❑❑❑❑❑

ایک اور انگریز ماہر فلکیات سر آرتھر اڈنگٹن نے موجودہ عہد کی سائنس کے نظریات پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب (The age of Analysis) میں لکھتے ہیں کہ:

The stuff of the word is mind stuff

یعنی کائنات کا مادہ ایک ذہنی شئے ہے

❑❑❑❑❑❑❑

پھر سر جینز جیمز جو ایک اور برطانوی مفکر ہے نے ریاضیاتی طبیعات کی جدید تحقیق ان الفاظ میں پیش کی ہے:

The universe is a universe of thought.

یعنی کائنات، مادی کائنات نہیں بلکہ تصوراتی کائنات ہے۔

❑❑❑❑❑❑❑

یہ ان انتہائی مستند سائنس دانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ ہے۔ڈبلیو این سولیون نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

The ultimate nature of the universe is mental.

کہ کائنات کی آخری ماہیت ذہن ہے۔

❑❑❑❑❑❑❑

یہ ایک عظیم تبدیلی ہے جو پچھلی نصف صدی کے دوران سائنس کے اندر ہوئی ہے اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو ہے۔ڈبلیو۔این سولیون کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

”یہ نہیں کہ تمدنی ترقی کے لیے زیادہ طاقت حاصل ہوگئی ہے بلکہ یہ وہ تبدیلی ہے جو اس کی ما بعد الطبیعاتی بنیادوں (Mataphysical Fondation) میں واقع ہوئی ہے“۔

❑❑❑❑❑❑❑

برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات اور ریاضی داں (Sir james jeens) کی کتاب (The Mysterious Universe) غالبًا اس پہلو سے موجودہ زمانے کا سب سے قیمتی مواد ہے جس کے ذریعے مفکر خالص سائنسی بحث کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچا ہے۔

”جدید طبیعیات کی روشنی میں کائنات مادی تشریح (Material Representation) کو قبول نہیں کرتی اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اب کائنات محض ایک ذہنی تصور (Mental Concept) ہو کے رہ گئی ہے۔ آخری حقیقت ذہن ہے یا مادہ۔ یہ فلسفیانہ الفاظ میں دراصل ایک سوال ہے کہ کائنات محض مادہ کے ذاتی عمل کے طور پہ خود بخود بن گئی ہے یا کوئی غیر مادی ہستی ہے جس نے بالارادہ اسے تخلیق کیا ہے۔ جیسے کسی کار کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے آخری تجزیے میں محض لوہے اور پیٹرول کا ایک اتفاقی مرکب ہے گویا یہ کہنا ہے کہ مشین سے پہلے صرف لوہا اور پیٹرول تھا اور اس نے خود ہی کسی اندھے مادی عمل کے تحت محض ایک اتفاق سے کار کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ یہ مشین اپنے آخری تجزیے میں انجینئر کا ذہن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مشین سے پہلے ایک ذہن تھا جس نے مادہ سے الگ اس کے ڈیزائن کو سوچا اور پھر اپنے ارادہ کے تحت اسے تیار کیا ذہن کے تعین میں اختلاف سے ذہن کو آخری حقیقت ماننے والوں میں مختلف گروہ ہوسکتے ہیں جیسے خدا کو ماننے والے خدا کو ماننے کے باوجود مختلف گروہوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں مگر اس علمی مطالعہ کا یہ نتیجہ کہ کائنات کی آخری حقیقت ذہن ہے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کی تصدیق اور الحاد کی تردید ہے“۔

□□□□□□□

(Sir james jeens) کے الفاظ یہ ہیں کہ جب کائنات ایک تصوراتی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تصوراتی عمل سے ہونی چاہیے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ مادہ کو امواجِ برق سے تعبیر کرنے کا جدید نظریہ انسانی تخیل کے لیے بالکل ناقابل ادراک ہے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لہریں محض امکان کی لہریں (Waves of probabilities) ہوسکتی ہیں یہ اور اس طرح کے دیگر وجوہ کی بنا پر سر جیمز جینز اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں بلکہ تصور ہے۔ یہ تصور کہاں واقعہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم کائناتی ریاضی دان (Mathematical Thinker) کے ذہن میں ہے کیونکہ اس کا ڈھانچہ جو ہمارے علم میں آتا ہے وہ مکمل طور پہ ریاضیاتی ڈھانچہ ہے چنانچہ اب عالم سائنس اس امر پہ مجبور نظر آتا ہے کہ وہ ذہن کا عالمِ مادی کے خالق اور حکمران کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی ذہن تخلیق کیا اور کائنات کی یہ ساری رونق اور ہماہمی اور رنگ و بو سے سجی اس کی ایک ایک روش ایک اسکیم کی صورت پہلے سے خالق کے ذہن میں موجود تھی اور جب اس (خدا) نے اپنے ارادہ کو تکمیل تک پہنچایا تو کائنات عدم سے وجود میں منتقل ہوگئی۔ چنانچہ آج خود ہمارا سائنسی علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ انسان اور کائنات پہ جلدی میں قائم ہونے والے ان نظریات پہ نظر ثانی کریں جو خالق کے تصور کے بغیر کسی دم کٹے شیر کی طرح نظر آتے ہیں۔ آج جب انسان نے اپنے پورے یقین کے ساتھ اس امر کو دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمران (Designing or Controlling power) کے وجود کی شہادت دے رہی ہے جو مادیت اور الحاد پرستوں کی ایسی شکست ہے جس کے بعد کوئی جواز ان کی اہلیت ثابت نہیں کرسکتا [45*]۔

ہزاروں فکری مغالطے

صدیوں سے مادہ پرستانہ اور روحانی تہذیب کے یہ دونوں نظریات متوازی طور پہ زندہ ہیں اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان چونکہ مادی تہذیب کی ترقی میں کافی حد تک سنجیدہ تھا اس لیے اس نے اپنے لیے آسائش کے بے پناہ در وا کر لیے مگر اس کے برعکس وہ روحانی تہذیب کے معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ نہ تھا اس لیے انسانی معاشروں کے اندر اس خلا نے جنم لیا جس کے بطن سے شرک الحاد اور دوسرے تمام قسم کے غلط فکری نظام وجود میں آئے۔اس نے کائنات میں موجود طبعی عناصر کو باہم جوڑ کے کار، موٹر سائیکل، کمپیوٹر اور ہوائی جہاز تو بنا لیے مگر مظاہر قدرت کے پس پردہ ان حقائق تک اس کی رسائی نہ ہو سکی جو انسانیت اور عقل کا حقیقی امتحان تھا اس نے دن اور رات کے تسلسل میں چھپے ہوئے اس اسرار کو پڑھنے کی کوئی کوشش نہ کی جو اسے خالق کی پہچان تک لے جاتے بلکہ اس نے کائنات کے بہت سے واضح اشارات کی غلط توجیح کی جس کی وجہ سے وہ اکثر و بیشتر وجود خالق کے بارے میں تشکیک کا شکار رہا اور غلط عقائد کی غلام گردشوں میں ہراساں پھرتا رہا۔مثال کے طور پر مظاہر کائنات میں تنوع دیکھ کر اس نے خدائی میں تنوع کا عقیدہ قائم کر لیا کہ جب چیزیں

کئی ہیں تو خدا بھی کئی ہونے چاہییں حالانکہ مظاہر کائنات میں تنوع خدا کی صفات میں تنوع کی علامت تھا نہ کہ خود خدائی میں۔ اسی طرح کائنات میں نظام تعلیل (Causatian) کی دریافت کو سائنس نے خود خدا کی دریافت قرار دے دیا حالانکہ وہ خدا کے طریق کار کی دریافت کے ہم معنی تھا نہ کہ خود خدا کی دریافت کے برابر؟

اللہ نے انسان کی مادی اور روحانی تہذیبوں کے ارتقاء کے لیے ضرورت کے تمام عناصر اسی کائنات میں رکھ دیئے ہیں اب انسان کو جب خودکار سواریوں کی ضرورت پیش آئی تو اس نے طویل تجربے اور مشاہدے کے ذریعے عناصر کائنات کا باہم اس طرح استعمال کیا کہ اس نے کار اور ہوائی جہاز تیار کر لیے۔ سائنس کبھی بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ ان چیزوں کی تکمیل میں اس نے کوئی ایسا عنصر بھی استعمال کیا ہے جو کائنات کی حدود سے ماورا ہو؟ یہ ایسا ہی معاملہ ہے جیسے وینس ڈی میلو کا مشہورِ زمانہ مجسمہ تراشنے والے سے جب سوال کیا گیا کہ اس نے اس کا بنیادی تصور کہاں سے حاصل کیا تو اس نے یہ خوبصورت جواب دیا کہ یہ حسین صورت تو اس پتھر میں موجود تھی میں نے تو صرف اضافی پتھر کو تراشا ہے جس کے بعد یہ صورت ظاہر ہو گئی۔

اسی طرح کا معاملہ ان تمام جدید ایجادات کا ہے جن کو دریافت کرنے کے بعد انسان اس احساسِ تکبر کا شکار ہوا جس نے اسے خالق کے وجود سے انکار پر اکسایا حالانکہ خالق نے انسان کی بنیادی ضروریات کی تمام اشیاء انسان کو پیدا کرنے سے پہلے اس دنیا پہ اتاریں تھیں تا کہ وہ خلافت فی الارض کا فریضہ احسن طور پہ ادا کر سکے۔ اس نے ہوا پانی اور روشنی جیسی چیزیں تو اپنی مکمل شکل میں اتاریں کہ انسان ان کو بنانے پہ قادر نہ تھا۔ مگر کار ہوائی جہاز اور کمپیوٹر کو مختلف اجزا کی صورت میں زمین پہ اتارا کہ وہ جانتا تھا کہ میں نے عقل کی جو شمع انسان کے اندر روشن کی ہے وہ اس کی روشنی میں ان اجزا کو باہم جوڑ کے کار ہوائی جہاز اور کمپیوٹر بنا لے گا۔

چنانچہ حیرت کی بات یہ ہے کہ کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور اچھی کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے خدا کا وجود بے معنی ہو گیا ہے؟

کیا جدید مواصلاتی نظام انٹرنیٹ ٹیلی فون اور موبائل کے ذریعے خبر رسانی سے وحی و الہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے؟

کیا ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ میں بیٹھ کر فضاء میں اڑنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات

میں کہیں وجود ہی نہیں ہے؟

کیا لذیذ کھانے خوشنما لباس اور اعلیٰ فرنیچر کے وجود میں آنے کے بعد جنت اور دوزخ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

کیا جدید عورتوں کی یہ صلاحیت کہ وہ ہمارے دفاتر میں تنگ شرٹ پہنے تیزی سے کی بورڈ پہ انگلیاں چلاسکتی ہیں یہ ثابت کرتی ہے کہ اب'' اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ '' کی آیت منسوخ ہو گئی ہے؟

کیا اسمبلی اور پارلیمنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اب شریعت کا قانون بے معنی ہو گیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرست ان تمام سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں اس لیے کہ جدید طرزِ زندگی یا تیز رفتار طورِ زیست کا مذہب کی ابدی صداقتوں کی تردید یا تائید سے کوئی تعلق ہی نہیں مذہب کا تعلق انسانی قدروں (Values) سے ہے نہ کہ تمدنی مظاہر سے کیونکہ تمدنی مظاہر تو ہمیشہ سے عمل ارتقاء کے ہاتھوں شکست کھاتے آئے ہیں مگر انسان کی بنیادی قدریں آج بھی وہی ہیں جو دس ملین سال پہلے تھیں کل بھی وہ کسی خالق کو پوجنے کا اشتیاق رکھتا تھا اور آج بھی دنیا کی 74% آبادی چاہے نہ چاہے کسی خالق کے در سے ہی وابستہ ہے دوسرے لفظوں میں مذہبی ہے۔ لاکھوں سال پہلے بھی انسان کا عورت کی طرف رغبت کا یہی حال تھا جو کہ آج ہے۔ لاکھوں سال پہلے بھی وہ اپنے منہ سے ہی کھانا کھاتا تھا اور آج بھی منہ ہی سے کھاتا ہے ناک سے نہیں۔ لاکھوں سال پہلے بھی وہ مل جل کر ایک سماج کی صورت رہتا تھا اور آج بھی وہ بڑے بڑے اور متمدن شہروں میں اکٹھے رہنا پسند کرتا ہے۔ لاکھوں سال پہلے بھی وہ اپنی اولاد سے محبت کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے لاکھوں سال پہلے بھی وہ حسن پرست تھا اور آج بھی ہے، لاکھوں سال پہلے بھی وہ مال وزر کی محبت کا شکار تھا اور آج بھی اس کا وہی حال ہے، لاکھوں سال پہلے بھی وہ احساس تفاخر اور قومی عصبیت میں مبتلا تھا اور آج بھی صورت حال کچھ ویسی ہی ہے، لاکھوں سال پہلے بھی اسے پھول کا حسن اور اس کی خوشبو

اسے متاثر کرتی تھی آج بھی کرتی ہے، لاکھوں سال پہلے بھی وہ بدلتے موسموں کے تغیر کا احساس لطیف رکھتا تھا اور آج بھی وہ موسم کے حسن سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ اب جہاں تک تمدنی مظاہر کا تعلق ہے تو وہ ہر زمانے میں بدلتے رہے ہیں اگر آج کی جدید اور تیز رفتار سواریوں نے کل کی فرسودہ اور سست رفتار سواریوں کی جگہ لے لی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے اس لیے مسئلے کی نوعی صورت میں کوئی فرق واضح نہیں ہوا کہ کل کی سواریاں ہوں یا آج کی ان کے بنانے اور استعمال کرنے میں بنیادی اخلاقی اصولوں کی ضرورت کل بھی تھی اور آج بھی ہے پیغام رسانی کے لیے آج کا جدید مواصلاتی نظام ہو یا کل کا فرسودہ نظام مگر اس بنیادی سوال کی اہمیت میں اب بھی کوئی فرق نہیں ہوا کہ اس نظام مواصلات کو جھوٹ کی اشاعت کے لیے استعمال کیا جائے یا سچ کی اشاعت کے لیے، کسی قانون ساز ادارے کا رکن قانون بنانے کے لیے اسمبلی حال میں چاہے ہوائی جہاز پہ بیٹھ کے پہنچے یا گدھے پر سوال یہی ہے کہ اس نے جو قانون بنایا ہے وہ خدائی قانون کی موافقت میں بنایا ہے یا کہ مخالفت میں اگر اس نے قانون سازی کرتے ہوئے اُن حدود کی پرواہ نہیں کہ جس کو خالق کائنات نے مقرر کیا ہے۔

جس کے مطابق ساری کائنات کا نظام جاری وساری ہے تو اس نے انحراف کی راہ اپنائی ہے اور خالق سمیت کائنات کے کل وسائل کو اپنے خلاف صف آرا کرلیا جس کی سزا اسے بھی بھگتنی ہوگی اور اس کی قوم کو بھی اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ اہل مغرب کے کئی ممالک نے ہم جنسی کو قانونی جواز فراہم کیا ہے جس کی سزا انھیں ایڈز کی صورت بھگتنی پڑ رہی ہے اور ان کا بے پناہ روپیہ اور وسائل ایڈز سے بچاؤ پہ استعمال ہو رہے ہیں مگر اِن کے مریضوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ریکارڈ کیا جا رہا ہے اس لیے کہ ان معاشروں نے زنا کو روکنے کے لیے کوئی قانونی اور اخلاقی جواز فراہم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ آج کے انسان نے جب مادی تعیش کی لذت چکھی تو وہ اس کے سحر میں اس بری طرح مبتلا ہوا کہ اس کے پاس اپنی ذات پہ غور کرنے کے لیے بھی وقت نہ بچا ورنہ اس کی اپنی ذات میں بھی خالق کی پہچان کے در وا کرنے کی سینکڑوں نشانیاں موجود ہیں آیئے ان پہ ایک نظر ڈالیں۔ جب ہم اس نقطہ نظر سے انسان اور کائنات کے معاملے پر غور کرتے ہیں تو انسان کی ذات کے اندر پنہاں بہت سی چیزیں ہماری راہنمائی کے لیے قطار باندھے کھڑی نظر آتی ہیں مثلاً ''ہنسی '' انسان جب غور کرتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ پوری کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو ہنستی ہے اگرچہ اس کے مقابل بہت سی پر ہیبت اور بارعب مخلوقات بھی موجود

ہیں مگر وہ اس لطیف احساس سے عاری ہیں جیسے کہ پہاڑ، پانی، ہوا، سمندر، جنگل، سورج، چاند ستارے بھی اس احساس سے عاری ہیں کیا آپ نے کبھی ان کو مسکراتے دیکھا ہے حتی کہ جدید سائنس نے ہی یہ انکشاف کیا ہے کہ جانور اور پرندے بھی اس احساس سے عاری ہیں چنانچہ یہ ثابت ہوا کہ ہنسنا مسکرانا صرف حضرت انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔فلاسفہ کہتے ہیں کہ مسکرانا شعوری لذت کی علامت ہے اور لذت کا شعور انسان کے سوا کائنات کی اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری معلوم کائنات میں انسان ہی ایک ایسی ہستی ہے جس کے لیے ہنسنا یا بالفاظ دیگر خوشی مقدر کی گئی ہے۔خوشی انسان کو وہ احساس لطیف عطا کرتی ہے جو اس کے اندر کسی ان دیکھی طاقت کے وجود کو دلیل فراہم کرتی ہے جس کی رحمت کی وجہ سے اسے خوشی اور مسرت کا یہ لمحہ حاصل ہوا اور ان لمحات میں طوالت اس کے اندر شکر کے جذبے کو جنم دیتی ہے۔

جب کسی انسان کے اندر جذبہ شکر زندہ ہو جائے تو اب وہ خالق کے در پہ کھڑا ہے اور جب چاہے قدم اٹھا کے ادراک کی وہ منزلیں طے کر لے جو اسے مقصدِ زیست کی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیں گی۔ذرا سا مزید غور کرنے پر انسان کی ذات کا ایک اور در وا ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ لذت کا حصول بھی انسان ہی کا خاصہ ہے اور انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو لذت کے بہت سے پہلوؤں سے آشنا ہے اس کا کھانا پینا رہنا پہننا اور ازدواجی تعلقات سب لذت کے دائرے میں آتے ہیں بظاہر انسان اور جانور میں یہاں کچھ قدریں مشترک نظر آتی ہیں مگر یاد رہے کہ جانور ہمیشہ اپنی اس جبلت کا تابع رہا ہے جو اس کو خالق کائنات نے روز اول سے عطا کر دی تھی اس کا کھانا پینا اور نسل بڑھانے کا تعلق لذت کے زمرے میں نہیں بلکہ جبلت کے زمرے میں آتے ہیں جانور جو عمل بھی کرتے ہیں وہ ضرورت اور جبلت کے لیے کرتے ہیں نہ کہ لذت کے لیے۔اس لیے صرف انسان ہی وہ ہستی ہے جو لذت کے ہمہ پہلو تصور سے آشنا ہے کسی گدھے کو گلاب کی کلیوں کی نازکی اور اس کی مہین خوشبو کا ادراک کبھی حاصل نہ تھا جب کہ انسان نے شعوری ابتدا سے ہی بادِ صبا کی لذت اور قوس قزح کے حسن سے آگاہ تھا چنانچہ انسانی ذات کے اندر پنہاں خوشی اور لذت کے احساس کے حوالے سے ہی ہم اس کی کامیابی کے معیار کو جانچیں تو ہم سمجھیں گے کہ صرف وہی انسان کامیاب ہے جس کو خوشی اور لذت حاصل ہو مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ انسان کو خوشی اور لذت گاہے گاہے حاصل رہتی ہے۔ مگر اس کو دوام حاصل نہیں اور وہ خود اپنی قوت کار سے اپنی خوشی اور لذت کو دوام عطا کرنے پر بھی قادر نہیں

اس لیے کہ یہاں بہت سی محدودیتیں (Limitations) ہیں جنہوں نے اسے گھیرا ہوا ہے۔خوشی اور لذت کے مقابل دکھ اور پریشانی بھی سر اٹھائے کھڑے ہیں جو اس کی خوشی اور لذت کو غارت کرتے رہتے ہیں اور دوسرے بہت سے امور اس کی خوشی اور لذت کی راہ میں زندہ حقیقتوں کی طرح حائل ہیں، دکھ ہے، بیماری ہے، بڑھاپا ہے، اور پھر موت ہے جو اس کے احساسِ لذت کو دوام حاصل نہیں کرنے دیتی۔ہم ارادہ کچھ اور کرتے ہیں اور نتیجہ کچھ اور نکلتا ہے یہاں پہنچ کر ہم مزید غور کرتے ہیں تو انسانی رویوں کا ایک اور بہت اہم عنصر ہمارے ہاتھ آتا ہے کہ یہ بھی انسانی خصوصیت ہے کہ تمام معلوم مخلوقات میں سے صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو کل (Tomorrow) کا تصور رکھتا ہے سورج آج ڈوبتا ہے اور کل طلوع ہوتا ہے یہ ہم جانتے ہیں خود سورج کو بھی اس کا شعور نہیں۔چیونٹی اگلے موسم کے لیے خوراک جمع کرتی ہے اور بیا اپنی آئندہ نسل کے لیے گھونسلے بناتا ہے مگر آج کی سائنس اس بات کو بخوبی جانتی ہے کہ وہ یہ سب اپنی جبلت (Instinct) کے تحت کرتے ہیں نہ کہ کل کے تصور کے تحت۔

تمام موجودات میں سے کل کا تصور صرف انسان کے اندر پایا جاتا ہے جو اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کل کی کامیابی صرف انسان کے لیے خاص ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں جو خوشیاں جو لذتیں ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی کی محدودیتیں انسان کو اتنا وقت اتنی آسانی مہیا نہیں کرتیں وہ سب کل کو دستیاب ہوں گی اور کل کے دن کو مستقبل بھی کہا جاسکتا ہے اور اس تسلسل کو بھی کل ہی کہا جائے گا جو اس مادی جسم کی فنا کے بعد بھی جاری وساری ہے یعنی موت۔اس کل کے راستے میں قطعاً کوئی رکاوٹ نہیں حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہم اپنی اس طلب کا صرف جزئی تعارف ہی حاصل کر پاتے ہیں اور اس کو کامل طور پہ پانے کے لیے ہمیں بہر حال کل کے دور میں داخل ہونا ہوگا اور کل کا یہی وہ تصور ہے جو اس دنیا میں انسانی زندگی کو ایک ایسے رستے کا راہی بناتا ہے جس میں نہ صرف اس انسان کی ذاتی فلاح کا تصور مضمر ہے بلکہ وہ باقی تمام لوگوں کے لیے بھی افادی اہمیت کا حامل ثابت ہوتا ہے۔ہر آدمی جب نیند کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کا جسم ایک قسم کی موت کی آغوش میں ہوتا ہے مگر اس کا ذہن یا روح پوری طرح بیدار ہوتی ہے۔انسان اس دوران نیند سوچتا ہے، فیصلے کرتا ہے، سفر کرتا ہے گویا ایک قسم کی جسمانی موت کے بعد بھی انسان کا ذہنی وجود پوری طرح زندہ رہتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ آدمی نہ صرف کل کا تصور رکھتا ہے بلکہ وہ کل کے دن تک زندہ موجود بھی رہتا ہے موت کے باوجود وہ ختم نہیں ہوتا اور آدمی کی زندگی ایک ایسا تسلسل ہے جو ''آج'' سے لے کر ''کل'' تک

چلا گیا ہے۔اب ہم انسان کی ذات کے دروں اس احساس کا مشاہدہ کرتے ہیں جس کے تحت انسان کے اندر خیراور شر کا یعنی (صحیح اور غلط) کا تصور جنم لیتا ہے۔یہ بھی صرف حضرت انسان کا ہی خاصہ ہے کہ وہ اشیاء کی ماہیت جان کر ان کے صحیح اور غلط ہونے کا تصور قائم کرتا ہے۔حقیقت واقعہ کا اعتراف اس کے نزدیک سب سے بڑی نیکی ہے اور حقیقت واقعہ کا انکار اس کے نزدیک سب سے بڑی برائی ہے۔چنانچہ اس شعور کے زندہ ہوتے ہی انسان سچ اور جھوٹ امانت اور خیانت،احسان اور ظلم،علم اور جہل نیکی اور بدی،تواضع اور سرکشی،عہد اور بدعہدی کے درمیان بھی فرق کرنا شروع کرتا ہے دراصل یہی وہ حدفاصل ہے جو انسان کے معاملات کو دوسری مخلوقات کے معاملات سے الگ کر کے رکھ دیتی ہے اور انسان پہ اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ اس کی کامیابی اخلاقی معیار پہ جانچی جائے گی۔

جب کہ دوسری چیزوں کی کامیابی محض مادی اعتبار سے بھی دیکھی جاسکتی ہے۔چنانچہ انسانی زندگی کے ان تمام فطری مظاہر کو جاننے کے بعد حیات انسانی کا جو کامل تصور بنتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جس کے لیے اس کے خالق نے لذت اور خوشی کو مقدر کیا ہے۔مگر یہ خوشی اور لذت اپنے حقیقی تصور میں اس کو آج ملنے والی نہیں ہے اور یہ اپنی کامل صورت میں اس کو صرف ''کل'' ہی ملے گی۔مگر یہ لازوال نعمت ہر کسی کو یونہی نہیں مل جائے گی اس کے لیے انسان کو ایک امتحان درپیش ہے جس میں اسے کامیاب ہونا پڑے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان اپنی ''آج'' کی زندگی میں اس کے واقعی استحقاق کا ثبوت دے۔کیونکہ وہ لوگ اس لازوال نعمت کے حق دار کیسے قرار دیئے جاسکتے ہیں جو بہ بانگ دہل آج کسی خالق کے وجود سے انکار کر رہے ہیں۔جو مذہب اور اس کے نظریات کو دھوکہ اور واہمہ قرار دیتے ہیں جو مذہب کو افیون بتاتے ہیں اور جو اتنے بدزبان ہیں کہ کہتے ہیں خدا مر گیا ہے۔جو نہ صرف خود اندھیری راہوں کے مسافر ہیں بلکہ انہوں نے شیطان کی ذریت سے مل کر خالق کے انکار پہ پورا ایک نظام فلسفہ وضع کیا اور کروڑوں انسانوں کو درِ خالق سے موڑ کے رکھ دیا اس دن وہ جان جائیں گے کہ دراصل وہ دانشور نہ تھے بلکہ عقل کے اتنے اندھے تھے کہ چمکتا دمکتا درِ خالق ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔

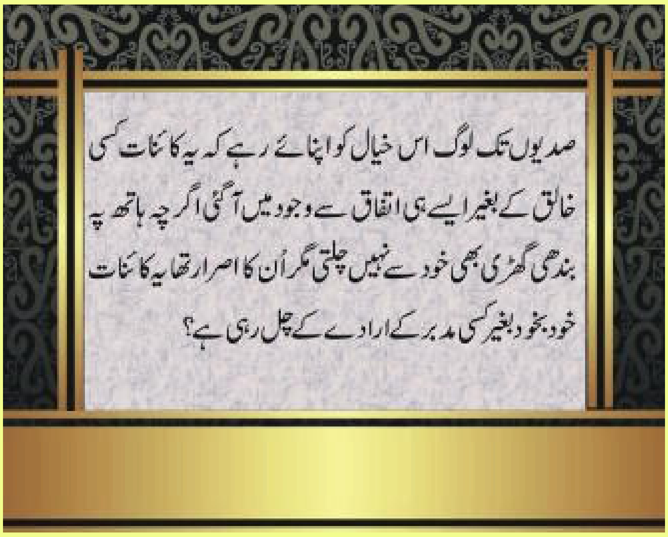
خوشی اور لذت کی اس لازوال نعمت کا اصل حق دار وہی ہے جس نے نہ صرف اپنے خالق کو پہچانا بلکہ اس کے احسان کی قدر و قیمت کو بھی پہچان لیا۔ایسا انسان ہی انکارِ حق سے بچے گا اور اقرارِ حق کی میزان پہ پورا اترے گا۔خالق کے وجود کا احساس انسان کو سطحی طور پہ جینے کی بجائے ابدیت کی سطح پہ جینے کا شعور عطا کرتا ہے اور

وہ صرف آج والا بن کے رہنے کی بجائے کل والا بن کے رہنا سیکھ لیتا ہے۔ جس کو رحمت کی یہ راہ بھا گئی وہ کل کی زندگی میں کامل انسان کے روپ میں ظاہر ہوگا اور وہ اس خوشی اور لذت کو ابدی طور پہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کا موجودہ زندگی میں اس نے محض تعارف ہی حاصل کیا تھا۔

پس ثابت ہوا کہ مادی تہذیب وقتی دنیا کی تعمیر کا نام ہے اور روحانی دنیا کی تعمیر ابدی دنیا کی تعمیر ہے چنانچہ جب انسان کو یہ شعور حاصل ہو جائے کہ یہ ساری مادی تہذیب ریت پہ بنائے اس گھروندے کی مانند ہے جس کو قدرت کی ایک ہی لہر نے فنا کے گھاٹ اتار دینا ہے تو وہ اپنی ساری توانائیاں اتنی ناپائیدار چیز کی تعمیر کے لیے کیوں کر صرف کرے گا یہی وہ سوال ہے جو مادہ پرست نظریات کی قلعی کھول دیتا ہے۔ انسان کے پاس وقت اور مہلت کم ہے اس لیے بعض اوقات اس کو بہت دیر کے بعد جا کے احساس ہوتا ہے کہ اس نے ایک طویل جدو جہد کے بعد زندگی سے کچھ بھی نہیں پایا اور اس کی باقی سانسیں احساسِ ندامت کی نظر ہو جاتیں ہیں۔ جب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے اور اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے ہر فعل کو غلط اور صحیح کے ترازو پہ تولتا ہے تو اس کے بعد وہ ایک ایسے ضابطے کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے جو اس کے شعور کے مطابق صحیح اور غلط کو متعین کرے۔

جانوروں کو جو ضابطہ اخلاق درکار تھا وہ خالق نے ابتدا سے ہی ان کی جبلت میں رکھ دیا۔ مگر انسان اپنے ساتھ کوئی ضابطہ نہیں رکھتا جس سے ایک خلا پیدا ہوا اور یہ خلا بتاتا ہے کہ انسان کے لیے ضرورت ہے کہ باہر سے اس کو ایک ضابطہ اخلاق فراہم کیا جائے۔ ''قانون'' یہی ضابطہ اخلاق فراہم کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے مگر اس کا حال یہ ہے کہ پانچ ہزار سال کی بہترین کوششوں کے باوجود بھی انسانی دماغ اپنے لیے قانون کی کوئی متفقہ بنیاد دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اہل فلسفہ کا ایک طبقہ اس کو انسانی ناکامی تو ضرور قرار دیتا ہے مگر ان کا اصرار ہے کہ آخر انسان کوئی ایسا متفقہ ضابطہ وضع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جسے انسانیت کے لیے باعث نجات قرار دیا جا سکے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان ابھی شعور وارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے۔ مگر ابھی راستے میں ہے اور اس کو چند صدیاں مزید درکار ہیں جب وہ اپنی منزل کو پالے گا مثلاً (Tocquevil) جیسے کتنے ہی نام نہاد دانشور انسان کو امید دلائے بیٹھے ہیں کہ وہ جلد ہی منزل پالے گا اور اس نئی دنیا کے لیے ایک نیا علم سیاست دریافت کر لے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کی یہ ناکامی اس کی تلاش کی ناکامی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی چیز کی تلاش میں ہے جس کی کھوج میں ناکامی بالآخر

اس کا مقدر ہے۔اس لیے کہ وہ اپنی کوششوں سے اس خلا کو پر کرنے کے قابل ہی نہیں انسان کے اندر اخلاقی شعور کا موجود ہونا مگر اس کا خود سے کوئی اخلاقی ضابطہ وضع نہ سکنا نظام فطرت کا ایک خلا ہے اور یہی خلا ''وحی'' کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے۔ اگر ایک بار اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد منزل خود انسان کے قدم چومے گی اور عقل انسانی کو اسلام کے سوا کوئی اور راہ سجھائی نہ دے گی۔ کیونکہ جس طرح انسان کو اپنی زندگی کی مادی تعمیر کے لیے سورج کی روشنی کی مستقل ضرورت ہے اسی طرح اس کو اپنی زندگی کی روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لیے ''علم وحی'' یعنی سچی ہدایت اسلام کی لازمی ضرورت ہے۔ چنانچہ جو لوگ اسلام کو نہ اپنائیں گے وہ گویا اپنی روحانی اور اخلاقی تعمیر سے پہلو تہی کر رہے ہیں اور روحانی تہذیب کے بجائے مادی تہذیب کو ترجیح دے رہے ہیں تو اس کے نتائج بھی یقیناً مادی ہی ہونگے اور روحانیت کے میدان میں ان کی تنگ دامانی نہ صرف ان کی زندگی میں اندھیرا کر دے گی بلکہ ان کی آخرت بھی برباد ہو جائے گی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سورج کے بغیر انسان کی دنیا اندھیری ہے اسی طرح علم وحی کے بغیر اس کی آخرت اندھیری ہے؟



حقیقت کی تلاش

کائنات ایک کھلی کتاب کی مانند ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے یہ ایک بولتی ہوئی کتاب ہے جو اپنی حقیقی ماہیت کو بیان کر رہی ہے۔ ذرا سے غور پہ ہی مظاہرِ کائنات اپنے خالق کے کامل اقتدار اور اس کی مکمل دسترس پہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ انسان اس نظامِ کائنات میں ایک ناقابل ذکر ذرے کی طرح ہے مگر عقل نے اس کو وہ مقام عطا فرمایا کہ اس نے اسرارِ کائنات پہ ہاتھ ڈال دیا۔ روزِ اول سے انسان کو یہ سوال درپیش رہا ہے کہ اس کائنات کو بنانے والا کون ہے؟ کون ہے جو اتنے وسیع نظامِ سلطنت کو بغیر کسی دِقت کے رواں رکھے ہوئے ہے۔ قدیم زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی ان دیکھی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں اگرچہ وہ کسی ایک بڑے خدا کے قائل ضرور تھے مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا بھی اس بڑے خدا کی

مدد کرتے ہیں تب جا کے وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کائنات کے نظام کو رواں دواں رکھ سکے۔ایک مدت تک انسانی سماج میں کائنات کے متعلق کچھ اسی قسم کے عقائد مروّج رہے۔مگر پھر گذرتے وقت نے انسانی شعور کو جو پختگی عطا کی اس نے جہاں اور بہت سے پردے چاک کیے وہیں اس کائنات کے اسرار بھی قدرے سرِ کے اور علمی دنیا نے کائنات پہ متصرف بہت سے خداؤں کے تصور کو مسترد کر دیا اگر چہ انسان نے علوم تمدن کی بہت سی منزلیں طے کیں مگر وہ کائنات کی کسی ایک توجیہ پہ متفق نہ ہو سکا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ بہت سے اہل دانش جو سرے سے کسی خالق کے وجود کے قائل ہی نہ تھے انھوں نے کائنات کے متعلق الہامی مذاہب میں دیئے جانے والے نظریات کو اس عناد کی بنا پر مسترد کر دیا کہ اس کے بعد خود ان کو اس خالق کے وجود کو بھی تسلیم کرنا پڑتا۔اس لیے سترہویں اور اٹھارویں صدی کے فلاسفہ اور سائنسدانوں نے باہمی منا پلی سے کائنات کے متعلق ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کی بنیاد انھوں نے اس اتفاق کو قرار دیا جو ان کے خیال میں کائنات کا محرک اول بنا۔

بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ اگر چہ اس دور کے بہت سے لوگ خدا کی ذات سے شرک میں ملوث تھے مگر ان کے فلاسفہ اہل دانش اور سائنس دان ان سے کئی ہاتھ آگے الحاد کا شکار تھے۔ان کا خیال تھا کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں اس لیے انہیں کسی خالق کے وجود پہ ایمان لانے کی ضرورت نہیں کہ یہ تو ایک فرسودہ رسم ہے جس کی ضرورت گذرے کل کا نہتا اور بے بس انسان محسوس کرتا تھا۔چنانچہ شرک کی بجائے الحاد کے قائل ان فلاسفہ نے کائنات کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آ ہیں گے۔اس طرح اسباب وواقعات کا ایک لامتناعی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلہ اسباب ہے جو اس نظام کائنات کو چلا رہا ہے۔انھوں نے اس توجیہ کی بنیاد دو چیزوں پہ رکھی۔ایک اتفاق اور دوسرا قانونِ علت (Law of Causation)۔چنانچہ اس توجیہ کی بنیاد پہ انھوں نے کائنات کا جو ابتدائی تصور پیش کیا وہ یہ ہے کہ اب سے تقریباً دو ارب سال پہلے کائنات کا کوئی وجود نہ تھا اس وقت نہ تو ستارے تھے اور نہ سیارے مگر فضاء میں ایک گہرا بادل سا موجود تھا جس کو مادہ کہا جاتا ہے اس وقت یہ مادہ جمی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا بلکہ اپنی اس ابتدائی حالت میں تھا جس کو سائنس نے برقیے اور پروٹون قرار دیا۔تب یہ برقیے اور پروٹون پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پہ پھیلے ہوئے تھے یا یوں کہیے کہ انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار

تھا جس سے ہماری یہ کائنات بھری ہوئی تھی اس وقت یہ مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا اور اس میں کوئی خفیف سی حرکت بھی نہ تھی۔ ریاضی دانوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا خلل بھی ڈال دے تو پھر یہ توازن بگڑ جائے گا اور اس توازن کے اندر ایک خلا جنم لے گا جو بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اگر اس ابتدائی خلل کو مان لیا جائے تو ان لوگوں کے مطابق اس کے بعد کے تمام واقعات علم ریاضی کے ذریعے ثابت کیے جا سکتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ابتدائی خلل کا محرک کیا تھا؟ کیا اس کے پیچھے خالق کی منشا تھی کیا؟ اس ابتدائی اضطراب کی کوئی سائنسی توجیہ موجود ہے یا آج تک وجود میں آ سکی ہے؟ کیا اتنا بڑے امر کو جس کے نتیجے میں ہماری یہ اتنی بڑی کائنات وجود میں آئی محض اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب نہ کل کے سائنس دان اور فلاسفہ دے سکے ہیں اور نہ ہی اس کا کوئی حتمی اور قابل قبول جواز آج کی سائنس فراہم کر سکتی ہے۔ لے دے کہ ان کے پاس ایک لفظ یا نظریہ اتفاق ہی رہ جاتا ہے جو ایک طفلانہ مذاق سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لیے کہ کائنات میں پھیلے اس مادے میں وہ خفیف سی حرکت وہ ہلکا سا خلا وقوع پذیر ہوا تو اس کا سبب کیا تھا جس کے بعد وہ خلل بڑھتا ہی چلا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا اور یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو آج ہم ستارے سیارے اور سحابیۓ کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدر بودی اور کمزور توجیہ تھی کہ خود سائنس دانوں کو بھی کبھی اس پہ شرح صدر حاصل نہ ہو سکا۔ یہ توجیہ اس حقیقت کو تو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی مگر اس کے باوجود ان کا اصرار ہے کہ انھوں نے کائنات کے محرکِ اول کو معلوم کر لیا ہے اور اس محرک اول کا نام ہے ''اتفاق''؟؟؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا اور اس کے سوا کوئی چیز ایسی نہ تھی جو صاحبِ وجود ہو تو یہ عجیب وغریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آ گیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دے دی۔ جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے نہ مادہ کے باہر تو پھر وہ واقعہ وہ ''حسین اتفاق '' کیسے وجود میں آ گیا جس کے نتیجے میں رنگ ونور سے سجی یہ کائنات وجود میں آئی؟؟؟ پھر اسی فکر کا ایک اور بڑا تضاد یہ ہے کہ جب سائنس ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد میں ظاہر ہونے والے واقعہ کا سبب بن سکے تو پھر کائنات کے بارے میں سائنس اپنے اس اصول سے کیوں مکر جاتی ہے اور کائنات کے واقعہ کی

توجیہ ایک ایسے واقعہ سے کیوں کرتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب ہی موجود نہیں۔ چنانچہ یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پہ کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریے کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ان کے وضع کردہ قانون علت(Law of Causation) کی لغویت تو قاری کے سامنے آ گئی اب اگر کائنات اور اس نظام تسلسل پہ ایک اور نگاہِ تدبر ڈالیں تو اس نظریے کے غبارے سے رہی سہی ہوا بھی نکل جائے گی۔

ذرا چند لمحوں کے لیے اگر ان کے نظریہ قانونِ علت ہی کو حقیقت مان لیا جائے تو بھی اس میں اتنی بے شمار کمزوریاں ہیں کہ اسے آسانی سے طفلانہ سوچ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ان کی یہ بات مان لی جائے کہ یہ کائنات محض ایک اتفاق سے وجود میں آ گئی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انھوں نے اختیار کیے۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا، کیا ایسے ممکن نہ تھا کہ ستارے اور سیارے آپس میں ٹکرا کر تباہ و برباد ہو جاتے۔ اس پرسکون مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض ایک حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے اور ایک حیرت انگیز تسلسل کیساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔ آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کر دیا اور آناً فاناً ایک ایسا نظام شمسی مرتب ہو گیا جس کی حرکتوں کے دائرے آج تک انسانی علوم کے دائرے سے دور ہیں اور انسان محض نظروں کے سامنے سجے اپنے ہی ایک نظام شمسی میں الجھ کے رہ گیا ہے جبکہ خود سائنس کا دعویٰ ہے کہ کائنات میں ایسے سینکڑوں نظام شمسی موجود ہیں؟؟؟

کیا ان کا وہ ''اتفاق '' کوئی طلسمی کرشمہ تھا جس نے کائنات کے بعید ترین گوشوں تک اس نظام شمسی کو پھیلا دیا پھر وہ کون سی منطق تھی جس کی بنا پر خود ہماری زمین پر عجیب و غریب تبدیلیاں وجود میں آئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا۔ یہاں ہوا ہے، پانی ہے، پھول ہیں، درخت ہیں، پہاڑ ہیں، پھل ہیں ، بدلتے موسم ہیں، بہتے چشمے ہیں، برستے بادل ہیں، ٹھنڈی ہوائیں ہیں کوئی ایک بھی تو ایسی کمی نہ تھی جو وجود انسان کے ارتقاء کے راستے میں حائل ہوتی بلکہ اس کے برعکس یہاں کے انتظامات خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اللہ کی مرضی کیا تھی وہ اس کرہ ارض پہ اس رونق کو دیکھنا چاہتا تھا جو آج ہمارے گرد و پیش میں چہار سو سجی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خالق کے تخیل کو ہی ثبات ہے۔ سائنس اس معاملے میں بھی آج بے بس دکھائی دیتی ہے کہ وہ اس وسیع و عریض کائنات میں کسی اور ایسی دنیا کا سراغ لگائے جہاں ایسی تبدیلیاں وقوع

پذیر ہوئی ہوں جیسی کہ ہمارے اس کرہ ءارض میں ہوئیں تھیں۔جن کی وجہ سے یہاں انسانی زندگی کا بقاء ممکن ہوا۔کیا سائنس اس سوال کا جواب دے سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کیوں کر اور کس طرح وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں اکھٹی کر دیں جو انسانی تمدن کے لیے درکار تھیں۔پھر وہ کون سی وجہ تھی جو ان حالات کو ہمارے لیے مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے جو انسانی بقاء کے لیے درکار ہیں۔کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسن ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں کھربوں سال تک ان کا سلسلہ بغیر کسی تعطل کے جاری رہے پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آئے۔نہ زمین سے پانی کم ہو۔نہ کوئی انسان کرہ ءارض پہ آکسیجن کی کمی کی شکایت کرے۔نہ کوئی سر پھرا آج تک اس کائنات میں اس کمی کا دعویٰ کر سکا ہو جو اس کے خیال میں انسانی بود و باش میں رکاوٹ کا باعث بنے۔سچ تو یہ ہے کہ انسان اپنی اذیت کا باعث خود ہی بنتا ہے۔چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

القرآن الحکیم (سورۃ روم ۳۰ ۔ ۴۱)

ترجمہ:

”خشکی اور تری میں جو بھی فساد ہے وہ خود تمارے اپنے ہی ہاتھ کی کمائی ہے“۔

❑❑❑❑❑❑❑

سائنس کو خدا جاننے والے دل اگر ہدایت پہ راغب ہوں تو کائنات کی کھلی کتاب کا ہر صفحہ ان کی راہنمائی کے لیے ہر لمحے تیار ہے۔مگر جب کوئی خالق پہ ہی بہتان باندھنے کی روش اپنا لے تو اس کے دل پہ مہر لگا دی جاتی ہے۔ذرا سی نگاہ عمیق ہمارے اردگرد بہت سے ایسے کرداروں کی نشاندہی کر دے گی جو زبان سے چاہے خالق کے وجود کا انکار نہ کریں کہ ہماری سماجی روایات ان کو اس کی اجازت نہ دیں گی مگر عملاً خالق کے وجود سے انکار کرنے والوں کا ایک انبوہ ہے جو ہر وقت مادیت کی بات کرتا ہے اور روحانیت سے انکاری ہے۔ان

کا دماغ خالق کے سامنے پیش ہونے کے کسی بھی احساس سے انکاری ہے۔اس بحث کے آغاز سے ہم اس حقیقت کی تلاش میں ہیں کہ وہ کون سا امر تھا جس کی بنا پہ یہ ہمہ پہلو خوشبوؤں اور رنگوں سے سجی کائنات وجود میں آئی۔اس کا خالق کون ہے اور خالق کا اس کائنات کو پیدا کرنے کا مقصد کیا ہے؟ وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظّم انداز سے حرکت دے رہا ہے کہ نہ چاند سورج سے ٹکراتا ہے، نہ زمین چاند سے۔مگر سائنس کے پاس نہ اس کا جواب کل تھا نہ آج ہے۔تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ علم سائنس بذات خود ایک انتہائی اعلیٰ علم ہے جس نے انسان کو خالق کی طرف راغب کیا ہے نہ کہ خالق سے دور۔

مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کے پیچھے کام کرنے والے دماغ ایسے ادوار میں پیدا ہوئے جب انسانیت کلیسا کے نظام جبر کے تحت سسک رہی تھی۔ چنانچہ سترہویں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان علوم میں مہارت حاصل کرنے والے لوگ طبعاً مذہب بیزار تھے۔اس لیے انھوں نے کبھی تو عمداً اور کبھی سہواً ایسے نظریات پیش کیے کہ لوگ کسی خالق کے وجود سے ایک فاصلے پہ رہیں۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ کائنات کے اس حیرت انگیز اسلوبِ روانی کو بھی محض ایک اتفاق قرار دے کر اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں کہ کہیں پھر سے وہ اس مذہبی نظام جبر کے تحت نہ آجائیں جو صدیوں علم کی راہ میں حائل رہا اور جس نے کبھی آزادانہ علم و تحقیق کی روایت کو پروان نہ چڑھنے دیا یہی خوف آج تک اہل مغرب کے تمام فلاسفہ کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہے جو ان کو حقیقت سے آنکھیں چرانے پہ مجبور کیے ہوئے ہے۔مگر انشا اللہ وہ دن دور نہیں جب خود اہل مغرب کے صاحبِ دانش قرآن کو کسی تعصب کے بغیر پڑھیں گے تو اُن کی آنکھوں سے صدیوں کے پڑے ہوئے پردے ہٹیں گے جو کلیسا کے جبر نے ان کی آنکھوں پہ باندھ رکھے ہیں۔اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ کائنات کی محض کسی اتفاق کے سہارے وجود میں آجانے کی توجیہ اس بات میں مانع ہے کہ کسی کو اس کائنات کا خالق قرار دیا جا سکے۔کیونکہ یہ توجیہ عین اپنی ساخت کے اعتبار سے دو خدا چاہتی ہے کیونکہ حرکت اول کی توجیہ کے لیے تو اتفاق کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اس کے بعد مسلسل حرکت کو کسی بھی حال میں اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔اس کی توجیہ کے لیے لامحالہ ایک دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔چنانچہ اسی مشکل کو حل کرنے کے لیے انھوں نے اصول تعلیل (Principle of causation) پیش کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے کہ ایک کے بعد ایک واقعات پیش آتے چلے جاتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے

کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ان کے مطابق جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالات ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناعی سلسلہ قائم ہو گیا جو اپنی ارتقائی منازل طے کرتا رہا حتیٰ کہ تاریخ عالم کا آغاز ہو گیا۔چنانچہ ان اہل دانش نے کہا کہ تاریخ عالم کے آغاز نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا۔

یعنی جب ابتدائی صورت ایک دفعہ متعین ہوگئی تو قدرت صرف ایک طریق سے منزل مقصود کو پہنچ سکتی تھی گویا ان کے اس تصور کے مطابق جس روز کائنات صاحب وجود ہوئی اس کی آئندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی تھی۔اس اصول کو قدرت کا اساسی اصول مقرر کرنا سترہویں صدی کا ایک بڑا واقعہ تھا جس کے نتیجے میں ایک نیا فلسفہ منظر عام پہ آیا اور سائنس دانوں نے زمین اور تمام نظام کائنات کو مشین قرار دینے کا تہیہ کر لیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں کائنات کو مشین ثابت کرنے کا تصور عروّج پہ پہنچ گیا یہ اس لیے بھی ہوا کہ یہ زمانہ انجینئر سائنس دانوں کا زمانہ تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ کائنات کے مشینی ماڈل بنائیں جائیں۔چنانچہ اس زمانے کے معروف سائنس دان اور انجینئر (Helm Holtes) نے کہا تھا کہ تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو مکینکس میں منتقل کر لینا ہے۔اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنس دانوں کو کافی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی مگر ان کو یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں کرنی ممکن ہے۔وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر وہ اس تمام کائنات کو ایک چلتی پھرتی مشین ثابت کر کے رہیں گے۔ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا کہ اصول تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے انسانیت پر یقین کرنا محال بنا دیا۔اس نظریے نے ایک اور بڑے سوال کو جنم دیا کہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی کو اس سے کیوں کر مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔چنانچہ اس طرز فکر کے نتیجے میں سترویں اور اٹھارویں صدی میں کئی میکانکی فلسفے وجود میں آئے جنہوں نے انسانی فکر پہ دوررس اثرات چھوڑے۔پھر جب یہ دریافت ہوا کہ جاندار خلیہ (Living Cell) بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیائی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزاء جن سے ہمارے یہ جسم و دماغ بنے ہیں کیوں کر اصول

تعلیل کے دائرے سے باہر ہوسکتے ہیں تو وقت کے سائنس دانوں نے یہ گمان کیا بلکہ دعویٰ کیا کہ زندگی بھی تو ایک مشین ہی کی طرح ہے اور اس کی بھی میکانکی تشریح ممکن ہے۔ بعض لوگوں کے دماغوں پہ اس میکانکی نظریے کا اتنا غلبہ تھا کہ انھوں نے برملا اعلان کردیا کہ نیوٹن باخ اور مائیکل اینجلو کے دماغ کسی پرنٹنگ مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف ہیں ورنہ ان کا کام صرف یہ تھا کہ وہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔ یہ الگ قصہ ہے کہ کائنات کی میکانکی تشریح کے پیرو اچانک ہی تاریخ کی راہداریوں میں کہیں گم ہوکے رہ گئے اور آج کی جدید سائنس ان کا صرف مذاق اڑاتی ہے۔ آج کی سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصول علیت کی اب قطعاً قائل نہیں اور جدید تحقیق کی روشنی میں نظریہ اضافت کے اصول وضع کیے گئے اور نظریہ اضافت کے پیرو اب اصول تعلیل کو دھوکے (Elusion) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں ہی سائنس پر یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ کائنات کے بہت سے مظاہر بالخصوص روشنی اور کشش ثقل کی قوت میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنادیتے ہیں اس دور میں جب یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا واقعتاً ایسی مشین تیار کی جاسکتی ہے جو نیوٹن کے افکار باخ کے جذبات اور مائیکل اینجلو کے خیالات کا اعادہ کرسکے مگر سائنس نے اس ضمن میں مکمل خاموشی اختیار کرلی اور ان تصورات کو کوئی عملی شکل نہ دی جاسکی۔ سائنس جو ہمیشہ سے عمل ارتقاء کی جانب رواں دواں رہی ہے اور اس کے آج کے نظریات کل کا مذاق بن کے رہ جاتے رہے ہیں اس نتیجے کے قریب تھی کہ کائنات کی میکانکی تشریح کے باب کو اب بند کردیا جانا چاہیے اس لیے کہ سائنس دانوں کو اس بات کا یقین حاصل ہوچکا تھا کہ کوئی مشین شمع کی روشنی اور سیب گرنے کے واقعہ کو محسوس نہیں کرسکتی چاہے اس مشین پہ منوں سیب گرتے رہیں یا اس کے سامنے سینکڑوں شمعیں روشن کردی جائیں۔ پھر اس قدیم سائنسی نظریے کو بھی خود اپنے ہی گھر سے ہزیمت اٹھانا پڑی جس میں بڑے وثوق سے اہل فلسفہ نے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کرسکتی ہے جو روز اول سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابدتک کے لیے متعین ہوچکا ہے۔

بالآخر سائنس کو خود یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پہ اس کے مستقبل کا سبب نہیں بن سکتا جیسا کہ پہلے پہل خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پہ اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (Non Mechanical Reality) کی طرف لیے جارہا ہے کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے

بارے میں سائنس کے یہ دونوں نظریات جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کرتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اپنے اس تاریخی نظریہ کی خود ہی تردید کر رہی ہے اور اب انسان دوبارہ پھر اسی منزل پہ پہنچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا یہ سفر شروع کیا تھا۔ یاد رہے کہ ابتداء میں انسان کائنات کے ارتقاء کے پیچھے کسی مافوق الفطرت قوت کا یا بہت سی قوتوں کا تصور رکھتا تھا۔

مختلف زمانوں کے سائنس دانوں اور اہل فلسفہ کی آرا پہ اس تنقید سے ایک زبردست فکری مغالطے کے لاحق ہو جانے کا خطرہ بھی موجود ہے جس کا ابطال ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر سائنس دان اور ہر فلسفی کائنات کی اس توجیہ کا قائل ہو جس کی تفصیلات مندرجہ بالا مباحث میں پیش کی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سینکڑوں سائنس دان اور فلاسفہ کائنات کی حقیقی ماہیت پہ غور و فکر کے بعد اس حقیقی نظریہ تک پہنچ گئے تھے جس کا اعلان بعد میں قرآن نے ابدی صداقت کی صورت فراہم کیا اہل فلسفہ کا پورا ایک گروہ خالق کے وجود کا نہ صرف اقرار کرتا تھا بلکہ وہ کائنات کے ہر معاملے میں اس کو دخیل بھی تصور کرتا تھا۔ سقراط افلاطون اور ارسطو جیسے بڑے یونانی فلاسفہ نہ صرف خدا کی ذات پہ یقین رکھتے تھے بلکہ وہ نظریہ توحید کے بھی قائل تھے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے فکر و تدبر کی بنا پہ یہ بات جان لی تھی کہ نظام کائنات کے نظم کے اندر جو بے مثال ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ اس کے پیچھے صرف ایک ہی قوت امر کارفرما ہے۔ ورنہ صورت حال بہت ابتر ہوتی یہی وجہ ہے کہ خالق کائنات کے وجود سے عاری مندرجہ بالا فلسفیوں کے افکار کے متوازی کئی دیگر آراء بھی اپنی علمی حیثیت میں قابل بحث تھیں۔ بلکہ وہ حقیقت سے اس لیے قدرے قریب تھیں کہ فلاسفہ کا یہ گروہ کائنات کی توجیہ کسی اتفاق سے نہیں کرتا بلکہ وہ اس سارے نظام کائنات کے پیچھے ایک قوت قاہرہ پہ یقین رکھتا تھا۔

چنانچہ بعض فلسفیوں نے یہ خیال پیش کیا کہ خدا اگرچہ کوئی متشخص ذات نہیں مگر وہ کائنات کی اس رنگارنگی کے عقب میں قوت محرکہ (Motive Force) یا بالفاظ دیگر علت العلل (Cause of Causes) ہے۔ تاہم بنیادی طور پہ یہ خیال فلسفیوں کا نہیں بلکہ سائنسدانوں کا تھا اس لیے میرے نزدیک ان کی رائے منطقی نہیں ہے اس لیے کہ ان کا ذہن مشینی ہوتا ہے یہ لوگ جذبات سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عقل کے دائرے میں ان کا قبلہ صرف ایک ہی ہوتا ہے یعنی مادی وجود جس کے باہر وہ کسی

چیز کو اہمیت نہیں دیتے۔ فلسفے میں اگر اس تصور کی کوئی بنیاد ہے تو وہ صرف (Seponziea) کے فلسفے میں ہے جس نے کہا تھا کہ خدا کا قانونِ قدرت ایک بڑی مشین یا قوت محرکہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا کو قوت محرکہ یا علت العلل مان لینے سے انسان کا کون سا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اس کی کون سی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔

اس لیے کہ انسان کو تو ایسے خدا کی ضرورت ہے جو اس کی نیاز مندیوں، اس کی دعاؤں، اس کی محبتوں اور اس کی التجاؤں کا مرکز و محور ہو۔ وہ جب چاہے اس کو پکار سکے، اس کے آگے فریاد کر سکے انسان جہاں بھی ہو جس حال میں بھی ہو خالق اس کی فریاد کو سن سکے۔ انسان کو یہ توقع ہو، یہ یقین ہو کہ میں جہاں سے پکاروں گا میرا خالق میری آواز سنے گا اور وہ جو بھی کرنا چاہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ چنانچہ یہ سب ہماری فطرت کا حصہ ہے کہ ہم ایک ایسی ہی صفات والے معبود کے محتاج ہیں۔ مجرد ایک قوت محرکہ یا مجرد قوانین قدرت سے انسان کو کیا حاصل ہو گا کسی مشین کے آگے سجدہ کر کے انسان کو کیا روحانی تسکین حاصل ہو گی۔ خدا اگر انجن کے اندر بھاپ کی طرح ہے تو اس کے آگے فریاد کرنے کا کیا فائدہ ہو گا وہ اپنا کام کرے گا یا ہماری فریاد سنے گا۔ اس ضمن میں دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خالق کائنات کو قوت محرکہ یا قوانین فطرت مان لینے سے کائنات کی توجیہ نہیں بن پاتی۔ مثال کے طور پہ کوئی شخص کسی کار کو دیکھ کے یہ دعویٰ کرے کہ میں اس کی حرکت کے راز کو پا گیا ہوں یہ پیٹرول سے چلتی ہے تو یہ دعویٰ کار کی اصل حقیقت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ سوال صرف کار کے چلنے کا نہیں بلکہ کار کے اندر ایک عظیم سائنسی نظام میں پوشیدہ ہے۔ اس کے اندر حسن و جمال ہے اس کی افادیت ہے۔ اس کا ایک پیچیدہ مکینیکل نظام ہے اور ہزاروں پرزے ہیں جو اس کار کو چلانے میں اپنا اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کی توجیہ یہ مان لینے سے تو نہیں ہو سکتی کہ کار پیٹرول سے چلتی ہے۔ پیٹرول تو محض کار کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ایک اندھی بہری قوت انجن کو مہیا کر دیتا ہے جس کو کنٹرول کر کے مفید مصرف میں لانے کے لیے بھی کار کے انجن کی ساخت کو دخل ہے۔ پس ثابت یہ ہوا کہ حرکت کی علت جان لینے سے اگر ایک کار کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آتا تو کسی قوت محرکہ کے وجود کو تسلیم کر لینے سے اس پورے عالم کائنات کی توجیہ کیسے ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے مذہب یا الہام سے دامن چھڑا کے کائنات کی حقیقی توجیہ ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ اس حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں جو نظام ربوبیت قائم ہے جو عظیم قدرت جو عظیم حکمت جو عظیم صناعی نظر آتی ہے، قدم قدم پہ خالق کی رحمانیت کے جو مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں کیا ان سب کی توجیہ ایک قوت محرکہ کے تصور

سے ہو سکتی ہے؟ کبھی نہیں۔ ذرا اور غور کریں کہ اس کائنات کے تمام چھوٹے بڑے عناصر ہر لحہ اور دن رات انسانوں کی پرورش کے سامان کی فراہمی میں مگن ہیں۔ چاند بھی اسی لیے مصروف کار ہے، ہوا بھی ہر آن اسی کے لیے گردش کر رہی ہے۔ پرورش اور تربیت کا یہ تمام اہتمام ہماری زندگی کے ہر گوشے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ظاہر کی بھی پرورش ہو رہی ہے اور باطن کی بھی۔ ہمارا جسم بھی پل رہا ہے اور ہمارا باطن بھی زیر تربیت ہے۔ ہماری عقل کو بھی غذا مل رہی ہے، ہماری روحانی صلاحیتوں کو بھی بالیدگی عطا کی جا رہی ہے ہمارے لیے ہی زمین کا یہ فرش بچھایا گیا ہے، آسمان کا شامیانہ تانا گیا ہے۔ سورج اور چاند چمک رہے ہیں ، ابر و ہوا ہماری خدمت میں سرگرم ہیں۔ کیا اس سارے اہتمام کی توجیہ کسی قوت محرکہ سے کی جا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کے پیچھے کسی رحم والی بردبار ہستی کا تصور ہی قابل قبول فلسفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب اس بات کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے کہ کوئی رحیم و کریم، علیم و خبیر ، سمیع و بصیر اور حکمت و تدبر سے بھرپور ذات ہے جو اس سارے اہتمام کے عقب میں موجود ہے اور اگر بقول فلاسفہ یہ صفات ان کی کسی قوت محرکہ میں ہی موجود ہیں جو کائنات کا نظام و انصرام سنبھالے ہوئے ہے تو پھر اسے محض ایک قوت کا نام کیوں دیا جائے کیوں نہ اسے اللہ کہا جائے جو بہت عمدہ نام ہے اور کائنات کی توجیہ کے لیے بھی موزوں محسوس ہوتا ہے۔

جہاں تک اہل فلسفہ کا خدا کی ذات کے متعلق عمومی تصور ہے تو ان کی عظیم اکثریت شروع سے لے کر آخر تک یہ مانتی چلی آئی ہے کہ خدا ہے۔ ماضی کے تمام بڑے فلاسفر یہی رائے رکھتے تھے حد یہ کہ ''ہیوم جیسا ارتیابی'' فلاسفر بھی خدا کی ضرورت کا قائل نظر آتا ہے اور اسی کی ذات پہ فلسفہ زندگی کی بنیاد رکھتا ہے۔

تاہم فلاسفہ کا ایک گروہ کسی خالق کے وجود سے ہمیشہ سے انکاری رہا ہے میرے نزدیک صرف وہ فلاسفر خدا کے وجود سے انکاری ہیں جنہوں نے بحیثیت مجموعی زندگی کا فلسفہ پیش نہیں کیا بلکہ محض کسی ضمنی چیز کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ وہ ان کے نزدیک پوری زندگی پہ حاوی ہو گئی ہے۔ مثلاً بعض لوگ نظریہ ارتقاء کو خدا کا بدل قرار دیتے رہے ہیں۔ فرائیڈ نے فرج کو اور مارکس نے بطن کو اپنے فلسفہ کا محور بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل فلاسفہ کا گروہ بھی اس طبقہ فکر کو فلسفی تسلیم کرنے سے انکاری ہیں اس لیے کہ ان کے خیال میں زندگی کے کسی ایک پہلو پہ بات کرنے کو فلسفہ کا موضوع ہی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ اہل فلسفہ کی اکثریت کے ہاں خالق کے وجود کے بارے میں اثباتی رائے پائی جاتی ہے اور تمام اصل فلسفی خدا کو مانتے ہیں اور اس طرح مانتے ہیں جس سے انسانی زندگی کے ساتھ اس کا تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بعض مفکرین کے اس خیال کا

تعلق ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے خدا کے مسئلے کو حل کر دیا ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا میں ارتقاء ہوا ہے۔ زندگی پانی، گندے کیچڑ، خشک مٹی اور کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی موجودہ حالت کو پہنچی ہے اور مٹی کے ایک لوندے سے اتنی شکلیں بن گئی ہیں۔ زندگی جو کبھی رینگنے والے جانوروں کی شکلوں میں چھپی ہوئی تھی اس سے درجہ بدرجہ ترقی کر کے انسان کے احسن تقویم میں بے نقاب ہوئی۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈارون نے اور زیادہ سنجیدگی سے خدا کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کائنات کو اتنا بے رنگ نہ سمجھو یہ ایک مدبر کی قوت کا کرشمہ ہوسکتا ہے کہ وہ مٹی سے گوناں گوں اشکال اور ایک عاقل و فرزانہ انسان بھی پیدا کر سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ارتقاء کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہوتا ہی رہتا۔ مگر کیا ہوا کہ آخر اس عمل ارتقاء کو ایک حد پہ جا کے روک دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہوسکتی ہے کہ ایک مدبر ذات نے اس کو ایک حد تک جانے کے بعد روک دیا ہے۔ ایک اور قابل غور امر یہ ہے کہ آخر مرد اور عورت کا بھی تو ارتقاء ہوا ہے لیکن ان دونوں میں اتنی سازگاری کس طرح پیدا ہوگئی کہ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل رہتا ہے اور دونوں مل کر ہی کائنات کے ایک عظیم مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے سنجیدہ امور کو کسی بھی سطح پہ اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کے پیچھے کسی مدبر اور حکیم و قدیر ذات ہی کا تصور پنپ سکتا ہے جس نے یہ سب کچھ کیا اور یہ تمام کرشمے کسی اندھی بہری قوت محرکہ کے نہیں ہو سکتے۔ فلاسفہ کے ایک اور مذہب بیزار گروہ نے یہ ہوائی اڑائی کہ خدا انسانی عقل سے بالاتر ہے جس سے یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ کیا انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے یا نہیں۔ چونکہ بیشتر فلسفیوں کی رائے کے مطابق خدا موجود ہے یا خدا کی ضرورت موجود ہے یا انسان خدا کو ماننے پر خود کو مجبور پاتا ہے لیکن ان کے خیال میں خدا کی صفات اور اس کی معرفت حاصل کرنا عقل انسانی سے بعید ہے۔ مثلاً فرانسس بیکن نے کہا کہ ہم عقل کے ذریعے خدا کو ماننے پر مجبور ہیں مگر اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ تھامس ہوبس اور ڈیوڈ ہیوم کہتے ہیں کہ ہم عقل کے ذریعے صرف اتنا جان سکے ہیں کہ خدا ہے جو اپنی کائنات کا نظام چلا رہا ہے مگر ہم اس کی ذات کے متعلق کچھ بھی نہیں جان سکے۔ البتہ دے کارت نے کہا کہ عقل کے ذریعے خدا کی بہت سی صفات اور تقاضوں کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

عقل کی نارسائی کا یہ نوحہ بھی طرفہ تماشا نظر آتا ہے اس لیے کہ ایک طرف تو انسان کی عقل کا یہ حال ہے کہ اگر اسے موہنجوداڑو ہڑپہ یا مصر کے اہراموں کی ریت سے کوئی ٹوٹا ہوا مرتبان مل جائے تو اس پہ موجود چند آڑی ترچھی لکیروں کی مدد سے وہ گذرے وقت کی تہذیب، وقت کا فلسفہ، وقت کا کلچر اور ثقافت تک دریافت کر لیتا

ہے۔اسی طرح اسے کہیں سے کوئی ٹوٹی ہوئی ہڈی یا جبڑا مل جائے تو وہ قدیمی انسان کی ساخت اس کی بودو باش اوراس کی عمر تک معلوم کر لیتا ہے۔لیکن دوسری طرف اس کی عقل کی رسائی کا یہ عالم ہے کہ یہ پورا صحیفہ کائنات اس کے سامنے ہے جس میں آسمان ہے، زمین ہے، سمندر ہیں، پہاڑ ہیں، ستارے ہیں، سورج ہے ، چاند ہے، کہکشائیں ہیں، قوموں کے عزل ونسب کے لیے خدائی قوانین ہیں۔ حیرت ہے کہ اس سارے اہتمام سے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان صرف اپنے گرد وپیش کی اشیاء پر ہی غور کرے تو خدا کی سینکڑوں صفات اور تقاضوں کو جان سکتا ہے۔انسان کو اپنی بھوک مٹانے کے لیے چاروں طرف انواع واقسام کی اجناس، غلے، سبزیاں، ترکاریاں، گوشت، پھل میوے اور مشروبات نظر آتے ہیں تو کیا یہ خدا کی رحمت اور اس کی ربوبیت کو ظاہر نہیں کرتے۔سورج کی گرمی اور اس کی روشنی کیا خالق کی قدرت اور حکمت کو ظاہر نہیں کرتے۔ یہ بے ستون آسمان اور اس پہ جگمگاتے ستارے خدا کی عظیم صناعی اور اس کے حسن وجمال کو ظاہر نہیں کرتے۔رحم کی تاریکیوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا موئے قلم جس طرح بچے کی نوک پلک سنوارتا ہے کیا اس سے اس کی صفتِ تخلیق کا اظہار نہیں ہوتا۔چنانچہ خدا کی صفات کا علم حاصل کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان صحیفہ آسمانی کو کھلی آنکھوں کے ساتھ پڑھے اور اس کے تقاضوں کو سمجھے البتہ یہ ضرور ہے کہ خدا کو سمجھنے کا بھی ایک دائرہ ہے اور نہ سمجھنے کا بھی ایک دائرہ ہے۔

نہ سمجھنے کا دائرہ یہ ہے کہ ہم خدا کی ذات کی کھوج میں لگ جائیں کہ خدا کس چیز کا بنا ہوا ہے اس کی ذات کیسی ہے، اس کی شکل کیسی ہے، وہ کس طرح سے اٹھتا اور بیٹھتا ہے اور کس طرح سے بات کرتا ہے اس طرح کے تمام سوالات انسان کی ذہنی استعداد سے باہر ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس طرح کے معاملات کی کھوج میں انسانیت کی فلاح کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ہمیں تو یہ جاننا ہے کہ ہمارے خالق کی مرضی کیا ہے آخر اتنی بڑی کائنات یونہی بے مصرف تو پیدا نہیں کر دی گئی بلکہ جتنی یہ کائنات ارفع واعلیٰ ہے یقیناً اس کے مقاصد بھی اسی نسبت سے ارفع اور بلند ہونگے۔ چنانچہ تلاش کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے خالق کی مرضی کیا ہے؟ اس کے احکام کیا ہیں؟ اس کی پسند وناپسند کیا ہے؟ اس کا انسان سے بنیادی مطالبہ کیا ہے؟ اس کی اصل منشا کیا ہے جن کے تحت زندگی بسر کر کے ہم اس کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر سلسلہ نبوت بھی اللہ کے انسانوں پہ احسان ہی کا تسلسل ہے اس لیے کہ اگر چہ تمام مظاہر قدرت ہماری مادی ضروریات کو بہ احسن پورا کر رہے ہیں مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خالق انسان کی روحانی تشنگی سے آشنا نہ ہو اور اس نے اس بات کا اہتمام نہ کیا

ہو۔مورخین لکھتے ہیں کہ کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر انسان کی راہنمائی کے لیے جدو جہد کرتے رہے انسان تک اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے۔تا کہ وہ صرف مادی الجھاوے میں ہی اپنی زندگی نہ گزار دے بلکہ اس کے تاج شرف کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ کی اس آواز پہ کان دھرے جو صرف اس کی فلاح کے لیے لگائی جارہی ہے۔چنانچہ ابدی صداقتوں سے سجے اور انسان کی منزلوں کے روشن سنگ میل کی صورت تین سو پندرہ آسمانی صحیفوں سے انسان کی راہنمائی کا اہتمام کیا گیا۔انسان جب اپنے شعوری ارتقاء میں ایک خاص مقام پہ پہنچا تو اسے قرآن عطا کیا گیا جو رسول عربی محمد رسول اللہ ﷺ پہ اتارا گیا اور آپ ﷺ نے اسے دنیا کے انسانوں تک پہنچا دیا۔جس نے روحانیت اور مادی تہذیب کے مابین وہ توافق فراہم کیا جس پہ چل کے انسان فلاح کی اس منزل کو حاصل کرسکتا ہے جو اگر چہ اس کا مقدر ہے مگر شیطان کے الجھاوے بھی اس راہ میں موجود ہیں جن سے دامن بچا کے چلنا ہی حقیقی دانش ہے۔

ورنہ زمانہ قدیم کے فلاسفہ کی طرح اور الحاد سے بھرے آج کے متکبر سائنس دانوں کی طرح انسان اپنی منزل سے بھٹک کے رہ جاتا ہے اور اس کے حصے میں فقط پشیمانی آتی ہے۔چنانچہ اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ اسرارِ کائنات ہوں یا خالق کی تلاش کا سفر حقیقت کا کوئی سرا اس وقت تک انسان کے ہاتھ نہیں آسکتا جب تک وہ علم وحی سے استفادہ نہیں کرتا کہ اگر کائنات کے خالق کے تصور کو قبول کرلیا جائے جو اصل حقیقت ہے اور آج کی جدید سائنس نے بھی جس کی تائید کردی ہے تو پھر اسرارِ کائنات بھی فلسفہ کی پیچیدہ راہداریوں اور سائنس کے متزلزل نظریات میں کھوجنے کے بجائے اس اللہ کی تعلیمات میں ہی ملیں گے۔قرآن میں ہی ملیں گے جہاں علم ہے، تیقّن ہے، روشنی ہے، راہنمائی ہے، فلاح ہے، سکون ہے، آسودگی ہے، گہرائی ہے، ابدیت ہے، عبرت ہے، قانون ہے، تاریخ ہے، ڈر ہے، دستور ہے، خوشخبری ہے، ماضی ہے، حال ہے، مستقبل ہے، جنت ہے، دوزخ ہے، برزخ ہے، زمین ہے، آسمان ہے، ستارے ہیں، کائنات ہے، نصیحت ہے، تاکید ہے، ذکر ہے، سلامتی ہے، عشق ہے، خرد ہے، جنوں ہے، دانش ہے، امن ہے، محرک ہے، نسبت ہے، پہچان ہے، دید ہے، شنید ہے، روحانیت ہے، حسن و جمال ہے، کمال خیال ہے، فطرت ہے، عدالت ہے، شہادت ہے، مسیحائی ہے، دلربائی ہے، اشک روائی ہے، کبریائی ہے، دانائی ہے، شفقت ہے، قدرت ہے، رحمت ہے، قہر ہے، خبر ہے۔چنانچہ قرآن کے اندازِ بیان سے ہی ظاہر ہے کہ وہ ایک ایسی ذات کی طرف سے ہے جو تمام اعلیٰ صفات رحم، قدرت، عنایت، مہربانی، شفقت، خبر، سمع اور علم اور ابدیت کا حامل ہے جیسا

کہ فرمایا گیا:

اللّٰہُ لَا إِلَٰہَ إِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّومُ لَا تَأْخُذُہُ سِنَۃٌ وَلَا نَوْمٌ لَّہُ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَمَا فِی الْأَرْضِ مَن ذَا الَّذِی یَشْفَعُ عِندَہُ إِلَّا بِإِذْنِہِ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ أَیْدِیھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیطُونَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہِ إِلَّا بِمَا شَاء وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا یَؤُودُہُ حِفْظُھُمَا وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیمُ O

(القرآن الحکیم سورۃ البقرۃ ۲۔۲۵۵)

ترجمہ:

''اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے، کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پہ حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پہ ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے''۔

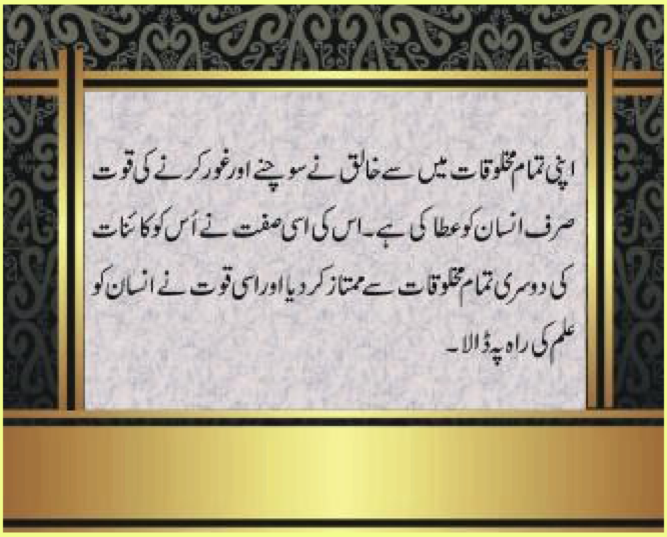
❑❑❑❑❑❑❑

ھُوَ اللَّہُ الَّذِی لَا إِلَٰہَ إِلَّا ھُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ھُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِیمُ Oھُوَ اللَّہُ الَّذِی لَا إِلَٰہَ إِلَّا ھُوَ الْمَلِکُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحَانَ اللَّہِ عَمَّا یُشْرِکُونَ Oھُوَ اللَّہُ الْخَالِقُ الْبَارِءُ الْمُصَوِّرُ لَہُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ یُسَبِّحُ لَہُ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیزُ الْحَکِیمُ O

(القرآن الحکیم سورۃ الحشر ۵۹ آیات ۲۲۔۲۴)

ترجمہ:

’’وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں غائب وحاضر کا جاننے والا وہ رحمان ورحیم ہے
وہی اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں بادشاہ، یکسر پاک سراپا سکھ، امن بخش، معتمد، غالب،
زورآور، صاحبِ کبریاء، اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے
ہیں وہی اللہ ہے، نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں
، اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب وحکیم ہے‘‘۔



ابدیت کی تلاش

کائنات کے ایک وسیع پس منظر میں جب انسان شعوری ارتقاء کی اس منزل کو پہنچا جب اس نے اپنی ذات کے متعلق سوچنا شروع کیا تو اس کے سامنے بہت سے سوالات پھن اٹھائے کھڑے تھے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ اسے کہاں جانا ہے؟ وہ اپنے اندر بہت سے حوصلے اور تمنائیں پاتا ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کی تسکین کس طرح ہوگی وہ اپنی اس زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ ابدیت چاہتا ہے وہ خوشی میں جوانی میں اور نعمت میں اس تسلسل کا آرزومند ہے جو اسے احساسِ تشنگی سے دور لے جائے وہ اپنی موجودہ اور محدود زندگی کے مقابلے میں ایک طویل تر زندگی چاہتا ہے مگر نہیں جانتا کہ اس کو کہاں سے پائے گا وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر پائے جانے والے بہت سے اخلاقی اور انسانی احساسات کو بری طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ یہ سوال اسے ہر لمحہ تنگ کرتا ہے کہ کیا وہ کبھی اپنی پسندیدہ دنیا کو حاصل کر سکے گا۔ یہ

اوراس جیسے بے شمار سوال اس کے ذہن میں ابلتے رہتے ہیں اور کائنات کا مطالعہ کس طرح اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا کرتا ہے اس کو متعین کرنے کے لیے قدرے تفصیل سے کائنات کے ارتقائی مراحل پہ نظر ڈالنا ہو گی۔ چنانچہ ماہرین حیاتیات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انسان اپنی موجودہ شکل میں تین لاکھ برس سے زمین پر موجود ہے مگر اس کے مقابلے میں کائنات کی عمر بہت زیادہ ہے یعنی تقریباً دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال)اس سے قبل کائنات برقی ذرات کے ایک غبار کی شکل میں تھی پھر اس میں حرکت ہوئی اور مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہوا یہی جمع شدہ مادہ بعد میں ستاروں سیاروں اور سحابیوں کی شکل اختیار کر گیا ۔یہ مادی ٹکڑے گیس کے مہیب گولوں کی شکل میں نا معلوم مدتوں تک فضا میں گردش کرتے رہے پھر تقریباً دو ارب سال پہلے ایسا ہوا کہ کائنات کا کوئی بڑا ستارہ فضاء میں سفر کرتا ہوا آفتاب کے قریب آنکلا جو اس وقت بہت بڑا تھا اور جس طرح چاند کی کشش سے سمندروں میں اونچی اونچی لہریں اٹھتی ہیں اسی طرح اس دوسرے ستارے کی کشش سے سورج پہ ایک عظیم طوفان برپا ہو گیا جس سے زبردست لہریں پیدا ہوئیں جو رفتہ رفتہ نہایت بلند ہوتی چلی گئیں اور قبل اس کے کہ وہ ستارہ آفتاب سے دور ہٹنا شروع ہو اس کی قوتِ کشش اتنی بڑھ گئی کہ آفتاب کی ان زبردست لہروں کے کچھ حصے ٹوٹ کر ایک جھٹکے کے ساتھ دور فضا میں بکھر گئے اور یہی ٹکڑے بعد میں ٹھنڈے ہو کر ہمارے نظام شمسی کے توابع بنے۔اس وقت سے یہ ٹکڑے آفتاب ہی کے گرد گھوم رہے ہیں اور انھی میں سے ایک ہماری یہ زمین بھی ہے زمین ابتدا میں ایک شعلے کی صورت سورج کے گرد گھوم رہی تھی مگر پھر فضا میں مسلسل حرارت خارج کرنے کی وجہ سے ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی یہ عمل کروڑوں برس جاری رہا۔

یہاں تک کہ وہ بالکل سرد ہو گئی مگر سورج کی گرمی اب بھی اس پہ پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے بخارات اٹھنا شروع ہوئے اور گھٹاؤں کی شکل میں زمین کے اوپر چھا گئے پھر جب یہ بادل برسنا شروع ہوئے تو ساری زمین پانی سے بھر گئی زمین کا اوپری حصہ اگرچہ ٹھنڈا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ ابھی تک گرم تھا جس کے نتیجے میں زمین سمٹنے لگی اس کی وجہ سے زمین کے اندر کی گرم گیسوں پہ بھی دباؤ بڑھا اور وہ باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہو گئیں اب تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد زمین پھٹنے لگی جگہ جگہ بڑے بڑے نشیب وجود میں آنے لگے اسی طرح بحری طوفانوں خوفناک زلزلوں اور آتش فشاں دھماکوں میں ہزاروں برس بیت گئے ان زلزلوں ہی کی وجہ سے زمین کا کچھ حصہ اوپر ابھر آیا اور بہت سا حصہ دب کے رہ گیا تب دبے ہوئے حصوں میں طوفانی

بارشوں کی وجہ سے پانی جمع ہوگیا اور یہ نشیب بھرتے سمندروں میں بدل گئے اور زمین کے ابھرے ہوئے حصوں نے براعظموں کی شکل اختیار کر لی۔بعض اوقات یہ ابھار اس طرح واقع ہوئے کہ اونچی اونچی سی باڑیں بن گئیں یہ ہماری دنیا کے اولین پہاڑ تھے۔ماہرین ارضیات بیان کرتے ہیں کہ اب سے تقریباً ایک ارب تیئس کروڑ سال پہلے زمین پر زندگی کے آثار پیدا ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جو پانی کے کناروں پر وجود میں آئے اس کے بعد بھی لاکھوں سال تک مختلف قسم کے جانور پیدا ہوتے اور مرتے رہے ابتداً کئی ہزار سال تک زمین پر صرف جانور ہی رہے۔

پھر اس کے بعد سمندری پودے نمودار ہوئے اور خشکی پر بھی گھاس پھونس اگنا شروع ہوئی اسی طرح ایک لمبی مدت تک بے شمار واقعات ظہور میں آتے رہے یہاں تک کہ زمین کے حالات انسانی زندگی کے لیے سازگار ہوئے زمین پر انسان پیدا ہوا۔اس نظریہ کے مطابق زمین پہ انسان کی ابتدا تین لاکھ سال قبل ہوئی۔یہ مدت بہت ہی کم ہے وقت کے جو فاصلے کائنات نے طے کئے ہیں ان کے مقابلے میں انسانی تاریخ چشم زدن سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی پھر اگر انسانیت کی اکائی کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایک انسان کی عمر کا اوسط سو سال سے بھی کم ہے۔

ایک طرف اگر اس واقعہ کو سامنے رکھا جائے اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی کسی بحث سے مبرا ہے کہ کائنات میں انسان سے بہتر کوئی وجود معلوم نہیں کیا جاسکا اور زمین و آسمان کی اربوں کھربوں سال کی گردش کے بعد جو بہترین مخلوق اس کائنات کے اندر وجود میں آئی ہے وہ انسان ہے۔مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ انسان جو ساری دنیا پہ فوقیت رکھتا ہے جو تمام موجودات میں سب سے افضل ہے اس کی زندگی چند سال سے زیادہ نہیں ۔ہمارا وجود جن مادی اجزاء سے مرکب ہے ان کی عمر تو اربوں کھربوں سال ہو اور وہ انسان کے مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائیں مگر ان مادی اجزاء کی یکجائی سے جو اعلیٰ ترین وجود بنتا ہے اس کی عمر سو برس سے بھی کم ہے جو وجودِ کائنات کا حاصل ہے اس کی عمر کی کائنات سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے اور تاریخ کے طویل ترین دور میں بے شمار واقعات کیا اس لیے جمع ہوئے تھے کہ ایک انسان کو چند دن کے لیے پیدا کر کے ختم ہو جائیں زمین پر آج جتنے انسان پائے جاتے ہیں اگر ان میں سے ہر آدمی کا قد چھ فٹ ہو وہ ڈھائی فٹ چوڑا اور ایک فٹ موٹا ہو تو اس پوری انسانی آبادی کو با آسانی ایک ایسے صندوق میں بند کیا جاسکتا ہے جو ایک میل لمبا ایک میل چوڑا اور ایک میل اونچا ہو بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے پھر اگر اس صندوق کو کسی

سمندر کے کنارے لے جا کے ایک ہلکا سا دھکا دیں تو وہ صندوق پانی کی گہرائی میں جا گرے گا صدیاں گذر جائیں گی مگر نسل انسانی اپنے کفن میں لپٹی ہوئی سمندر کی گہرائی میں پڑی رہے گی۔ اور دنیا کے ذہن سے بھی یہ محو ہو جائے گا کہ یہاں کبھی کوئی انسان نامی مخلوق بھی آباد تھی سمندر کی سطح پر اسی طرح بدستور طوفان آتے رہیں گے۔ ہوائیں یونہی چلتی رہیں گی۔ موسم یونہی بدلتے رہیں گے سورج اسی طرح چمکتا رہے گا اور کرہ ارض بدستور اپنے محور کے گرد چکر لگاتا رہے گا۔ کائنات کی لامحدود پہنائیوں میں پھیلی ہوئی بے شمار دنیائیں اتنے بڑے حادثے کو ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دیں گی۔ کئی صدیوں بعد ایک اونچا سا مٹی کا ڈھیر زبان حال سے بتائے گا کہ یہ نسل انسانی کی قبر ہے جہاں وہ صدیوں قبل ایک چھوٹے سے صندوق میں دفن کی گئی تھی۔ کائنات کے اس وسیع تر اور رنگارنگ تناظر میں سوچا جائے کہ کیا انسان کی بس اسی قدر قیمت ہے مادہ کو کوٹیے پیٹیے یا جلایئے کچھ بھی کیجیے وہ ختم نہ ہوگا بلکہ ہر حال میں اپنے وجود کو باقی رکھے گا۔

مگر انسان جو بہر حال مادہ سے برتر مخلوق ہے کیا اس کے لیے بقاء نہیں۔ یہ زندگی جو ساری کائنات کا خلاصہ ہے کیا وہ اتنی بے حقیقت ہے کہ آسانی کے ساتھ اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا انسانی زندگی کا منتہیٰ بس یہی ہے کہ وہ کائنات میں اپنے چھوٹے سے مسکن میں چند دن کے لیے پیدا ہو اور پھر ہمیشہ کے لیے فنا ہو کے رہ جائے۔ تمام انسانی علم اور انسانی کامرانیوں کے سارے واقعات ہمارے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں، کائنات کی ہماہمی اور رونق اسی طرح برقرار رہے۔ گویا نسل انسانی کی مظاہر کائنات کے نزدیک کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔

چنانچہ انسان اس احساسِ گراں کا بوجھ ہر دم اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے کہ کیا یہی زندگی ہے مگر یہ تو ایک ایسی زندگی ہے جس میں ہماری امنگوں کی کبھی تکمیل نہ ہو سکے گی، جہاں ہمارے ارادوں کو پل پل شکست کا سامنا ہے۔ جہاں ہماری جدوجہد کے نتائج شاذ ہی ہمارے تصوراتی تخیل پر پورا اترتے ہیں۔ انسان طبعی طور پر موت سے نفرت کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس کے ارادوں اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ ہر انسان لامحدود مدت تک زندہ رہنا چاہتا ہے وہ موت سے کبھی سمجھوتے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ عام حالات میں وہ دکھ اور اذیت کی زندگی کو بھی موت پر فوقیت دیتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر سانس کے اس تسلسل کو برقرار رکھنے کی سعی کرتا ہے مگر اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ایسی زندگی سے محروم ہے جس میں دوام ہو خوشی ہو سکون ہو۔ اگرچہ ہر کسی کی خواہش یہی ہے کہ وہ دکھ درد اور ہر قسم کی تکلیفوں سے محفوظ زندگی گذارے مگر

حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی یہاں ایسی زندگی حاصل نہیں کرسکتا جس میں وہ اپنے حوصلوں کو ولولوں کو تکمیل کی آخری حد تک لے جاسکے۔ وہ اپنی ساری تمناؤں اپنے سارے خوابوں کی تعبیر عملی صورت میں یہاں دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر اس دنیا کی محدود زندگی اس کا راستہ روکے کھڑی ہے۔ اس لیے انسان جو کچھ چاہتا ہے یہ کائنات اس کے لیے بالکل ناسازگار معلوم ہوتی ہے اور ہر چند قدم بعد ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے مظاہر ہر دم انسانی خوابوں کو توڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی زلزلہ کسی خطے میں تباہی مچا جاتا ہے تو کبھی سیلاب نسلوں کی نسلیں اجاڑ جاتے ہیں، کبھی وبائیں بستیاں انسانی وجود سے خالی کر دیتی ہیں تو کبھی آگ خاکِ نشیمن کو جھلس دیتی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی زندگی محض کسی غلطی سے ایک ایسی کائنات میں بھٹک رہی ہے جو دراصل اس کے لیے بنائی ہی نہ گئی تھی اور جو بظاہر زندگی اور اس کے متعلقات سے بالکل بے پرواہ ہے؟ کیا انسان کے تمام جذبات خیالات احساسات اور تمنائیں غیر حقیقی ہیں جن کا اس واقعی دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ ہمارے تمام بہترین تخیلات کائنات کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور ہمارے ذہن میں یونہی بلاجہ جنم لیتے رہتے ہیں۔ وہ احساسات تصورات خیالات جن کو لے کر نسل انسانی ہزاروں سال سے پیدا ہو رہی ہے اور اپنے سینوں میں لیے ہوئے اسی حال میں دفن ہو جاتی ہے۔ وہ انھیں حاصل نہ کرسکی کیا ان احساسات کی کوئی منزل نہیں کیا۔ وہ انسانوں کے ذہن میں بس یونہی پیدا ہو رہے ہیں جن کے لیے نہ تو ماضی میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مستقبل میں ان کا کوئی مقام ہے۔ حالانکہ ساری کائنات میں صرف انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو خواب دیکھتا ہے جو منصوبے بناتا ہے جو آنے والے کل سے امید کا دامن وابستہ کرتا ہے۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے اپنے کل کی بہتری کے لیے جہد وسعی کرتا ہے۔ وہ کل کے متعلق سوچتا ہے اور کل کا تصور ہی اس کی زندگی میں رنگ بھرتا ہے اس میں شک نہیں کہ بعض جانور مثلاً چیونٹیاں خوراک جمع کرتی ہیں یا بیا اپنی آئندہ نسل کے لیے گھونسلا بناتا ہے مگر وہ یہ سب غیر شعوری طور پر محض عادتاً کرتے ہیں اور اس میں ان کی وہ جبلت راہنمائی کرتی ہے جو روز اول سے ان کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ ان کی عقل اس بات کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انھیں کل کے لیے خوراک کا ذخیرہ جمع کرنا چاہیے تاکہ آنے والے کل کو ان کی ضروریات پوری ہو سکیں اور نہ ہی بیا اس لیے گھونسلا بناتا ہے کہ اسے رہائش کے لیے ایک جائے پناہ درکار ہوتی ہے جو اسے موسم کے شدائد سے محفوظ رکھے بلکہ وہ یہ سب عادتاً کرتا ہے نہ کہ

ضرورتاً۔انسان اور دوسری مخلوقات کا یہ فرق ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو دوسری تمام مخلوقات سے زندگی میں زیادہ پھلنا پھولنا چاہیے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اوسط عمر تو کوّوں سے بھی کم ہے۔جانوروں کی زندگی صرف آج کی زندگی ہے وہ زندگی کا کوئی کل نہیں رکھتے۔کیا اسی طرح انسانی زندگی کا بھی کوئی کل نہیں۔مگر ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے اس لیے کہ فکرِ فردا کا جو تصور انسان کے ہاں پایا جاتا ہے اس کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کی زندگی اس سے کہیں زیادہ بڑی ہو جتنی آج اسے حاصل ہے انسان ''کل'' چاہتا ہے مگر اس کو صرف'' آج ''دیا گیا ہے۔

اسی طرح جب ہم اپنی سماجی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ایک زبردست خلا کا احساس ہوتا ہے ایک طرف مادی دنیا ہے جو اپنی جگہ پہ بالکل مکمل نظر آتی ہے وہ ایک متعین قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کی ہر چیز اپنے راستے پہ چلی جا رہی ہے نہ سورج چاند سے ٹکراتا ہے نہ چاند زمین سے۔نہ رات دن میں داخل ہوتی ہے نہ دن رات میں،ادھر پہاڑ اپنی جگہ جمے کھڑے ہیں تو سمندر اپنی ذات میں گم رواں دواں ہیں بادل اپنے نظام الاوقات کے پابند ہیں تو ہوائیں بھی خالق کی منشا کے مطابق ہی چلتی اور رکتی ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مادی دنیا ویسی ہی ہے جیسی اسے ہونا چاہیے۔مگر انسانی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ہم صریح طور پہ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے اس کا حق غصب کرتا اس سے زیادتی کرتا ہے۔طاقتور کمزور کو اپنا غلام سمجھتا ہے دولت مند غریب کی تضحیک کرتا ہے۔مالک مزدور کی اجرت کھا جاتا ہے۔مزدور بیوی پہ ظلم کرتا ہے اور اسی طرح ایک لامتناعی سلسلہ جنم لیتا ہے۔جو انسان کے مرنے ساتھ ختم ہو جاتا ہے ظالم بھی اسی حال میں مر گیا اور مظلوم بھی اسی حال میں مر گیا کہ ان کے بیچ انصاف نہ ہو سکا۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ دیئے بغیر اور مظلوم کو اس کا حق دلائے بغیر ان کی زندگی کو مکمل کس طرح کہا جا سکتا ہے۔پھر اسی تصویر کو ایک دوسرے رخ سے دیکھیں کہ ایک شخص سچ بولتا ہے پورا تولتا ہے کسی کا حق نہیں مارتا دوسروں کے حقوق ادا کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی زندگی مشکل بن کے رہ جاتی ہے ایک دوسرا شخص جھوٹ بولتا ہے فریب سے کام لیتا ہے جس کی جو چیز پاتا ہے ہڑپ کر لیتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی زندگی عیش و عشرت کی زندگی بن جاتی ہے۔چنانچہ ان دونوں پہ اگر یہ دنیا اسی حال میں ختم ہو جائے تو کیا ان دونوں انسانوں کے اس مختلف انجام کی کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے۔ایک قوم دوسری قوم پہ ڈاکہ ڈالتی ہے اور اس کے

وسائل کے تمام ذرائع پر قبضہ کر لیتی ہے مگر اس کے باوجود وہی نیک نام رہتی ہے اس لیے کہ اس کے پاس نشر واشاعت کے ذرائع ہیں اور دبی ہوئی قوم کی حالت سے دنیا ناواقف ہے کیونکہ اس کو اپنی آہ دنیا تک پہنچانے کے لیے مطلوب وسائل دستیاب نہیں اور یہ آج کی دنیا کی کہانی ہے۔

اپنے اردگرد نظر دوڑائیے کیا یہی نہیں ہورہا۔ امریکہ نے افغانستان پہ کیا اس لیے حملہ کیا اور اس لیے قبضہ کیا ہے کہ طالبان اٹھ کر امریکہ کو تباہ کر دیں بلکہ اس نے افغانستان پہ اس لیے حملہ کیا کہ وہ نظام قرآن کے داعی تھے اور اہل مغرب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر دنیا کے کسی خطے پہ قرآ اپنے حقیقی دستور کے مطابق نافذ ہو گیا تو مغرب کی بالادستی خاک میں مل جائے گی اس کی اقتصادیات تباہ ہو جائیں گی۔ اس کا سماجی نظام جو پہلے ہی ایک ذلت کا نظام ہے مزید رسوا ہو جائے گا اور اس سے دنیا کا اقتدار چھین لیا جائے گا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایران میں پہلے ہی اسلام پسند قابض ہیں اب افغانستان پہ طالبان کا قبضہ ہو گیا ہے جس کے اثرات پاکستان اور ترکی میں بھی محسوس کیے جارہے ہیں اور ہر دو ممالک میں اسلام پسند مضبوط ہو رہے ہے۔

کل کو اگر ان ممالک میں بھی اسلام پسند حکمران آجاتے ہیں تو نیٹو کی طرح کا کوئی دفاعی نظام مسلمان بھی اپنے ہاں متعارف کرا سکتے ہیں جس کے بعد امریکہ کی دست درازیاں رک جائیں گی چنانچہ اس نے افغانستان اور عراق پہ فوج کشی کر کے ان کو تباہ کر دیا اور ایران اور پاکستان پر فوج کشی کے لیے پر تول رہا ہے بلکہ پاکستان میں تو شمال مغربی سرحد پہ ان دنوں اس کے حملے جاری ہیں اور حکومت پاکستان روائتی بے حسی کا ثبوت دیتے ہوئے خاموشی سے اپنے شہریوں کا قتل عام دیکھ رہی ہے اللہ ہم پہ اپنا رحم فرمائے۔ کیا ظالم اور مظلوم اقوام کی حقیقی تصویر کبھی دنیا کے سامنے آئے گی آ بھی جائے تو کیا ہماری دنیا میں کوئی ایسا نظام عدل قائم ہے جو زورآور کو نکیل ڈال سکے اور مظلوم کی دادرسی کر سکے۔ نہیں!

اس لیے یہ ایک فطری ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی تو کل ایسا ہو جہاں مظلوم پکار کر اپنے حق کا سوال کر سکے اور ظالم کسی قوت قاہرہ سے مغلوب ہو۔ آج کی دنیا کو ایٹمی دور کہا جاتا ہے مگر میرے خیال میں اگر اس کو خودسری کا دور کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس لیے کہ آج کا انسان صرف اپنی رائے اور خواہش پر چلنا چاہتا ہے خواہ اس کی رائے اور خواہش کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ہر شخص غلط کار ہے مگر ہر شخص گلے کی پوری قوت کے ساتھ خود کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اخبارات لیڈروں حکمرانوں کے بیانات اور ترسیل خبر کے اداروں کو دیکھیں ہر ایک انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ اپنے ظلم کو عین انصاف اور اپنی غلط کاریوں کو عین

حق ثابت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ کیا اس سارے فریب کا اس سارے گورکھ دھندے کا پردہ کبھی چاک نہ ہوگا۔ انسان کبھی اپنی ان حقیقتوں سے آگاہ نہ ہوگا جن کی بنا پر اس کے بے گناہ خون کو بے دریغ بہایا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ صورت حال صریح طور پہ اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ یہ دنیا نامکمل ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ایک ایسی دنیا ضرور ہونی چاہیے جہاں ہر ایک سے انصاف ہو جہاں ہر ایک کو اس کے درست مقام پہ بٹھایا جائے۔ جہاں عدل کا وہ معیار ہو جس کے خواب دیکھتے دیکھتے انسان کی ہزاروں نسلیں مٹی میں جا ملیں مگر ان کو نہ عدل مل سکا اور نہ حق۔

آیئے ایک بار پھر اس مادی نظم پہ نظر ڈالتے ہیں جس کو دوسرے لفظوں میں ہم کائنات بھی کہتے ہیں جہاں اگر کوئی خلا واقعہ ہو تو اس کو پورا کرنے کے لیے فوراً ہی کوئی قوت متحرک ہو جاتی ہے اور اس خلا کو پورا کرنے کے اسباب دستیاب رہتے ہیں۔ اول تو مادی دنیا میں کوئی کمی ہی نظر نہیں آتی اس کے برعکس انسانی دنیا میں ایک زبردست خلا ہے سوال یہ ہے کہ جس قدرت نے مادی دنیا کو مکمل حالت میں ترقی دی ہے کیا اس کے پاس انسانی دنیا میں موجود اس خلا کو پورا کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں۔ ہمارا احساس بعض افعال کو اچھا اور بعض کو برا سمجھتا ہے ہم کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ وہ ہوں اور کچھ باتوں کے متعلق چاہتے ہیں کہ نہ ہوں مگر ہماری اس فطری خواہش کے الرغم وہ سب کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ جس کو انسانی فطرت برا جانتی ہے انسان کے اندر اس طرح کے احساس کی موجودگی یہ معنی رکھتی ہے کہ چونکہ کائنات کی تعمیر حق پہ ہوئی ہے اس لیے یہاں باطل کے بجائے حق ہی کو غالب آنا چاہیے۔ پھر کیا حق ظاہر نہیں ہوگا کیونکہ جو چیز مادی دنیا میں پوری ہو رہی ہے کیا وہ انسانی دنیا میں پوری نہیں ہوگی۔

دراصل اس تصور کے بغیر انسان کے اندر شدت سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اگر یہی زندگی ہے جو اس وقت نظر آ رہی ہے تو یہ کس قدر لغو زندگی ہے کیونکہ مشاہدے اور سائنسی علوم نے آج اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ کائنات میں انسانی زندگی کے ارتقاء کے لیے اس قدر مکمل اہتمام کیا گیا ہے کہ یوں لگتا ہے قدرت کے ترحم کا تمام تر بہاؤ انسان ہی کی طرف ہے مگر دوسری طرف انسان کی زندگی نہایت مختصر اور اتنی ناکام سی ہے کہ سمجھ نہیں آتا انسان کو آخر پیدا کس لیے کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سوال کے اندر پنہاں تہہ در تہہ پیچیدگی نے بہت سے لوگوں کو اس سے متنفر کر دیا اور آج کے جدید معاشروں کا اس سوال کے متعلق عمومی رجحان یہ ہے کہ اس قسم کے کسی بھی جھنجٹ میں پڑنا ہی فضول ہے اور انھوں نے اپنی زندگی ”بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست“

کے فلسفے تحت گذارنی شروع کردی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب فلسفیانہ موشگافیاں ہیں جن سے عام آدمی کا کوئی واسطہ نہیں ان کا فلسفہ زیست یہ ٹھہرا کہ انسان کو جو لمحہ حاصل ہے وہ اس کو پرمسرت بنانے کی فکر کرے آئندہ کیا ہوگا یا ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط اس فکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نقطہ نظر کے بارے میں کم ازکم جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس انداز میں سوچتے ہیں انھوں نے انسانیت کو اس کے مقام سے بہت نیچے گرادیا ہے وہ مجاز کو حقیقت سمجھ لینا چاہتے ہیں وہ عارضی لذتوں کو ابدی لذتوں پہ ترجیح دے کر دنیا کو گمراہی کے اندھے غار کی طرف دعوت دے رہے ہیں ان کو کبھی بھی خیر کا نمائندہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ وہ خود ہی زندگی کے عمومی نظریے سے جس لاابالیانہ پن کا مظاہرہ کر رہے ان کو اس کا بدلہ ملے گا۔

مجاز ہی کو حقیقت سمجھ لینے والوں کو کب دانشور قرار دیا جاسکتا ہے کائنات کے تمام مظاہر انھیں ابدیت کا راز معلوم کرنے کی طرف دعوت دے رہے ہیں مگر وہ چندروزہ زندگی کی عارضی لذتوں پہ ہی قانع ہوگئے ہیں۔ انسانی نفسیات کا تقاضا ہے کہ اپنی امنگوں اور حوصلوں کی تکمیل کے لیے ایک وسیع تر دنیا کی تلاش کرے مگر یہ نادان روشنی کے بجائے سایہ کو کافی سمجھ رہے ہیں۔ کائنات انسان کو پکار رہی ہے کہ یہ دنیا تمھارے لیے نامکمل ہے تم مکمل دنیا کا کھوج لگاؤ مگر ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم اسی نامکمل دنیا میں اپنی زندگی کی عمارت تعمیر کریں گے ہم کو کسی مکمل دنیا کی ضرورت نہیں۔ حالات کا صریح اشارہ ہے کہ اس زندگی کا ایک انجام ہونا چاہیے مگر یہ لوگ صرف آغاز کو لے کر بیٹھ گئے ہیں اور انجام کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔ حالانکہ یہ اسی قسم کی ایک حماقت ہے جو شترمرغ کے متعلق مشہور ہے۔ سوچا جائے کہ اگر زندگی کا فی الوقع کوئی انجام ہے تو وہ پیش آکر رہے گا اور کسی کا اس سے غافل رہنا اس کو روکنے کا سبب تو نہیں بن سکتا۔ البتہ ایسے لوگوں کے حق میں وہ ناکامی کا فیصلہ ضرور کرسکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو ہی تمام قرار دینا کُل قرار دینا اور آج ہی کی مسرت کے لیے ہر وقت مگن رہنا اور اسی کو مقصد بنالیتا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بے عقلی کی بات ہے۔ آدمی اگر اپنی زندگی اور کائنات پہ تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس پر مندرجہ بالا نظریہ کی لغویت فوراً ہی ظاہر ہوجاتی ہے اور ایسا فیصلہ وہی شخص کرسکتا ہے جو حقیقتوں سے آنکھیں بند کرلے اور مادر پدر آزاد زندگی کا آرزومند ہو۔ اگرچہ اہل مغرب نے آزادانہ روش کی زندگی اختیار کرکے دیکھ لیا ہے اور ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا سوائے رسوائی اور رشتوں کی وارفتگی میں کمی کے۔ انھوں نے سیکس کو دیوتا مان کر جو طرزِ زیست اختیار کیا ہے اس نے

انھیں کیا دیا ہے سوائے خاندانی نظام کی تباہی کے اور خاندان جب ان کے معاشرے کی اکائی نہ رہا تو اس کے نوجوان نے ہپی ازم میں پناہ ڈھونڈی جہاں کوکین اور افیون کی لت نے مغربی اقوام کی پوری ایک نسل تباہ کر کے رکھ دی خیر مغرب کا سماجی ڈھانچہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اس لیے جب نظام کائنات پہ ایک نظر ڈالنے سے یہ بات تو ظاہر ہو چکی کہ کائنات کا ایک خالق ہونا چاہیے مگر بہت عرصہ تک انسان اس کے وجود سے آشنا نہ تھا۔ کون ہے جو کائنات کے اتنے بڑے نظام کو اتنے سہل اور رواں طریقے سے حرکت دے رہا ہے۔ ایک احساس نے ہمیشہ سے انسان کو اپنے گھیرے میں رکھا کہ وہ کون ہے جس کی رحمت وجود انسان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ آخر کوئی تو ہے جس کے احسانات سے ہم ڈھکے ہوئے ہیں اور مجسم شکر و سپاس بن کر اس ہستی کو ڈھونڈنا چاہتے ہیں جس کے آگے اپنے عقیدت کے جذبات کو نثار کر سکیں۔ مگر ایسا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا ہم اس کائنات کے اندر انتہائی عجز اور بے بسی کے عالم میں ہیں۔ ہم کو ایک ایسی پناہ گاہ کی تلاش ہے جس کے سائے میں پہنچ کر ہم خود کو محفوظ تصور کر سکیں۔ مگر ایسی کوئی پناہ گاہ ہماری نگاہوں کے سامنے موجود نہیں۔ پھر جب ہم اپنی زندگی اور عمر کو دیکھتے ہیں تو کائنات کا یہ تضاد ہم کو ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی عمر تو کھربوں سال ہو اور انسان جو کائنات کا خلاصہ ہے اس کی عمر صرف چند سال۔ فطرت ہم کو بے شمار امنگوں اور حوصلوں سے معمور کرے مگر دنیا کے اندر اس کی تسکین کا سامان فراہم نہ کرے۔ مادی دنیا پہ نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی ایک سنگین تضاد موجود ہے کہ مادی دنیا انتہائی طور پہ مکمل ہے اور اس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا۔ مگر انسانی زندگی میں زبردست خلا موجود ہے کہ اشرف المخلوقات کی حالت ساری مخلوق سے بدتر نظر آتی ہے۔ انسان کی بدقسمتی کی انتہا تو یہ ہے کہ اگر پیٹرول کا کوئی نیا چشمہ دریافت ہو یا بھیڑ بکریوں کی نسل بڑھے تو انسان خوش ہوتا ہے مگر انسان کی نسل کا اضافہ خود انسان کے لیے قابل قبول نہیں۔ ہم اپنی مشکلوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ انسان کی پیدائش روک دینا چاہتے ہیں۔

چنانچہ ان حالات میں سوالات ہیں جو انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ جو اس کے اندر بھی ابل رہے ہیں اور جن کا دباؤ وہ خارج میں بھی محسوس کرتا ہے۔ انسان کی نارسائی اسے ہر وقت ایک انجان سی بے بسی کا احساس عطا کرتی ہے کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ انسان کو زندگی تو عطا کر دی گئی مگر یہ نہ بتایا گیا کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے۔ زندگی کی حقیقت اور اس کی ابدیت کی کھوج میں انسان نے ہزاروں سال بتا دیئے مگر جواب ندارد چنانچہ زندگی کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے جب ہم اپنی عقل اور اپنے تجربات کی

طرف دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اساسِ زیست کا درست اور قطعی جواب معلوم کرنا ہماری عقل اور مشاہدے کے بس سے باہر ہے اور اس سلسلے میں عقل انسانی نے اب تک جو آراء قائم کی ہیں وہ اٹکل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔اس لیے کہ جس طرح ہماری نظر کا دائرہ محدود ہے اور ہم ایک مخصوص جسامت سے چھوٹی چیز کا مشاہدہ نہیں کر سکتے اور ایک مخصوص فاصلے سے آگے کے اجسام کو بھی نہیں دیکھ سکتے اسی طرح کائنات کے متعلق بھی ہمارا علم ایک تنگ دائرے میں محدود ہے جس کے آگے یا پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ ہمارا علم نامکمل ہے اور ہمارے حواس خمسہ ناقص ہیں۔ہم حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے مثال کے طور پر میدہ اور کالک کو اگر ملایا جائے تو وہ بھورے خاکستری رنگ کا ایک صفوف سا بن جاتا ہے لیکن اس سفوف کا باریک کیڑا جو سفوف کے ذروں ہی کے برابر ہوتا ہے اور انسان کو خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتا۔وہ کیڑا اس سفوف کو کچھ سیاہ اور کچھ سفید رنگ کی چٹان سمجھتا ہے اور اس کے مشاہدے کے پیمانے کے مطابق خاکستری سفوف کوئی چیز نہیں۔کچھ ایسا ہی حال انسان کا اس کائنات میں ہے کہ اگرچہ اس کو عقل سے نوازا گیا جس نے طرح طرح کے سوال اٹھا کر انسان کو عاجز کر رکھا ہے مگر اس میں اور کائنات میں کوئی نسبت بنتی نظر نہیں آتی کہ نوع انسانی کی زندگی اس زمانے کے مقابلہ میں جب یہ کرہ ارض وجود میں آیا اس قدر مختصر ہے کہ موازنہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اور پھر کرۂ ارض بھی تو کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں ایسی صورت میں انسان کائنات کی حقیقت کے بارے میں جو خیال آرائی کرتا ہے اس کو اندھیرے میں اندھے کے ٹٹولنے سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا اور کائنات کی وسعتوں کا تصور کرنے سے انسان کی انتہائی لاعلمی فوراً ہی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اگر ہم اس بات کو سوچیں کہ آفتاب اسی کھرب سال سے موجود ہا س زمین کی عمر جس پہ ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے اور اس زمین پہ زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تین کروڑ سال بیت چکے ہیں مگر اس کے مقابلے میں زمین پہ ذی عقل انسان کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں ہے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے چند ہزار سال کا زمانہ جس میں انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں اس طویل زمانہ کا بہت حقیر جز ہے جو دراصل کائنات کے اسرار معلوم کرنے کے لیے درکار ہے۔کائنات کے بے حد طویل ماضی اور نامعلوم مستقبل کے درمیان انسانی زندگی محض ایک لمحہ کی حیثیت رکھتی ہے ہمارا وجود ایک نہایت حقیر قسم کا درمیانی وجود ہے جس کے آگے اور پیچھے کی ہمیں کوئی خبر نہیں اور ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات اور زندگی کی اصل ماہیت اور رازِ ابدیت جاننے کے لیے ہماری

عقل اور ہمارا تجربہ بالکل ناکافی ہیں۔

منزلوں کے نشاں

اب تک کی انسانی سعی اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہم اپنی محدود صلاحیتوں کے ذریعے کبھی بھی اسرارِ کائنات کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارا علم اور ہمارا مشاہدہ ہمیں ایک ایسے مقام پر لا کے چھوڑ دیتا ہے جہاں ہمارے سامنے بہت سے سوالات ہیں۔ ایسے سوالات جو ہر سوچنے والے ذہن سے جواب طلب کرتے ہیں اور اس احساس کو جنم دیتے ہیں کہ اگر ان سوالوں کا کوئی جواب نہ مل سکے تو انسانی زندگی بالکل لغو اور بیکار ہے۔ مگر جب ہم سوچنے بیٹھتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہن سے ان سوالات کا جواب حاصل کر ہی نہیں سکتے اس لیے کہ ہم کو وہ آنکھ ہی نہیں ملی جو اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکے جس کا تعلق اسرارِ کائنات سے ہو یا ابدیت کی تلاش سے ہو ہمیں وہ ذہن ہی حاصل نہیں جو حقیقت کا براہ راست ادراک حاصل کر سکے۔ چنانچہ اس موقع پر پہنچ کر انسان یہ سوچتا ہے آخر ان سوالوں کی حقیقت سے انسان کو نا آشنا رکھنے سے خالق کی کون سی مصلحت وابستہ ہے مگر ذرا سے غور پہ یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اگر عام آدمی اور انبیاء کا علم برابر ہو جائے تو پھر ان کی بات کون سنے گا۔ اس لیے انسانی ذہن میں ان کلبلاتے سوالات کا جواب لے کر اللہ کے

پیغمبر انسانوں کے درمیان اترتے رہے اور جنہوں نے ان کی نصیحت پہ کان رکھا ان کو اپنے ہر سوال کا جواب مل گیا۔ چنانچہ سوالوں میں گھرے اور کائنات کی وسعتوں سے گنگ انسان کے سامنے اللہ کا پیغمبر آتا ہے اور انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے انسان تیرے ذہنِ پریشاں کے ہر سوال کا جواب میرے پاس ہے تو میری بات غور سے سن اور میری نصیحت پہ کان دھر پھر تجھے جوابوں کی آسودگی عطا کر دی جائے گی۔ کیونکہ مجھے وہ خاص علم عطا کیا گیا ہے جس میں انسان کے تمام سوالوں کے جواب پنہاں ہیں۔ پیغمبر انسان کو بتاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے جس نے اس سارے عالم کو بنایا ہے اور اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعہ اس کا انتظام کر رہا ہے۔ جو چیزیں تمہیں حاصل ہیں وہ اسی نے تمہیں دی ہیں اور سارے معاملات کا اختیار اسی کے پاس ہے۔ یہ جو تم دیکھ رہے ہو کہ مادی دنیا کے اندر کوئی تضاد نہیں اور وہ ٹھیک ٹھیک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے اور اس کے برعکس انسانی دنیا تمہیں ادھوری نظر آتی ہے اور اس میں زبردست خلفشار برپا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو آزادی دے کر اسے آزمایا جا رہا ہے کہ تمہارا مالک تمہارا خالق تم سے یہ چاہتا ہے کہ اس کا قانون جو مادی دنیا میں براہ راست نافذ ہو رہا ہے اس کو انسان اپنی زندگی میں اپنی خوشی سے اختیار کرے۔

یہی وجودِ کائنات کا تقاضا ہے یہی اس کے خالق کی منشا ہے اور یہیں پہ ابدیت کی تلاش تمام ہوتی ہے کہ اگر تم نے ان اصولوں کی پیروی کی جن میں خالق کی منشا ہے تو زندگی کی ابدیت تجھے حاصل ہو گئی چونکہ وہی اس کائنات کا مدبر اور منتظم ہے اور وہی تمہارے جذبہ شکر کا اصل مستحق ہے اور وہی ہے جس کی پناہ میں تم سکون حاصل کر سکتے ہو اس نے تمہارے لیے ایک لامحدود زندگی کا اہتمام کر رکھا ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے۔ جہاں تمہاری امنگوں آرزوؤں اور تمناؤں کی حقیقی تسکین کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جو زندگی میں ابدیت لائے گی جہاں دکھ اور پریشانی کا گذر تک نہ ہوگا۔ جہاں تمہاری خوشی کو وہ دوام حاصل ہوگا جس کی تشنگی تم دنیا میں محسوس کرتے رہے ہو۔ جہاں حق اور باطل الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔ جہاں ظالم کو ذلیل کیا جائے گا اور مظلوم کو اس کا حق دلایا جائے گا۔ جہاں نیکوں کو ان کی نیکی اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے گا۔ تو اے لوگو تمھارے اللہ نے میرے ذریعے تمہاری طرف اپنی کتاب بھیجی ہے جس کا نام قرآن ہے جو اس پہ ایمان لائے گا کامیاب ہو جائے گا اور جو اس کا انکار کرے گا اس کو ذلیل کر دیا جائے گا۔ یہ وہ آواز تھی جو عرب کے ریگستانوں میں گونجی جب عربوں کے تھکے ماندے قافلے نیم شب نخلستانوں میں اترتے تو لوگ

ایک دوسرے سے اس آواز کا تذکرہ کرتے کہ سرزمین مکہ میں کوئی محمد ﷺ نامی شخص ہے جو ایسی باتیں جانتا ہے کہ انسان کو حیران کر دے۔ کہتے ہیں اس کے کلام میں اتنی شرینی ہے کہ لوگ اپنے ہی دانتوں سے اپنی انگلیاں چبا لیتے ہیں۔ اس کے لہجے میں ایسا ٹھہراؤ ہے کہ بادِ صبا بھی شرما شرما جائے جس کی اِک اِک ادا پہ اس کے ماننے والے قربان ہو جاتے ہیں۔ محمد ﷺ کی یہ آواز چودہ سو برس پہلے عرب کے ریگزاروں سے بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں گونج گئی۔ جس میں کائنات اور زندگی کے ہر الجھے ہوئے سوال کا جواب موجود تھا۔ جس میں پیغام تھا کہ اگر حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہو تو میری آواز پر کان لگاؤ اور میں محمد ﷺ جو کچھ کہتا ہوں اس پہ غور کرو۔

سوال یہ تھا کہ کیا یہ آواز حقیقت کی واقعی تعبیر ہے؟ کیا ہمیں اس پہ فوراً ایمان لے آنا چاہیے یا ان بنیادوں کی کھوج میں لگ جانا چاہیے جو اس آواز کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کریں۔ یہ سوال اس وقت بھی گونجا تھا جب آپ ﷺ اہل عرب کو پوری دردمندی سے پکار رہے تھے اور یہ سوال آج کی متمدن دنیا میں بھی بہت سے لوگوں کا راستہ روکے کھڑا ہے اس لیے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حقیقت کو وہ اس وقت تسلیم کریں گے جب وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے مگر یہ مطالبہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فلکیات کا مطالعہ علم ریاضی کے بغیر کرنے کی کوشش کرے اور وہ کہے کہ وہ فلکیاتی سائنس کی صرف ان دریافتوں کو ہی تسلیم کرے گا جو کھلی آنکھوں سے اسے نظر آتی ہوں اور علم ریاضی کی کوئی دلیل اسے قبول نہیں۔ یہ مطالبہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی کو اپنی قوت کا صحیح علم نہیں ہے اس لیے کہ انسان کے پاس مشاہدے کی جو قوتیں ہیں وہ نہایت محدود ہیں اور حقیقت ہمارے لیے ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے ہم اسے محسوس تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ایک زمانے میں یہ تصور کیا جاتا تھا کہ کائنات دنیا کی چار چیزوں سے مل کر بنی ہے "آتش و آب و خاک و باد" دوسرے لفظوں میں قدیم انسان اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ حقیقت ایک ایسی چیز ہے جسے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے مگر جدید تحقیق نے اس انسانی غلط فہمی کی تصیح کر دی اور آج کے جدید سائنسی تمدن میں ہم جانتے ہیں کہ ہماری اس کائنات کی تمام چیزیں اپنے آخری تجزیے میں ایٹم کے باریک ترین ذرات پر مشتمل ہیں۔ ایٹم ایک اوسط درجہ کے سیب سے اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے جتنا کہ وہ سیب ہماری زمین سے۔ مگر ہر ایٹم خود اپنے اندر ایک کائنات سجائے بیٹھا ہے جس کے متعلق ابھی انسان صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ ہر ایٹم کے اندر ایک طرح کا نظام شمسی موجود ہے جس کا ایک مرکز ہے اور اس مرکز میں نیوٹران اور پروٹان ہوتے ہیں اور اس کے

چاروں طرف الیکٹران مختلف مداروں میں اس طرح حرکت کرتے ہیں کہ جیسے سورج کے گرد اس کے تابع سیارے حرکت میں رہتے ہیں۔ایک برقیہ جس کو الیکٹران بھی کہا جاتا ہے اس کا قطر سینٹی میٹر کا پانچ ہزار کروڑواں حصہ ہو اور جو اپنے مرکز کے گرد چاروں طرف ایک سیکنڈ میں کروڑوں مرتبہ چکر کاٹتا ہو اس کے تصور کی کوشش بھی سعی لا حاصل ہی ہے۔جب کہ ہمیں ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ ایٹم کے اندرونی عالموں کی آخری حد کیا ہے ممکن ہے ان عالموں کے اندر ان سے بھی چھوٹے عالم موجود ہوں جو ابھی انسان کی حدِ ادراک سے پوشیدہ ہوں۔چنانچہ جہاں صرف ایک ایٹم یعنی ایک ذرے کے اندرونی عالموں پہ انسانی علم ختم ہو جاتا ہو وہاں انسان کو ایسا علمی تکبر زیب نہیں دیتا کہ وہ خالق کے وجود کا ہی انکار کر بیٹھے یا اس کے معمور کردہ پیغمبروں کی تعلیمات پہ انگلیاں اٹھائے۔انسان کی قوت مشاہدہ اتنی کمزور ہے کہ وہ ابھی ایٹم کی کلی ماہیت کو بیان کرنے سے بھی قاصر ہے۔ابھی وہ نہیں جانتا کہ پروٹان اور نیوٹران کے وہ انتہائی چھوٹے ذرے جو باہم مل کر مرکز بناتے ہیں وہ کس طرح وہاں قائم رہتے ہیں۔آخر یہ پروٹان اور نیوٹران مرکز سے باہر کیوں نہیں نکل جاتے۔وہ کون سی طاقت ہے جو انھیں ایک دوسرے سے باندھے رکھتی ہے۔سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ان مادی ذرات کے درمیان ایک قسم کی توانائی موجود ہے اور یہی توانائی مرکز کے برقی اور غیر برقی ذرات کو آپس میں جکڑے ہوئے ہے۔

اس طاقت کو یکجائی (Binding Energy) کا نام دیا گیا ہے۔گویا ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مادہ اپنے آخری تجزیے میں توانائی ہے۔مگر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا توانائی قابل مشاہدہ چیز ہے کیا کسی خوردبین کے ذریعے توانائی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور کیا (Binding Energy) کے نظریے کو ایک ثابت شدہ صداقت قرار دیا جاسکتا ہے۔اب اگر خود سائنس اس بات کو تسلیم کر رہی ہے کہ توانائی کا مشاہدہ ممکن نہیں تو گویا اس نے خود ہی بتا دیا کہ کائنات کی حقیقت اپنی آخری صورت میں ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے جس کو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔اب اگر کوئی کم عقل یہ شرط لگاتا ہے کہ اللہ کا رسول ﷺ جو بھی حقیقت بیان کرتے ہیں اور وہ جن حقیقتوں کی خبر دے رہے ہیں وہ ہمیں چھونے اور دیکھنے کو ملنی چاہییں تب ہی ہم ان پر ایمان لائیں گے تو یہ ایک نہایت احمقانہ مطالبہ ہے جسے نہ سائنس کی مادی روایات کی تائید حاصل ہے اور نہ ہی مذہب اور روحانیت کے میدان سے اس کے لیے کوئی دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔تاہم کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا نبی کی دعوت کو عقل کی بنیاد پہ پرکھا جاسکتا ہے یا نہیں اور وہ کونسی بنیادیں ہیں جن کی روشنی میں انسان

یہ فیصلہ کرے کہ وہ نبی کی دعوت قبول کرے یا اس پہ مزید غور وفکر کرے میرے نزدیک نبی کی دعوت کو جانچنے کے تین خاص عقلی پہلو موجود ہیں۔

اول؛ نبی کی توجیہ حقیقت کائنات سے کتنی مطابقت رکھتی ہے۔

دوم؛ زندگی کے انجام کے بارے میں اس کے دعویٰ کے پیچھے کیا دلیل ہے۔

سوم؛ نبی کے کلام میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پہ اسے اللہ کا کلام قرار دیا جا سکے۔

چنانچہ جب ہم ان تینوں پہلوؤں کے اعتبار سے نبی کے کام جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان میں سے ہر ایک پر نہایت کامیابی سے پورا اتر رہا ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے کائنات کی جو توجیہ کی ہے اس میں تمام انسانی پیچیدگیوں کا حل موجود ہے۔ ہمارے اندر اور ہمارے باہر جتنے بھی سوالات ابلتے ہیں اس کی تعلیمات میں ان سب کا جواب موجود ہے۔ زندگی کے انجام کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا جو دعویٰ ہے اس کے لیے وہ ایک قطعی دلیل بھی اپنے پاس رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ زندگی میں وہ اس انجام کا ایک نمونہ ہمیں دکھا دیتا ہے جس کو بعد کی زندگی میں آنے کی خبر وہ دے رہا ہے۔ پھر وہ کلام جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے اس کے اندر اتنی غیر معمولی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ یقیناً وہ ایک فوق الانسانی کلام ہے اور ایسا اعلیٰ کلام انسان کے بس سے باہر کی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کی صداقت کے لیے اگر چہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر انسانوں کا ایک انبوہ ہے جو تشکیک اور تذبذب کا شکار ہے ان میں مسلم بھی شامل ہیں اور غیر مسلم بھی۔ ان میں آج کے عقلاء بھی ہیں اور کل کے فلسفی بھی۔ کسی نے سائنس کو خدا بنا لیا تو کوئی معیارِ زیست اور مادی الجھاوے میں الجھ کر رہ گیا۔ کسی نے معیشت کو خدا قرار دیا، تو کسی نے آبائی اقدار کو، کسی نے بتوں کی پوجا کی تو کسی نے آگ کی، کسی نے سورج کو خدا کہا، تو کسی نے ہواؤں اور سمتوں کو پوجا، کسی نے جنس میں انسانیت کی تشنگی کے اسباب کھوجے، تو کسی نے دولت کی مساوی تقسیم کو انسانی دکھوں کا مسیحا قرار دیا۔

چنانچہ افکار کے اس ہجوم میں اگر نبی مکرم ﷺ کے افکار کو ایک روشن دلیل کی صورت پیش نہ کیا جائے تو اندھیرا بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے عقل پرستوں کو روحانیت کی اس گلی میں نکلنا پڑے گا جہاں روشنی ہے ورنہ ان کے اپنے ہی نظریات ان کی قتل گاہیں بن جائیں گے اور تاریخ کے مختلف ادوار میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ مارکس جو دن رات دنیا کی دولت کا حساب جتاتا رہتا تھا اس کو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے شہر کے کوڑا

دان الٹنا پڑتے تھے۔ پیغمبر کی صداقت کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات انسانی نفسیات کے عین مطابق ہوتی ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی پیدائش جس فطرت پہ ہوئی ہے وہی فطرت اس کی توجیہ بھی ہے اور اس توجیہ کی بنیاد ایک خدا کے وجود پہ رکھی گئی ہے اور ایک خدا کا شعور انسان کی فطرت میں شامل ہے اس کے دو مضبوط قرینے ہیں ایک یہ کہ انسانی تاریخ کے تمام معلوم زمانوں میں انسانوں کی اکثریت نے بلکہ ان کی تقریباً تمام تعداد نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے انسان پہ کبھی بھی ایسا کوئی دور نہیں گذرا جب اس کی اکثریت خدا کے شعور سے خالی رہی ہو۔ قدیم ترین زمانوں سے لے کر آج تک انسانی تاریخ کی متفقہ شہادت یہی ہے کہ خدا کا شعور انسانی فطرت کا نہایت طاقتور شعور ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جب بھی انسان پہ کوئی نازک وقت آتا ہے تو اس کا دل بے اختیار اس خدا کو پکار اٹھتا ہے جسے عام حالات میں وہ ماننے پر ہی تیار نہیں ہوتا۔ جب اس کو کوئی مادی سہارا دکھائی نہیں دیتا تو وہ عالم غیب سے اس سہارے کو پکارتا ہے۔ چنانچہ جاہل ہو یا عالم، خدا پرست ہو یا ملحد، روشن خیال ہو یا بنیاد پرست جب بھی اس پہ ایسا وقت آتا ہے جب عام انسانی قوتیں جواب دیتی ہوئی نظر آتی ہیں تو اس کے اندر وہ شعور انگڑائی لے کر بیدار ہوتا ہے جسے اس نے جھوٹے دلائل دے دے کر سلایا ہوتا ہے۔ وہ طاقتور شعور اس کی راہنمائی اس طاقت کی طرف کرتا ہے جو سب سے بڑھ کر طاقتور ہے جو قوت کا منبع ہے۔ پس انسان اپنے نازک ترین لمحات میں خدا کو یاد کرنے پر مجبور ہے اس کی ایک دلچسپ مثال ہمیں سٹالن کی زندگی میں ملتی ہے جس کا ذکر برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل نے دوسری جنگ عظیم کے حالات سے متعلق اپنی کتاب کی چوتھی جلد میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ۱۹۴۲ء کے نازک حالات میں جب ہٹلر سارے یورپ کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا تو چرچل نے ماسکو کا سفر کیا اس موقع پر چرچل نے سٹالن کو اتحادی فوجوں کی کاروائی کے متعلق اپنے منصوبے کی تفصیلات بتائیں۔ چرچل کا بیان ہے کہ منصوبے کی تشریح کے ایک خاص مرحلہ پر جب سٹالن کی دلچسپیاں اس منصوبے میں بہت بڑھ چکیں تھیں تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا کہ ”خدا اس مہم کو کامیاب کرے

(May God prosper this undertaking)

پھر دیکھیں کہ نبی ﷺ کی آواز میں یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ ان تمام سوالوں کی توجیہ ہے جو انسان معلوم کرنا چاہتا ہے اور جو کائنات کے مطالعہ سے ہمارے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ مظاہرِ کائنات کے مطالعہ نے ہمیں اس نتیجہ تک پہنچایا تھا کہ کائنات محض اتفاق سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ ضرور کوئی اس کا پیدا کرنے والا ہے کوئی

بہت ہی ارفع منصوبے والی قوت کائنات کو رواں رکھے ہوئے ہے پھر جن لوگوں نے کائنات کی یہ تشریح کی کہ وہ ایک مادی مشین کی طرح ہے ان کو بھی فطرت کی طرف سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر یہ نظریہ بھی اوراقِ تاریخ میں کہیں اوجھل ہو گیا بلکہ آج خود سائنس ان بنیادوں پہ سوچنے لگی ہے کہ کائنات اتنی وسیع اور اس کا انتظام اتنا پیچیدہ ہے کہ ضرور اس کے پیچھے کسی غیر معمولی قوت کا وجود ہے جو اسے چلا رہی ہے۔

جانے کب سے انسان کو اپنے اس محسن کی تلاش تھی جس کے احسان وہ اپنی پور پور میں محسوس کرتا چلا آیا تھا۔ اسے ایک ایسی ہستی کی تلاش تھی جو اس کا سہارا بن سکے۔ اس توجیہ میں اس کا احساس کا جواب بھی موجود ہے۔ ایک مدت تک انسان کو یہ خیال ستاتا رہا کہ کائنات کے مقابلے میں انسان کی عمر اتنی کم کیوں ہے اور وہ اس کو لامحدود دیکھنا چاہتا ہے۔ اس ابدیت کی تلاش میں تھا جہاں اس کی امنگوں کی تکمیل ہو سکے۔ نبی ﷺ کی تعلیم میں اس کی توجیہ بھی موجود ہے پھر انسانی حالات کا شدید تقاضا تھا کہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت ہو جائے اور اچھے برے لوگ الگ الگ کر دیئے جائیں۔ اس سوال کا جواب بھی اس توجیہ میں موجود ہے۔ الغرض زندگی سے متعلق تمام سوالات کا حل نبی ﷺ کی تعلیم میں موجود ہے اور اتنی مکمل حالت میں موجود ہے کہ اس سے بہتر جوابات کا انسانیت تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہ یقینی بات ہے کہ علم وحی سے وہ سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں جو کائنات کے پیچیدہ نظام سے انسانی ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ نبی ﷺ کی دعوت کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسلام زندگی کے انجام کے بارے میں وہ جو نظریہ پیش کرتا ہے اس کا ایک واقعاتی نمونہ خود نبی ﷺ کی زندگی میں ہمیں دکھائی دے جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں بیان کیا گیا کہ یہ دنیا اسی طرح ظالم اور مظلوم کو لیے ہوئے ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اس کے انجام پر کائنات کا مالک ظاہر ہو گا۔ تب سچوں اور جھوٹوں کو الگ الگ کر دیا جائے گا اور اس دن کے آنے میں جو دیر ہے وہ صرف اس مہلتِ کار کے ختم ہونے کی ہے جو انسان کے لیے مقدر کی گئی ہے۔

چنانچہ نبی ﷺ یہ بات کہہ کے اس کو یونہی نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اس کے ساتھ ان کا یہ دعویٰ بھی شامل ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اس کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس عدالت کا ایک نمونہ مالک کائنات میرے ذریعے سے اسی دنیا میں تم کو دکھائے گا اور میری ہی ذات سے وہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کر کے دکھائے گا۔ وہ اپنے فرماں برداروں کو عزت دے گا اور اپنے نافرمانوں کو ذلیل کر کے انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا اور یہ واقعہ بہر حال ظہور میں آئے گا دنیا کے لوگ چاہے اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کریں اور چاہے وہ اپنی ساری

طاقت اس کو روکنے میں لگا دیں۔ جس طرح آخرت کا ہونا قطعی طور پہ مقدر ہے اسی طرح میری زندگی میں اس کا نمونہ دکھایا جانا بھی لازمی ہے یہ ایک نشان ہو گا اس آنے والے دن کا اور یہ دلیل ہو گی اس بات کی کہ کائنات کی تعمیر عدل پہ ہوئی ہے۔ اور یہ کہ جس طاقت کا میں نمائندہ ہوں وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی طاقت سب پہ بالا ہے اور یہی طاقت ایک روز تم کو اپنے سامنے کھڑا کر کے تمام اگلے پچھلے انسانوں کا فیصلہ کرے گی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ نبی ﷺ اپنی قوم کے سامنے یہ چیلنج اس وقت رکھتے ہیں جب کہ وہ بالکل تنہا تھے، پوری قوم ان کی دشمن ہو گئی تھی، خود ان کا اپنا ملک ان کو جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نبی ﷺ کے قریب ترین اعزا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، ان کے پاس مادی وسائل و ذرائع میں سے کچھ بھی نہ تھا ۔مگر ان مخدوش حالات میں بھی ان کے لہجے میں موجود یقین اس بات کو متعین کرتا تھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کے پیچھے ایک مضبوط دلیل موجود ہے جس کا یقین چاہے روح زمین پہ کوئی نہ کرے مگر نبی کو اس پہ پورا شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس بے سروسامانی کے باوجود نبی ﷺ با آواز بلند اعلان کرتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ میں ہی غالب رہوں گا اور میرے ذریعے ہی خدا کی عدالت اسی زمین پہ قائم ہو گی۔ لوگ ان کا دعویٰ سنتے ہیں مگر ان کی بے سروسامانی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ نبی ﷺ ان کے اس ردِ عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ دشمن اپنا دباؤ ان پہ بڑھا دیتے ہیں اور ملک کی اکثریت ان کے قتل کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ آپ ﷺ کو جلاوطنی پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ آپ ﷺ کی دعوت کی راہ کو روکنے لیے تمام دستیاب وسائل استعمال کرتے ہیں۔

وہ نبی ﷺ کو ناکام بنانے کے لیے ہر حربہ اختیار کرتے ہیں اور اس پہ اپنا سارا زور صرف کر دیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی سب چالیں بے اثر رہتی ہیں ان کے تمام منصوبے ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں اور اللہ کی طرف سے ان کے سروں پہ خاک ڈال دی جاتی ہے جس طرح ان کے دلوں پہ پردہ ڈالا گیا تھا۔ وہ ناکام رہتے ہیں اور فتح و نصرت نبی ﷺ کے قدم چومتی ہے۔ اگرچہ بہت تھوڑے لوگ آپ ﷺ کا ساتھ دیتے ہیں اور ایک معمولی اکثریت آپ کی ہمنوا تھی۔ جب کہ دوسری طرف تمام ملک آپ کا دشمن تھا ایک طرف ساز و سامان ہے اور لاؤ لشکر ہے۔ دوسری طرف بے سروسامانی ہے اور معمولی اقلیت، ایک طرف دشمن کو ملکی باشندوں کی حمایت حاصل ہے اور دوسری ہمسایہ اقوام کی پشت پناہی بھی۔ جب کہ اس طرف اپنوں اور غیروں کی متفقہ مخالفت۔ حالات کی اس انتہائی ناسازگاری کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ کے ساتھی گھبرا اٹھتے ہیں

مگر نبی ﷺ کے لبوں پہ یقین کی وہی پراسرار مسکراہٹ سجی ہے جو دعوت کے اولین روز سے ان کے ہمراہ تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ آ کر رہے گا اور کوئی طاقت اس کو روک نہیں سکتی۔ پھر اس چمکتے سورج اور جگمگاتے چاند نے دیکھا، ابر و ہوا نے دیکھا، مکہ کے ایک ایک پتھر، ایک ایک شجر نے دیکھا اور خود پورے عرب نے دیکھا کہ نبی کے دعویٰ کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ وہ مکمل شکل میں پورا ہوا۔ تاریخ میں اس طرح کی مثال کم ہی ملتی ہے کہ کوئی شخص اس طرح کا دعویٰ کرے اور وقت اس کو اتنی جامعیت کے ساتھ پورا کرے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے جس دعویٰ کے ساتھ اپنی دعوت اور کارِ نبوت کا آغاز کیا تھا دشمن اپنی پوری قوت کے باوجود اس میں ذرا بھر بھی کمی نہ کر سکے۔ حق اور باطل الگ الگ ہو گیا۔ خدا کے فرماں برداروں کو عزت اور غلبہ حاصل ہوا اور خدا کے نافرمانوں کا روز توڑ کر انھیں محکوم بنا دیا گیا۔ اللہ نے نبی ﷺ کو ان کا وطن بھی واپس دلا دیا اور ان کے یقین محکم کو دلیل بھی فراہم کر دی۔ اس طرح اسلام کی دعوت نے انسانوں کے لیے جس انجام کی خبر دی تھی اس کا یک نمونہ دنیا میں قائم کر دیا گیا جو قیامت تک کے لیے غور کرنے والوں کے لیے نشانِ عبرت ہے اور اس نمونہ کی حتمی تکمیل روزِ محشر ہو گی جب سارے انسانوں کو خدا کی عدالت میں حاضر کر کے ان کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔

قرآن مخبر صادق ہے

اب ہم کلام الٰہی پہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ قرآن کی پہلی آیت کے اترنے سے لے کر آج پندرہ سو سال بعد تک اس پہ اپنی زبان دراز کرتے رہے ہیں اور خود کو بے دانش لوگوں کے گروہ میں داخل کرتے رہے ہیں۔ جن کا کہنا یہ تھا کہ نبی ﷺ خود ہی قرآن کے الفاظ گھڑ لیتے ہیں۔ کچھ یہ کہتے کہ آپ ﷺ کو کوئی اس کی تعلیم دیتا ہے۔ کوئی قرآن حکیم فرقان عظیم کو کسی گمنام راہب کی کارستانی قرار دیتا۔ ان سب میں مشترک یہ تھا کہ قرآن بہرحال اللہ کی کتاب نہیں ہے اس لیے ہم تو اس پہ ایمان لانے سے رہے۔ خود آج کا دانشور اپنی نام نہاد دانش کے بل بوتے پر قرآن کا انکار کرنے پہ تلا ہوا ہے اور اس کے نزدیک کوئی علمی دلیل اہمیت نہیں رکھتی۔ [46*] حالانکہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کے اوپر کتنی صدیاں گذر چکی ہیں مگر اس کی عظمت اس کی سچائی اور حقیقت کے بارے میں اس کے بیان کا ایک حرف بھی غلط ثابت نہ ہو سکا۔ جب دنیا میں اور کوئی بھی انسانی کتاب ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں اس طرح کا دعویٰ کیا جا سکے۔ دوسرے لفظوں میں قرآن بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے اس کے بہت سے پہلو

ہیں تاہم طوالت سے بچنے کے لیے ان میں سے چیدہ چیدہ خصائص پیش کیے جاتے ہیں۔اس بات میں اب اہل عقل کو کوئی شبہ نہیں ہے کہ قرآن اپنی دلیل آپ ہے۔قرآن ایک غیر معمولی کلام ہے اس کو پڑھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نازل کرنے والا ایک ایسے بلند مقام سے بول رہا ہے جو قوت انسانی کی سرحد سے بہت پرے ہے۔

اس کی عبارتوں کا شکوہ اس کی بے پناہ روانی اور اس کا فیصلہ کن اندازِ بیاں حیرت انگیز طور پہ انسانی کلام سے اتنا مختلف ہے کہ اس میں شک کی گنجائش ہی ختم ہوجاتی ہے کہ یہ مالک کائنات ہی کی آواز ہے کسی انسان کی آواز نہیں ۔ پر یقین اور با عظمت کلام خود اس امر کا گواہ ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے جس میں اس نے اپنے بندوں کو مخاطب کیا ہے۔قرآن میں کائنات کی حقیقت بیان کی گئی ہے،انسان کے انجام کی خبر دی گئی ہے اور انسان کی زندگی سے متعلق تمام کھلے اور چھپے حالات پر گفتگو کی گئی ہے،تاریخ کے دریچوں سے نشان عبرت پیش کیے گئے ہیں۔مغضوب اقوام کے حالات سے بحث کی گئی ہے،توحید سے انکار کرنے والی اقوام کے بد انجام کی خبر دی گئی ہے اور انسان کو وہ دستور عطا کیا گیا ہے جو اس کی راہنمائی اس راہگذر کی طرف کرتا ہے جس کے دوسرے سرے پہ فلاح اور کامیابی اس کی منتظر ہے۔یہ سب کچھ اس قطعی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ بیان واقعہ کا اظہار خود واقعہ معلوم ہونے لگتا ہے۔قرآن کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان کو حقیقت کا علم نہیں دیا جا رہا بلکہ اس کو حقیقت کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔وہ واقعہ کو قرآن کے صفحات میں نہیں پڑھ رہا بلکہ خود واقعہ کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔کلام کی یہ قطعیت صاف ظاہر کر رہی ہے کہ یہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جس کو کائنات کی ہر حقیقت کا علم ازبر ہے اور کوئی انسان جو ان حقیقتوں کا علم نہ رکھتا ہو ہرگز اپنے کلام میں ایسا زور پیدا نہیں کرسکتا جس کا نمونہ قرآن کی سطر سطر اور حرف حرف میں موجود ہے۔مثال کے طور سورۃ ''الانفطار '' کا مطالعہ کریں۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝

جب آسمان پھٹ جائے ، جب ستارے بکھر جائیں گے۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝

جب دریا ابل پڑیں گے ، جب قبروں کو الٹ دیا جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝

اس دن ہر شخص جان جائے گا جو اس نے آگے بھیجا۔

يَاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝

اور جو اس نے پیچھے چھوڑا اے انسان خدا کے بارے میں تجھے کس نے دھوکے میں ڈالا۔

الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝

جس نے تجھے خلق کیا پھر تیرا تسویہ فرمایا۔

فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝

پھر جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝

اور تم فیصلے کے دن کا انکار کرتے ہو۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝

حالانکہ تمھارے اوپر نگہبان مقرر ہیں۔

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝

صحیح صحیح لکھنے والے۔

يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِىْ نَعِيْمٍ ۝

اچھے لوگوں کے لیے نعمتیں ہیں۔

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِىْ جَحِيْمٍ ۝

اور یقیناً برے لوگوں کے لیے جہنم ہے۔

يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝

وہ فیصلے کے روز اس میں ڈالے جائیں گے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝

اور وہ ہرگز بھاگ نہیں سکتے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝

کیا تم جانتے ہو فیصلے کا دن کیا ہے۔

ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝

پھر کیا تم جانتے ہو فیصلے کا دن کیا ہے۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ ۝

اس روز کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہ کر سکے گا۔

وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۝

اس دن حکم صرف اللہ ہی کا ہوگا۔

❑❑❑❑❑❑❑

قرآن کی ان آیات پہ غور کریں اور اس کے یقین بھرے اندازِ بیان کا مشاہدہ کریں۔ اللہ کا یہ کلام جس میں زندگی کی ابتدا اور انتہا کو بیان کیا گیا ہے کوئی بھی انسانی کتاب جس میں زندگی اور کائنات کو موضوع بنایا گیا ہو اپنے بیان میں قرآن جیسا یقین اور تحکم پیدا نہیں کر سکتی۔ صدیوں سے انسان کائنات کی ماہیت پر غور کر رہا ہے بڑے بڑے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے اس موضوع پر اپنی فکر پیش کی مگر کوئی بھی اس یقین کے ساتھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا جس طرح کا حتمی انداز قرآن نے اختیار کیا ہے۔ سائنس آج بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ کائنات کے بارے میں وہ ابھی کسی قطعی اور صحیح علم سے بہت دور ہے مگر اعجازِ قرآن یہ ہے کہ انسانی معاملات ہوں یا کائنات کے پیچیدہ اسرار وہ اس قدر یقین کے ساتھ بات کرتا ہے گویا اس نے تمام علوم کا احاطہ کیا ہوا ہے اور وہ حقیقت سے آخری حد تک واقف ہے۔ عقل و دانش کی راہگذر کا کوئی مسافر کبھی قرآن کے کلام الٰہی ہونے پہ دلیل نہیں مانگے گا بلکہ بہت ابتدائی مرحلوں پہ ہی اس کی عقل اس بات کی شہادت دے گی کہ یہ کلام صریحاً کلام الٰہی ہے اس لیے کہ قرآن نے مابعد الطبیعی حقائق سے لے کر تمدنی مسائل تک تمام امور پہ گفتگو کی ہے۔ مگر کہیں بھی اس کے بیانات میں تضاد نہیں پایا جاتا گذرے پندرہ سو سالوں میں انسان نے بہت سی نئی نئی باتیں معلوم کی ہیں مگر وہ قرآن کی کسی بات میں کبھی تضاد تلاش نہ کر سکا

۔اگرچہ انسانوں میں کسی ایک فلسفی کے بارے میں بھی اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا کلام تضاد سے پاک ہے۔ بلکہ فلاسفہ کا طرزِ عمل تو یہ بھی رہا ہے کہ وہ خود اپنے ہی نظریات سے رجوع کرتے رہے ہیں اس دوران ہزاروں فلسفی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی عقل سے زندگی اور کائنات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی مگر بہت جلد ان کے کلام کا تضاد ظاہر ہوگیا اور زمانے نے اس کو رد کردیا۔ چنانچہ یہ اصول وضع ہوا کہ کسی کلام کا تضاد سے پاک ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حقیقت سے کلی مطابقت رکھتا ہے جو شخص حقیقتوں کا علم نہ رکھتا ہو یا اسے صرف جزئی علم حاصل ہو وہ جب بھی حقیقت کی تشریح کرنے بیٹھے گا تو لازمی طور پہ تضادات کا شکار ہو جائے گا۔ وہ ایک پہلو کی تشریح کرتے ہوئے دوسرے پہلو کی رعایت نہ کر سکے گا وہ ایک رخ کو کھولے گا تو اسی موضوع کے کئی رخ بند کردے گا۔ زندگی اور کائنات کی توجیہ بھی ہمیشہ سے ایک ہمہ گیر سوال رہا ہے مگر اس کے جواب کے لیے اس کی ساری حقیقتوں کا علم ہونا ضروری ہے اور انسان اپنی محدود صلاحیتوں اور کم علمی کی وجہ سے کائنات اور زندگی کے کلی علوم کا کبھی احاطہ نہ کرسکا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے فلسفوں میں تضاد کا پایا جانا ایک لازمی امر ہے جس کا ثبوت تاریخ کے ہر موڑ نے فراہم کیا ہے کہ انسان کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کا فلسفہ کائنات بھی اپنے رنگ وروپ اور بنیادی قدروں کو بدلتا رہا ہے مگر اس کے برعکس قرآن نے انسان اور کائنات کی جو توجیہ کی ہے وہ اس قسم کے تضادات سے پاک ہے جو اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ قرآن ہی حقیقت کی صحیح ترین تعبیر کرنے کا اہل ہے کہ وہ خالق کا کلام ہے جس کو اپنی مخلوق کے تمام حالات اور سوالات کا حتمی علم حاصل ہے۔ اسی لیے قرآن نے جب بھی انسانی معاملات سے بحث کی ہے اور اس کے لیے فرائض متعین کیے ہیں تو اس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ٹھیک ٹھیک رعایت کی ہے کہ ایسا نہ ہو اس کا کوئی حکم زندگی کے کسی اور پہلو سے ٹکراتا ہو۔ اس امر کو اس مثال کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کریں کہ انسانی معاشرے میں عورت اور مرد کی حیثیت متعین کرنا تمدنی زندگی کا ایک اہم مسئلہ تھا جس کو قرآن نے ایک اور انداز سے متعین کیا اور آج کے متمدن معاشرے نے اس کی اور طرح تشریح کی۔ چنانچہ اس تضاد کے نتائج ہی اصل حقائق تک انسان کی راہنمائی کر سکتے تھے کہ آیا اس معاملے میں قرآن کا نقطہ نظر درست تھا یا مادیت سے آلودہ وہ فلسفہ جس نے حقائق پہ نگاہ عمیق ڈالے بغیر ہی یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ مرد اور عورت ہر حوالے سے برابر ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان مساوات ہونی چاہیے اور زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں کو یکساں طور پہ کام کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ مگر

سائنس اور مادی تہذیب کا یہ تمدنی اصول یہاں انسانی ساخت کے حوالے سے ایک اہم واقعی صورت سے ٹکرا رہا ہے اس لیے کہ خود آج کی ماڈرن سائنس کے انکشافات نے اس حقیقت کو عیاں کر کے رکھ دیا ہے کہ علم حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان قطعاً کوئی مساوات نہیں ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں یکساں طور پہ زندگی کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اس کے برعکس قرآن نے تمدنی زندگی میں عورت اور مرد کا جو مقام متعین کیا ہے وہ دونوں کی پیدائشی ساخت کے عین مطابق ہے اس لیے قانون اور حقیقت کے مابین دور دور تک کوئی تضاد تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور پہلو سے انسانی علوم کی نارسائی کا مطالعہ کریں تو آج کے دور میں مادیت کے سرغنہ (Marks) جس نے ایک ایسا نظام فکر متعین کیا جس میں خدا کی کوئی گنجائش نہ تھی مگر اس کی فکر میں پوشیدہ علمی تضاد ذرا سے غور کے بعد ہی واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مارکس نے انقلاب کا فلسفہ یہ بیان کیا ہے کہ جس طرح ایک عالمگیر قانون (کشش ثقل) کے تحت تمام ستارے اور سیارے اپنے محور کے گرد گھوم رہے ہیں اسی طرح کچھ ناگزیر تاریخی قوانین ہیں جو سماجی تبدیلیوں کا سبب بنتے ہیں یہ قوانین انسانی سماج میں مسلسل اپنا کام کر رہے ہیں اور اسی وجہ سے انسانی معاشروں میں انقلاب آتے ہیں مگر اس فلسفہ کو مرتب کرنے کے بعد یہ نعرہ بھی مارکس ہی لگاتا ہے کہ؛

دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ

ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ اگر سماجی تبدیلیوں کا کوئی ناگزیر تاریخی قانون موجود ہے تو پھر کسی سیاسی جدوجہد کی ضرورت نہیں انقلاب اپنے وقت پہ آ ہی جائے گا اور اگر کسی معاشرے میں انقلاب کے لیے سیاسی جدوجہد کی ضرورت ہے تو اس ناگزیر تاریخی قانون کے کیا معنٰی ؟ اس کے برعکس قرآن انسانی ارادے کو تسلیم کرتا ہے اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اسے کائنات پہ غور و فکر کی ترغیب فراہم کرتا ہے۔ اسے عمل پہ ابھارتا ہے اس کا فلسفہ یہ ہے کہ زندگی میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور مادی دنیا کی طرح ان واقعات کی کوئی لازمی منطق نہیں بلکہ انسانی کوشش اپنے ارادے کو کوئی بھی شکل دینے میں بالکل آزاد ہے یقیناً فطرت کے کچھ قوانین ہیں اور اس سلسلہ میں وہ بھی اپنا اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت یہ ہے کہ وہ انسانی کوششوں کا ساتھ دے کر انھیں منزل تک پہنچا دیں نہ کہ خود انسانی کوششیں ان قوانین کا خارجی ظہور ہیں۔ اس طرح قرآن کے نظریہ اور اس کی دعوت میں کوئی تضاد نہیں وہ جب اپنے نظریہ کو قائم کرنے کے لیے لوگوں کو پکارتا ہے تو ساتھ ہی وہ اپنے فلسفہ کی تصدیق

بھی کرتا ہے نا کہ تردید۔ مارکس کے نظریات پر نظر ڈالیں تو اس کا سارا فلسفہ اس کے عملی پروگرام سے ٹکرا رہا ہے کیمونسٹ پارٹیوں کا وجود حقیقی معنوں میں مارکسی فلسفہ کی تردید ہے۔ کیمونسٹ نظریات کے منشور کا آخری فقرہ اس کے پہلے فقرے کو رد کر دیتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات کو اگر آپ انسانی فلسفوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیں گے تو انسانی فکر میں اس نوع کے سینکڑوں تضادات کو موجود پائیں گے۔ آیئے قرآن کے ایک اور اعجازی پہلو سے بحث کرتے ہیں کہ کیا خطہ ارض پہ قرآن کے سوا کوئی ایسی کتاب موجود ہے جو پندرہ سو سال پہلے بھی موجود تھی مگر وہ آج تک کسی تحریف سے پاک ہو۔ جس کا حرف حرف کسی امانت کی طرح محفوظ ہو جس کی سطر سطر اپنی زندگی اور تسلسل کا ثبوت پیش کر رہی ہو۔ جس کی فکر بوسیدہ نہ ہوئی ہو، جس کے اوراق کو گھن نے نہ چاٹا ہو، جس کی زبان اور لہجہ بھی پندرہ سو سال سے اسی طرح زندہ ہو جیسے کل کی بات ہو تو اس سوال کا سیدھا اور سادہ جواب یہی ہو گا کہ نہیں قرآن کے سوا کسی اور ایسی انسانی یا الہامی دستاویز کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ان تمام خصوصیات کی حامل ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن پندرہ سو سال سے زمین پر موجود ہے۔

اس عرصے میں زمانے نے سینکڑوں انقلابات دیکھے تاریخ میں کتنی الٹ پلٹ ہوئی اور آدم کی کتنی نسلوں نے اپنا سفر تمام کیا۔ انسان تمدنی طور پہ کہاں سے کہاں نکل گیا اس نے سماجی اور معاشی حوالوں سے انگنت منزلیں طے کیں مگر یہ سارے حوادث یہ سارے زمانے یہ ساری ترقیاں مل کر بھی قرآن کے کسی اعلان کسی دعویٰ کو غلط ثابت نہ کر سکیں۔ اگرچہ تاریخ کے بہت سے موڑوں پہ بہت سے حقیقت نا آشنا لوگوں نے قرآن کو سائنس یا دیگر حوالوں سے غلط ثابت کرنے کی کوششیں ضرور کیں مگر وقت نے ان تمام نظریات کو قرآن کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ قرآن نے ہر زمانے کے عقلی امکانات اور تمدنی ضروریات کا مسلسل ساتھ دیا ہے اس کے دعووں کی ہمہ گیری کبھی کسی مقام پہ ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کی تعلیمات نے اپنے اندر ہر زمانے کے تمدنی معاشی اور عقائدی الجھنوں کا حل پوشیدہ رکھا کہ جس کو ہدایت کی تمنا ہو قرآن اٹھا کر دیکھ لے۔ یہ قرآن عظیم فرقان حکیم کی ایسی خصوصیت ہے جس کی مثال انسانی علوم سے دی ہی نہیں جا سکتی۔ جو اس امر پہ مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ قرآن ہی آج کی واحد الہامی کتاب ہے جس میں انسانیت کے دکھوں کی تمام تر مسیحائی کو سمو دیا گیا ہے۔ انسان نے زندگی اور کائنات کے بارے میں سینکڑوں فلسفیانہ پہلو پیش کیے مگر پھر وہ خود ہی ان کو رد کرنے کی راہیں بھی تلاش کرتا رہا۔ صدیوں پہ صدیاں گذریں اور گذرتی جا رہی ہیں مگر قرآن کی صداقت

اور اس کے محکم فلسفہ زیست میں کوئی فرق در نہ آنے پایا۔اگرچہ اول اول قرآن کے قوانین اس وقت وضع کیے گئے جب عرب کے غیر متمدن اور منتشر قبائل کے ابتر سماج میں اسلامی ریاست قائم کرنے کا مسئلہ درپیش تھا مگر اس کے بعد قرآن صدیوں تک اسلامی حکومتوں کی تمام ضروریات پوری کرتا رہا اور موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی وہ نہ صرف یہ کہ زمانے کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے بلکہ آج بھی قرآن ہی ایک ایسا نظام زیست پیش کرتا ہے جو حقیقی معنوں میں زندگی کے تمام مسائل کا حقیقی جواب ہے۔

قرآن نے پندرہ سو سال قبل جس طرح اپنی برتری ثابت کی تھی اسی طرح آج بھی وہ موجود تمام فلسفوں پر فوقیت رکھتا ہے۔اگرچہ ماضی میں کچھ مغربی اور کچھ مشرقی ''اہل دانش'' اس بات کا دعویٰ کرتے چلے آئے ہیں کہ قرآن کی تعلیمات اور قوانین کو صرف ان عرب بدوؤں کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس کے اصل مخاطب تھے اور یہ کہ ان کا حقیقی فائدہ بھی اس عصر کے لیے مخصوص تھا جب وہ نازل ہو رہا تھا یعنی وہ کہنا چاہتے تھے کہ قوانین قرآن کی کسی دائمی حیثیت کو تسلیم کرنا محض بے وقوفی ہے یہ قرآن پہ صریحاً ایک بہتان تھا جو اگر صرف غیر باندھتے تو اتنا دکھ نہ ہوتا مگر افسوس تو اس بات کا ہے مسلمانوں میں سے بھی کئی مغرب پسند اہل دانش نے کچھ ایسا ہی نقطہ نظر اختیار کیا اگرچہ ان کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی سو گنا کم ہی ہوگی۔قرآن کا یہ معجزہ کہ زندگی اور کائنات کے بارے میں قرآن نے جو بھی نظریات پیش کیے اس نے فرد اور معاشرہ کے باہمی انضباط کے لیے جو بھی اصول وضع کیے وہ نہ تو کبھی پرانے ہوئے اور نہ ہی ان میں کسی نقص اور تضاد کی نشاندہی کی جا سکی اس دوران کتنے فلسفے پیدا ہوئے اور مر گئے کتنے نظام بنے اور بگڑ گئے۔

مگر قرآن کے نظریہ کی صداقت اور اس کے عملی نظام کی افادیت آج بھی مسلّم ہے وہ ہوا اور پانی کی طرح زمانے کی قید سے آزاد ہے۔اس کی تعلیمات مسلّمہ اور اصول ابدی ہیں جن کو زمان و مکاں کی قید سے آزاد رکھا گیا ہے بلکہ خود زمانہ اپنا سفر قرآن کی طرف اور قرآن کی صداقتوں کو ابدی صداقتوں میں بدلنے کی طرف ہی کر رہا ہے۔عام طور پہ خیال کیا جاتا ہے کہ سائنس اور مذہب کے بیچ بہت سے تضادات ہیں سائنس تجربے اور مشاہدے کے بعد ایک حقیقت کو اجاگر کرتی ہے۔جب کہ مذہب اپنے اساسی قوانین کی بنیاد الہام کو قرار دیتا ہے۔مذہب کا نظام قدرے پیچیدہ اور سائنس دو اور دو چار کا نام ہے۔دراصل یہ خیال ایک فکری مغالطے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اس لیے کہ نہ تو مذہب اور روحانیت میں کوئی پیچیدگی ہے اور نہ ہی سائنس کے نظریات اتنے سیدھے اور آسان ہیں کہ ان پہ بے سوچے سمجھے یقین کر لیا جائے۔اس سارے معاملے میں

اگر کوئی یقینی بات ہے تو وہ یہ ہے کہ وحی والہام کی ہر بات حتمی اور قابل یقین ہوتی ہے۔ جب کہ سائنس کا کوئی اصول اگر آج پورے یقین سے بیان کیا جارہا ہے تو یہ بات یقینی نہیں آنے والے کل میں بھی وہ یقین کے اسی درجہ پہ قائم رہے بلکہ ہوتا تو یہ آیا ہے کہ سائنس کے بہت سے نظریے جن کی بنا پر کل تک کچھ ناہنجار لوگ خدا کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے تک آمادہ تھے وہ نظریات آج خیال وخواب ہوئے اور ان کی جگہ نت نئے نظریات نے لے لی۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور مذہب میں سرے سے کوئی اختلاف ہی نہیں اور جو غلط فہمی عام طور پہ پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ مذہب کے اصولوں کو بھی سائنس کے نظریات کی طرح ارتقاء کی راہ پہ مائل دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں جس کے پورا نہ ہونے پر وہ مذہب کو بوسیدہ اور سائنس کے نظریات کو نیا قرار دے کر اپنی کسی نفسیاتی الجھن کا علاج تلاش کرتے ہیں۔ ہر چند کہ سائنس کے علوم ہمیشہ سے علم وحی کے تابع رہے ہیں اور ہمیشہ تابع ہی رہیں گے۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھیں کہ قرآن نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کائنات کا محرک ایک ایسی ہستی ہے جو برتر قوت کی حامل ہے، جو اپنے ارادے سے کائنات کو حرکت دے رہی ہے۔ یاد رہے کہ قرآن نے یہ دعویٰ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے بہت پہلے کیا تھا۔ بعد کے دور میں بہت سے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے کائنات کے بارے میں جو نظریات پیش کیے اگر چہ ان پہ بہت سے لوگ ایمان لے آئے مگر انھی نظریات پہ بعد میں خود ان فلسفیوں اور سائنس دانوں کی اولاد نے یقین کرنے سے انکار کر دیا اور وہ کائنات کی نئی توجیہ تلاش کرنے میں لگ گئے۔

ارتقاء کا یہ عمل جاری رہا اور اس کی آخری منزل وہی ٹھہری جو قرآن پہلے ہی بیان کر چکا تھا۔ چنانچہ اب اگر اس کو انسانیت ایک اصول کے طور پہ اپنا لے تو کوئی حرج نہیں کہ جب انسان کی کھوج خالق کی منشا تک جا پہنچے تو پھر مزید کسی منزل کی کھوج بے سود ہو کے رہ جاتی ہے۔ فلاسفہ اگر چہ اندھیری راہوں میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں کہ وہ یقین کی منزل عقل کے راستے کھوجنا چاہتے ہیں مگر اس میں کامیابی کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔ ایک دور تھا جب اہل فلسفہ اور سائنس دانوں کے پورے ایک قبیلے نے مشترکہ طور پہ کائنات کی یہ توجیہ کہ وہ محض ایک مادی مشین ہے جو خود بخود حرکت میں ہے، جس کا کوئی محرک نہیں یہ نظریہ دو صدیوں تک انسانی ذہن پہ حکمرانی کرتا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے علم کی ترقی نے قرآن کے دعووں کو رد کر دیا ہو۔ مگر پھر وقت نے آخری فیصلہ قرآن کے حق میں سنایا۔ وہ اس طرح کہ جدید سائنس اس اعتراف پہ مجبور ہوئی کہ کائنات اور زندگی کی توجیہ محض مادی قوانین کے ذریعے کی ہی نہیں جا سکتی۔ اس اعتراف کے بعد سائنس کا ہر قدم اسی حقیقت کی طرف

اٹھا کہ کائنات کو کوئی مدبر قوت ہی چلا رہی ہے۔

مشہور سائنس دان (Sir Jameus Jeens) سائنسی رویے میں اسی تبدیلی کی تشریح میں اپنی کتاب(Modren Scitefic Thought) میں لکھتے ہیں:

''علم کے دریا نے پچھلی چند دھائیوں میں تیزی سے ایک نیا رخ اختیار کیا ہے کہ تیس سال پہلے ہمارا خیال تھا یا ہم نے فرض کر لیا تھا کہ ہم ایک ایسی آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی ہے، ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹوں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پہ اکھٹا ہو گئے ہیں، جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت جو کوئی شعور نہیں رکھتیں کچھ زمانوں کے لیے ایک بے معنی رقص کریں گے جس کے بعد محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے گی۔ اس خالص مشینی دنیا میں مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران زندگی ایک حادثے کے طور پر بالکل اتفاق سے وجود میں آ گئی کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے تھے مگر موجودہ معلومات کی روشنی میں طبیعیات کی حد تک سائنس اب اس اعتراف پہ مجبور نظر آتی ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر مشینی حقیقت (Non Mechanical Reality) کی طرف لے جا رہا ہے اور جدید تحقیق ہم کو اس بات پہ مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے سابقہ نظریات پر نظر ثانی کریں جو کائنات کی ماہیت کے بارے میں انسان نے عجلت میں اختیار کر لیے تھے۔ یعنی یہ کہ ہم اتفاق سے ایک ایسی کائنات میں آ پڑے ہیں جس کو خود زندگی سے کوئی تعلق نہیں یا وہ باقائدہ طور پہ زندگی سے عداوت رکھتی ہے۔ اب ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات کا نظم خود ہی ایک ایسے خالق یا مدبر طاقت (Designing or Controlling power) کا ثبوت فراہم کر رہی ہے جو ہمارے مذہبی تصور سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے''۔

❑❑❑❑❑❑❑

یہ نظری اور فکری پہلو سے قرآن کی علوم انسانی پہ برتری کا بیان تھا۔ اب عملی پہلو سے قرآن کی برتری کو اس زاویے سے دیکھیں کہ اسلام نے انسان کی معاشرتی زندگی کا قانون وضع کیا تو اس نے ایک مرد کو چار عورتوں سے شادی کی اجازت دے دی۔ اسلام کا غلبہ جب دنیا سے قدرے کم ہوا تو اہل مغرب کو بھی کچھ ہوش آنے لگا۔ انھوں نے قرآن کے اس قانون کو نوکِ تنقید پہ رکھ لیا اور اس کا خوب مذاق اڑایا، اس کو جاہلیت کے زمانے کا وحشی قانون قرار دے دیا۔ ان کے نزدیک یہ عورتوں سے سراسر زیادتی تھی۔ اور اس طرح کے قوانین کی بنیاد پر کبھی بھی کوئی ترقی یافتہ تمدن تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ خود مسیحیت میں بھی مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت موجود تھی۔ مگر مغربی تہذیب نے اس کو بہ یک جنبش قلم اپنے ہاں سے خارج کر دیا اور ان کے ہاں اس امر کو ایک مردود فعل قرار دے دیا گیا کہ ایک شخص ایک عورت کے ہوتے ہوئے دوسری عورت سے شادی کرے ''مگر زنا جہاں چاہے جب چاہے کرتا پھرے'' انھوں نے اپنے معاشرے میں اس بات کی تبلیغ اس زور شور سے کی کہ اب یہ حال ہے کہ کوئی مرد اس کی جرأت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عورت اپنے بارے میں ایسا سوچ سکتی ہے کہ وہ کسی شخص کی دوسری یا تیسری بیوی بن کے رہے مگر حالات نے خاص طور پہ دوسری جنگ عظیم نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دراصل زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے۔

کبھی بعض افراد کی زندگی میں اور کبھی کبھی پورے کے پورے معاشرے کسی ایسی ناگہانی صورت حال سے دو چار ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو انسان دوسری شادی کر لے یا پھر زنا کرے جس کا مطلب پورے تمدن کو ایک ہولناک خطرے میں مبتلا کر دینا ہے۔ دوسری شادی سے معاشرے کی کوئی اکائی بھی متاثر نہیں ہوتی جب کہ زنا سے پورے معاشرے کا ڈھانچہ ہی بدل کے رہ جاتا ہے جس کی حقیقی تصویر آج کے مغربی معاشروں میں بہ خوبی دیکھی جا سکتی ہے جہاں ایسے ایسے منظر بکھرے پڑے ہیں کہ انسانیت ان کو دیکھ اور سن کر دھنگ رہ جاتی ہے۔ پچھلے دنوں روزنامہ جنگ میں ایک خبر دیکھی کہ نیویارک کے ایک سکول میں چوتھی جماعت کی نو سالہ بچی کو اچانک ہی پیٹ میں درد اٹھا تو ٹیچر اور بچے اس کی طرف متوجہ ہو گئے بچی نے تھوڑی دیر بعد ایک نومولود کو جنم دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں کو اس امر سے آگاہ کرنا چاہتی تھی مگر اس کی ماں اس کے باپ کے بجائے اپنے کسی دوست کے ہاں رہتی ہے اور باپ سے اس کی ملاقات صرف اتوار کی صبح کو چند منٹوں کے لیے ہوتی ہے۔ امریکہ اور یورپ خاص طور پہ

برطانیہ میں جو کچھ ہو رہا ہے اخلاق ان کے بیان کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی ان حقائق کا ذکر ان صفحات کے شایان شان ہے۔اس لیے ہم گریز کی راہ اختیار کرتے ہوئے دلائل سے اپنے موقف کو ثابت کریں گے ،انشاء اللہ۔دوسری جنگِ عظیم کے بعد ان تمام ملکوں میں جو جنگ میں شریک تھے یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ ان کی عورتیں زندہ رہیں مگر مرد کثرت سے ہلاک ہو گئے جس کے نتیجے میں مردوں کی تعداد بہت کم اور عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی بلکہ بعض جگہ تو جیسے جوان مردوں کا قحط پڑ گیا ہو۔دوسری جنگ عظیم میں خاص طور پہ مرد اتنی تعداد میں ہلاک ہوئے کہ ان کی کمی اب تک محسوس کی جاتی ہے۔ ۱۹۵۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق جاپان میں ایک مرد کے مقابلے میں آٹھ عورتیں تھیں،جنگ کے بعد سب سے بدترین صورت حال جرمنی کی تھی جہاں بے شمار عورتیں بیوہ اور لاکھوں بچے یتیم ہو گئے تھے۔

کئی سال تک وہاں یہ صورت حال رہی کہ لڑکیوں کے لیے جوان ساتھی کی تلاش ایک بڑی مہم بن کے رہ گئی تھی۔عورتیں جو شوہروں سے محروم ہو گئیں تھیں انھوں نے اپنے فطری تقاضے سے مجبور کر اپنی خواہش پوری کرنے لیے زنا کا راستہ اپنایا۔جرمنی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب بائیس عورتوں کے لیے ایک ہی مرد دستیاب تھا جرمنی میں اپنی فطری خواہش سے مجبور بعض عورتوں نے اپنے گھروں کے دروازوں پر اس قسم کے بورڈ آویزاں کر رکھے تھے جن پہ لکھا ہوتا!

(wanted an Evening Guest)

یعنی رات گذارنے کے لیے ایک مہمان چاہیے۔دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی ممالک میں طوائفوں کا ایک سیلاب تھا جس نے معاشرے کو کسی وبا کی طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ان میں اکثر تعداد ان عورتوں کی تھی جن کے شوہر جنگ میں مارے گئے تھے۔ایک برطانوی صحافی (James Cameron) نے جو جنگ کے بعد رپورٹنگ کے لیے جرمنی میں تھا اس نے بعد میں اپنی یاداشتیں شائع کیں جن میں جنگ کے بعد کی صورت حال کی کچھ اس طرح تصویر کشی کی گئی ہے کہ دل دہل کے رہ جاتا ہے۔اخبار (Garjean) کا یہ نامہ نگار لکھتا ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر جب میں برلن گیا تو پورا شہر بھوکی طوائفوں (Hungry whores) سے بھرا ہوا تھا اور عورتیں ایک وقت کے کھانے یا محض چائے کے ایک کپ کے عوض آپ کے ساتھ سونے کو تیار تھیں۔دور دور تک تباہی تھی،شہر کسی قدیم کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا تھا جن میں ایسے بچے گھومتے تھے جن کے والدین جنگ میں ختم ہو گئے تھے۔وہ سارے کے سارے بھوکے تھے اور کچھ بوڑھے

تھے جوان کھنڈروں کے بھوت دکھائی دیتے۔ ایسا نہ تھا کہ مجھ میں جنگ کی برداشت نہ تھی مگر فتح ایسی خوفناک ہوتی ہے میں نہ جانتا تھا۔ مردوں کی یہ کمی بہت سے ممالک میں آج تک باقی ہے تاہم اب اہل مغرب کی جنسی بے راہ روی سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کے اس ناسور کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت سے انحراف کی راہ اپنائی ہے انھوں نے دوسری شادی تو کیا ایک شادی کے تصور کو بھی تقریباً فراموش کر دیا ہے۔ قانونی طور پہ اب وہاں ایک شادی کے لیے بھی راستے مسدود ہیں اس لیے کہ شادی اور طلاق پہ ایک تو خرچ بہت زیادہ اٹھتا ہے دوسرے طلاق کی خوفناک اور ہر دم بڑھتی ہوئی شرح نے معاشرے کو شادی سے روک رکھا ہے۔ اگرچہ مغربی ذہن نے ابھی تک اپنی اس غلطی کو تسلیم نہیں کیا مگر مغرب کے دانشوران کے سامنے آنے والے خوفناک وقت کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ عملی طور پہ مغربی معاشروں پہ اب وہ برے اثرات نظر آنے شروع ہو گئے ہیں جن کی نشاندہی اسلام نے کی ہے اور وہ دن دور نہیں جب مغرب اس بات کو تسلیم کرنے پہ مجبور ہو گا کہ قرآن کا فیصلہ ہی آخری حقیقت ہوا کرتا ہے۔

نکاح کے معاملے میں جس اصول کو مغرب نے اختیار کر رکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج کو فحاشی میں مبتلا کر کے بے شمار جرائم کا دروازہ کھول دیا جائے۔ جب کہ اسلام کا اصول اصل مسئلہ کو احسن طریقے سے حل کرتا ہے اور سماج کو ان شدید نقصانات سے بچا لیتا ہے جن سے آج اہل مغرب دوچار ہیں۔ قرآن کے نظریات اور اس کے قوانین کی ابدیت کی اتنی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ان کے ذکر میں زندگی گذر جائے مگر بات تشنہ ہی رہے۔ اس لیے ہم انھی دو مثالوں پہ اکتفاء کرتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسانی ساخت کے نظریے اور قوانین بن بن کر بگڑتے رہے مگر قرآن نے پہلے دن جو کہا تھا آخر دن تک اس کی سچائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ جس طرح پہلے حق تھا آج بھی وہ اسی طرح حق ہے۔ جس طرح وہ پہلے دن غالب تھا اسی طرح آج بھی وہ تمام انسانی فلسفوں پہ غالب ہے۔ قرآن کی یہ خصوصیت ظاہر کرتی ہے کہ وہ ایک بلند کلام ہے، اس کے نازل کرنے والے کا علم ماضی حال اور مستقبل پر محیط ہے، یہ قرآن کی ابدیت اس کے کلام الٰہی ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ ہمارے اس مطالعہ نے ہم پہ حقیقت کے وہ در وا کیے جن کے ذریعے ہم نے جانا کہ کائنات اور زندگی کے بارے میں وہ تمام نظریات خس و خاشاک ہیں جن کو لوگ قرآن کے مقابلے میں رکھتے آئے ہیں۔ پھر ہمارے کانوں میں عرب سے اٹھنے والی وہ انمول آواز پہنچی جس نے ہم کو تفکر کے وہ جہاں ارزانی فرمائے کہ زندگی اور کائنات جیسے مسئلے محض ثانوی حیثیت اختیار کر کے رہ گئے۔ محمد

کریم ﷺ نے اللہ کی کتاب ہم تک پہنچائی جس میں تمام جہانوں کے علوم کا احاطہ کیا گیا۔قرآن میں شبنم کی نرمی اور تلوار کی تیزی ہے،قرآن میں عشق کے جہاں اور رفعتوں کے نشان ہیں،قرآن میں وفا کے ہنر اور جفا سے بیزاری ہے،قرآن میں امید کے ساحل اور امنگ کے سنگ میل ہیں،قرآن میں منزلوں کا ذکر اور عبرتوں کے جہاں ہیں،قرآن میں ستاروں کی منزلیں اور شامِ زمستاں ہیں،قرآن میں حسن کی تقرار اور جمال کے خیابان ہیں،قرآن میں دل کا سکون اور مسیحائی کے سامان ہیں، قرآن میں سوزِ آرزو اور ذکرِ راحت جنوں ہے،قرآن میں احساس کا جہاں اور یقین کا سماں ہے،قرآن میں زخموں کا مرہم اور راحتوں کا پیام ہے، قرآن میں ازل کا بیان اور ابد کا نشان ہے،قرآن میں وجد کی منزلیں اور عرفان کے کوہ گراں ہیں،قرآن میں فنا کی منزلیں اور بقاء کی راحتیں ہیں،قرآن میں عشق کی منزلیں اور پہچان کے رنگ ہیں،قرآن میں دستور کی منزلیں اور قانون کے سب نشان ہیں،قرآن میں اشک کی قیمت اور وفا کا جوہر بیان ہے،قرآن میں سعادت کے سلسلے اور خوشبوؤں کا سامان ہے،قرآن میں محمد ﷺ کی وفائیں اور امت کے انعام ہیں،قرآن میں قلب کی تزئین اور نفس کا وجدان ہے،قرآن میں وفا کی تاکید اور محبت کا فرمان ہے،قرآن میں وصل کی راحتیں اور ابدی جنت کا بیان ہے،قرآن میں تشنگی کی موت اور فراغی کا پیام ہے،قرآن میں ڈر کا سماں مگر رحمت کا سائبان ہے،قرآن میں مسیحائی کا ہنر اور چشم خوباں ہے،قرآن میں فنا کا تذکرہ اور ثبات کا پیام ہے، قرآن میں دھڑکن کا تسلسل اور احساس زیاں کا پیام ہے،قرآن میں تقدیر کے کرشمے اور یوسفؑ کی داستان ہے،قرآن میں علم کے سمندر اور معرفت کے جہاں ہیں،قرآن میں اشک اشک کا حساب اور ہر سانس کا بیان ہے،قرآن میں فطرت کی گہرائی اور شرف انسان کا بیان ہے،قرآن میں فصاحت کے نمونے اور بلاغت کے نشان ہیں،قرآن میں نخلستانوں کی صدا اور ہدی خوانوں کا بیان ہے،قرآن میں طلسم کے دریچے اور حقیقت کا آسمان ہے،قرآن میں بادِ صبا کی خنکی اور بادِ صرصر کا بیان ہے،قرآن میں نفسیات کی الجھنیں اور کائنات کا فرمان ہے،قرآن میں اسلوبِ لطیف اور شانِ قلب کا بیان ہے،قرآن میں پہچان کے دریچے اور عرفان کا نشان ہے۔

انسان خدا اور کائنات

گذشتہ ایک صدی میں سائنس کے مزاج میں زبردست تبدیلیاں واقعہ ہوئی ہیں۔ اگرچہ طبیعاتی اور حیاتیاتی سائنس متوازی طور پر نئی منزلوں کی طرف گامزن رہی ہے مگر اس کا مرکز تبدیل ہوا اور وہ طبیعاتی سائنس سے ہٹ کر حیاتیاتی سائنس کی طرف منتقل ہوا۔ علم سائنس نے چشم انسان کو جو روشنی بخشی ہے اسی کے تحت ہی انسان نے دور تک دیکھنا سیکھا ہے۔ آج انسان کئی لاکھ سال پہلے شروع ہونے والے انسانی ارتقاء کے بارے میں علم رکھتا ہے اور اس کی تحقیق نے انسان کے ابتدائی رویوں سے آگاہی بہم پہنچائی ہے اس کے ابتدائی سماجی خدوخال کو واضح کیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے ابتدائی عقائد تک سے آج کا انسان واقف ہے۔ مظاہر کائنات اور نظم کائنات پہ بھی انسان کا مطالعہ سیر حاصل ہے اور اس نے ان کہکشاؤں کا سراغ لگایا ہے جو کل تک خیال وخواب تھیں۔ سائنسی علوم کے بارے میں جو اساسی خیال ذہن نشین رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ علم عمومی حیثیت میں اور سائنس خصوصی حیثیت میں قیاس آرائیوں پر مشتمل نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی جہد مسلسل ہے کل کے انسان کا خواب ہے جس کی تعبیر آج کا انسان بہ چشم سر دیکھ رہا ہے۔ سائنس انسان کے

ان منصوبوں اور خیالات کا ثمر ہے جو اس نے تسخیر کائنات کے لیے وضع کیے۔عروجِ آدم کے پس منظر میں تحقیق وعلم فلسفے کا میلان اور خیالات کے زریں دھارے ہیں۔تاہم یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ انسان کی مسلسل تحقیق اور جستجوئے پیہم کے باوجود کبھی بھی کسی بھی مرحلہ پر انسان کا علم قرآن سے آگے نہیں بڑھ سکا اس لیے کہ علم کی ایک نوعیت ایسی بھی ہے جو اسے روائتی علم سے الگ تھلگ کر دیتی ہے ایک علم وہ ہے جو خدا کا اپنا ہے اس کا ذاتی ہے چونکہ اس کی تعلیم اور اس کا علم (Judgment) بالکل الگ ہے اس کا اپنا معیار ہے جو انسانی علم کے معیار سے قطعی مختلف ہے۔

اس لیے اس اعلیٰ ترین الٰہیاتی معیار پر کوئی انسان کوئی سائنسی نظریہ کوئی ارضی مخلوق کبھی نہیں پہنچ سکتی مگر اس علم کلی کے انسانی عقل سے ماوراء ہونے کے باوجود پروردگار نے اپنی کچھ رحمت بطور احسان انسان کو بھی عطا کی اسے کچھ علم منتقل کیا جو خود خالق کی ذات کو سمجھنے، اس کی کتاب کو سمجھنے، اسرارِ کائنات کو سمجھنے، اسرارِ حیات کو سمجھنے کے کام آتا ہے۔اپنے شعوری ارتقاء کے ساتھ ہی انسان نے کائنات میں اپنے مقام کی کھوج شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں کائنات اور انسان کے باہمی تعلق پر بہت سے نظریات سامنے آئے۔انسان کا ایک طبقہ کائنات کو مشین قرار دیتا ہے یا وجودِ کائنات کو ایک اتفاق کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

جب کہ دوسری طرف مذہب پسند لوگ تھے جنہوں نے ہمیشہ سے کائنات کے پس منظر میں ایک طاقتور خالق کا تصور پیش کیا۔چنانچہ قدیم انسانی تاریخ سے ہی مادیت اور روحانیت کے اس نزاع نے جنم لے لیا تھا جو اگرچہ آج تک صحیح طور پہ حل نہیں ہوسکا تاہم قرآن کے آنے کے بعد دراصل تو یہ مسئلہ حل ہو چکا ہے مگر طرفہ تماشا یہ ہے کہ اہل مغرب کی طرف سے سائنس اور مذہب کی علیحدگی نے پھر سے اس مسئلہ کو الجھا دیا ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تحقیق کے میدان میں آج ان لوگوں کی اکثریت ہے جو کسی خالق کے وجود سے انکار پر تلے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے نظام کائنات کی توجیہ اور اس میں انسانی مقام کا تعین ایک الجھن بن کے رہ گیا ہے۔اگر انسان خالق کائنات پہ ایمان لے آئے تو اس کے لیے کائنات کی توجیہ انتہائی آسان ہوگی اور اس کو انسانی شرف کا علم بھی حاصل ہوجائے گا جو اسے خالق نے اس لیے بخشا ہے تاکہ وہ اس کو پہچان سکے اور اپنے اصل مقام کا ادراک حاصل کر سکے۔کائنات کی لامحدود وسعتوں میں خالق کی بے شمار نشانیاں انسان کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں تاکہ وہ ان کا مشاہدہ کرے۔،ان کے خالق کی ذات تک رسائی حاصل کرے انسان نے یہ سفر جاری رکھا جس کے نتیجے میں علم وفلسفہ کے وہ جہاں مرتب ہوئے جن میں تاریخ کے ہر دور کے

انسان کے عقائد اور اس کے شعور کی پختگی کو جانچا جا سکتا ہے۔انسان نے علم و فلسفہ کے میدان میں جو منزلیں طے کیں اس نے انسان اور کائنات کے مابین باہمی تعلق اور ان دونوں پہ کسی قوت قائرہ کے تصرف کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے مگر معاملہ کو شرح و بسط کے ساتھ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اور کائنات کے مابین باہمی تعلق کو جاننے سے قبل کائنات میں انسانی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے اس کے شعوری سفر کے تمام سنگ میلوں سے آشنائی حاصل کی جائے تب کہیں انسان اور کائنات کے مابین باہمی تعلق کو درست طور پہ سمجھا جا سکتا ہے۔

انسانی ارتقاء کی داستان

صحرائے عرب کے ریگزاروں میں ترکمانوں کے تھکے ہارے قافلے جب دن بھر کی تگ وتاز کے بعد رات کو اپنے خیموں کے کنارے اترتے اور آگ کا آلاؤ روشن کر کے اس کے گرد بزم داستان سجاتے تو اسی مسحور کن فضاء میں صحرا کی حسین صبحیں ان کا استقبال کرتیں۔ان کی داستانیں سادہ مگر فصاحت اور بلاغت سے بھر پور ہوتیں۔وہ جانتے تھے مگر قبائلی عصبیت کی بنا پر ضد پہ اڑے ہوئے تھے کہ ان سے کچھ ہی دور شہر مکہ میں ایک شخص (صلی اللہ علیہ وسلم) انسان اور کائنات کے ان رازوں سے پردہ اٹھا رہا تھا جس کا گمان بھی کرنا اس وقت ممکن نہ تھا۔وہ جانتے تھے کہ اب ان کی داستانوں کا وقت گذر چکا ہے اور داستانِ کائنات کا آغاز ہو چکا ہے جو سب داستانوں سے بڑی داستان ہے۔اس داستان کا آغاز کب اور کیسے ہوا مکہ کی گلیاں اور دیواریں اس دلنشیں آواز کو سن رہیں تھیں جس میں انسانی ارتقاء کے حتمی نظریات کو بیان کیا جا رہا تھا بہت سے لوگوں نے اس وقت بھی اس آواز پہ کان نہ دھرے اور اندھیروں کے مسافر بنے اور آج بھی انسانوں کی اکثریت اس آواز کو سننے کی روادار نہیں اور وہ اندھیروں ہی کی مسافر ہے۔ورنہ منزل اتنی دور نہ تھی۔قرآن نے تو ہر دور

میں انسان کی آسانی کا سامان ہی فراہم کیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئاً مَّذْكُوراً O

القرآن الحکیم (سورۃ الدهر۷۶۔آیات ۱)

ترجمہ؛

''بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر شئے ہی نہ تھا''۔

□□□□□□□

یعنی اربوں سال تک انسان پر ایک ایسا زمانہ بھی گذرا ہے جب وہ کوئی قابلِ تذکرہ شئے ہی نہ تھا اور خالق کے نزدیک ابھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔پھر جب خالق کا دل چاہا تو اس نے اس مرحلے کا آغاز فرمایا جب اس نا قابلِ تذکرہ شئے کو قابلِ تذکرہ اشیاء میں داخل کر دیا جائے۔پھر اللہ نے اپنے اس احسان کا ذکر کیا کہ میں نے ہی تجھے سننے دیکھنے اور سمجھنے والا بنایا ہے اور تجھے سیدھی راہ بھی دکھا دی اب اگر تو شکر گذار نہیں بنتا تو یہ تیری بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعاً بَصِيراً إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً O

القرآن الحکیم (سورۃ الدهر۷۶۔۲)

ترجمہ؛

''بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا جسے ہم پلٹتے رہتے ہیں پھر ہم نے اسے دیکھنے اور سننے والا بنایا اور ہم نے ہی تمہیں راہ حق دکھائی اب خواہ تم شکر گذار بنو یا ناشکر گذار''۔

□□□□□□□

جب اللہ نے انسان کو دیکھنے سننے اور سمجھنے والی مخلوق بنا دیا تو پھر اسے راہ حق دکھائی۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ راہ حق کیا ہے؟ یاد رہے اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے اس لیے کہ اگر یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو آج خطہ ارض پہ پانچ ارب کے قریب لوگ حق ناشناس نہ ہوتے چنانچہ راہ حق وہ ہے جو خالق نے انسان کے لیے وضع کی اور باقی تمام رویے زندگی گذارنے کے تمام نظریے حق سے روگردانی تصور ہوں گے۔اس لیے کہ مخلوق کو یہ حق ہی حاصل نہیں کہ وہ خالق کی منشا کے بغیر زندگی گذارے۔اس کی فلاح اور کامیابی صرف اس میں ہے کہ انسان اپنی ترجیح اولیٰ کے طور پہ خالق کے پیش کردہ نظریات کو چنے۔یہی انسان کا اصل امتحان ہے اور یہی کائنات میں انسان کو پیدا کرنے کا مقصد۔تاریخ، فلسفہ، منطق اور سائنسی علوم ہمیں انسان کے ارتقائی مراحل سے آگاہ کرتے ہیں۔بیان کیا جاتا ہے کہ تمام حیاتیاتی مخلوقات کو ایک ہی جنیاتی مرکز سے تخلیق کیا گیا۔

پھر برسوں تک انسان حیوانات سے کسی طور مختلف نہ تھا اور نہ خطہ ارض پہ موجود دوسری مخلوقات سے الگ اس کی کوئی شناخت موجود تھی۔مدتوں تک ماہرین عمرانیات اس امر میں متردد تھے کہ انسان کی ابتدا کا سراغ کہاں سے تلاش کریں۔وہ وقت کے اس خاص دور تک رسائی حاصل کرنے کے آرزومند تھے جب انسان نے خود کو دوسری مخلوقات سے الگ کیا اور کب اس نے اپنی الگ شناخت پیدا کی۔انسان کی جہد مسلسل اور کئی نسلوں پر محیط صدیوں کی تحقیق سے انسان اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانی ارتقاء میں اس نوع کی تبدیلی کا پہلا سراغ نو کروڑ سال قبل کا ملتا ہے اور انسان سے قدرے مشابہ ایک جاندار کا سراغ پانچ سے چھ کروڑ سال قبل کے زمانے میں نظر آتا ہے۔تب مخلوقات کا ایک اژدھام تھا جس میں انسان کو شناخت کرنا کافی مشکل تھا۔پھر مخلوقات کے درمیان ایک باہمی تصادم نے جنم لیا جس نے انھیں دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔چنانچہ کثیر تعداد میں مخلوقات نے اپنا رخ زمین کی طرف کیا اور زمین کے بطن یعنی اس کے سوراخوں وغیرہ میں پناہ لی۔ان میں سانپ بچھو اور اسی نوع کی دوسری مخلوقات تھیں۔دوسری قسم کی مخلوقات جو زمین کے آزار سے خوف زدہ تھیں اس لیے ان کی اکثریت نے زمین کی مخالف سمت درختوں کی بلندیوں کا رخ کیا اور یہی کائنات کے ابتدائی حیوان تھے۔انسان نما مخلوق بھی غالباً انھی میں شامل تھی اس کو انسان کہنا ابھی دور از کار تھا کیوں کہ اس کے ہاتھ پاؤں جڑے ہوئے تھے، قد چھوٹا تھا آنکھیں برائے نام اور اس کا دماغ صرف 475 CC تھا۔ یعنی آج کے ایک نارمل نوزائیدہ بچے سے تقریباً چار گنا کم کہ آج کل پیدا ہونے والے ایک نارمل بچے کا

دماغ 1750CC ہوتا ہے۔وقت گذرنے ساتھ اس مخلوق نے اپنے ارتقائی مراحل طے کرنے شروع کیے [47*]۔پھر اس نے جبلتوں کو ظاہر کرنا شروع کر دیا اور ادھر اُدھر ہاتھ مارنا شروع کر دیئے۔اس کے ہاتھ اور پاؤں کے انگوٹھے اور انگلیوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔اس کی آنکھوں کے ڈیلے حرکت کرنے لگے اس کی حرکی استعداد اور توانائی میں اضافہ ہوا۔اگر آج کا ترقی یافتہ انسان اس دور کے انسان کو دیکھ لے تو اس تصور سے ہی شرما جائے کہ کبھی اس نوع کی کوئی مخلوق بھی اس کے آباؤاجداد میں شامل تھی۔

قدیم دور کی انسان نما یہ مخلوق درختوں سے آگے بڑھنے کی تگ دو میں مصروف تھی۔مگر یہ انسانی دور میں تب داخل ہوا جب اس نے اپنے جینیاتی رویئے (Genetic Behaviour) اور اپنی جبلت (Instinct) کے خلاف جدوجہد شروع کی اور وہ جینیاتی رویہ جو اس میں نسل در نسل چلا آرہا تھا وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔اور اس نے اس پورے پیٹرن سے جدا ہونے کی جدوجہد شروع کر دی۔انسان کی یہ ابتدائی شکل (Primitive) کسی معاشرے یا سماج کی تعمیر کے قابل نہ تھی۔مگر انسان کے اعلیٰ تر درجے تک پہنچنے کے لیے بنیاد اس کی اسی شکل نے فراہم کی اور اس کا یہی تسلسل انسان کو آج کے متمدن انسان کی شکل تک لایا۔سائنس نے دورِ اول کے اس انسان کو دورِ جدید کے انسان کے ساتھ قدرتی مماثلت کی وجہ سے (Homonides) کہا ہے۔(Homo) انسان کو کہتے ہیں اور (Homonides) کا مطلب ہے انسان سے مشابہہ مخلوق۔مگر اس دور کا یہ ہوموپرلے درجے کا بد صورت تھا گوریلا اور چمپنزی سے بھی گیا گزرا۔تاہم مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ زندگی اور بقاء کی جدوجہد میں مصروف تھے اور یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہوگیا بلکہ ارتقاء کا یہ سفر چھ کروڑ سال تک جاری رہا۔تب جاکے انسان سے کسی قدر مشابہہ ایک مخلوق کا سراغ ملتا ہے۔انسان کے انھیں ارتقائی مراحل پر جامع نظر ڈالنے کے لیے (Charles Darwan) کی تحقیقات پہ ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں [48*]۔

ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور اسلام

حکومت برطانیہ نے انیسویں صدی میں انسان کے ارتقائی مراحل پہ تفتیش و تحقیق کے لیے ایک بحری مہم روانہ کی جس کی سربراہی ایک نوجوان انگریز سائنس دان سر چارلس ڈارون کر رہا تھا۔ یہ 1832ء کے دن تھے جب بیگل نامی یہ بحری جہاز امریکہ کے ساحلی علاقوں میں پچھلی مخلوقات کا تحقیقی جائزہ لے رہا تھا۔ پھر یہ (Kape Baren) کے علاقے سے ہوتا ہوا مملکت چلی کے ساحلی علاقوں میں گھومتا ہوا بالآخر بحر الکائل میں داخل ہوا۔ جب مہم ایکوڈور سے ہوتی ہوئی مجمع الجزائر (Galapaggos) میں پہنچی تو انھیں اپنے مستقر سے جدا ہوئے تین سال بیت چکے تھے۔ وہ عیسائی کلیسا کے استبداد کا زمانہ تھا۔ مذہبی روایات کافی پختہ تھیں اور عوام الناس کسی بھی علمی نظریے پر یقین کرنے کی بجائے انسان اور کائنات کے بارے میں مذہبی فلسفے پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ اس زمانے میں عوام کا عام اور راسخ عقیدہ یہ تھا کہ تمام جاندار انواع غیر متغیر ہیں اور ہر جاندار کو خالق نے انفرادی طور پہ خاص اہتمام اور منصوبے کے تحت بنایا ہے۔ چارلس ڈارون کا تعلق بھی اسی معاشرے سے تھا اور ان کو ملحد قرار دینے کا پروپیگنڈہ بھی عیسائی کلیسا ہی کی کاروائی تھی حالانکہ

ڈارون نے جامع کیمبرج سے عیسائی دینیات میں ڈگری حاصل کی تھی۔ڈارون نے دیکھا کہ مجمع الجزائر کے جانور عام طور پہ جنوبی امریکہ کے جانوروں کے مماثل تھے لیکن ایک خاص حد تک مختلف بھی تھے۔جانوروں کی متنوع انواع میں اختلافی شکل وصورت دیکھ کرڈارون کے ذہن میں یہ نظریہ پختگی اختیار کرتا جارہا تھا کہ مخلوقات کی کوئی نوع ہمیشہ کے لیے مستقل اور یکساں شکل وصورت میں نہیں رہتی بلکہ ان میں جسمانی تبدیلیوں کا ارتقاء جاری رہتا ہے اور وہ شکل وصورت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بھی ہو جاتے ہیں۔

اس نے خیال ظاہر کیا کہ جب یہ جزائر براعظم امریکہ سے جدا ہوئے تب ان جانوروں کی شکلیں قدرے مختلف تھیں لیکن جب انہوں نے لاپیگوس کے جزائر کی آب وہوا اور حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی تو کئی نسلوں کے بعد ان میں اتنی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکیں تھیں کہ سابقہ اور ابتدائی نوع کے طور پہ اب ان کی شناخت ممکن نہ رہی تھی۔ چنانچہ ڈارون نے منطقی طور پہ اس سوال کا جواب کھوجنے کی کوشش کی کہ جب ایسی تبدیلیاں ہزاروں سال کے نسبتاً تھوڑے عرصے میں ممکن ہیں تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ لاکھوں کروڑوں سال بیتنے پر جاندار مخلوقات میں اتنے بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہو چکی ہوں گی ان کی اولین شکل وہیت اور عادات بدل کے رہ گئی ہوں۔مثال کے طور پہ مچھلیوں میں عضلاتی گل پھڑے پیدا ہوئے اور کروڑوں سال گذرنے کے بعد وہ جل تھلیے بن کر پانی سے خشکی پہ آ گئیں۔پھر کروڑوں برس بیت گئے اور ان میں پن ورک جلد پیدا ہو گئی اور وہ رینگنے والے جانوروں یعنی (Reptiles) میں بدل گئیں ہوں [*49]۔

اس بات کے امکانات اور رجحانات بھی قوی ہیں کہ ارتقائی مندارج طے کرتے ہوئے وہ درختوں پہ بسیرا کرنے والے بندروں میں بدل گئیں اور پھر ارتقاء کے اس سفر نے انھیں ایپ نما میں بدلا اور وہ بن مانسوں کے دوپایہ سماج میں بدل گئیں جن کی ذہانت اور عادات انسان سے کافی ملتی جلتی ہیں بعد میں یہی ایپ نما بن مانس نسل انسانی کے مورثِ اعلیٰ تصور کئے جانے لگے۔یاد رہے کہ انسانی ارتقاء کا یہ نظریہ صرف ڈارون کی حد تک ہی محدود نہیں بلکہ ڈارون سے قبل بھی کئی لوگ اس طرح کے تصوارت پیش کر چکے تھے جن میں حیاتیات کا معروف ماہر (Alfred Wallace) بھی شامل ہے جو اگرچہ ڈارون کا ہم عصر ہے مگر وہ دنیا کے ایک مختلف خطے جنوب مشرقی ایشیا میں انسانی حیات کے ارتقائی مراحل پہ تحقیق کر رہا تھا۔کئی دیگر ماہرین

حیاتیات نے بھی اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ تمام جاندار ایک دوسرے سے باہمی تعلق رکھتے ہیں۔ڈارون کی انقلابی بصیرت اور ادراک نے اس طریق عمل کی بھی تشریح اور وضاحت کی ہے جس کے ذریعے جانداروں میں ایسی نوعی تبدیلیاں جنم لیتی ہیں۔انھوں نے تخیلی اور زبانی فلسفے کی جگہ ایک تفصیلی اور مربوط عمل کا نظریہ پیش کیا ہے جس کی صداقت کئی مضبوط اور نا قابل تردید شہادتوں سے ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوئی ہے۔ڈارون کا نظریہ اور استدلال اس بنیاد پر کھڑا ہے کہ ایک ہی نوع کے تمام جاندار یکساں نہیں ہوتے۔مثلاً بڑے کچھووں کے انڈوں کی ایک کھیپ میں سے کچھ ایسے بچے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کی گردنیں لمبی ہوتی ہیں اس لیے خشک سالی کے زمانے میں وہ اپنی گردنوں کو لمبی کر کے پتوں سے غذا حاصل کر لیتے ہیں اور زندہ رہ جاتے ہیں جبکہ ان ہی کے قبیلے کے کچھ دوسرے جانور گردن کی کم لمبائی کی وجہ سے غذا تک نہیں پہنچ سکتے اور مر جاتے ہیں ڈارون اس کو تنازعہ للبقاء کا قانون قرار دیتا ہے۔جس میں طاقتور جاندار اپنے ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور زندگی اور بقاء کی جنگ جیت لیتے ہیں وہ نہ صرف خود اپنے وجود کو قائم رکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں بلکہ اگلے مرحلے میں وہ اپنی اعلیٰ خصوصیات اپنی آئندہ نسلوں تک بھی منتقل کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کئی نسلوں کے بعد خشک مقامات پر بسنے والے کچھوؤں کی گردنیں لمبی ہو جاتی ہیں لیکن آبی گذرگاہوں میں بسنے والے کچھوؤں کی گردنیں چھوٹی ہی رہ جاتی ہیں۔

ڈارون کہتا ہے کہ میں نے اپنا نظریہ ارتقاء پیش کرنے سے قبل پچیس سال تک شہادتیں اور ثبوت اکھٹے کیے پھر تب کہیں جا کر 1859ء میں اپنی کتاب (Origin of Species) شائع کی۔فطری انتخاب (Nature Selection) کا نظریہ ایک مدت تک بحث وتحقیق کا موضوع رہا اسے تجربات کی کسوٹی پر پرکھا اور جانا گیا اس کو جلاء دی گئی اور اس میں مزید جامعیت پیدا کی گئی اور ایک مدت بعد سالمیاتی حیاتیات آبادی کی قوت حرکیات (Dynamics) جانداروں اور انسانوں کے مختلف رویوں نے اس نظریے کو نئے افق عطا کیے۔چنانچہ اس نظریہ نے انسان کو اس خیال تک پہنچایا کہ حیات ایک طویل اور مسلسل عمل ہے جس میں پودوں اور جانوروں سمیت تمام جاندار نسل بہ نسل ماحول سے مطابقت کے زیر اثر بدلتے رہتے ہیں جس کا ثبوت حجری باقیات زمین کی تہوں کے علاوہ تالابوں اور سمندروں کی تہوں میں رکاز (Fossils) کی شکل میں محفوظ ہوتے ہیں۔چنانچہ انسان نے جانا کہ پروٹین جو خلیے کی کامیاب کارکردگی کے لیے ضروری ہیں اس کے علاوہ DNA کا نظام نسلی اور موروثی ہدایات کے لیے ضروری ہیں وہ تمام پودوں درختوں اور

جانداروں میں یکساں ہیں،ان سب میں جین کی ہدایات ایک ہی زبان میں لکھی ہوئی ہیں۔یہ اس واقعہ کی شہادت اورثبوت ہے کہ تمام جاندار ایک ہی جداعلیٰ اور واحد خلیے سے وجود میں آئے ہیں جو زمین پر حیات کی ابتداء یعنی چار ارب سال پہلے وجود میں آیا تھا۔نظریہ ارتقاء پہ ڈارون کی کتاب (Origin of Species) کے بعد برطانیہ ہی کے ایک اور مشہور ماہر حیاتیات(Dob Zohansic)) نے ڈارون کے نظریہ کو بنیاد بنا کر اس میں کچھ ترمیم کی (Genetic and The origin of species) نامی کتاب میں اس نے ڈارون کے نظریہ مطابقت پذیری کی توثیق کی کہ ارتقائی عمل کی حقیقی بنیاد یہی ہے۔ڈارون اب اس نظریہ پہ کام کررہا تھا کہ کیا فطرت میں نامیاتی اور حیاتیاتی نظام میں خودکار منصوبہ بندی کا تسلسل موجود ہے اور کیا اس میں جانور اپنے اردگرد کے ماحول سے جلد مطابقت پیدا کر لیتے ہیں اور یہی ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی حقیقی روح ہے جس کو عیسائی کلیسا کی طرف سے شدید مزاحمت اور مخالفت کا سامنا تھا۔

کلیسا کے علماء نے ڈارون کو کافر کہا اور اس کو اپنے مذہب سے نکال باہر کیا۔ڈارون نے اس کے ردعمل میں ایک کانفرنس منعقد کی اور اپنے نظریے کو شرح وبسط سے بیان کیا کہ جانداروں میں فطری انتخاب ہی ان کی بقاء کی منصوبہ بندی ہے اور کسی جاندار کا فطری انتخاب ہی وہ عمل ہے جس میں ماحول سے عدم مطابقت کی وجہ سے کمزور انواع ناپید ومعدوم ہوجاتی ہیں اور طاقتور انواع ماحول سے مطابقت پیدا کر کے نہ صرف اپنی بقاء کا اہتمام کرتیں ہیں بلکہ اپنی اعلیٰ خصوصیات آنے والی نسلوں کو منتقل بھی کرتی رہتی ہیں۔تاہم ہرحال میں موت ارتقاء کا لازمی جز ہے جس سے مفر ممکن نہیں چنانچہ انسان نے جانا کہ کائنات میں موجود تمام جانداروں اور انسانوں کو تقسیم کرنے ،انھیں تباہ کرنے ،زندگی کو پھر سے شروع کرنے اور انسانی حیات میں متنوع تبدیلیاں پیدا کرنے کے صرف دو ہی عوامل دریافت ہوسکے ہیں

۱۔ماحولیاتی تبدیلی اور موسم کا تغیر

۲۔برفانی طوفانوں (Glaciers) سے ہونے والی برفانی بارش (Ice Rain)

انسانی تمدن کے قدیم اور ابتدائی ادوار میں جب موسم بھی اپنے ارتقائی مراحل میں تھے اور زمین ابھی ٹھنڈی

تھی تب اس نوعیت کی برفانی بارشیں معمول تھیں اور یہ برفانی بارشیں کوئی چھوٹی موٹی برف باری نہ تھی بلکہ یہ ایک ایک میل کی تہہ ہوتی جو زمین پہ جم جاتی۔سائنس نے دریافت کیا ہے کہ اب تک خطہ ارض پہ آنے والے اس نوعیت کے طوفانوں کی تعداد چار سو سے زائد ہو سکتی ہے۔یقیناً یہ برفانی طوفان خالق کے اس منصوبے کا حصہ رہے ہوں گے جو اس نے کائنات کو مرتب کرنے سے پہلے ترتیب دیا تھا کیونکہ انسانی علوم نے ہم کو اس امر سے آگاہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان طوفانوں کو مخلوقات کی قطع و برید کے عمل Process of (Elimination) کے طور پہ استعمال کیا ہے کہ ان طوفانوں نے ان تمام غیر مطلوبہ مخلوق کو ختم کر دیا جو خالق کے منصوبے سے خارج ہو گئیں تھیں اور جو اپنے اندر ارتقاء کی گنجائش نہ رکھتی تھیں یا جو بدلتے حالات میں بہتر طور پہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں چنانچہ خالق نے ایک تازہ (Genetic Trend) اور تیزی سے ابھرتی ہوئی مخلوق کو موقعہ دیا جو یقیناً انسان تھا۔

یہ شاید انتخاب کا مرحلہ تھا جو انسان نے جیتا اور خالق نے اس کے لیے سرِ کائنات اتنے رنگ بکھیرے کہ آج تک ششدر آنکھیں ان کی پرتوں کا احوال جاننے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکیں اور شاید کبھی بھی انسانی ادارک مکمل طور پہ خالق کے احسانوں کا احاطہ نہ کر سکے گا۔اللہ پاک نے اپنی آخری کتاب قرآن میں اگرچہ گاہے گاہے اپنے احسانوں کا ذکر ہے مگر اس کا باعث صرف یہ تھا کہ انسان شکر کی راہ پہ قائم رہ سکے۔چنانچہ قرآن میں انسان کے لیے خالق کے اہتمام خاص کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ O

القرآن الحکیم (سورۃ حم سجدہ ۴۱۔۱۰)

ترجمہ:

”اور ہم نے زمین میں اوپر سے بھاری پہاڑ رکھے اور ان میں بڑی برکت رکھی ان میں مخلوق کے لیے سامانِ معیشت مقرر کیا چار دن کے اندر جو سب طلبگاروں کے یکساں ہے“۔

□□□□□□□□

گویا انسان کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر اس چیز کو پیدا کیا جس کی انسان کو ضرورت تھی یہ ایک عملِ انتخاب تھا جس کے تحت انسان کو مختلف مراحل سے گذارتے ہوئے پیدا کیا گیا۔ حال ہی میں تنزانیہ میں ایک انسانی ڈھانچہ ملا ہے جو (Ice Age) کے پگھلنے سے سامنے آیا ہے۔ اس ڈھانچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ انسان گھر بنانے کے لیے پتھر استعمال کرتا تھا یعنی اس انسان نے اپنی نسل کی حفاظت کے لیے بندوبست کرنا اور عمومی زندگی میں ذرائع استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور یہاں سے ہی انسان اور جانوروں میں فرق واضح ہونا شروع ہوا کیونکہ جانور ایسے ذرائع استعمال نہیں کرتے اور نہ اپنی زندگی کی کوئی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اس لیے کہ منصوبہ بندی کرنا ان کا کلچر ہی نہیں۔ چنانچہ انسان کے ارتقائی مراحل میں اس دور کے انسان کو (Austro Flixin) کہا جاتا ہے کیونکہ اب اس نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ مگر انسان کے سوچنے کی یہ عادت ابھی ابتدائی مراحل میں تھی جو بتدریج ترقی پذیر تھی اس کا دماغ بڑھ رہا تھا جو اب 700CC ہو چکا تھا۔ اس نوع کی ابتدا کے بارے میں انسان نے بہت سے نظریات قائم کیے ہیں جن کا ذکر ابھی گذرا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا کوئی واضح جواب ابھی نہ سائنس وضع کر سکی ہے نہ ماہرین حیاتیات(Biologists) اس معمہ کا کھوج لگا سکے ہیں اور نہ ہی ماہرین بشریات (Anthtropologits) اور نہ ہی فلسفہ اپنی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں انسانی ارتقاء کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کر سکا ہے اس لیے کہ اس سارے معاملے کے پیچھے ایک الوہی طریق کارفرما ہے جس پہ ایمان لائے بغیر اس طرح کی کوئی گتھی کبھی نہیں سلجھ سکتی۔ چنانچہ خالق نے انسان کو عقل کی نعمت سے بتدریج نوازا جیسا کہ ارشاد پاک ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا O

القرآن الحکیم (سورۃ دھر ۷۶-۲)

ترجمہ:

”بلاشبہ ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائش میں ڈالیں اور ہم نے

اسے دیکھنے اور سننے والا بنایا ہے''۔

□□□□□□□

اسی انسان نے آگے بڑھ کے عظیم ذمہ داریوں کا حامل بننا تھا اس لیے خالق نے اسے ارتقاء کے تمام مراحل میں اپنی رحمت کے سائے میں رکھا۔ انسان کے بتدریج ارتقاء کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ایک گوریلا کا دماغ 850CC ہوتا ہے جبکہ ایک (Austro Flixin) کا دماغ 700 CC تھا۔ اسی طرح دس بیس لاکھ سال گذر گئے جب افریقہ اور یورپ میں اس دور کے انسان کے مزید ڈھانچے دریافت ہوئے جن کے مطالعہ سے انسان نے جانا کہ اس دوران انسان نے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کی تھیں۔ چنانچہ اب کے جو انسانی ڈھانچہ دستیاب ہوا اسے (Homo or Homo Erectus Habilis) کا نام دیا گیا یہ انسان نسبتاً چالاک تھا اور اس لیے کہ اس کی ذہنی استعداد بڑھ چکی تھی اس کا نشان کلہاڑا تھا۔ اس نے پتھر کی تیز دھار کا استعمال اپنا لیا تھا اب اس نے شکار کر کے اپنا پیٹ بھرنا سیکھ لیا تھا۔ اس دور میں انسان کے پاس وقت بہت زیادہ تھا جس میں خالق کی یہ مصلحت دکھائی دیتی ہے کہ وہ اپنی ذات پہ غور کر سکے۔ مظاہرِ کائنات کی توجیح کر سکے اپنے خالق کا ادراک حاصل کر سکے اور کائنات میں اپنے مقام کا تعین کر سکے جس طرح آج کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ذات کے لیے بھی وقت نہیں تو وہ خالق کی پہچان کے لیے وقت کہاں سے نکالے گا۔ چنانچہ قدیم وقتوں کے انسان کو اس المیہ سے بچانے کے لیے خالق نے یہ اہتمام کیا کہ اس دور میں بڑے بڑے جانور پیدا کیے جن کا شکار کرنے کے بعد انسان کے پاس بہت وقت بچ رہتا تھا۔

جس میں وہ ان بنیادی سوالات پر غور کر سکتا تھا اس طرح کا یک واقعہ ہمیں دورِ نبوت میں بھی ملتا ہے جب صحابہؓ ایک مرتبہ جہاد پر گئے ہوئے تھے تو ان کی خوراک ختم ہو گئی جب بھوک کی شدت نے انھیں آ گھیرا تو انھوں نے اللہ سے اس مشکل سے نکلنے کی دعا کی تو پانی سے ایک بہت بڑا جانور باہر آیا اور وہیں رک گیا وہ جانور اتنا بڑا تھا کہ اس کے جبڑے کی ہڈی کے نیچے سے اونٹ سوار سمیت گذر سکتا تھا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم اسے مہینہ بھر کھاتے رہے اسی طرح زمانہ قدیم زمانے میں بڑے بڑے جانوروں کو پیدا کرنے میں یہی حکمت کارفرما تھی کہ انسان کچھ دیر کے لیے فکرِ معاش سے آزاد ہو کر غور و فکر اور تفکر کر سکے۔ گذرتے وقت کے

ساتھ انسانی ارتقاء کا سفر جاری رہا۔ چنانچہ اس انسان نے جسے (Homo Erectus) کہتے ہیں اسی نے صدیوں کی روایت کو توڑا اور اپنے جبلی رویوں سے راہ بغاوت اختیار کی۔ اس نے سیدھا ہوکر اپنے دو نوں پاؤں پہ چلنا شروع کیا تو اس نے جانا کہ اس طرح چلنا اس کے لیے قدرے آسان ہے اس کا سیدھا ہو کے کھڑا ہونا ہی اس کے شکار کے دور میں داخل ہونے کا باعث بن گیا۔

اس کا نشان کلہاڑا تھا اب اس کا دماغ 950cc سے 1050cc ہو چکا تھا یاد رہے کہ آج ایک نارمل بچے کا دماغ 1750cc ہوتا ہے اگر چہ اس کا دماغ بڑھ چکا تھا مگر ابھی وہ انسانی مرحلے سے کچھ فاصلے پہ تھا۔ ابھی اس کے آباؤ اجداد آرہے تھے اور کاروانِ حیات بتدریج آگے بڑھ رہا تھا پھر جرمنی میں انسانی ارتقاء کا یک اور سراغ ملا یہ ملین سال سے بھی پہلے کے انسان کا نشان تھا اسے (Homo Sapian Neamderthen) کا نام دیا گیا یہ بھی انسان کے آباؤ اجداد میں شامل تھا اور اس میں بہت سی صفات تھیں جو اس سے پہلے کے انسان میں موجود نہیں تھیں یعنی انسانی ارتقاء کا سفر ہر لحاظ سے جاری تھا۔ غور وفکر اور تفکر کی جس نہج پر قدرت انسان کو چلانا چاہتی تھی اس کے اثرات اس کی خارجی زندگی میں نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس دور میں انسان نے اپنے مردوں کو دفن کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی دور کے ایک بچے کی قبر تاشقند میں اور ایک بڑے فرد کی قبر عراق میں دریافت ہوئی ہے جن کے مطالعہ سے انسانی ارتقاء کے حیرت انگیز شواہد منظر عام پہ آئے ہیں اور انسان نے جانا کہ اس دور میں انسان کے اندر فنونِ لطیفہ کا حس وشعور بھی اجاگر ہو چکا تھا اور وہ آرٹ میں اپنے علم کی ابتداء کر چکا چکا تھا۔ وہ اپنے اعزاء کی قبروں پر پھول چڑھاتا مگر کیا تاریخ کے ان ادوار میں انسان کے پاس خدا کا تصور آچکا تھا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نہیں کیونکہ اگر چہ اب وہ ذہنی بلوغت کے قریب تھا مگر اسے ذہنی بالغ نہیں کہا جا سکتا اور خالق کا تصور بلوغت کی علامت ہے۔ ابھی اس کی ذہنی استعداد اتنی بلند نہ ہوئی تھی کہ وہ خدا کا تصور کر سکتا اور معرفتِ خداوندی کے بوجھ کو اٹھا سکتا۔ تاہم اس دور کے انسان اور پہلے دور کے انسان میں اب بہت فرق آچکا تھا اب وہ سوچتا تھا سمجھتا تھا سنتا تھا اور دیکھتا تھا اور غور کرتا تھا اس نے اپنے سماج میں انسانی اخلاقیات کے اولین خدوخال وضع کرنے شروع کر دیئے تھے۔ عورت اور مرد الگ الگ ہو چکے تھے۔ اچھے اور برے کی تمیز کے پیمانے وضع کیے جانے لگے تھے شاید اسی لیے اس دور کے انسان کو (Homo Spapian) کا نام دیا گیا جس کا مطلب تھا سوچنے والا انسان۔ چونکہ باقی جانوروں کی نسبت انسان کا

بچہ دیر سے بڑا ہوتا ہے اس لیے اس دور کے انسان نے اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔اس نے کالونیاں بنانا شروع کر دیں تھیں وہ اکھٹے ہو کر گروہ کی شکل میں رہنا سیکھ چکا تھا جس سے تہذیب وتمدن کی بنا پڑی اس نے آگ کا استعمال سیکھ لیا تھا اور شکار کے نت نئے طریقے بھی دریافت کر لیے تھے۔

اگر چہ انسان کے شعور میں ارتقاء بتدریج جاری تھا مگر اس کی عقل شعور اور تفکر کی صلاحیت کے ارتقاء میں بڑی پیش رفت تب ہوئی جب اس نے اپنے(Genatic Code) کی صدیوں سے قائم روایات کے خلاف بغاوت کر دی یہ بغاوت بھی (Homo Sapain Neamderthen) کے دور میں وقوع پذیر ہوئی اس کے بعد(Homo Sapian) کا دور شروع ہوا جس کے ملحق زمانے کو عام لفظوں میں پتھر کا دور (Stone Age) کہا جاتا ہے انسانی زندگی کے اس ارتقاء میں عقلی انسان کا دور تین لاکھ قبل بتایا جاتا ہے مگر ایک ترقی یافتہ اور بلوغت شدہ انسان کا سراغ صرف دس ہزار سال سے لے کر پچیس ہزار سال قبل بیان کیا جاتا ہے ۔یہ اپنے سے قبل کے تمام انسانوں سے بہتر اور برتر انسان تھا جس نے طویل اور صدیوں کا سفر طے کر کے یہ منزل حاصل کی تھی۔اب اس نے اپنے کلچر کی تشکیل شروع کری تھی اپنے لیے اخلاقیات اور قانون وضع کرنے کا شعور حاصل کر لیا تھا۔حضرت آدم علیہ السلام کا ظہور شاید اسی زمانے میں ہوا ہو۔اس لیے کہ اب انسان نے شعور کی اعلیٰ منزل کو حاصل کر لیا تھا اور وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ توحید اور معرفت ربانی کی عظیم امانت کا بار اٹھا سکے۔اللہ تعالیٰ کے احکام قبول کر سکے اور اس کے عطا کردہ حسن و قبح میں فرق کر سکے اچھے اور برے میں امتیاز کر سکے ۔ چنانچہ جب رب ذوالجلال نے انسان کو خلیفۃ الارض بنانے کا فیصلہ کیا تو اس سامنے یہی(Homo Sapian Neadmderthen) نامی انسان تھا جو فکر و شعور میں قدرے پست اور فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے بھی اتنا زیادہ بالیدہ اور مہذب نہ تھا اسی لیے جب ربِ ذوالجلال نے فرمایا:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ۲۔ ۳۰)

ترجمہ؛

''اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پہ اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں''۔

❑❑❑❑❑❑❑

(تواس کے جواب میں فرشتوں نے کہا)

قَالُوٓا۟ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ

القرآن الحکیم (سورۃ البقرہ ۲۔ ۳۱)

ترجمہ؛

''اے پروردگار کیا تو زمین میں ایسے کو نائب بنائے گا جو شر اور فساد پھیلائے گا اور خونریزی کرے گا''۔

❑❑❑❑❑❑❑

اسی سے ملتا جلتا ایک مضمون ہمیں حدیث کی کتابوں میں بھی ملتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو معتبر اور معزز قرار دے کر اسے خلیفۃ الارض بنانے کا اعلان فرمایا تو ملائکہ نے کہا ''اے پروردگار'' تو اسے پنا خلیفہ بنائے گا جو کھاتا ہے پیتا ہے مباشرت کرتا ہے اور دنیا کے حقیر امور میں مصروف رہتا ہے اس لیے اے پروردگار تو اسے یعنی انسان کو دنیا دے دے اور ہمیں آخرت کا عزت وشرف عطا فرما دے۔تو اس پر رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا کہ اے ملائکہ میں نے تمہیں حرفِ کن سے پیدا کیا ہے مگر انسان کو میں نے حرفِ کن سے نہیں بلکہ اپنے ہاتھ سے بنایا ہے تم دونوں برابر کس طرح ہو سکتے ہو۔چنانچہ اغلب یہی ہے کہ یہ (Homo Sapian) ہی کا زمانہ تھا جب انسان نے شعور کی پہلی جھلک کو پایا یہ آج سے دس ہزار سال سے چالیس ہزار سال پہلے کی بات ہے جب انسان نے اپنے شعور کو پوری طرح استعمال کرنا شروع کیا ۔اس پورے ارتقائی عمل سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ جب تک ایک مسلسل تجرباتی دور مکمل نہ ہو کوئی اصول وضع نہیں ہوتا اور جب تک انسان اپنے شعور کو مکمل طور پہ استعمال کرنا شروع نہیں کر دیا اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی ہدایت کو محفوظ اور غیر منزل ہی رکھا تا آنکہ وہ دور آیا جب حضرت آدم علیہ السلام کو منصبِ نبوت پہ سرفراز کیا

گیا عین ممکن ہے کہ صحیفہ آدمؑ ایک ہی آیت ایک ہی ہدایت پر مشتمل ہو۔ چونکہ آدم کو ان تمام داخلی اور خارجی حالات میں بے شمار معاملات کو از سر نو دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک نئے ماحول میں ایک نوع کے تربیتی اور ارتقائی دور میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس لیے انھیں ایک ہی حکم اور ایک ہی آیت کا سہارا دیا گیا کہ تم نے اسی پر عمل کرنا ہے زندگی کے ایک محدود حصے میں انھیں حکم الٰہی کا پابند بنایا گیا جب کہ بقیہ زندگی میں انھیں آزاد چھوڑ دیا گیا کیونکہ ابھی اس انسان کا دماغ اور ذہن اتنا بالیدہ نہ ہوا تھا کہ وہ زیادہ احکام کا بوجھ اٹھا سکتا شاید اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی۔

کیونکہ اس دور کے انسان کا ذہن اتنا زیادہ (Fungshnial) نہ تھا اندریں حالات یہ ایک قدرتی بات تھی کہ خالق کی طرف سے انسان کو زیادہ عمر عطا کی جاتی تا کہ اسے غور و فکر کے لیے زیادہ وقت مل سکے۔ تاریخ انسانیت میں یہ ایک الوہی اصول رہا ہے کہ کسی بھی نسلِ انسانی میں پیغمبر وہی شخص ہوتا ہے جو نہ صرف ہدایت یافتہ ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے معاشرے کا اعلیٰ ترین ذہن بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر معاشرے میں نبی کے سوا کوئی اور زیادہ ذہین فرد بھی موجود ہو تو یہ انصاف سے بعید ہوگا گویا امانت علم اسے ہی ملے گی جو سب سے زیادہ ذہین ہوگا۔ چونکہ آدم علیہ السلام اس دور کے ذہین ترین شخص تھے سو آپ کو پیغمبری اور راہنمائی کے لیے چنا گیا۔ اس طرح ہدایت اور شرف انسانیت کو عطا کیا گیا۔ انسان کو موجودہ ارتقائی دور تک پہنچنے کے لیے کروڑوں سال لگ گئے کیونکہ وہ جبلت جو جانوروں سے مشابہ تھی اس سے ایک آدھ صدی میں انسان الگ نہ ہو سکتا تھا۔ علم فلسفہ کے مطابق اسی جبلت کو ہم ''نفس'' کا نام دیتے ہیں جو ان خصوصیات پر مشتمل ہے جو انسان نے جینیاتی طور پہ ورثے میں حاصل کی ہیں مثلاً قتل و غارت گری، حملہ آوری، نفرت اور اسی قبیل کے دیگر عیوب اور انھیں کے خلاف جدوجہد انسان کو خدا تک لے جاتی ہے۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى ○ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى○

القرآن الحکیم (سورۃ نازعات۷۹-آیات ۴۱)

ترجمہ؛

”اور جو کوئی روز قیامت اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور جس نے اپنے نفس کو روکا انھیں کے لیے فلاح ہے“۔

اگر چہ سائنس اور اہل فلسفہ نے کائنات میں انسانی ارتقاء کے متعدد نظریات پیش کیے ہیں مگر در حقیقت میرے نزدیک یہ بات جاننے سے زیادہ کہ انسان اس دنیا میں کیسے اترا یہ بات جاننے کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کیوں اترا اور یہی وہ سوال ہے جس کے معلوم ہونے جانے کے بعد انسان اس طلسماتی دنیا کی اصل حقیقت کا ادراک حاصل کر لیتا ہے اور یہی اس کی کامیابی اور فلاح کی ضمانت ہے۔اسی امر کے پس پردہ انسان اور کائنات کے تعلق میں وہ پوشیدہ اسرار ہیں جو انسان کو خالق کی پہچان کی دعوت دیتے ہیں۔مظاہر کائنات کی ہر پرت خالق کے احسان پر دلیل فراہم کرتی ہے اور یہی ادراک علم ہے جسے حقیقی علم کہا جا سکتا ہے۔کسی پھول پہ منڈلاتا کوئی بھنورا ہو یا کسی ادھ کھلی کلی کے عارض پہ شبنم کی شرارت، قوس قزح کی حسین رنگوں سے سجی کمان ہو یا پھر چاندنی رات میں بپھرتے سمندر کی تہہ در تہہ لہریں، کسی ویران راہگذر پہ خزاں رسیدہ سنہری پتوں کا فرش ہو یا سرِ چمن بہار کے دہکتے رنگ، حسین اور سیاہ زلفوں کے سائے ہوں یا ڈوبتے سورج کی شفق، نیلے آسمانوں میں محو سفر کونجوں کی ڈار ہو یا چیونٹیوں کے زیر زمین مسکن، پہاڑوں میں ابلتے میٹھے پانی کے چشمے میں ہوں یا صحرا میں بکھرے نخلستان، گھنے جنگلوں میں پرندوں کی حمد ہو یا سرسراتے سانپوں کی آہٹ، بن میں لہراتا کوئی آنچل ہو یا کسی دریچے میں حسن کی یکبارگی چمک، کائنات کا ہر نیا رنگ انسان پہ اپنا اچھوتا تاثر چھوڑتا ہے۔کائنات کی یہ رنگا رنگی خالق کے وجود پہ اس کے رویہ احسان پہ دلیل پیش کرتی ہے۔چنانچہ خالق کی پہچان اور اس کی بندگی ہی مقصدِ زیست ہے۔یہی فلاح کا راستہ اور کامیابی کی کلید ہے باقی سب سوال ثانوی ہیں۔

> عرفان ومعرفت وہ روحانی مراتب ہیں جو ہر کسی کو عطا نہیں کیے جاتے۔ بلکہ علم کی راہوں پہ چلتے وہ مسافر جن کی مسافت تلاش کے رستے آبلوں سے مزین ہوتی ہے اُن کو حکمِ الٰہی سے تفویض کیے جاتے ہیں۔

معرفت کے رستے

انسان نے جب اصولِ کائنات پہ نگاہ عمیق ڈالی تو اس نے جانا کہ خالق کی طرف سے کائنات میں کسی بھی مخلوق سے بے توجہی کا رویہ اختیار نہیں گیا بلکہ اس کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لیے مدد اور راہنمائی کا ایک مستقل سلسلہ ہے جو ازل سے جاری ہے اور جس کی بنا پہ ہی چیونٹی سے لے کر اژدھے تک نے اپنا سماج تعمیر کیا ہے۔ خالق کی اس کائنات میں ابھی انسان صرف کئی لاکھ مخلوقات کی پہچان کر سکا ہے اگرچہ اسرار کے دبیز پردوں میں خالق کے انگنت کرشمے آنے والے وقت میں انسانی آنکھ کے منتظر ہیں۔ سمندر کی تہوں میں وہ کل تک جن کو پودے سمجھتا تھا آج ان کی پہچان بدل چکی ہے اور انسان انھیں مچھلی کی نسل کی کوئی مخلوق قرار دیتا ہے۔ اسی طرح جب اس کے مشاہدے کو وسعت ملی تو اس نے جانا کہ کائنات میں پائی جانے والی ہر جاندار چیز ایک امت ہے اور چڑیا سے لے کر شیر تک اپنے سماجی رویوں کی پہچان رکھتے ہیں جو صدیوں پر محیط ہیں۔ شہد کی مکھی اگر کسی ملکہ مکھی کے حکموں کو تسلیم کرتی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اس کی تہذیبی بناوٹ اس کو آگہی فراہم کرتی ہے کہ اس کی نسل یا اس کی امت میں عمومی رویے کیا ہوں

گے۔ایک معمولی بھڑ(انجنا) کی مثال لیں بھڑ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے ایک گڑھا کھودتی ہے پھر ایک ٹڈے کو قابو کر کے اس کو گڑھے کے کنارے پہ رکھ دیتی ہے جب وہ ٹڈے کو پکڑ لیتی ہے تو ڈنک مارتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے خاص عصبی مقام پہ ڈنک مارتی ہے، وہ ایک خاص اندازے سے ٹڈے کے جسم میں صرف اتنا ہی زہر داخل کرتی ہے جس سے وہ بے ہوش ہو جائے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے بھڑ یہ عمل کر رہی مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ٹڈا اس کے ہاتھ سے مر گیا ہو کیونکہ اگر وہ مر جائے تو بھڑ کا مشن ناکام ہو جائے۔ٹڈے کو بے ہوش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب اس کے بچے انڈوں سے نکلیں تو ان کو تازہ گوشت فراہم ہو جائے۔چنانچہ بھڑ ٹڈے کو بیہوش کر کے اس کے گرد انڈے دینا شروع کر دیتی ہے جب اس کے بچے انڈوں سے باہر نکلتے ہیں تو ان کو اپنی بقاء کے لیے زیادہ جدوجہد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ ٹڈے کا تازہ گوشت ان کی ضیافت کے لیے پہلے ہی وہاں موجود ہوتا ہے۔وہ ٹڈے کے زندہ گوشت کو دھیرے دھیرے کھاتے رہتے ہیں اگرچہ وہ نہیں جانتے کہ یہ گوشت ان کے لیے مضر صحت ہے یا نہیں۔مگر ان کی ماں ضرور جانتی تھی کہ مردہ ٹڈے کا گوشت ان کے نقصان دہ ہوگا اس لیے وہ ٹڈے کو مرنے نہیں دیتی اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے اور پھر لوٹ کے کبھی نہیں آتی اور نہ کبھی اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔

مگر اس کے باوجود جب اس کا بچہ بڑا ہوتا ہے تو وہ ٹھیک اسی عمل کو دھراتا ہے اور ساری بھڑیں اپنی زندگی میں ایک بار اور پہلی بار اپنی نسل کی بقاء کے لیے بالکل ٹھیک انداز سے وہی کام سرانجام دیتی ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بھڑ کے بچے کو اپنی آئندہ نسل کی بقاء کے لیے اس اندازِ زیست کی طرف کون راغب کرتا ہے۔کون اس کو بتاتا ہے کہ اگر وہ ایک ٹڈے کو قابو کر کے اس کے اردگرد انڈے نہ دے گی تو اس کی نسل خطرے میں پڑ جائے گی۔حالانکہ اس نے اپنے ماں باپ کو کبھی یہ عمل کرتے نہ دیکھا تھا۔مشہور جرمن فلسفی برگساں بھڑ کے اس عمل کے بارے میں لکھتا ہے کہ میں نے حیرت سے بھڑ کے ان رویوں کے بارے میں سوچا تو مجھے محسوس ہوا جیسے بھڑ نے کسی اعلیٰ ماہر عضویات سے تعلیم حاصل کی ہو۔انسانی علوم نے بھڑ کے ان رویوں کو اس کی جبلت قرار دیا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جبلت کیا ہے اور اس کا محرک اول کیا ہے جو کسی بھی مخلوق کو ایسے عمل پہ اکساتا ہے جو اس کی زندگی کے فائدے کا باعث ہو۔اسی طرح ایک لمبی مچھلی کو لیجئے جسے انگریزی میں (Eal) کہا جاتا ہے ڈنمارک کے ماہر حیوانات ڈاکٹر شمٹ (Dr Johannes

(Schmidt) نے کئی سال کی تحقیق کے بعد معلوم کیا ہے کہ یہ عجیب وغریب مچھلی اپنی زندگی کی جوانی ہر جگہ کے آبی مرکزوں میں گذار کر اپنی موت سے قبل جزیرہ برمودا کے پاس جمع ہوتی ہے اور وہیں یہ سب مچھلیاں انڈے دے کر مر جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بحر اٹلانٹک میں جزیرہ برمودا کے آس پاس سمندر کی گہرائی میلوں تک پہنچ جاتی ہے اور یہاں سمندر اپنی انتہائی گہرائی کو جا چھوتا ہے۔ یورپ کی ایلین مچھلیاں سمندروں میں تین ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں۔ جزیرہ برمودا کی گہرائیوں میں آنکھ کھولنے والے یہ بچے اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اس کے باوجود بھی اپنی زندگی کے اختتامی آیام تک پہنچنے سے پہلے وہ انھیں پانیوں کے کنارے آ لگتی ہیں جہاں سے کبھی ان کے والدین چلے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماں باپ والی ندیوں جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہو جاتیں اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔

پھر ان مچھلیوں کو آمد و رفت کی یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوتی ہیں یہ سوال کہ ان کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے صدیوں انسان کی الجھن بنا رہا۔ تاہم قرآن نے انسان کو بتایا کہ یہ سب وحی کے ذریعہ ہوتا ہے ''وحی'' پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات میں ہمیشہ سے جاری ہے۔ کوئی مخلوق زندگی گزارنے کے لیے کیا کرے اور خالق کائنات نے مجموعی اسکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے اس کو وہ کس طرح انجام دے اسی کا نام وحی ہے۔ اس وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات کے ساتھ ہے اور ایک وہ جس کا تعلق خاص انسان سے ہے۔ انسان کے سوا کائنات کی وسعتوں یا زمین کے اس تختے پر جتنی بھی سانس لینے والی مخلوقات پائی جاتیں ہیں وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہیں ان کا کوئی کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور اردے پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ ایک شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو سائنس کی زبان میں جبلت (Instinct) کہا جاتا ہے اور مذہب اور الہامیات میں اسے وحی کہتے ہیں۔ گویا کائنات کے تمام جاندار ایک طرح کی مشینیں ہیں جو ایک محدود دائرے میں اپنا متعین عمل مکمل کرتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے جانداروں کے لیے ارادہ و اختیار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں

بلکہ جبلت یا عادتِ فطری کے کی شکل آتی ہے۔خالق کے خصوصی امر کے تحت ان کی ساخت اس طرح کی بنائی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دھراتے رہیں مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے جسے خالق کی طرف سے مرضی اور ارادے میں آزادی عطا فرمائی گئی ہے۔چنانچہ وہ اپنے ذاتی ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کام کو نہیں کرتا۔وہ ایک کام شروع کرتا ہے پھر اسے بلقصد چھوڑ دیتا ہے۔پہلے وہ ایک کام نہیں کرنا چاہتا پھر اسی کو کرنا شروع کر دیتا ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگر چہ اسی طرح خدا کی مخلوق ہے۔جس طرح کہ دوسری مخلوقات ہیں مگر وہ اس لحاظ سے کائنات کی دوسری تمام مخلوقات سے منفرد ہے کہ اسے عمل وارادہ میں آزادی عطا کی گئی ہے اور اسی آزادی کی بدولت اسے حالت امتحان میں رکھا گیا ہے جو کام دوسری مخلوقات سے عادت وفطرت کے تحت لیا جارہا ہے وہی کام انسان کو اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے یہی اس کا اصل امتحان ہے۔

چنانچہ انسان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے نہ کہ عادت اور جبلت کی صورت میں۔دوسرے لفظوں میں اس حقیقت کی تشریح یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ عام حیوانات کی وحی ان کی فطرت میں پیوست کر دی جاتی ہے۔حیوانات یا چرند پرند کو کیا کرنا ہے اس کا علم وہ پیدائشی طور پہ اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اس کے برعکس انسان جب عقل وشعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کو اس کے احکامات یا قوانین کی وحی خارج سے سنا دی جاتی ہے اور اس کے ارادہ عمل کو آزمانے کے لیے اللہ اس کو مہلت عطا فرما دیتا ہے۔کہ انسان میرے احکام اور قوانین کو مانتا ہے یا بغاوت وانحراف کی راہ اختیار کرتا ہے۔اس پیغام رسانی کا طریقہ کار یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں کے درمیان اپنے خاص بندے ایک خاص علم کے ساتھ مزین کر کے انسانوں کے درمیان اتارتا ہے جن کو ہم نبی یا رسول کہتے ہیں۔وہ انسان کو بتاتے ہیں کہ خالق کی رضا کس میں ہے انسان کی کامیابی کا راستہ کون سا ہے اور انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کس چیز سے رک جانا چاہیے۔گویا رسول وہ درمیانی کڑی ہے جو انسان کو اس کے خالق سے جوڑتی ہے۔اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ کسی بندہ خاص پر خدا کی وحی کس طرح آتی ہے اور یہ کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی وحی ہے جس سے انسان خدا کی حقیقی رضا تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔چنانچہ اس گھمبیر مسئلہ کو اس مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں انسان نے جو مشینیں اور جو آلات بنائے ہیں وہ تقریباً سب کے سب لوہے کے ہیں۔اگر لوہے کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوگی کہ انسان نے کس طرح اس کو دریافت کیا۔جب کہ

لوہے کے متعلق اسے پہلے سے کوئی علم نہ تھا۔اس نے کس طرح اس کے منتشر اجزا کو یکجا کیا جو مختلف مرکبات کی شکل میں زمین کی مختلف چٹانوں کے ساتھ مخلوط ہو کر منتشر پڑے تھے۔انسان نے انھیں یکجا کیا اور اس کو خالص لوہے کی ٹھوس شکل میں تبدیل کیا۔یہی حال دوسری ایجادات کا بھی ہے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ ان ایجادات کی طرف انسانی ذہن کی راہنمائی کس نے کی اور وہ کون سی قوت ہے جو تجربے اور مشاہدے کے دوران ایک سائنس دان کو اس مخصوص نقطے تک پہنچا دیتی ہے جہاں پہنچ کر اسے ایک مفید اور کارآمد نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔جو بات ہم کو معلوم نہ تھی وہ کیسے معلوم ہوگئی اس علم کا ذریعہ وہی خدائی فیضان ہے جس کو ہم وحی کہتے ہیں کہ سب کچھ جاننے والا اپنے علم میں سے تھوڑا سا حصہ انسان کو عطا کر دیتا ہے اور اس کے اندھیرے روشنیوں میں بدل جاتے ہیں۔بہت سے وجود جو کل تک عدم میں تھے آج وجود میں آجاتے ہیں یہ فیضانِ وحی کا ابتدائی درجہ ہے جو غیر محسوس طور پہ آتا ہے اور ہر شخص کو اس میں سے حصہ ملتا ہے۔

آپ نے کبھی محسوس کیا ہے کہ آپ کسی راہ پہ جا رہے ہوں پھر خود ہی اندر کی کسی پراسرار ضد سے آپ راہ بدل جاتے ہیں۔کچھ ہی دیر بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس راہ پہ آپ جا رہے تھے وہاں کوئی خوفناک واقعہ پیش آگیا ہے۔تب انسان جانتا ہے کہ کسی پراسرار قوت نے اسے اس راہ پہ جانے سے روکا تھا جو اس کے فائدے کی خواہش مند تھی۔ہزاروں دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان سوچتا کچھ اور ہے مگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتا۔خود اس کی نظروں کے سامنے اس کے شکستہ ارادوں کا عکس اس کو پریشاں کرتا ہے مگر کچھ وقت گذنے کے بعد انسان پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اگر اس وقت وہ اپنے ارادوں میں کامیاب جاتا تو اس کو فلاں فلاں نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔انسان نے مادی دنیا میں جو بیشمار کامیابیاں حاصل کیں ہیں وہ اسی فیضان کا تسلسل ہیں اس نے طرح طرح کی جو ایجادات کی ہیں وہ اس کے اسی تخیل کی پیداوار ہیں جو اس نے اپنے ذہن میں تراشا پھر اس کی عملی تعبیر کے حصول میں مشغول ہوگیا۔آج کی جدید ایجادات میں سے کسی پر غور کر لیں مثلاً کار اور ہوائی جہاز کی مثال ہی لے لیں کیا اس کے موجد یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جہاز اور کار میں انھوں نے کوئی ایسا عنصر استعمال کیا ہو جو ماورائے کائنات ہو۔حقیقت یہ ہے کہ یہ کار اور ہوائی جہاز اسی کائنات کے منتشر اجزا تھے جنھیں جب ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ اکھٹا کیا گیا تو انھوں نے زمین پر دوڑھنا اور آسمان پر اڑنا شروع کر دیا۔لوگ اس کو علم سائنس یعنی تجربے اور مشاہدے کا کرشمہ قرار دیتے ہیں مگر میں اس کو اسی خاص علم کے ساتھ مختص کرتا ہوں جو غیب سے ہر آن انسان کی راہنمائی کے درپئے ہے۔وحی کی دوسری قسم ذرا زیادہ

طاقتور اور ترقی یافتہ ہے اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر آدمی کو ویسا حصہ نہیں ملتا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ وہ شعوری احساس ہے جو مخصوص لوگوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہ وحی صرف ان لوگوں کے پاس آتی ہے جن کے قلوب کو خاص اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہو اور وہ خاص لوگ اللہ کے وہ نیک اور پسندیدہ بندے ہوتے ہیں جن کو اللہ نے لوگوں کی طرف فلاح کا پیغام پہنچانے کے لیے چن لیا ہو یعنی فریضہ رسالت کے لیے منتخب کرلیا ہو۔ ان کا علم بھی خاص ہوتا ہے اور طریقہ بھی خاص۔ ان کو معروضی علوم (جن کے تحت انسان نے کار اور ہوائی جہاز بنائے) کی بجائے موضوعی علوم عطا کیے جاتے ہیں جن کو حقیقت کا علم یا علم حقیقی بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان کی فلاح کے لیے اللہ کے اس خاص اہتمام میں انسان کو اس رستے تک راہنمائی فراہم کی جاتی ہے جس پر عمل کرنے سے وہ کامیابی کی منزل حاصل کرسکتا ہے۔ پیغمبر انسان کو زندگی گذارنے کا طریق بتاتے ہیں اور حق پہ قائم رہنے کی تاکید و تلقین کرتے ہیں۔ وحی والہام کی اس دوسری قسم کے متعلق بس ہم اسی قدر سمجھ سکتے ہیں اور اس سے زیادہ مطالبہ کرنا دراصل ایک ایسا مطالبہ کرنا ہے جو انسان کے بس سے باہر کی بات ہے۔

مثلاً غور کریں کہ ایک اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو زمین سے لاسلکی پیغام بھیجا جاتا ہے جس کو ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا آدمی پورے یقین کے ساتھ صاف الفاظ میں سن لیتا ہے یہ ہماری قریبی زندگی کا ایک واقعہ ہے مگر آج تک سائنس اس کی مکمل توجیہ نہیں کرسکی اس سلسلے کی کئی درمیانی کڑیاں ابھی تک غائب ہیں کہ یہ واقعہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ یہی حال ان تمام واقعات کا ہے جن سے ہم اس زمین پر واقف ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہے کہ ہم حقیقتوں کو صرف مجمل طور پہ جانتے ہیں جیسے ہی ہم کسی حقیقت کو آخری حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ہماری قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلی حقیقت کو سمجھنے کا مطالبہ کرنا کسی ایسے آدمی کا کام ہی ہوسکتا ہے جو خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہو۔

سائنس نے بھی اب اس امر کو طوعاً و کرہاً تسلیم کرلیا ہے کہ حقیت متعلق کا علم حاصل کرنا انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس سلسلے میں برطانوی مفکر **(Heisen Berg)** کی تازہ کتاب **(Modern Scintefic Thought)** سے ہم وہ اصول بیان کریں گے جس کو انھوں نے اصول عدم تعین **(The Principle of Indeterminacy)** کا نام دیا ہے اس اصول کا عمومی تصور یہ ہے کہ قدیم زمانے میں اہل سائنس کا خیال یہ تھا کہ کائنات کی بسیط پہنائیوں میں اگر کسی ایک ذرے (ایٹم) یا

ایک الیکٹران کا مقام مکمل طور معلوم ہوا گر ہم یہ جان لیں کہ کسی خاص وقت میں فضاء کے اندر اس کا مقام اور رفتار کیا ہے اور اگر ان معلومات کے ساتھ بیرونی طور پہ اثر انداز ہونے والی طاقتوں کا علم بھی حاصل ہو جائے تو الیکٹران کے تمام مستقبل کو متعین کیا جا سکتا ہے۔ اگر کائنات کے تمام ایٹوں کے متعلق ان باتوں کا علم حاصل ہو جائے تو ساری کائنات کے بارے میں آنے والے وقت کی پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ مگر ہائزن برگ کی تشریح کے مطابق جدید سائنس اب اس نتیجے تک پہنچی ہے کہ ان مقدمات کی دریافت میں بہت سے قوانین قدرت حائل ہیں اس لیے کہ اگر ہم یہ جان بھی لیں کہ ایک خاص الیکٹران اس وقت فضاء میں کس خاص مقام پر موجود ہے تب بھی ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کس رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ قدرت ہمیں کسی حد تک سہو (Margin of Error) کی اجازت دیتی ہے۔ مگر جب ہم اس گنجائش میں گھسنا چاہیں گے قدرت ہمارا راستہ روکے گی اور قوانین فطرت ہماری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت انسان ہی کی طرح بالکل صحیح پیمائشوں سے قطعاً نا آشنا ہے اسی طرح اگر ہمیں فضاء میں کسی الیکٹران کی حرکت کی ٹھیک ٹھیک رفتار معلوم ہو تو قدرت ہمیں فضا کے اندر اس کا صحیح مقام دریافت نہیں کرنے دیتی اور اگر ہم فضاء میں کسی الیکٹران کا درست مقام معلوم کر لیتے ہیں تو قدرت اس کی رفتار کو ہم سے چھپا لیتی ہے گویا الیکٹران کا مقام اور اس کی حرکت کسی پرانی لالٹین کی سلائیڈ کی دو مختلف سمتوں پر نقش ہیں۔ اگر ہم سلائیڈ کو کسی خراب لالٹین میں رکھیں تو ہم ان دو رخوں کے درمیان کے نصف کو روشنی میں لا سکتے ہیں اور الیکٹران کے مقام اور اس کی حرکت دونوں کو کچھ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔

اچھی لالٹین کے ذریعے ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم ایک سلائیڈ پر جتنی زیادہ روشنی ڈالیں گے دوسری اتنی ہی دھندلی ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ سچ یہ ہے کہ خراب لالٹین قدیم سائنس ہے جس نے صدیوں انسان کو اس فریب میں مبتلا رکھا کہ اگر ہمارے پاس مکمل لالٹین ہو تو ہم کسی خاص وقت پر ذرے کے مقام اور اس کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکتے ہیں یہی دھوکہ تھا جس نے سائنس میں جبریت (Determinism) کو داخل کیا۔ مگر اب جب کہ جدید سائنس کے پاس زیادہ بہتر لالٹین موجود ہے تو اس نے ہمیں بتایا کہ کسی بھی ایٹم کی حالت اور حرکت کا تعین حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں جنھیں ہم بہ یک وقت روشنی میں نہیں لا سکتے اس سلسلے کا آخری سوال یہ ہے کہ خدا کی وحی جو مختلف زمانوں میں انسان کے پاس آتی رہی ہے ان میں سے کون سی وحی ہے جس کی پیروی آج کے انسانوں کو کرنی ہے۔ اس کا جواب بالکل سادہ ہے کہ بعد کے لوگوں کے

لیے وہی وحی قابل اتباع ہوسکتی ہے جو سب کے بعد آئی ہو۔ مثلاً کوئی حکومت ایک ملک میں کسی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتی ہے ظاہر ہے کہ اس شخص کی سفارت اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ اس عہدے پر باقی ہو۔ جب اس کی مدت کار ختم ہوجائے گی اور کسی دوسرے شخص کو اس عہدے پر معمور کردیا جائے گا تو اس کے بعد وہی شخص حکومت کا نمائندہ تصور ہوگا جس کو سب سے آخر میں نمائندگی کا موقع دیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے حضرت محمد ﷺ ہی وہ آخری رسول ہیں جو آج اور قیامت تک کے لیے انسانیت کے راہنما ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عرب سے اٹھے تھے اور جن کے بعد کوئی نبی ہوا اور نہ آئندہ کوئی نبی ہوگا۔

آپ ﷺ کا تمام نبیوں کے بعد تشریف لانا اس بات کی کافی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کو ہی حال اور مستقبل کے لیے خدا کا نمائندہ قرار دیا جائے کیونکہ بعد کو آنے والا اپنے سے پہلے آنے والوں کو منسوخ کرسکتا ہے مگر پہلے آنے والا بعد میں آنے والے کو منسوخ نہیں کرسکتا۔ اگر چہ ہم ان تمام نبیوں کو مانتے ہیں جو خدا کی طرف سے انسانوں کی طرف آئے ان میں سے کسی کا بھی ہم انکار نہیں کرتے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے رسولوں میں تفریق نہ کرو مگر ظاہر ہے کہ اطاعت اور پیروی تو صرف وقت کے نبی ہی کی جاسکتی ہے۔ محمد ﷺ کے بعد کسی اور نبی کا ظاہر نہ ہونا اور اللہ کی طرف سے اس اعلان کے بعد کہ محمد ﷺ ہی اس کے آخری رسول ہیں اس بات کی علامت ہے کہ اب آپ ﷺ ہی وقت کے نبی ہیں اور اب تمام انسانوں کو آپ ﷺ ہی کی پیروی کرنی ہے۔ جب کوئی نبی آتا ہے تو وہ دراصل اپنے وقت کے لیے خدا کا حکم ہوتا ہے اور وقت کے نبی کو چھوڑ کر اس سے پہلے گذرے کسی بنی کی اطاعت کا دعویٰ کرنا خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے اور ایسا شخص خدا کے ہاں وفاداروں میں شمار نہیں ہوگا بلکہ اسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور خود تاریخ کے وہ رسول ان سے اعلان برأت کریں گے جن کی پیروی کا آج وہ دعویٰ کررہا ہے جیسے کہ آج کے یہود، ہنود اور نصاریٰ کا طرزِ عمل یہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے پرانی اور مذہبی کتاب رگِ وید ہو جو خدا کی ہدایت کے تحت مرتب کی گئی ہو جیسا کہ انجیل نسبتاً درمیانی زمانے کی الہامی کتاب ہے مگر اب یہ سب کتابیں آوٹ آف ڈیٹ ہوچکی ہیں اس سے قطع نظر کہ ان کے مضامین کی صحت مشکوک ہے اور اس سے قطع نظر کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی خود کو آخری اور دائمی کتاب کی حیثیت سے پیش نہیں کرتی صرف یہ واقعہ کہ وہ خدا کے آخری ہدایت نامے سے پہلے نازل کی گئیں ہیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ان کو آج منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ کوئی شخص یہ سوال کرسکتا ہے کہ میں آخری نبی محمد ﷺ پر کیوں ایمان لاؤں اور یہود نصاریٰ ایسے ہی کہتے

ہیں تو ان کے لیے یہ سادہ سی دلیل کافی ہے کہ جن وجوہ اور دلائل کی بنا پر آپ دوسرے رسولوں کو رسول مانتے ہیں انھیں وجوہ اور دلائل کی بنا پر ان کو محمد ﷺ پر بھی ایمان لانا پڑے گا۔ لوگ کسی دوسرے رسول کے بارے میں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ خدا کا حقیقی نمائندہ ہے جو اصول بھی وہ بنائیں گے اور جو مقدمات بھی قائم کریں گے ٹھیک انھیں دلائل اور انھیں مقدمات کی بنا پر ان کو محمد ﷺ کو بھی خدا کا رسول اور نمائندہ ماننا ہو گا۔ اگر کوئی آخری رسول ﷺ کا انکار کرتا ہے تو اس کو اللہ کے سارے رسولوں کا انکار کرنا پڑے گا اور اگر کوئی اللہ کے دوسرے رسولوں پر ایمان رکھے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اللہ کے آخری پیغمبر محمد ﷺ پر بھی ایمان لائے۔ جب کوئی نبی ﷺ پر ایمان لا کر دین اسلام میں داخل ہوتا ہے تو لامحالہ اس کو اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ محمد ﷺ ہی آخری سند ہیں۔ محمد ﷺ کو رسول ماننا ان پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کو آخری سند قرار نہ دینا ایک ایسا تضاد ہے جس کی اخلاق معاشرت اور مذہب میں کوئی گنجائش نہیں اور خدا کے آخری حکم کی موجودگی میں سابقہ حکموں کا حوالہ دینا خدا کی اطاعت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خدا کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ یہ خود اپنے نفس کی اطاعت ہے نہ کہ خدا کی اطاعت۔

چنانچہ نفس کی اس خواہش نے دنیا میں ایک بہت بڑے بگاڑ کو جنم دیا جس کی وجہ سے لوگ ٹکروں اور قوموں میں بٹ کر رہ گئے۔ حالانکہ نبی ﷺ کو تمام دنیا کی طرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے مگر لوگوں نے قرآن کے سائے میں پناہ ڈھونڈنے کے بجائے اپنے نفس کی خواہش کو غالب رکھا جس کی وجہ سے نہ صرف اس کی انفرادی زندگی میں بلکہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں بھی فساد اور بے چینی کا وہ جذبہ پیدا ہوا جس نے کرہ ارض کا چہرہ لہولوہان کر رکھا ہے۔ آج قومیت مذہب اور معیشت پر دنیا بھر میں شدید تصادم بپا ہے اگر انسان کائنات میں اپنے مقام اور راستی کے افکار پر نظر رکھتا تو خطہ ارض پر کبھی یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی اور انسان امن و سکون کی اس دنیا سے آشنا ہوتے جس کا آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تخلیق کے بارے میں خدا کا منصوبہ ایک کامل منصوبہ ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات ٹھیک خالق کی منشا کے مطابق اپنے افعال سرانجام دے رہی ہے۔ اس لیے ساری کائنات درست حالت میں ہے اور اس میں دور دور تک کہیں کوئی خرابی نہیں ہے۔ مگر انسان چونکہ اپنے عمل میں آزاد ہے اس لیے وہ حق کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلتا ہے اس لیے اس کی دنیا سے سکون و آشتی غائب ہے۔ چنانچہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسانی معاشروں کا بگاڑ دراصل انسان کی آزادی کی قیمت ہے۔ انسان کے مسائل کا حل اسلام کے نزدیک وہی ہے جو بقیہ کائنات کے مسائل کا حل

ہے۔انسان اپنی خواہش پر چلنے کی بجائے اگر اسی حق پر چلے جس پر کائنات کی بقیہ تمام قوتیں چل رہی ہیں تو اس کے سماج میں بھی وہی اصلاح اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی جو بقیہ کائنات میں ہر وقت موجود ہے۔خدا کے منصوبے کے مطابق خدا کا قانون ہے جس میں عدل کا وہ معیار ہے کہ اس کو اپنا لینے کے بعد فساد دب کر رہ جاتا ہے اور انسان کے ہر طرف خیر کا غلبہ نظر آتا ہے۔اگر چہ ایک تصوراتی سماج کی تیاری کے لیے اہل فلسفہ اور علوم سماجیات کے ماہرین نے بے پناہ کاوشیں کی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ خالق ہی اس بات کا اصلی حق دار ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لیے زندگی کے دائرے متعین کرے اور قرآن انھیں دائروں اور سماجی قوانین کو انسان تک پہنچاتا ہے جن پر عمل کر کے وہ ایک ایسے سماج کی تعمیر کر سکتا ہے جس میں خیر کا غلبہ اور شر کو ذلت کا مقام حاصل ہوگا۔خدا کا قانون ہے کہ ہر ایک اپنے دائرہ عمل میں رہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سورج چاند زمین سمیت تمام اجرام فلکی اسی حکم پر عمل پیرا ہیں یہی وجہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں سال گذر گئے مگر ان میں سے کوئی کبھی دوسرے کے مدار میں داخل نہیں ہوا اور نہ کبھی وہ ایک دوسرے سے ٹکرائے ہیں۔اگر اسی حق کا طلاق انسان پر کیا جائے اور ہر انسان اپنے دائرہ عمل کو متعین کرتے ہوئے اس امر کا لحاظ رکھے کہ اس سے کسی کی حق تلفی نہ ہو تو اس کا سماج درست ہوتا چلا جائے گا۔اس کے برعکس اگر انسان اپنی خواہش پر چلنے لگے تو پھر انسانی معاشروں کی ایسی ہی صورت نظر آئے گی جیسا کہ آج کل دنیا کی حالت ہے۔سچ تو یہ ہے کہ مادیت اور مسابقت کے ان معاشروں نے انسان سے ان کی بنیادی اخلاقی اقدار تک چھین لی ہیں۔خالق کی پہچان اور معرفت تو دور کی بات ہے آج کا انسان تو اپنی ناک سے آگے دیکھنے کا روادار نہیں۔وہ کن منزلوں کا راہی ہے خود اس کو بھی نہیں معلوم۔مگر اس کے باوجود کہ اس کی سانس پھول رہی ہے وہ کسی اجنبی سراب کی طرف اپنی پوری توانائیوں سے بھاگ رہا ہے اور یونہی اس بھاگ دوڑ میں جانے کب زندگی کی شام ہو جائے اسکی اس کو کوئی پرواہ نہیں کہ آج کا دور (Flux of information) کا دور ہے جس نے معلومات کا ایک سیلاب پیدا کر دیا ہے اور علم کہیں پس منظر میں چلا گیا ہے اور یہی آج کے انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے !!!

وجود خالق پہ استدلال

انسان جب اپنے شعوری عہد میں داخل ہوا تو اس نے اپنی زندگی میں ایک صریح خلا کو محسوس کیا جو اسے بے چین رکھتا، اس کے اندر سوالات ابلتے رہے مگر کوئی جواب دینے والا نہ تھا۔ انسان اپنے وجود کے اندر اور اس کے باہر کی دنیا پہ ذرا بھی غور کرے تو دو نہایت شدید جذبے اس کے اندر جنم لیتے ہیں ایک شکر اور احسان مندی کا جذبہ اور دوسرا اس کی کمزوری اور عجز۔ انسان اپنی زندگی کے جس گوشے پہ بھی نظر ڈالتا ہے تو اس کو صاف دکھائی دیتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی بلکہ اس کا ایک ایک لمحہ کسی کے احسان سے بوجھل ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اندر ابلتے جذبہ شکر کو محسوس کرتا مگر اس کو کوئی راہ دکھائی نہ دیتی کہ وہ اپنی بہترین عقیدتوں کو اپنے کسی محسن کی نظر کر سکے۔ خالق کی یہ تلاش انسان کے لیے محض کوئی فلسفیانہ نوعیت کی کوئی چیز نہیں تھی بلکہ انسانی نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ثابت ہو چکا ہے اور آج کا دانشور جانتا ہے کہ خالق کی تلاش کا یہ سوال محض ایک خارجی مسئلے کو حل کرنے کا سوال نہیں بلکہ یہ ہماری اندرونی طلب ہے اور ہمارا پورا وجود اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے انسان جب دیکھتا ہے کہ وہ کائنات میں ایک مستقل واقعہ کی حیثیت سے موجود ہے

حالانکہ اس میں انسان کی اپنی کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ وہ مزید غور کرتا ہے تو ایک اور احساس اس کا احاطہ کرتا ہے کہ وہ خود کو ایک بہترین جسم میں پاتا ہے جس سے بہتر جسم کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا حالانکہ اس جسم کو خود اس نے نہیں بنایا اور اس کو ایسی عجیب وغریب ذہنی قوتوں سے نوازا جو کسی دوسرے جاندار کو نہیں دی گئیں اور ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لیے بھی اس نے کچھ نہیں کیا اور نہ ہی کچھ کرسکتا ہے۔

چنانچہ اس کے ذہن میں ہر آن یہ سوال ابلتا رہتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے یہ جسم وذہن اس کو عطیہ کیے ہیں۔ انسانی فطرت اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتی کہ اس کا محسن اس کا خالق کہاں ہے جو احسان پہ احسان کیے جاتا ہے مگر سامنے نہیں آتا۔ چنانچہ اپنے اسی احساسِ تشنگی کے سکون کے لیے انسان نے فرضی معبود تراشے اور ان کی پوجا کرنے لگا۔ مگر خالق نے اسے زیادہ دیر تنہا نہیں چھوڑا اور اپنی تعلیمات اپنے رسولوں کے ذریعے اس تک پہنچائیں تاکہ وہ سیدھی راہ اور حقیقی معبود کی پہچان سے آشنا ہو۔ گذشتہ باب میں ہم نے دیکھا کہ سائنس میں انسان کو کچھ ترقی حاصل ہوئی تو اس نے تکبر کی راہ اپنائی اور خالق کے وجود سے ہی انکاری ہوگیا۔ انھوں نے انسانی زندگی اور کائنات کی مادی تشریحات پیش کیں مگر ان کے نظریات میں جھول تھا جس کو علم اور سائنس کی ترقی نے دور کردیا اور انسانیت کو دوبارہ خالق کے در پہ ڈال دیا۔

دراصل انسان نے جدید علوم اور سائنسی فکر کی ترقی پر جانا کہ پوری کائنات اور اس کے مظاہر خود زبانِ حال سے بول رہے ہیں کہ وہ کسی قوتِ قاہرہ کے حکم کے پابند ہیں اور اسی کی مرضی ہے زمینوں پہ بھی اور آسمان پہ بھی۔ علم سائنس کی وجہ سے انسان نے یہ جانا کہ احسانات کا وہ سلسلہ جس کو وہ اب تک جانتا تھا حتمی نہیں بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ ہے جو بحر وبر اور زمین وآسمان اور کائنات کی تمام وسعتوں کو محیط ہے۔ انسان نے دیکھا کہ وہ کائنات میں ذرا سا تصرف کرنے کے بھی قابل نہیں بلکہ خود سے ہی کسی کے احسان کی مانند زمین و آسمان کا نظام اس کے لیے سازگار ہے۔ انسان کو نہ تو کائنات پہ کوئی اختیار ہے اور نہ ہی وہ اپنی ضرورتوں کو خود سے پورا کرنے کے قابل ہے۔ انسان کی ہزاروں ضرورتیں خود بخود پوری ہورہی ہیں مگر اس کو ان کا شعور تک نہیں۔ پوری دنیا کے ہر خطے میں حیرت انگیز طور پر انسان کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اپنے تمام ساز وسامان کے ساتھ اس بات کی منتظر تھی کہ حضرت انسان آئے اور وہ اس کی خدمت پر لگ جائے۔ کائنات میں انسان کے لیے اتنے ہمہ گیر اور بیشمار انتظامات کیے گئے ہیں کہ ان کی تفصیل بیان کرتے کرتے عمر بیت جائے۔ خالق نے حضرت انسان کے لیے قدم قدم پر اتنا خوش

رنگ اہتمام کیا ہے کہ انسان غور کرے تو دھنگ رہ جائے۔ چنانچہ یہ عطیات جن سے ہر دم آدمی دوچار ہو رہا ہے اور جن کے بغیر اس زمین پر انسانی زندگی اور تمدن کا کوئی تصور تک ممکن نہیں تھا۔ انسان صدیوں اِک بے چینی کا شکار رہا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ سب رنگ و بو اور طرح طرح کے میوے اس کے لیے کس ذات نے مہیا کیے ہیں۔ ہر آن وہ خالق کی کسی نعمت سے دوچار ہوتا ہے اور ہر آن اِک جذبہ شکر اس کے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوتا۔ وہ اپنے محسن کو دیکھنا اور جاننا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ شکر کے امنڈتے سمندروں کو اس خالق کے قدموں میں ڈال دے جو اس کا محسن ہے جو اس سے محبت کرتا ہے مگر سامنے نہیں آتا۔

چنانچہ اپنے محسن کے احسانات کو ماننا اور اس کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دینا اور اسے اپنے بہترین جذبات کے لیے مختص کرنا انسانی فطرت کا شریف ترین جذبہ ہے۔ ہر آدمی جو کائنات پر غور کرتا ہے اس کے اندر جذبہ شکر کا احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا خالق انسان کے اس جذبہ شکر کا جواب نہیں دے گا؟ کیا انسان اس کائنات میں ایک یتیم بچے کی طرح ہے جس کے احساسات کچلے جاتے ہیں مگر اس کی پرواہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اور کیا کائنات میں کسی ایسی ہستی کا وجود پایا جاتا ہے جو انسان کے جذبات و احساسات کا جواب دے اور اس کو سکون کی وہ دولت عطا کرے جس کا وہ صدیوں سے متلاشی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ایسا سوچنا بھی کہ خالق اپنی مخلوق سے لاپرواہ ہے پرلے درجے کی نادانی اور بیوقوفی ہے کیونکہ خالق کی تلاش کے لیے دور جانے کی ضرورت ہی نہ تھی اس کے ڈیرے تو انسان کے دل میں موجود ہیں فقط اس کو پہچاننے کا ہنر آنا چاہیے کہ انسانی دل احساسات و جذبات کا ایسا مرکز ہے جس سے روشنی اور خیر کی لہریں نکلتی ہیں۔ یہیں سے جذبہ شکر جنم لیتا ہے اور یہیں سے اشکِ ندامت اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ حیرت تو ان سائنس دانوں اور ان کی پیروی کرنے والی مادہ پرست ذہنیت پر ہے کہ وہ اپنے نفس کی غلامی سے نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ عام آدمی تو عقلی طور پہ اتنا بالغ ہی نہیں ہوتا کہ خیر اور شر میں درست طور پہ فرق کر سکے مگر جن لوگوں کو اللہ نے علم دیا ہے وہی انسانیت کو گمراہ کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر خالق اعلیٰ پیمانے پر انسان کے لیے خطہ زمین کے حالات کو سازگار بنانے کا اہتمام نہ کرتا تو ممکن ہی نہ تھا کہ انسان جیسی ناتواں مخلوق اپنی بقا کو ممکن بنا سکتی۔ آج کی جدید سائنس نے ہم کو اس علم سے آگائی بہم پہنچائی کہ انسان انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہے ذرا اس خلا کا تصور کریں کہ جس میں ہماری یہ زمین سورج کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ زمین کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے اور وہ ایک ناچتے

ہوئے لٹو کی طرح اپنے محور پر مسلسل اس طرح گھوم رہی ہے کہ ہر چوبیس گھنٹے کے اندر اس کا چکر پورا ہو جاتا ہے۔ گویا اس کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ ہے اور اسی کے ساتھ وہ سورج کے چاروں طرف اٹھارہ کروڑ ساٹھ لاکھ میل کے لمبے دائرے میں نہایت تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہے۔ خلا کے اندر اس قدر تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی زمین پر ہمارا وجود قائم رکھنے کے لیے خالق نے زمین کی رفتار کو ایک خاص اندازے کے مطابق رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین کے اوپر انسان کی حالت ان سنگریزوں کی طرح ہو جائے جو کسی متحرک پہیہ پر رکھ دیئے گئے ہوں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مزید انتظام کے طور پہ خالق نے زمین کو کشش ثقل کی قوت سے نوازا ہے جو انسان کے جسم کو کھینچے ہوئے ہے پھر اوپر سے ہر جسم پر ہوا کا ایک زبردست دباؤ ہے جو انسان کو سطح زمین پر متوازن رکھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ ہوا کے ذریعے جو دباؤ انسان پر پڑ رہا ہے وہ جسم کے ہر مربع انچ پر پندرہ پاؤنڈ تک معلوم کیا گیا ہے یعنی ایک اوسط آدمی کے سارے جسم پر تقریباً 280 من کا دبا۔

یہی وہ حیرت انگیز انتظامات ہیں جن کی بدولت انسان خلا میں مسلسل دوڑتی ہوئی اس زمین پر اپنا توازن قائم رکھنے میں کامیاب رہتا ہے۔ ذرا سورج کے وجود پر تو غور کیجیے سورج کی جسامت آٹھ لاکھ پینسٹھ ہزار میل ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ہماری زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے۔ یہ سورج آگ کا ایک دہکتا ہوا سمندر ہے جس کے قریب کوئی بھی چیز ٹھوس حالت میں نہیں رہ سکتی۔ زمین اور سورج کے درمیان اس وقت تقریباً ساڑھے نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے [50*]۔ اگر اس کی بجائے وہ چاند کی جگہ یعنی دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلے پر آ جائے تو زمین پگھل کر بخارات میں تبدیل ہو جائے یہی سورج ہے جس سے زمین پر زندگی کے تمام مظاہر قائم ہیں۔

اسی لیے خالق نے اس کو زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر رکھا ہے کہ زمین پہ حیات قائم رہے اور اس کی ساری رونقیں برقرار رہیں۔ یاد رہے کہ سورج اگر ایک خاص فاصلے سے زیادہ زمین کے نزدیک آ جائے تو زمین کی ہر چیز جل اٹھے اور اگر وہ ایک خاص فاصلے تک زیادہ زمین سے دور چلا جائے تو زمین برف کی طرح جم جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم تو خدا سے جوڑنے والی چیز ہے مگر اہل مغرب جو آج علم کے دعویدار ہیں سب کچھ جاننے کے باوجود خالق کے وجود پر کوئی دلیل اس لیے قبول کرنے کو تیار نہیں کہ اس طرح ان کو اپنے اس اندازِ زیست سے دستبردار ہونا پڑے گا جس کی بنیاد ہی خالق سے انکار پر رکھی ہے۔ ان کا دن شراب سے شروع ہوتا ہے دن بھر وہ سودی نظام کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی رات کا تصور شراب اور

شباب کے عنواں سے مزین ہے۔اسی لیے امریکا اور برطانیہ کے آدھے سے زیادہ بچے اپنی ماں کو تو جانتے ہیں مگر ان کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان کا باپ کون تھا۔شاید ان کی ماں بھی درست طریقے پر نہ جانتی ہو کہ اس کے بچے کا باپ کون ہے۔جب ہر رات ہر مرد نئی عورت ساتھ اور ہر عورت اپنی ہر رات کسی نئے مرد کی آغوش سجائے گی تو باپ کی پہچان کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ کائنات کے بہت سے راز جاننے کے باوجود وہ خالق کی طرف راغب ہونے سے انکاری ہیں کہ انھیں غلامی اگرچہ پسند ہے مگر اپنے نفس کی اپنے خالق کی نہیں؟؟؟

آیئے اب نظم کائنات پر ایک نظر اور ڈالتے ہیں جو خالق کے وجود پر دلیل کی روشنی سے ہمارے سینوں کو منور کرے گی۔کائنات کی وسعت اور اس کی قوت کشش پر نگاہ تفکر ڈالیں تو ہم جانیں گے کائنات ایک بے انتہا وسیع کارخانہ ہے اس کی وسعت کا اندازہ ماہرین فلکیات کے نزدیک یہ ہے کہ روشنی جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے اس کو بھی کائنات کے گرد اپنا ایک چکر پورا کرنے کے لیے کئی ارب سال درکار ہوں گے اور یہ نظام شمسی جس پر ہماری یہ زمین قائم ہے بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے مگر پوری کائنات کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔کائنات میں اس سے بڑے بڑے بے شمار ستارے اور سیارے لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے کچھ اتنے بڑے ہیں کہ ہمارا یہ پورا نظام شمسی آرام سے ان کے اوپر رکھا جاسکتا ہے جو قوت کشش ان بے شمار دنیاؤں کو سنبھالے ہوئے ہے اس کی عظمت کا تصور اس بات سے کیجیئے کہ سورج جس بے پناہ طاقت سے زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس کو وسیع ترین فضاء میں گر کر برباد ہو جانے سے روکتا ہے یہ غیر مرئی طاقت اس قدر قوی ہے کہ اس مقصد کے لیے اگر کسی مادی شے سے زمین کو باندھنا پڑتا تو جس طرح گھاس کی پتیاں زمین کو ڈھانپے ہوئے ہیں اسی طرح ہمارا یہ پورا کرہ ارض دھاتی تاروں سے ڈھک جاتا۔

چنانچہ ثابت ہوا کہ ہماری زندگی بلکلیہ ایسی طاقتوں کے رحم وکرم پہ ہے جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔انسان کی زندگی کے لیے دنیا میں جو انتظامات ہیں اور جن کی موجودگی کے بغیر انسانی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا وہ اتنے بلند پیمانے پر ہو رہے ہیں اور ان کو وجود میں لانے کے لیے اتنی غیر معمولی قوت تصرف درکار ہے کہ انسان انھیں خود سے وجود میں لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔اس لیے کہ موجودات کے لیے جو طریق عمل مقرر کیا گیا ہے انسان کے لیے اس کو مقرر کرنا تو دور کی بات ہے ان امور پہ انسانی غلبے کے متعلق سوچنا بھی فضول

ہے آج کا انسان جانتا ہے کہ اگر اس کائنات کی غیر معمولی قوتیں اس کا ساتھ نہ دیں یا انسانی تمدن سے ہم آہنگی اور موافقت نہ کریں تو انسان اس زمین پر ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا بلکہ وہ برباد ہو کے رہ جائے اور اس صورت حال میں ایک ترقی یافتہ تمدن کا تو تصور بھی دور کی بات ہے۔انسان نے خالق کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار کرنے کے لیے اس کی کائنات کے مظاہر پر غور کیا تو اس نے جانا کہ کائنات کا خالق کے ساتھ تعلق اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ انسان سے اس کا تعلق محبت پہ مبنی ہے۔

ظاہر ہے جس نے ہمیں خلق کیا وہ ہم سے محبت بھی کرے گا اور وہی ہے جو ہمارے لیے خطہ ارض پر مسلسل موزوں ترین حالات کو باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمیشہ ہمارے لیے ہموار کرتا رہتا ہے جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ انسان اپنے مقابلے میں اس کی برتر حیثیت کو تسلیم کرے اور جب انسان خالق کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرلے گا تو اس کا رخ کامیابی اور فلاح کی طرف موڑ دیا جائے گا۔قدیم زمانوں سے انسان جن اقدار سے واقف ہے ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اپنے محسن کے سامنے دب کر رہے۔عزت دار وہی ہے جو اپنے محسن سے نظر نہ ملائے اور اس کی رضا کی فکر میں لگا رہے۔خالق کا اپنی اس مخلوق سے مطالبہ بھی صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اس کی رضا کی فکر کرے اگرچہ اس میں بھی خالق کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس میں صرف مخلوق ہی کی بھلائی ہے۔چنانچہ خدا کا خدا ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان اس کی خدائی اور قدرت کو تسلیم کرے اور اس کی مرضی کو ہی اپنی ترجیح اول قرار دے۔

بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لیے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت بھی نہیں مگر بات یہاں ختم نہیں ہوتی جب خالق کے وجود پہ دلیل حاصل ہو جائے تو حق شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنی عاجزی اور خدا کے غلبے کو دل کی گہرائیوں میں اتار لے اور اپنی بندگی کا رخ اس کی طرف موڑ دے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ ہے بھی نہیں۔ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں ہم کو جو کچھ بھی ملے گا اسی کی طرف سے ملے گا۔سب اہل علم جانتے ہیں کہ اس کے سوا اور کوئی دینے والا ہے بھی نہیں۔انسان کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہے کہ وہ اپنے خالق کی توجہ کے بغیر ایک لمحہ بھی زمین پر اپنا وجود برقرار رکھنے پر قادر نہیں۔چنانچہ اس کے لیے دانش کی راہ یہی ہے کہ وہ خالق کے در پر اپنے سر کو جھکا

دے اور تکبر کی راہ اختیار نہ کرے۔ خود اپنے خطے کی جغرافیائی حقیقتوں پہ اگر ہم غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ شمالی ہندوستان کی سرحد پر اگر ہمالیہ کا پچیس سو میل لمبا سلسلہ نہ ہوتا اور اگر ہمالیہ کی بلندیاں ہمارے مفادات کی محافظ نہ ہوتیں تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی وہ ہوائیں جو ہمارے خطے پہ سال میں دو دفعہ بارشیں برساتی ہیں ہمالیہ کی غیر موجودگی میں وہ سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں اور پورا پاکستان منگولیا کی طرح لق ودق صحرا میں بدل جاتا اور یہاں کے لوگ بارش کے ایک ایک قطرے کو ترستے رہتے۔

اللہ پاک نے اپنی کتاب میں سچ ہی کہا ہے کہ اگر انسان میری پہچان کے لیے نکلے تو میری آیات ہر قدم پہ اسے ایک نئی حیرت میں مبتلا کرتی رہیں گی۔ آج کے جدید علوم قدم قدم پہ اللہ کی آیات کی نشاندہی میں مصروف عمل ہیں۔ آیئے ایک بار پھر سے سورج کے وجود پہ غور کرتے ہیں آج کا انسان اپنے جدید علوم کی معرفت سے جانتا ہے کہ وہ ایک غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور زمین ایک مرکز گریز قوت(Centrifugal Force) کے ذریعہ سے سورج کی طرف جانے سے خود کو روکتی ہے۔ اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضاء میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ذرا سوچیں کہ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت اچانک ختم ہو جائے تو وہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف سفر شروع کر دے اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے جیسے کسی بہت بڑے آلاؤ میں کسی درخت کا کوئی سوکھا پتہ جا گرتا ہے۔ ظاہر ہے اہل سائنس کم از کم اس امر سے ضرور واقف ہیں کہ زمین کو یہ طاقت انھوں نے فراہم نہیں کی اور نہ ہی سائنس اس طاقت کی ابھی کوئی توجیہ کر سکی ہے۔ چنانچہ جس طرح سورج اور زمین کی یہ کشش ایک دوسرے کی قوت کو زائل کر کے ٹھیک اس مقام پر سفر کر رہے ہیں جس پر خالق کی منشا ہے اسی طرح کائنات کا پورا نظام اسی خالق کی مرضی کے تابع ہے۔

ستاروں سے لے کر سیاروں تک، سمندروں سے لے کر پہاڑوں تک، شجر سے لے کر حجر تک، زمین سے لے کر آسمانوں تک، مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک، اوپر سے لے کر نیچے تک، شیر سے لے کر ہاتھی تک، چیونٹی سے لے کر شہباز تک کسی مخلوق کو بھی خالق کی مرضی کے خلاف جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر افسوس کہ بدقسمتی کی یہ عادت حضرت انسان کے حصے میں آئی جو اشرف المخلوقات ہے۔ ذرا سے اختیار نے جس کے ظرف کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ چنانچہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ انسان جلد باز بھی ہے ناشکرا بھی ہے اور جھگڑالو بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان اس حقیقی سکھ اور طمانیت سے بہت دور ہے جس کے لیے

اس کو پیدا کیا گیا تھا۔ جب اس کا ذہن خالق کے وجود پہ تشکیک کا شکار ہو گیا تو پھر اس کو اس بھری کائنات میں سکون جیسی دولت کون عطا کرتا۔ انسانوں کے بہت سے گروہ آج اس خطہ زمین پہ ان عنوانوں کے تحت زندگی کر رہے ہیں جن میں خالق کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں بنتی۔

چنانچہ جب انسان نے خالق سے منہ موڑا تو خالق تو ازل سے بے پرواہ ہے اسے کیا پڑی ہے کہ وہ کسی قوم کو امتحان کی آزادی سے ٹوکے۔ اگرچہ نبی کریم محمد ﷺ کی دعوت کے بعد اور قرآن کی موجودگی میں انسان کی گمراہی ایسی ہی ہے جیسے ذہنی ابتری کا شکار کوئی شخص آگ کے گڑھے میں جا گرے۔ دنیا بھر کے مصلحین اور دانشور آج کے انسان کی روٹھی خوشیوں اور تشنہ آرزوؤں کی تلاش پہ مکالے لکھ رہے ہیں، حل کھوج رہے ہیں وہ اپنی کھوج کے آغاز میں ہی مذہب کو بوسیدہ رسموں رواج کا مجموعہ قرار دے کر ان اندھیری گلیوں کو نکل جاتے ہیں جہاں نئے سراب ان کی منزل کھوٹی کرنے کے لیے ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ فرائیڈ نے جنس میں انسانی آزار کو کھوجا تو مارکس نے دولت کی مساوی تقسیم میں، قدیم یونانی حکماء نے جمہوریت اور نظام حکومت میں انسان کے سکھ کو تلاشا تو آج کا مغربی مفکر آسائش آسودگی اور مادیت کی انتہاؤں میں انسان کے ازلی سکون کا متلاشی ہے۔ مگر افسوس کہ میں جانتا ہوں وہاں بھی منزل کی جگہ نئے سراب ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ کائنات پہ نگاہ ڈالیں تو اس کی وسعتوں کے جس ادنیٰ سے علاقہ میں حضرت انسان رہائش پذیر ہے سائنس کی زبان میں اسے نظام شمسی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے اس نظام شمسی کو اگر انسان کسی بلند اور دور دراز مقام سے دیکھے تو وہ جانے گا کہ ایک اتھاہ خلا ہے جس کے اندر ایک گھومتا ہوا آگ کا بہت بڑا گولہ ہے جس کو ہم سورج کہتے ہیں جو زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکل رہے ہیں کہ ان کی لپٹیں کئی لاکھ میل تک خلاؤں کا احاطہ کیے رہتی ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اسی سورج کے گرد بہت سے سیارے ہیں جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔

ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس کی گولائی صرف پچیس ہزار میل ہے۔ اگرچہ ابھی انسان اپنے نظام شمسی کی کلی ماہیت سے بھی واقف نہیں ہے مگر اتنا وہ جان چکا ہے کہ نظم کائنات میں ہمارے نظام شمسی کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ کائنات میں اتنے بڑے بڑے سیارے موجود ہیں جن کے مقابلے میں ہمارا یہ نظام شمسی زمین کی فضا میں اڑنے والے کسی ادنیٰ پروانے سے بھی حقیر

ہے۔چنانچہ کائنات کی ان اتھاہ وسعتوں میں انسان اپنے وجود کی ناتوانی کے احساس سے دوچار ہے اور اس کی بے بسی اس کی نارسائی اس کو کسی طاقتور سہارے کی تلاش پہ اکساتی ہے۔وہ بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی تو ہو جو اس اتھاہ کائنات کے اندھیرے میں روشنی بن کے اس کی راہنمائی کرے۔وہ ایک ایسی ہستی کی پناہ چاہتا ہے جو کائنات کی قوتوں سے بالاتر ہو اور جس کی پناہ میں آجانے کے بعد اس کو اطمینان ہو کہ اب وہ محفوظ ہو گیا ہے۔دراصل خالق کی تلاش ایک فطری جذبہ ہے۔جو آدمی کی محبت اور اعتماد کا محور بن سکے۔

موجودہ زمانے میں بعض اہل دانش نے وطن قومیت اور ریاست کو انسان کی اس طلب کا جواب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔جدید تہذیب انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی قوم اپنے وطن اور اپنی ریاست کو یہ مقام دو کہ وہ تمہاری عقیدتوں کا مرکز بن کے رہ جائے اور اسی وابستگی کو اپنا سہارا بناؤ۔اگرچہ ان چیزوں کو معبود کے نام سے پیش نہیں کیا جاتا مگر انسانی زندگی میں ان کو جو مقام دیا گیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو دراصل کسی معبود کا مقام ہونا چاہیے۔مگر ان چیزوں کو معبود کی جگہ دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی کو رفیق زندگی کی ضرورت ہو مگر اس کی اس طلب کے جواب میں پتھر کی ایک سل اس کے ہاتھ میں تھما دی جائے۔کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ انسان کے اندر خالق کی تلاش کا جو جذبہ ابھرتا ہے اس کے اسباب انسانی نفسیات میں بہت گہرائی تک پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ایک ایسی ہستی کی تلاش میں ہے جو ساری کائنات پہ محیط ہو۔چنانچہ انسان کی اس طلب کا جواب کسی جغرافیائی خط میں نہیں دیا جا سکتا کہ یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ ایک سماج کی تعمیر میں کچھ مدد دے سکتی ہیں مگر وہ انسان کے تلاش معبود کے جذبے کو تسکین فراہم نہیں کر سکتیں۔اس کے لیے تو انسان کو ایک کائناتی وجود درکار ہے جو انسان کی محبتوں کا مرکز و محور بن جائے۔جس نے زمین و آسمان کو بنایا ہو۔اپنے سہارے کے لیے انسان کو ایک ایسی طاقت کی تلاش ہے جو کائنات کے اوپر حکمران ہو۔جب تک انسان ایک ایسے ہی خالق کے وجود کو نہیں پا لیتا اس کا اندرونی خلا بدستور باقی رہے گا۔دور دور تک کوئی دوسری چیز اس خلا کو پر کرنے والی نظر نہیں آتی۔اس خلا کو پر کرنے کی وہ کوشش جس میں اہل مغرب مبتلا نظر آتے ہیں ایک سعی عبث ہے،ایک سراب ہے جس میں حقیقت کا پرتو تو دیکھا جا سکتا ہے مگر حقیقت سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔حیرت ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل عطا کی مگر وہ سایوں کا تعاقب کر رہا ہے۔اللہ ہم سب پہ اپنا رحم فرمائے کہ اس کے سوا کوئی جائے پناہ ہے ہی نہیں۔

حرفِ آخر

اللہ کا شکر ہے کہ مقدمہ سیرۃ المزمّل ﷺ تمام ہوا جس میں عالمِ انسانیت کے اُن ادوار کا احاطہ کیا گیا جب چار سو اندھیرا تھا، جب تاجِ شرف اوجِ ثریا سے قعرِ مذلت میں گرا پڑا تھا، جب انسانیت سسکتی تھی اور ہر طرف وحشت کا راج تھا، جب خواب آنکھوں کے رستے پانی بن کے بہہ جاتے تھے جب فلسفے کا اندھیرا اور عقائد کے اندھے غار تھے، جب رسموں کی جلن اور رواجوں کی بہمیت انسان کے سر پہ سوار تھی، جب تصورِ معبود انتہائی پست اور عقل جنسِ گراں تھی، جب رستے سراب زدہ اور منزل نارسائی کا نشان تھی، جب ہر انسانی قدم اخلاقی پستی کا اِک سماج استوار کر رہا تھا، جب چمن کی روش روش دستِ خزاں کی رسائی میں تھی، جب مذہب کے نام پہ معاشروں کے معاشرے چند شاطر ذہنوں نے یرغمال بنا رکھے تھے، جب انسانوں کی ہر بستی عدل سے خالی تھی اور گلی گلی وحشت اپنے بال کھولے ناچ رہی تھی، جب امیدِ نویدِ سحر میں آنکھیں پتھرا کے رہ گئیں تھیں، جب بادِ صبا اِک خواب اور بادِ صرصر ایک تلخ حقیقت کی صورت حسین بدنوں کو جھلسائے دیتی تھی، جب دامنِ بہار میں بھی محض انگارے ہی بچے تھے، جب زندگی کے تقاضے سفاک اور موت کے رستے

آسان تھے، جب یقین کی راہیں دھواں دھواں تھیں اور حرفِ آرزو ابھی ناتمام تھے، جب جستجو کی راہیں مسدود اور نگر نگر شعوری قحط تھا، جب فکر پہ توہمات کے مہیب سائے تھے اور مقصد کی لگن خارج از بحث تھی ، جب پوجنے کو سبھی کچھ تھا مگر خدا نہ تھا، احساس کا ایک بے کراں تسلسل تھا جس میں بے گناہ بچیوں کی قبریں صدا دیتی تھیں، اور ریگزاروں میں وہ بگولے تھے جو انسانی وحشت پہ سر جھکائے سسکتے تھے، شجر و حجر، گُل و بلبل انسان کے پست رویوں پہ ششدر رہتے پشیماں تھے، سنگ و خار نم آنکھوں کے دریچوں سے ہجومِ آدم کی گمراہی کو جھانکتے اور سر جھکا لیتے تھے، ستارے ذرا دیر کو آنکھ لگاتے پھر خلیفۃ الارض کے طورِ شرک پہ سلگ کے رہ جاتے تھے، مظاہرِ کائنات انسانی عقل کے پست استدلال پر جھنجلا کے رہ جاتے تھے، بادلوں کا دل نہ چاہتا کہ وہ برسیں مگر حکم سے مجبور تھے سورج آگ بگولہ تھا کہ حضرت انسان کو کیا ہو گیا ہے، جب فلسفے نے الجھن پیدا کر دی تھی اور سائنس نے اذیت، تب صرف آوازیں تھیں، حرف تھے، مگر ذکر نہ تھا، اور پھر ذکر اتار دیا گیا ، تب انکار تھا ضد تھی اُنا تھی، عصبیت تھی، مگر ذکر بڑھتا رہا اور اذیت گھٹتی رہی، اِک آواز تھی جس میں مٹھاس تھی دلیل تھی، نصیحت تھی، تمنا تھی، محبت تھی، نرمی تھی وہ بلند ہوئی اور ہوتی چلی گئی، جہاں جہاں وہ صدا پہنچی بہار حسنِ آرزو کے پیرہن میں قدم قدم گلبار تھی، صحرائے عرب کے ریگزاروں کا ذرہ ذرہ شادمان تھا خوابوں کے جھلستے صحرا نخلستانوں میں بدل رہے تھے، عرب کی جھلستی گلیوں میں اِک مسیحا تھا جس کی مسیحائی روح تک اترتی تھی، اِک عالم شوق تھا جس نے نیا جنم لیا تھا، وارفتگی کا بحرِ بے کراں تھا جس کا انت نظروں سے اوجھل تھا، کیا رونق تھی دیارِ یار کی اس گلی میں جہاں فلاح بانٹی جا رہی تھی ، اور اس گلی میں اِک در تھا جس کی چوکھٹ کی مٹی بھی اپنے مقدر پہ نازاں تھی، تو چلیں ہم بھی درِ مصطفیٰ ﷺ کی جانب؟؟؟؟

اشاریہ

*1

بابلی تہذیب کا یہ پس منظر ایک تاریخی اثاثہ ہے بہت سے مورخین نے اِن قدیم اقوام کے حالات بیان کئے ہیں، ہم نے اہل بابل ونینوا کے بعض حالات سید علی عباس جلالپوری کے حوالے سے درج کئے ہیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 39)

*2

اہل بابل کی روایتی عبادت گاہ کا نام ہے۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 13)

*3

سید علی عباس جلالپوری سمیت کئی مورخین نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ قدیم بابلی اقوام فن تحریر سے آشنا تھیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 15)

*4

بابلیوں میں انسانی قربانی کارواج موجودتھا۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 15)

*5

حمورابی قوانین کی اس دستاویز کوتاریخ انسانی کا پہلاتحریری آئین قراردیا جاتا ہے۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 16)

*6

حضرت عیسیٰؑ اورحضرت مریم کی تصویرعام طور پہ ہمارے گھروں میں بھی کئی جگہ نظر آجاتی ہے ،اسی کا تذکرہ یہاں مقصود ہے۔

مولف؛ سیرۃ المزمل ﷺ

افتخاراحمد افتخار

*7

آمن ہوتپ کا مذہبی تخیل سیدعلی عباس جلالپوری کے حوالے سے پیش کیا گیا۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 46)

*8

مفمس نامی فرعون بادشاہ کے دور(۴۹۵۔ ۴۴۰ق م) میں فن مجسمہ سازی نے بہت ترقی کی اور بہت سے نادر مجسّمے تراشے گئے۔اُن میں سے کئی آج تک قاہرہ کے عجائب گھروں کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 49)

*9

آریاؤں کے دیوتاؤں کی یہ تفصیل انتہائی مختصر ہے اِن کے لاتعداد دیوتاؤں کی تفصیلات تحریر کرنا ممکن نہیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 190)

*10

آریاؤں میں بھی معاصر اقوام کی طرح انسانی قربانی کا رواج موجود تھا۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 193)

*11

بعض اہل تحقیق کا خیال ہے کہ شنکراچاریہ کے اپنشد حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے لکھے گئے۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 194)

*12

گوتم بدھ کی تاریخ پیدائش کے بارے میں مورخین باہم متفرق ہے۔انھوں نے مختلف تاریخیں درج کی ہیں یہاں تک کہ اُن میں ستر سال کا فرق درآیا۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 218)

*13

اہل یونان کی قدیم مذہبی دیو مالا کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اگرچہ اس کا تذکرہ بہت ہے۔

مولف؛ سیرۃ المزمل ﷺ

افتخار احمد افتخار

*14

سقراط،ارسطو اور افلاطون کے مختصر حالات روایات تمدن قدیم سے تحریر کئے گئے یہ لوگ یونانی فلسفہ کی شان تھے۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 134)

*15

مورخین کی اکثریت اس بات پہ متفق ہے کہ اسٹیج ڈرامہ کے ابتدائی خدوخال اہل یونان نے وضع کئے۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 138)

*16

یونانی ڈرامہ کے متعلق یہ بنیادی معلومات روایاتِ تمدن قدیم سے تحریر کی گئیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 138)

*17

زرتشت کے متعلق بنیادی معلومات تاریخ طبری سے تحریر کی گئیں۔

علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی۳۱۰ھ)

تاریخ الامم والملوك (جلد اول)

*18

ایرانیوں کے قدیم مذہب مانویت کے متعلق تفصیلات تاریخ طبری سے فراہم کی گئیں۔

علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی۳۱۰ھ)

تاریخ الامم والملوك (جلد اول)

*19

مزدکیت کا تذکرہ اکثر مورخین کے ہاں پایا جاتا ہے۔ہم نے کچھ معلومات تاریخ طبری سے تحریر کی ہیں۔

علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی ۳۱۰ھ)

تاریخ الامم والملوك (جلد اول)

*20

علامہ طبری نے تخت تاکیدس کا ذکر کیا ہے ہم نے وہیں سے استفادہ کیا ہے۔

علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی ۳۱۰ھ)

تاریخ الامم والملوك (جلد اول)

*21

ایرانی بادشاہوں کی تعیش اور ایرانی عوام کی داستان عسرت کا تذکرہ اکثر مورخین کے ہاں مذکور ہے۔ہم نے تاریخ طبری سے استفادہ کیا ہے۔

علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی ۳۱۰ھ)

تاریخ الامم والملوك (جلد اول)

*22

ایرانی بادشاہ تاج سر پہ نہ پہنتے تھے بلکہ اپنے سر کو تاج کے عین نیچے رکھتے تھے تاکہ دور سے ایسا نظر آئے کہ بادشاہ نے تاج پہن رکھا ہے۔

علامہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری (المتوفی ۳۱۰ھ)

تاریخ الامم والملوك (جلد اول)

*23

اہل ایران موسیقی کے دلداہ تھے۔ باز بد اور دیگر ماہرین موسیقی کے متعلق معلومات ہم نے علامہ ابن خلدون کے حوالے سے تحریر کی ہیں۔

تاریخ ابن خلدون

مقدمہ (از ابن خلدون)

*24

ہامنشی حکمران کمبوجیہ اور اس کے وزیر کا یہ عجیب واقعہ ہم نے روایات تمدن قدیم سے تحریر کیا ہے۔

سیّدعلی عباس جلالپور

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 157)

*25

اہل عجم کی علمی برتری اور علماء اور مشاہیر کا تذکرہ رویات تمدن قدیم سے تحریر کیا گیا ہے۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

روایات تمدن قدیم (ص ؛ 179)

*26

ساسانی ریاست کی مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کا احوال تاریخ اسلام سے تحریر کیا گیا۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

تاریخ اسلام (جلد اول ؛ ص 164)

♦♦

*27

حضرت عمر نے بیت المقدس کی فتح کے موقعہ پر اہل نصاریٰ کو جو امان نامہ لکھ کے دیا تھا اس کا متن ہم نے تاریخ اسلام سے تحریر کیا ہے ۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

تاریخ اسلام (جلد اول ؛ ص 183)

♦♦

*28

اہل رومہ کی مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کا تمام تر احوال تاریخ اسلام سے تحریر کیا گیا۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

تاریخ اسلام (جلد اول ؛ ص 184)

♦♦

*29

ہندوستان کے دور دراز پہاڑی علاقوں میں ناگا قبائل کے کچھ لوگ آج تک ٹوٹم مت پہ قائم ہیں اور قدیم مذہبی روایات سے وابستہ ہیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات (ص ؛ 39)

♦♦

*30

فرائیڈ کا یہ مذہبی تخیل اُس کی کم نگاہی اور کثرت گمراہی کا ثبوت ہے۔ وہ لوگوں کی مذہب کے ساتھ وابستگی سے چڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ زمانے کے بدلتے رنگوں کے ساتھ انسان مذہب سے نہ جانے کیوں چمٹا رہا مگر اُس نے اپنے اندر اٹھتے اس سوال کو نظر انداز کیا ورنہ شاید وہ بھی ایک مذہبی آدمی ہوتا۔ دوسری طرف اس بات سے حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اپنی تمام تر مذہبی بیزاری کے وہ اپنی تحریروں میں ایک متشدد یہودی دکھائی دیتا ہے اور یہودیت پہ حرف نہیں آنے دیتا دوسری طرف اُس کی خالق سے بے زاری سے اُس کا فکری تضاد جھانکتا ہے۔

مولف ؛ سیرۃ المزملؐ

افتخار احمد افتخار

*31

روح کا تصور قدیمی ہے۔ مذہبی لوگ اکثر و بیشتر اس تصور کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات (ص ؛ 47)

*32

ہندوستان کے دور دراز پہاڑی علاقوں میں ناگا قبائل کے کچھ لوگ آج تک ٹوٹم مت پہ قائم ہیں اور قدیم مذہبی روایات سے وابستہ ہیں۔

سیّدعلی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات (ص ؛ 39)

*33

مذہبی اخلاق کا یہ پہلو متقلمین کے تخیل کی نفی ہے۔ بلکہ یہ ان مادیت پسندوں کی اختراع ہے جوانسانوں کی ہر پریشانی کا جواز مذہب پرستی میں تلاش کرتے ہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

◆◆

34*

انسانی قربانی کا رواج بہت قدیم ہے۔ کچھ انسانی معاشروں میں بڑے بیٹے کی قربانی کا رواج بھی رہا ہے۔ مادہ پرستوں نے اس بات کو اہل مذہب کے خلاف ایک بڑی دلیل بنا کے پیش کیا ہے حالانکہ انھی کے آباء کے ہاں یہ رسم زیادہ مقبول تھی۔ یادرہے کسی الہامی مذہب نے انسانی قربانی کو جائز قرار نہیں دیا۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

◆◆

35*

صابئین اور اہل مجوس کے ہاں کہانت کا چرچا تھا۔ بعد میں کہانت بنو اسرائیل کے ہاں بھی رواج پا گئی۔

علامہ محمود شکری آلوسی

بلوغ الارب جلد اول ص 319

◆◆

36*

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کرسمس، ایسٹر اور بپتسمہ جیسے امور اہل نصاریٰ نے دوسری اقوام سے مستعار لیے تھے اس بات سے خود آج کے نصاریٰ آگاہ بھی نہیں۔ کیونکہ انھیں اپنے مذہب کی بنیادیں کھودنے کا کوئی شوق نہیں اس لیے کہ اُن کے پاس اِن باتوں کے لیے وقت نہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*37

روحوں کے مت سے ہی جادو کا احیا ہوا۔اس لیے اہل فلسفہ نے کہا کہ مذہب کے بیشتر تصورات روحوں کے مت سے ماخوذ ہیں۔

سیّد علی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات ص ؛12

*38

مثالیت پسندی کا حقیقی آغاز فیثا غورث کے زمانے سے شروع ہوا جس کی تعلیمات کی اشاعت سے عارفی مت میں بھی مثالیت رواج پا گئی۔

سیّد علی عباس جلالپوری

انسان اور کائنات ص ؛ 185

*39

حقیقت یہ ہے کہ خالق کی پہچان علم وحی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ہم نے اہل فلسفہ کے تصور الٰہ میں جانا کہ انھوں نے خالق کی پہچان کے ہر مرحلے پر ٹھوکر کھائی ہے۔اس لیے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے علم فلسفہ کوئی بنیاد فراہم نہ کر سکی اور اہل فلسفہ لوگوں کو خالق کے در تک نہ لے جا سکے بلکہ اُن کا تصور الٰہ اتنا لایعنی اور ناتواں تھا کہ اسے خالق سمجھنا ہی عبث تھا۔تاہم اتنا ضرور ہے کہ فلاسفہ نے عقل وخرد کے ذریعے جو نظریات وضع کئے انھوں نے لوگوں کو خدا کا انکار کرنے کی بجائے اُس کے وجود کو تسلیم کرنے پہ مائل کیا۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*40

قرون وسطیٰ کے اہل فلسفہ اور سائنسدانوں کے ایک گروہ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات ایک مشین ہے اور انسان اس مشین کا ادنیٰ سا پرزہ ہے۔ تاہم یہ نظریہ بھی وقت کی راکھ تلے کہیں گم ہو گیا۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*41

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو آج فلسفہ اور سائنس کی جدید روشنی میں شکست ہو چکی ہے آج کا انسان اس تصور کو قبول نہیں کرتا۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*42

یہ قرآنی نظریہ ارتقاء ہے جو حتمی ہے اور عقلی طور پہ بھی قابل قبول ہے۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*43

اہل یونان کے فلاسفہ نے انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کے بارے میں جو نظریات پیش کئے وہ یا سیت پسندوں کی نسبت سوفسطائی نظریہ حیات کے قدرے قریب دکھائی دیتے ہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*44
کلیسا اہل علم ودانش پہ غالب آ گیا اور نئی علمی قدریں وضع ہونے کا سلسلہ رُک گیا۔مورخین نے اس علمی تعطل کے اس دور کے لیے ایک اصطلاع وضع کی جسے (Dark age) کہا جاتا ہے۔یہ سلسلہ تین صدیوں پہ محیط ہے۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*45
اگرچہ بیسویں صدی کے سائنسدانوں اور فلاسفہ نے ایک خدا کی ضرورت کو حتمی قرار دے دیا مگر وہ اپنے سماج میں خدا کے تصور کو داخل نہ کر سکے اس لیے کہ اُن کے منتشر سماجی ڈھانچے میں اب کسی خدا کی ضرورت نہیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*46
میری مراد غیر مسلم دانشوروں سے ہے جس میں عام طور پر یہود و نصاریٰ کے اہل دانش شامل ہیں۔کوئی مسلمان اس بات کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ قرآن کو اللہ کی کتاب نہ مانے چاہے اس کا ایمان کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

*47
انسانی ارتقاء کے مراحل صدیوں انسان کی بحث کا موضوع رہے ہیں تاہم آج بھی اس بحث کے متعلق انسان کوکوئی حتمی رائے نہیں دے سکے۔قرآن نے انسانی ارتقاء کا جو تصور

پیش کیا ہے وہی حقیقت ہے۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

♦♦

48*

انسانی ارتقاء اور اسلام کے موضوع پہ کچھ معلومات پروفیسر احمد رفیق اختر کے حوالے سے درج کی گئیں۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

♦♦

49*

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے نے اگرچہ ایک صدی سے زائد عرصہ تک لوگوں کے ذہنوں کو متاثر رکھا مگر آج کی جدید سائنس نے اُس کو رد کر دیا ہے۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

♦♦

50*

زمین کا قطر، چاند سے زمین کا فاصلہ، زمین سے سورج کا فاصلہ، انسانی جسم پہ ہوا کا دباؤ جیسے معاملات کو بیان کرتے ہوئے ہم نے مولانا وحیدالدین کی کتاب ''اسلام اور عصر حاضر'' سے راہنمائی حاصل کی۔

مولف؛ سیرۃ المزملؐ افتخار احمد افتخار

♦♦

ماخذ و مصادر و مراجع

القرآن الحکیم

سیرۃ النبی ﷺ ***** مولانا شبلی نعمانیؒ

سنن ابی داؤد ***** امام ابی داؤدؒ

موطا امام مالک ***** امام محمد مالکؒ

مشکواۃ شریف ***** امام محمد رازیؒ

صحیح مسلم شریف ***** امام مسلمؒ

جامع ترمذی	*****	امام ترمذیؒ
تاریخ ابن خلدون	*****	علامہ ابن خلدونؒ
تاریخ الامم والملوک	*****	امام ابن جریر طبریؒ
تاریخ اسلام	*****	اکبر شاہ نجیب آبادیؒ
تاریخ اسلام	*****	معین الدین شاہ ندویؒ
انسان کامل	*****	محمد منیر قریشیؒ
مسلمان امتیں	*****	ڈاکٹر اسرار احمدؒ
سیرت ابن ہشام	*****	ابن ہشامؒ
نقوش (رسول نمبر)	*****	ادارہ
مجموعہ مضامین	*****	پروفیسر احمد رفیق اختر

اسلام اور عصر حاضر	*****	مولانا وحید الدین خانؒ
ضیاالقرآن	*****	جسٹس محمد کرم شاہؒ
تفہیم القرآن	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ
خلافت وملوکیت	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ
سنت کی آئینی حیثیت	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ
الجہاد فی الاسلام	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ
خطبات	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ
سیرت سرور کونین ﷺ	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ
پردہ	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ
اسلام کے بنیادی تصوارت	*****	سیّدابوالاعلی مودودیؒ

پیغمبر اعظم و آخرؐ	*****	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
محمد عربی ﷺ	*****	مولانا وحید الدین
محسن انسانیتؐ	*****	نعیم صدیقی
تدبر قرآن	*****	مولانا امین احسن اصلاحیؒ
کشت زربار	*****	پروفیسر احمد رفیق اختر
خطبات بہاولپوری	*****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
بلوغ الارب	*****	علامہ محمود شکری آلوسیؒ
العقد الفرید	*****	ابن عبد ربہؒ
رویات تمدن قدیم	*****	سیّد علی عباس جلالپوری
الامینؐ	*****	محمد رفیق ڈوگر

سیرت الرسول ﷺ	*****	محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ
کائنات اور انسان	*****	علی عباس جلالپوریؒ
حجۃ البالغہ	*****	شاہ ولی اللہ دہلویؒ
تمدن ہند	*****	علی بلگرامیؒ
سیرت عائشہؓ	*****	سیّد سلمان ندویؒ
تحقیق ماللہند	*****	علامہ البیرونیؒ
کرم کی برسات	*****	ڈاکٹر محمد خالد عاربی
ابوسفیانؓ	*****	الطاف حسن گیلانی
تاریخ اسلام	*****	شیخ محمد رفیق
تاریخ مدینہ	*****	محمد صادق بہاولپوری

مقالات	*****	سرسید احمد خان
تاریخ اسلام	*****	حسن ابراہیم
جزیرۃ العرب	*****	علامہ ہمدانی
تاریخ اسلام	*****	ڈاکٹر حسن ابراہیم
المروج الذہب	*****	المسودیؒ
تفصیل الازمنہ	*****	یوسف بن عبدالملکؒ
العرب قبل از اسلام	*****	علامہ جرجی زیدانؒ
الروض الانف	*****	امام سہیلیؒ
شرح سنن ابی داؤد	*****	امام خطابیؒ
قانون اسلام	*****	سرسید احمد خانؒ

عہد نامہ قدیم

عہد نامہ جدید

احکام القرآن	*****	امام رازیؒ
الاحکام السطانیہ	*****	امام ماوردیؒ
کتاب المثالب	*****	ابن ہشام
اعلام النبوۃ	*****	امام ماوردیؒ
الطرق الحکمتیہ	*****	علامہ ابن قیمؒ
البیان والتبیان	*****	امام جاحظ
الکامل	*****	علامہ ابن کثیرؒ
کتاب البیان	*****	امام لیثیؒ

ضرب الامثال	*****	میدانیؒ
کتاب العمدہ	*****	علامہ ابن رشیقؒ
کتاب الاوائل	*****	اسماعیل بن عبداللہ موصلیؒ
الوفاء	*****	ابن جوزیؒ
مفردات القرآن	*****	علامہ راغب اصفہانیؒ
الجامع الصغیر	*****	امام سیوطیؒ
شرح المواہب اللدنیہ	*****	امام زرقانیؒ
البیان والتعریف	*****	ابراہیم بن محمد الحسینیؒ
الصحاح اللغتہ	*****	امام جوہریؒ
مقاتل الفرسان	*****	ابوعبیدہؒ

دیوان	*****	حضرت حسان بن ثابتؓ
الشفاء	*****	قاضی عیاضؒ
طبقات الکبری	*****	ابن سعدؒ
سیرت حلبیہ	*****	امام حلبیؒ
مدارج النبوۃ	*****	محدث دہلویؒ
جمع الوسائل	*****	ملا علی قاریؒ
المواہب اللدنیہ	*****	امام قسطلانیؒ
جواہر البحار	*****	امام بیہقیؒ
السیرۃ النبویہ	*****	ابن عساکرؒ
شعب الایمان	*****	امام بیہقیؒ

المعجم الصغیر ***** امام طبرانیؒ

فتح الباری ***** ابن حجر عسقلانیؒ

اخبار مکہ ***** امام فاکہیؒ

الکفایہ فی العلم الراویہ ***** خطیب بغدادیؒ

التمہید ***** ابن عبدالبرؒ

الثقات ***** ابن حبانؒ

سبل الہدیٰ والرشاد ***** امام صالحیؒ

المنصف ***** ابن ابی شیبہؒ

شرح مسلم ***** امام نوویؒ

شمائل الرسول ***** امام ابن کثیرؒ

صفوۃ الصفوۃ	*****	ابن جوزیؒ
امتاع الاسماع	*****	امام طبرانی
میزان الاعتدال	*****	امام ذہبیؒ
الاستیعا ب	*****	ابن عبدالبرؒ
التفسیر الکبیر	*****	امام رازیؒ
کتاب الزہد	*****	ابن مبارکؒ
السنن	*****	دارمیؒ
الآحادولمثانی	*****	امام شیبانیؒ
المسند	*****	ابن جعدؒ
السنن الکبریٰ	*****	امام نسائیؒ

تاریخ دمشق الکبیر	*****	ابن عساکرؒ
المنصف	*****	عبدالرزاقؒ
المستدرک	*****	حاکمؒ
زادالمعاد	*****	ابن قیمؒ
تاریخ الکبیر	*****	امام بخاریؒ
انسان العیون	*****	امام حلبیؒ
مشکواۃ المصابیح	*****	خطیب بغدادیؒ
الکامل فی التاریخ	*****	ابن جریر طبریؒ
تاریخ الامم والملوک	*****	ابن جریر طبریؒ
السنن	*****	نعیم بن حمادؒ

تہذیب الکمال	*****	امام مزیؒ
المسند	*****	اسحاق بن راہویہؒ
تہذیب الاسماء	*****	امام نوویؒ
الاصابہ	*****	ابن حجر عسقلانیؒ
الریاض النضرۃ	*****	امام زرقانیؒ
شرح المؤطا	*****	طبرانیؒ
معجم الاوسط	*****	عبدالرزاقؒ
الادب المفرد	*****	امام بخاریؒ
لسان المیزان	*****	ابن حجر عسقلانیؒ
تذکرۃ الحفاظ	*****	امام ذہبیؒ

المسند	*****	ابو عوانہؒ
مسلمانوں کا ہزار سالہ اقتدار	*****	پروفیسر ارشد جاوید
رسول اکرمﷺ کی سیاسی زندگی	*****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
قرآن اور جدید سائنس	*****	ڈاکٹر حشمت جاہ ؒ
رسول عربی اور عصر جدید	*****	سیّد محمد اسماعیلؒ
علم کی اسلامی تشکیل	*****	خورشید احمد ندیم
میزان	*****	جاوید احمد غامدی
شرح الشفا	*****	ملا علی قاریؒ
تاریخ الخمیس	*****	دیار بکریؒ
الایمان	*****	ابن مندہ ؒ

السنن	*****	ابن ماجہؒ
ترکۃ النبیؐ	*****	ابو اسماعیل بغدادیؒ
الرسولؐ	*****	عبدالحلیم محمودؒ
روح المعانی	*****	علامہ محمود شکری آلوسیؒ
قیامت اور جدید سائنس	*****	ڈاکٹر حشمت جاہؒ
الدیباج	*****	امام سیوطیؒ
مکارم اخلاق	*****	ابن ابی الدنیاؒ
السنن الکبریٰ	*****	امام بیہقیؒ
الخصائص الکبریٰ	*****	امام سیوطیؒ
المسند	*****	امام احمد بن حنبلؒ

الطبقات	*****	ابن خیاطؒ
الجامع الصحیح	*****	امام ترمذی
السنن	*****	ابوداؤدؒ
شرح معنی الآثار	*****	امام طحاویؒ
مجمع الزوائد	*****	ہیثمیؒ
فیض القدیر	*****	منادیؒ
الترغیب والترہیب	*****	منذریؒ
مشکل الآثار	*****	امام طحاویؒ
اسلامی ریاست	*****	پروفیسر خورشید احمدؒ
کیمیائے سعادت	*****	امام غزالیؒ

البیان فی التفسیر القران	*****	ابن جریر طبری ؒ
مشکواۃ المصابیح	*****	الخطیب ؒ
الجوامع السیاسیہ	*****	امام ابن تیمیہ ؒ
بیان العلم و فضلی	*****	ابن عبدالبر ؒ
تاریخ السلامی السیاسی	*****	حسن ابراہیم الدکتور ؒ
النظم الاسلامیہ	*****	حسن ابراہیم الدکتور ؒ
کتاب الخراج	*****	الامام ابو یوسف ؒ
تحفۃ الاشراف	*****	المزی ؒ
حسن المحاضرۃ	*****	امام سیوطی ؒ
مقائس اللغۃ	*****	ابن فارس ؒ

اعلام الموقعین ***** ابن قیمؒ

سنن الدارمی ***** الدارمیؒ

الزھد ***** امام احمد بن حنبلؒ

تفسیر ابن کثیر ***** از ابن کثیرؒ

تاریخ الکامل ***** ابن اثیرؒ

فتوح البلدان ***** امام بلازریؒ

المذاہب الاربعہ ***** عبدالرحمانؒ

کتاب النوبیہ ***** ابن ہشامؒ

عیون الاخبار ***** ابن قتیبہؒ

شذرات الذھب ***** ابن عمادؒ

الشفاء	*****	قاضی عیاضؒ
غریب الحدیث	*****	امام ابن اثیرؒ
وفا الوفا	*****	امام سمہودیؒ
کتاب الاصنام	*****	ابن قتیبہ
لسان العرب	*****	ابن منظورؒ
الرسول القائد	*****	خطاب محمود شیثؒ
البدر الطالع	*****	امام شوکانیؒ
الاداب	*****	امام بیہقیؒ
دلائل النبوۃ	*****	ابن ندیمؒ
الشمائل	*****	امام ترمذیؒ

المنار ***** رضا رشیدؒ

علم الراویہ ***** خطیب بغدادیؒ

السنۃ قبل التدوین ***** خطیب العجاجؒ

الکشاف ***** زمخشریؒ

مسند الفردوس ***** دیلمیؒ

معجم الکبیر ***** طبرانیؒ

تفسیر در منشور ***** امام جلال الدین سیوطیؒ

المبسوط ***** شمس الائمہؒ

المراسیل ***** سجستانیؒ

غریب الحدیث ***** خطابیؒ

صحیح ابن حبان	*****	از ابن حبانؒ
عمل الیوم ولیلۃ	*****	للنسائیؒ
تاریخ الادب الجاہلی	*****	شوقی ضیف الدکتورؒ
مفتاح الجنۃ	*****	امام سیوطیؒ
علوم الحدیث	*****	صبحی صالحیؒ
شرح معانی الاثار	*****	امام الطحاویؒ
تاریخ الادب الاسلامی	*****	شوقی ضیف الدکتورؒ
شرح مسلم	*****	شبیر احمد عثمانیؒ
فلسفہ التشریخ فی الاسلم	*****	صبحی صالحیؒ
الاحدیث المھشرہ	*****	شمس الدین سخاویؒ

انساب الاشراف	*****	امام بلاذری ؒ
ہدیۃ العارفین	*****	اسماعیل باشاؒ
مناہل الصفاء	*****	امام سیوطی ؒ
مقاصد الحسنہ	*****	امام سخاوی ؒ
المنصف	*****	عبدالرزاق ؒ
جامع الصغیر للمنادی	*****	امام سیوطی ؒ
مفاتیح الغیب	*****	امام رازی ؒ
مسند احمد	*****	امام احمد ؒ
الشعر والشعرا	*****	ابن قتیبہ ؒ
العبقریات الاسلامیہ	*****	العقاد عباس محمود ؒ

حدیث دفاع	*****	میجر جنرل اکبر خانؒ
اسلامی طریق جنگ	*****	میجر جنرل اکبر خانؒ
الفیض القدیر	*****	المناویؒ
الکامل فی الضعفاء	*****	ابن عدیؒ
محاسن التاویل	*****	قاسمی جمال الدینؒ
مسلمانوں کا نظم مملکت	*****	حسن ابراہیمؒ
سود	*****	سیّد مودودیؒ
حیات محمدؐ	*****	محمد حسنین ہیکلؒ
الوثائق الساسیہ	*****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
تجدید احیائے دین	*****	سیّد مودودیؒ

الاحکام القرآن	*****	محمد بن احمد قرطبیؒ
مسلم نشاۃ ثانیہ	*****	ڈاکٹر محمد امین
مسلمان اور سائنس کی تحقیق	*****	حبیب احمد صدیقیؒ
نامور مسلمان سائنس دان	*****	حمید عسکریؒ
نظام الحکومت نبویہ	*****	شیخ عبدالحیٔؒ
الاسلام والحضاوۃ العربیہ	*****	کرد علیؒ
سائنس وطب میں مسلمانوں کا عروج	*****	حفیظ الرحمٰن صدیقیؒ
فیض الباری	*****	محمد انور شاہؒ
سو مسلم سائنس دان	*****	رفیق انجمؒ
شاندار سائنسی کارنامے	*****	زکریا ورقؒ

تخریج الحدیث	*****	مولانا محمد سعیدؒ
سنت کا تشریحی مقام	*****	محمد ادریس میرٹھیؒ
احادیث الموضوعہ	*****	ملا علی قاریؒ
ترجمان القرآن	*****	مولانا ابوالکلام آزادؒ
رسول عربیؐ	*****	مولانا ابوالکلام آزادؒ
رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی	*****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
منصب امامت	*****	شاہ اسماعیل شہیدؒ
یورپ پر اسلام کے احسانات	*****	غلام جیلانی برقؒ
حسنت جمیع خصالہ	*****	طالب ہاشمیؒ
دعوت دین اور اس طریق کار	*****	امین احسن اصلاحیؒ

فی ظلال القرآن	*****	سیّد قطب شہید ؒ
احسن التفاسیر	*****	احمد حسن دہلوی ؒ
قصص الانبیاء	*****	محمد حفظ الرحمٰن ؒ
مدارج النبوہ	*****	معین فراحی ؒ
سیرت الرسول	*****	محمد بن عبدالواہاب ؒ
الرحیق المختوم	*****	صفی الرحمان مبارک پوری ؒ
محمد عربی ؐ	*****	محمد احمد برانق ؒ
اسلامی ریاست	*****	امین احسن اصلاحی ؒ
ترجمان السنۃ	*****	بدر عالم میرٹھی ؒ
اسلام کا معاشرتی نظام	*****	خالد علوی ؒ

اسلام کا سیاسی نظام *****	محمد اسحٰق سندیلوی ؒ
تفہیمات *****	سیّد مودودیؒ
سیرت نبویؐ *****	ڈاکٹر مصطفیٰ صباحیؒ
پیغمبر انسانیت *****	شاہ محمد جعفر پھلواریؒ
سیرت رسول عربی *****	علامہ نور بخش توکلیؒ
خطبات مدارس *****	سید سلیمان ندویؒ
عہد نبوی نظام حکمرانی *****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
سیرۃ المصطفیٰؐ *****	محمد ادریس کاندھلویؒ
تاجدار دو عالمؐ *****	عزائم عبدالرحمانؒ
اسلام کا اقتصادی نظام *****	حفظ الرحمٰنؒ

معجزات سرورکونین	*****	طالب ہاشمیؒ
ارشادات دانائے کونین	*****	طالب ہاشمیؒ
منصب امامت	*****	طالب ہاشمیؒ
اخلاق پیغمبری	*****	طالب ہاشمیؒ
معارف الحدیث	*****	محمد منظور نعمانیؒ
فصاحت نبوی	*****	ڈاکٹر ظہور احمد اظہرؒ
رہبر کامل	*****	مولانا عبدالمجید خادمؒ
اسوہ رسول اکرمؐ	*****	ڈاکٹر محمد عبدالحئیؒ
اخلاق نبوی	*****	سیّد محمد اسحاقؒ
نبی رحمت	*****	سیّد ابوالحسن ندویؒ

محمد رسول اللہؐ	*****	شیخ محمد رضا مصری ؒ
محمد رسول اللہ ﷺ	*****	توفیق الحکم ؒ
پیغمبر انقلاب	*****	مولانا وحید الدین خان ؒ
عبقریت محمدؐ	*****	عباس محمود العقاد ؒ
نبی اکرمؐ کی معاشی زندگی	*****	ڈاکٹر نور محمد غفاری ؒ
خاندان نبوت	*****	محمد ادریس ؒ
معرکہ اسلام اور جاہلیت	*****	صدر الدین اصلاحی ؒ
مغازی رسولؐ	*****	حضرت عروہ بن زبیرؓ
تاریخ مکہ	*****	منظور احمد شاہ ؒ
منصب نبوت	*****	سیّد ابو الحسن ندوی ؒ

شمائل کبری ***** عبدالحکیم خانؒ

سیرۃ اکبریٰ ***** مولانا ابوالقاسمؒ

راہ عمل ***** مولانا جلیل احسنؒ

زادراہ ***** مولانا جلیل احسنؒ

وفود عرب ***** طالب ہاشمیؒ

سیرت سیّدہ فاطمہؓ ***** طالب ہاشمی

معارف القرآن ***** مفتی محمد شفیعؒ

ترجمہ قرآن ***** سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

البستان ***** واثق باللہ

کتاب السماء ولغات ***** امام نووی

محمد رسول اللہؐ	*****	محمد صادق ابراہیمؒ
رسول مبینؐ	*****	محمد احسان الحق سلیمانیؒ
سیرت محمدیؐ	*****	سر سید احمد خانؒ
سیرت سرور کونینؐ	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

Westren Authors.

Dalbeer...Mater ,Eather,Motion.

J.G.Freezer... Man God and Immortalilty.

S. Hussan Naser... Islamic Science.

J.Heksely... Religion Without Revolation.

Philps Hitty... History of Arabs.

Springler...Fall of west.

Carbin... EN Iranien Islam.

Sir jamees jeen...Modren Islimic Thought.

Johan Wellosan...Philosophy of Reilgion.

R.I.Gulick..Muhammad The educator.

Cob..Islamic Contribution to word culture.

Briffault...The making of Humanity.

Bosworth... The Lagacy of Islam.

S, Charles Darwen...Origion of Species.

Mont Watt...History of Islamic Spain.

B.Russal...The Conquest of Happiness

Michael H Hart... The 100

M,White...The limitaaions of Sciens

Ameer Ali... The Spirit of Islam.

Edendton...The age of analysis.

James jeans...The Mysterious Univers.

Hanes Berg...Modren scientefec thought.

W Back...Modern Science & natur Life.

Zohansicy...Gentic and origen of Species.

Karal Marx...Das Kapital.

Lebon...The Erab Civilazation.

Genetic Code .... Issaac Asimov.

Trawleing...History of Religion.

B, Russiall History of civiliazation.

Freud... Toam and Tabuos.

Freud....Pleasure thinking.

Robert Semith....Religion of Erabs.

well deurant...The age of faith.

Walteare...The History of China.

Freud...His Dream & Sex Theories.

Pierre Lecomde... Human Destiny.

Pro, Brian..New Horizons in Psychology.

P.Nik... Fondamentals of Politics.

Glance at Historical Materialism.ASpirken.

Pro, Hageel... Wonder Of Life

Dr. Hehoom... Human Understanding.

Fraied.... Totam and Taboos

Fried.....Pleasure Thinking

Robert Smith...Religion of the semites.

RussallBurtrand ...The Conquest of Happiness.

JOHAN WILLSON ...Philosophy and Religion

Tyndall...Matter and Motion.

MORTEN WHITE....The Limitations of Science.

ARUTHOR ENDEKTAN...The age of Analysis

Sir Jameus Jeens...Modren Scitefic Thought.

Dob Zohans..Genetic and The origin of species.

Raney Grew...Civilization of the east.

Sir Leonard Woolley...Abraham.

Freazer...The Golden Bough.

Edward Mc Nall.... Westren Civilization.

Breufalt.... The Making of Humanity.

Dr, Dedat ... The Ultimate Miracle.

A. Curte...Discover Behind The iron Curtain.

Dr,Harwey Day...The Hidden Power of vibration.

Russal...History of Westren Philosophy.

Jon Stevens... Secred Calligraphy of east.

Dr,simith... Divin Origin.

B Russal...History of Arebs.

Dr,Zafar, Towards understandin Qurran.

DR, mir Aneesudin... The Holly Quran.

Dr M Taqi... The Noble Quran.

Asimov... Exploring the earth and cosmos.

S,Hawhing...A Brief History of Time.

Al,Gore ... Erth in Balance.

J.Sylvester... The Gene Age.

R.Hill.... Physical Methalogy.

David Burine... Micro Life.

STephen Jay Gold... The Panda Thumb.

Rachel Carson... Silent Spring.

Mir,Steween... Geodetic Survey.

J.Parker ... Erth Sciences.

Aavagardo.... Water Realities.

Lyantan Keith...Between Two Words.

Allan Baratan...Recovery and Recycil.

Oliver Owen... Natural Conservations.

A.J.Longly....Environment of Technology.

Richard Wedford....Envionmetel Management

Robert Raymond...Out of Fiery.

P.R.Trevidi....Energy Resources.

Dr.Shafi Hader... Four Tools for a Musilm.

Dr.Shafi Hader... Scince in Quraan.

M.A.Qazi.... Quranic Concept.

A.Ryabchikov....Changing Face of earth.

Dr.Shafi Hader... Deep Thinking.

S.Manzoor...Scientific Significance in Quraan.

Dr.Shafi Hader...Quraan and Miracle Life.

Dr.Shafi Hader...Quraan and Fate of Cosmos.

Muhammad Shihabuddin nadvi... Cloning.

Syed Mubarak... Quranic Phlosephy.

Ellisow Hawks...Mysteries Of Science.

E.L.Abel... Moon Madnes.

Abdul Mobin Khan... Basic Immunology.

Dr.Shafi Hader...Creation Of Life.

Dr.Shafi Hader...Creation Of Universe.

Barnaby Rogerson... The Prophet Muhammad

Ingird Mattson.... The Study of Qurran.

Dr, Mohammad Rana... History of Islam.

Adrinne Jansen... Asian Face Of Islam.

Thomos C,... Years of Innovation.

Erich.V, ... Miracles Of God.

I.A. Ibrahim... Understanding Islam.

Dr,Kazmi ...Guinness Concept.

Dr.Shafi Hader..Quraan and Quality Concepts

Judit Bower...Enviromental Systems.

Syed Mubarak...Quranic Therapy.

Shah Manzoor... Quranic Verses.

B.Person...History of Prophet Mohammad.